جملہ حقوقِ اشاعت بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	...	محرم کی دس راتیں
مصنف	...	حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم العالیہ
سنِ اشاعت	...	2020ء
کمپوزنگ	...	مولانا عبد اللہ صاحب۔ اوکاڑہ
سیٹنگ	...	صہیب ظفر۔ محمود پبلی کیشنز
ناشر	...	محمود پبلیکیشنز اسلامک ٹرسٹ، اردو بازار، لاہور

ملنے کے پتے

☆ مکتبہ دار المعارف، دفتر: محمود پبلی کیشنز (اسلامک ٹرسٹ)

فرسٹ فلور 55، ہادیہ حلیمہ سنٹر، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور

فون: 042-37.32.15.26, 0302-42.84.770

☆ جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی، نزد توحید پارک، شاہدرہ، لاہور

فون: 0300/0336-63.32.387

☆ جیلانی اکیڈیمی جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0300-48.40.053

☆ سٹی جامع مسجد سٹاک پورٹ روڈ مانچسٹر، یو۔کے، پوسٹ کوڈ: M12 4DT

Jamia Islamia, Manchester M12 4DT, UK

Tel: 0044-787.715.1083, Mob: 0044-781.510.8503



فہرست عنوانات

چوتھی رات (مجلس4) 179

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی خَیْرِ الْوَرٰی مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہِ الَّذِیْنَ ھُمْ نُجُوْمُ الْھُدٰی وَعَلَی الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ بِاِحْسَانٍ مِّنْ اَھْلِ التُّقٰی وَالنُّھٰی ... اَمَّا بَعْدُ:

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رشد و ہدایت کے لئے نبوت و رسالت کا سلسلہ شروع فرمایا جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور اس سلسلہ ذہب کی آخری کڑی رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین حضور محمد عربی ﷺ کی پر نور ذاتِ مبارکہ قرار پائی اس لیے عقیدہ ختم نبوت دین اسلام کے عقائد میں ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

اللہ ربّ العزت نے اپنے محبوب حضور نبی کریم ﷺ کو خاتم النبیین کا منصب عطا فرمایا اور بقیہ تمام قیامت تک آنے والی امت کی ہدایت و نجات کا انحصار آپ ﷺ کے ذریعہ بھیجی گئی اور آپ کی بتائی گئی تعلیمات کو ماننے میں مرکوز رکھا۔

اس لیے آپ ﷺ کی بعثت بھی کسی خاص ایک قوم یا کسی ایک ملک یا کسی خاص ایک قبیلہ یا کسی خاص ایک خاندان یا چند مخصوص افراد کے لیے تو ہوئی نہ تھی بلکہ آپ ایک عالمی نبی اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے مبعوث کیے گئے تھے اور قابل غور امر ہے کہ آپکی بعثت اس خطہ میں ہوئی جہاں کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں نہ کوئی عام مہذب معاشرہ تھا اور نہ ہی متمدنہ زندگی کے اصول پائے جاتے تھے۔ تمام قبائل و خاندان افتراق و انتشار کا شکار اور مختلف مذہبی نظریات کو اپنائے ہوئے تھے چنانچہ ایسی قوم کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنا یا تسبیح کی مانند ایک دھاگے میں پرونا کوئی آسان کام نہ تھا مگر اللہ رب العزت کے بھیجے گئے اس نبی آخر الزماں حضور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت سے یہ مشکل اور ناممکن کام بھی ہو کر رہا، اور نا صرف یہ ہوا بلکہ ایسا ہو کر اس آسمان کے نیچے ایک ایسی مثال قائم ہو گئی کہ جسکی نظیر اقوام عالم میں نہ

پہلے ملتی ہے اور نہ کہیں بعد میں ملتی ہے۔ ع

محمد (ﷺ) کی غلامی کر تو بھی سیکھ جائے گا

جہاں بینی، جہاں گیری، جہاں داری، جہاں بانی

آنحضرت ﷺ نے اپنی ایک شاگردوں کی جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تیار کیا جو کسی خاص ایک قوم، ملک، قبیلہ یا خاندان کے نہ تھے۔ آپ ﷺ ان کے سامنے قرآن کریم کی آیات تلاوت فرمایا کرتے، ان کی تربیت کیا کرتے، سنت و حکمت سکھایا کرتے اور انہیں تزکیہ کی دولت سے مالامال کیا کرتے تھے گویا کہ آپ کی تربیت نے ان حضرات کو مذہبی، معاشرتی، اخلاقی، وروحانی اعتبار سے ایک درجہ کمال تک پہنچا دیا اور ان مختلف خیالات کے حامل معاشرے میں زندگی گزارنے کے ہر شعبے جس میں عقائد و اعمال، عبادات و معاملات، غم و مسرت، مصافحہ و سلام، ہجرت و اقامت، سفر و حضر، دعوت و ملاقات، عبادات و تعزیت، غسل و طہارت، تبریک و تحنیت، کفن و دفن، صلح وجنگ، تجارت و معیشت، مسجد و گھر، سے لیکر کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے، مرنے جینے، شادی بیاہ اور سیاست تک ہر میدان میں، گنتی کے چند سالوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اللہ کی مدد و نصرت سے ان کے دلوں کو جوڑ کر انہیں ایک ایسی قوم بنا دیا کہ جس کی مثال چشم فلک نے پہلے کبھی نہ دیکھی ہو گی۔ چنانچہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ع

کیا تو نے صحراں نشینوں کو یکتا

نظر میں خبر میں اذانِ سحر میں

طلب جس کی صدیوں تھی زندگی کو

وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں

اس دین محمدی نے قیامت تک چلنا ہے اس لیے ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ آپ ﷺ کی عمر مبارکہ کئی سو سال ہوتی اور آپ براہ راست قیامت تک آنے والے انسانوں کو خود دعوت دیتے اور ایسا ہونا سنت الہٰی کے خلاف بھی ہے تو آنحضرت ﷺ نے جماعت صحابہ

کو تیار کیا۔ اس لیے صحابہ کرام وہ پہلی دین کی کڑی قرار پائے جن سے اس دین کا سلسلہ آگے چلا اور ان کے ذریعہ سے ہی یہ دین بقیہ امت تک پہنچا کیونکہ بلاشبہ دین کو اگلوں تک پہنچانے کا اس سے بہتر عقلی اور مؤثر طریقہ اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دین کڑی بہ کڑی ایک تسلسل کے ساتھ قیامت تک آنے والے انسانوں کی راہنمائی کا ذریعہ بنے۔
چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲﴾ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۳﴾

(پ28، الجمعہ 2-3)

ترجمہ: وہی ہے جس نے امی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کرے، اور ان کو پاکیزہ بنائے، اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ اور (یہ رسول جن کی طرف بھیجے گئے ہیں) ان میں کچھ اور بھی ہیں جو ابھی ان کے ساتھ آکر نہیں ملے۔ اور وہ بڑے اقتدار والا، بڑی حکمت والا ہے۔

ان آیات سے آنحضرت ﷺ کی دو بعثتیں معلوم ہوتی ہیں اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے امیین میں سے ہی ایک رسول بھیجا جس نے ایک جماعت کو تیار کیا اور یہ آپ ﷺ کی پہلی بعثت ہوئی جس کی سعادت بلاشبہ براہ راست حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حصہ میں آئی اور دوسری بعثت ان لوگوں کی طرف ہوئی جو ابھی آئے نہیں یا پیدا نہیں ہوئے اور ان تک یہ دین بھی صحابہ کرام کے ذریعے ہی پہنچا، تو یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ بقیہ امت کے لیے اس دوسری بعثت کا ذریعہ بھی حضرات صحابہ کرام ہی قرار پائے اور الغرض اس طرح یہ دین ایک تسلسل کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے صحابہ اور پھر صحابہ سے تابعین اور پھر تابعین سے تبع تابعین کے ذریعے ایک منظم طریقہ سے اگلی نسلوں تک پہنچتا رہا ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک ایسے ہی چلتا رہے

گا۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جوں ہی کسی علاقے میں اسلام قبول کیا جاتا آپ فوراً وہاں اپنی تیار کردہ جماعت میں سے کسی شاگرد صحابی کو معلم بنا کر بھیج دیا کرتے تھے جو ان نو مسلموں کو دین سکھایا کرتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد خلفاء کے دور میں بھی جونہی کسی ملک یا علاقے میں دین حق قبول کیا جاتا تو خلیفہ وقت وہاں قرآن وسنت کی تعلیم کے لئے فوراً حضور کے کسی صحابی یا تابعی کو ان لوگوں پر مقرر فرما دیا کرتے تھے۔

سو اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اندر ہی مکہ و مدینہ سے لے کر کوفہ، بصرہ، شام، یمن گویا کہ اسلامی سلطنت کے ہر صوبے اور ہر بڑے شہر میں قرآن وسنت کی تدریس کے عام حلقے ہوا کرتے تھے جن میں اہل سنت کی ہی تعلیمات کا درس دیا جاتا تھا کیونکہ تمام صحابہ کرام ایک ہی دین کی تعلیم و ترویج کی اشاعت کیا کرتے تھے۔ لہذا آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کا لایا گیا دین بڑے احسن طریقہ سے سینہ بہ سینہ اور قلم و قرطاس کے ذریعے ہو بہو اسی طرح آگے منتقل ہوتا ہوا بقیہ امت کو پہنچا۔

یہاں ایک بات ذہن نشین رہے کہ اگر دین کی پہلی کڑی والے حضرات کے درمیان بشری تقاضے کے پیش نظر، انتظامی امور میں کبھی کوئی اختلاف رونما ہوا بھی ہے تو اس وجہ سے ان کا کلمہ، اذان، نماز، وضو اور مساجد الگ الگ نہ ہو گئی تھیں بلکہ وہ حضرات ان انتظامی امور کو دین کے ساتھ نہ جوڑا کرتے تھے اس لیے اختلافات ہونے کے باوجود وہ بزرگ حضرات، دین کے معاملہ میں ایک دوسرے پر مکمل اعتماد کیا کرتے تھے اور اپنے دنیوی معاملات اور دین کے فروعی مسائل میں اختلافات رکھنے کے باوجود ایک ہی کلمہ، نماز، اذان، وضو اور مسجد کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

تاہم جیسا کہ آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد صحابہ کرام اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کی محنت اور ایثار و قربانی سے یہ دین آگے بقیہ امت تک پہنچا جس میں پہلی صدی ہجری کے آخر تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بذات خود موجود تھے اور

دوسری صدی ہجری میں تابعین و تبع تابعین ایک بڑی تعداد میں موجود تھے جن میں حدیث وفقہ کے بڑے بڑے آئمہ کرام میں سے امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ (70-150ھ) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ (93-179ھ) امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (88-157ھ) امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ (96-161ھ)، امام لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ (94-175ھ)، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (150-204ھ) اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (164-241ھ) جیسی قد آور علمی شخصیات شامل ہیں اور یہ تمام حضرات اہل سنت والجماعت کے ہی آئمہ کرام مانے اور جانے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ ان آئمہ حضرات کی تقلید دوسری صدی ہجری سے ہی تمام مملکت اسلامیہ میں رائج ہو چکی تھی اور ان میں سے بھی بالخصوص آئمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کے مدون فقہی مذاہب سر فہرست ہیں جو آج تک اپنی پوری شان وشوکت اور تابانی کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔

اسی طرح پہلی اور دوسری صدی ہجری میں احادیث کا ذخیرہ بھی کئی صحیفوں اور کتابوں کی شکل میں موجود تھا اور بالخصوص پہلی صدی ہجری میں (بقول مولانا گیلانی مرحوم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کردہ احادیث کے زندہ وجاوید نسخے حضرات صحابہ کرام بذات خود موجود تھے، جن میں سے ہر کوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق تابعین کو فیض یاب کر رہا تھا سو یہاں ہم پہلی اور دوسری صدی ہجری سے چند کتب احادیث کے نام بھی پیش کیے دیتے ہیں، امام ہمام بن منبہؒ (101ھ) کا "صحیفہ ہمام بن منبہ" امام شعبیؒ (106ھ) کی "الابواب" امام مالکؒ (179ھ) کی "مؤطا امام مالک" امام محمدؒ (189ھ) کی "مؤطا امام محمد" اور "کتاب الآثار" سر فہرست ہیں بلکہ تیسری صدی ہجری کے وسط تک حدیث کی شہرہ آفاق کتاب صحیح بخاری اور صحیح مسلم بھی منظر عام پر آچکی تھیں۔

مختصر یہ بتانا مقصود ہے کہ اسلام کی پہلی دو صدیوں میں مسلمان اپنی سادہ فطرت کے مطابق خالصتاً قرآن کریم اور اپنے رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال پر کار بند تھے اور صرف کار بند ہی نہ تھے بلکہ اسے بڑے احسن طریقے سے اگلوں تک پہنچا بھی رہے تھے اور بلاشبہ ان تمام سلف صالحین اور آئمہ و محدثین کا شمار اہل سنت کے ہی اکابرین اور اسلاف

میں ہوتا ہے۔

یونانی فلسفہ سے مسلمانوں کا واسطہ

تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور(158ھ) کے عہد خلافت کے آخری چند سالوں میں ایک علم سے واقفیت کی غرض سے اور علمی خدمت سمجھتے ہوئے فلسفہ یونان کی کتب کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا باقاعدہ آغاز ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا اور بالاخر خالصتاً عقل پر مبنی اس فلسفہ یونان نے مذہب اسلام کے ساتھ ٹکرانا شروع کر دیا۔

اس وقت کے علمائے کرام کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے(**فجزاھم اللہ**) کہ جنھوں نے اسلامی عقائد کا دفاع کرتے ہوئے اس دور کے ان تمام فتنوں کے پیدا کردہ ان مسائل و نظریات کا بھرپور اور پرزور رد کیا۔

اس وقت کے ان علمائے ربانیین میں امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 333ھ) اور امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ(متوفی 330ھ) کا نام سر فہرست ہے جنھوں نے اسلامی عقائد کا دفاع کر کے نا صرف حق ادا کر دیا بلکہ "علم الکلام" جیسے اونچے موضوع اور فن کی بنیاد بھی رکھی جسے بعد میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (505ھ) جیسی قد آور علمی شخصیت نے کمال کی حد تک پہنچا دیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور اسی کی زبان و منطق میں اسے جواب دیا۔ یونانی فلسفہ پر امام غزالی کی "مقاصد الفلاسفہ" اور "تھافتہ الفلاسفہ" نامی کتابیں مشہور و سر فہرست ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ (606ھ) جیسی نابغہ روزگار شخصیت تشریف لائے اور فلسفے کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور جو رہی سہی کسر باقی رہ گئی تھی اسے شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ(728ھ) نے پورا کر دیا اور "الرد علی المنطقیین" کتاب لکھ کر اپنی حجت ان پر تمام کر دی۔ المختصر امام ابو منصور ماتریدی و امام ابو الحسن اشعری کی ابتداء و محنت ہو یا امام غزالی کے افکار، امام رازی کے مسائل ہوں یا ابن تیمیہ حرانی کی علمی مہمات، ان تمام علمائے اعلام کا حدف اسلام مخالف عقلیات کا رد تھا۔

یہاں ایک اور بات واضح کرتا چلوں کہ اہل سنت نے ہمیشہ علم الکلام کو ایک مفید فن کی حد تک سمجھا یا رکھا ہے جس کے ذریعہ عموماً اہل باطل کا انہی کی زبان میں رد اور حق واضح کرنا مقصود ہوا کرتا ہے کیونکہ اپنی اصل میں اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ تو صرف قرآن و سنت کے ذریعہ ہی بہتا چلا آرہا ہے۔ اور اسی طرح یہ آگے قیامت تک چلتا چلا جائے گا۔

یونانی فلسفہ اور شیعہ مذہب

یونانی فلسفے کا اسلام سے باقاعدہ واسطہ پڑنے سے پہلے ہی خالصتاً قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیمات اہل سنت کے اسلاف و آئمہ کے ذریعے ترتیب پاکر پورے عالمِ اسلام میں پھیل چکی تھیں جس کا ہم اجمالاً پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بعد سے اہل تشیع ایک سیاسی گروہ کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے اور اسی طرح یہ معاشرے میں چلے آرہے تھے کہ چوتھی صدی ہجری میں ملا یعقوب کلینی (329ھ) اپنے مذہب کو باقاعدہ طور پر ترتیب دے کر ''اصول الکافی'' کے نام سے اپنی اس کتاب کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ جس دور میں ملا یعقوب کلینی آنکھ کھولتے ہیں اور جس سیاسی مکتبہ فکر کی آغوش میں آپ پروان چڑھے ہیں اور جس ماحول میں وہ علمی پرورش پاتے رہے ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ خالصتاً عقل پر مبنی فلسفہ سے متاثر تھے جس کا قوی ثبوت آپ کے اصول الکافی میں بیان کردہ نظریات اور اپنی اس کتاب کو ''کتاب العقل'' سے شروع کرنا، واضح کرتا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ بھی مذہب اہل تشیع کی دیگر معتبر مذہبی کتب اسی فلسفہ و منطق سے لت پت نظر آتی ہیں۔

اہل تشیع کے برعکس اہل سنت کی صرف دو معتبر اور شہرہ آفاق حدیث کی کتب صحیح بخاری شریف اور صحیح مسلم شریف کے آغاز کو ہی دیکھ لیا جائے کہ ان میں سے ایک کا آغاز ''باب الوحی'' اور دوسری کا آغاز ''کتاب الایمان'' سے ہوتا ہے جو خالصتاً فلسفہ و منطق سے پاک اور خالصتاً قرآن کریم کے عین مطابق ترتیب دی گئی ہیں۔

المختصر اسی فلسفہ و منطق کے زیر سرپرستی اہل تشیع حضرات اہل سنت کے خلاف محاذ آرائی شروع کرتے ہیں اور ان کے علامہ حلی (676ھ) ''المنہاج الکرامۃ فی معرفۃ الامامۃ''

کے نام سے ایک کتاب لکھتے ہیں اور اہل سنت کی طرف سے اس کے جواب میں شیخ الاسلام علامہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (728ھ) جیسی قد آور راسخ العلم ہستی صف آرا ہوتی ہے اور ایک مایہ ناز اور ضخیم کتاب "منہاج السنہ" کے نام سے تصنیف فرما کر ان پر حجت تمام کر دیتے ہیں، حق بحق دار رسید۔

اسی طرح اہل سنت کے عقائد و نظریات اور صحابہ و اہل بیت کی عزتوں اور عظمتوں کے گرد پہرہ دینے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور متحدہ ہندوستان میں اس عظیم الشان خدمت کی انجام دہی کے لیے باقاعدہ طور پر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ العزیز (1034ھ) "رد روافض" کے عنوان سے ایک کتاب لکھتے ہیں۔ اس کے بعد سراج الہند شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (1239ھ) کی کتاب "تحفہ اثناء عشریہ" منظر عام پر آتی ہے اور پھر اس کے بعد مولانا محمد احتشام الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (1313ھ) کی "نصیحۃ الشیعہ"، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ (1297ھ) کی "ہدیۃ الشیعہ" اور "اجوبہ اربعین"، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ (1346ھ) کی "مطرقۃ الکرامہ" اور "ہدایات الرشید"، امام اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (1381ھ) کی "تفسیر آیات خلافت وامامت" (اور حضرت کی دیگر کئی کتب)، مولانا قاضی کرم الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ (1365ھ) کی کتاب "آفتاب ہدایت"، مولانا دوست محمد قریشی (1394ھ)، مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ (1404ھ)، قاضی مظہر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (1424ھ)، مولانا عبد الستار تونسوی (1434ھ)، مولانا محمد نافع (1436ھ) رحمہم اللہ تعالیٰ اور رئیس المحققین، امام المتکلمین، مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی کتب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی شمار ہوتی ہیں۔

مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی وہ نابغہ روزگار شخصیت ہیں جنکا شمار عالم اسلام کے نامور علماء میں ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت نے حضرت علامہ صاحب کو علم، عمل، حافظہ، فصاحت، خطابت، حکمت، بصیرت، تصنیف گویا کہ ہر میدان میں لاجواب صلاحیتوں سے مالا مال فرمایا ہے۔ ویسے تو آنموصوف علمی دنیا کے ہر میدان کے شہسوار ہیں مگر اس دور میں اسلامی عقائد و نظریات کے دفاع اور ادیان باطلہ کے

متعلق جو گہری سوچ اور تفکر و تدبر اور مجتہدانہ بصیرت و صلاحیت اللہ رب العزت نے حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم کو عطا فرمائی ہے اس کا ثانی ملنا بہت مشکل ہے۔ حضرت علامہ صاحب کا علم و تحقیق کے ساتھ وہی رشتہ ہے جو ایک جسم اور روح کا ہوتا ہے۔ اور آں موصوف کا ذخیرہ علم گُل و بُلبُل کی وضعی داستانوں، معشوق کی زلف و رُخسار کی مدح سرائیوں یا یارِ بے وفا کے ناز و ادا کے تذکروں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کی سچی تصویر اور نقطہ ءاعتدال پہ قائم رہ کر پیغام قران و سنت بطرزِ اسلاف اگلی نسلوں میں منتقل کرنے کی خوشبوؤں سے معطر ہے۔ البتہ خرمنِ باطل پہ جب وہ بجلیاں گراتے ہیں تو پھر حضرت خالد بن ولید کے اسم گرامی کی برکت و نسبت سے انکے گُلِ علم کی پتیاں تیغ و تفنگ کا کام بھی دیتی ہیں جس کی تیز دھاریں باطل کے اوہام و توہمات کے تمام پر پُرزے اڑا دیتی ہیں۔ اللہ ربّ العزت کی توفیق سے حضرت علامہ صاحب کا یہ خاصا ہے کہ بڑے سے بڑے مسائل کو منٹوں میں حل کر کے اسلاف کی یاد تازہ فرما دیتے ہیں۔ تاہم حضرت علامہ صاحب کی شخصیت اور خدمات پر تو کوئی دفتر چاہیے اس لیے اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

حضرت علامہ صاحب نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عزتوں و عظمتوں کے گرد پہرہ دیتے ہوئے اور عقائد اہل سنت کا دفاع کرتے ہوئے کئی کتب تصنیف فرما چکے ہیں جن کی افادیت و اہمیت خاص و عام کسی بھی حلقے سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ان کتب میں عبقات (دو جلدیں)، خلفائے راشدین (دو جلدیں)، تجلیات آفتاب (دو جلدیں)، معیار صحابیت، دوازدہ احادیث، اہل بیت کرام اور درس قرآن (آنحضرت ﷺ کے بعد خلافت کیسے قائم ہوئی) جیسی ضخیم کتابیں شامل ہیں جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اسی سلسلے کی یہ ایک اہم کڑی "محرم کی دس راتیں" چھپ کر اس وقت آپکے ہاتھوں میں ہے۔ احقر بلا مبالغہ کہتا ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے سے قارئین کو بہت جلد ان مجالس کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان محرم کی مجالس میں حضرت علامہ صاحب نے اہل سنت کے مسلک اعتدال کو آج کل کی زبان میں بڑے آسان فہم پیرائے میں بیان فرما کر اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے اور ناقدین صحابہ و اہل بیت پر حجت کو تمام کر دیا ہے اور نیز

آپ نے ناقدین صحابہ کی طرف سے واقعہ کربلا کے پس منظر میں پیدا کیے گئے شکوک وشبہات کا رد اور غلط نظریات کو تحقیقی اور کئی جگہ سمجھانے کی غرض سے الزامی طریقہ سے بیان کر کے انہیں اچھی طرح بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ مزید یہ کہ حضرت علامہ صاحب نے ان مجالس میں بالخصوص قرآن کریم کی عام فہم سادہ منطق کے ذریعہ ناقدین صحابہ کا صحابہ کرام کے متعلق بُنے خالصتاً عقل پر مبنی جال کو تار تار کر کے رکھ دیا ہے کیونکہ اسلام کی ہدایت کا سرچشمہ قرآن و سنت کے ذریعے ہی بہتا ہے اور بہتا چلا آرہا ہے اور اسی طرح یہ قیامت تک بہتا چلا جائے گا۔

حضرت علامہ صاحب نے دوران مجلس جہاں کہیں آیات، احادیث، تاریخ یا شیعہ کتب سے حوالے دیئے ہیں قارئین کی آسانی کے لیے ان کے حوالہ جات کی تخریج کر دی گئی ہے تاکہ کسی کو کوئی حوالہ تلاش کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں بات کو مزید واضح کرنے کے لیے حاشیے میں حضرت علامہ صاحب اور دیگر بزرگ علماء کی کتابوں سے تحریرات اور اقتباسات کو نقل کر دیا گیا ہے۔

آخر میں احقر بالخصوص استاذنا المکرم رئیس المحققین، امام اہل سنت حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب اطال اللہ فیوضھم علینا کا شکر گزار ہے کہ جنہوں نے احقر کی درخواست پر شفقت فرماتے ہوئے کتاب ھذا پر ایک مبسوط علمی مقدمہ سپرد قلم فرمایا جس کی اہمیت کا اندازہ پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے اور میرے اس لکھے پیش لفظ میں بھی حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم نے میری اصلاح فرمائی (فجزاہ اللہ احسن الجزاء) اور احقر بالخصوص حضرت مولانا عبد اللہ اوکاڑوی صاحب کا بھی شکر گزار ہے کہ جنہوں نے اپنی کئی علمی و تدریسی مصروفیات سے اپنا قیمتی وقت نکال کر ان مجالس کو مدون و منضبط کیا جس پر ہم ان کے تہہ دل سے مشکور و ممنون ہیں۔ اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ جل شانہ اس مساعی جمیلہ کو اپنی بارگاہ میں قبول و منظور فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

محمد ثقلین جاوید حیدری عفا اللہ عنہ

حال مقیم مانچسٹر (انگلینڈ)

مقدمہ

اہل سنت کے حلقوں میں محرم کی دس راتیں

مقدمہ از محقق العصر جسٹس (ر) ڈاکٹر علامہ خالد محمود دامت برکاتہم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ءٰ آللّٰہُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ أَمَّا بَعْدُ!

مسلمانوں کا سن ہجری محرم سے شروع ہوتا ہے اور محرم کا سب سے زیادہ افسوسناک حادثہ سید شہداءِ کربلا جگر گوشہ حضرت سیدہ فاطمہ الزہراء حضرت سیدنا حسین کی شہادت عظمٰی ہے اس سانحہ کی یاد میں سنی اور شیعہ دونوں غمناک ہوتے ہیں شیعہ اوقات مقرر کر کے ماتم کرتے ہیں اور سنی غم میں ڈوبے اشکبار ہوتے ہیں ان کے ہاں بڑے سے بڑا سانحہ پر بھی سوگ تین دن سے زیادہ نہیں ہوتا اور یہ تین دن اسی محرم الحرام میں ختم ہو گئے تھے جس میں سید شہداءِ کربلا نے جام شہادت نوش فرمایا۔ سانحہ کربلا آئندہ کے محرم کا واقعہ شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سانحہ غم کا جو بھی مرتکب ہوا اور اس دردناک واقعہ میں جو بھی خوش ہوا اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ یزید نے بھی ابن زیاد پر لعنت کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کا حضرت حسین سے کوئی رحمی رشتہ ہوتا تو وہ کبھی قتل حسین کی جرأت نہ کرتا۔

لعن اللہ ابن مرجانۃ (منہاج السنہ، ج:7، ص:558)

(مرجانہ ابن زیاد کی والدہ کا نام ہے)

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (728ھ) اہل سنت کے بڑے مقتدر عالم گزرے ہیں انہوں نے ابن زیاد پر لعنت کرتے ہوئے اس باب میں اہل سنت کے عقیدے کی پوری وضاحت کر دی ہے۔

جب یہ دونوں طبقے اہل سنت اور اثنا عشری شیعہ اس سانحہ کربلا پر غم زدہ اور غمگین

ہیں تو چاہیے تھا کہ اس پر ان دونوں میں تاریخی اتحاد ہو جاتا دونوں اور زیادہ ایک دوسرے کے قریب آجاتے، لیکن افسوس کہ انہی دنوں میں ان دونوں کے درمیان اور زیادہ کھچاؤ نظر آتا ہے، محرم میں عام سڑکوں پر بھی پولیس کو بڑے بڑے مورچے سنبھالنے پڑتے ہیں، اور کئی جگہ خیمے لگے نظر آتے ہیں۔

شیعہ اگر واقعی ہی ان دنوں میں مظلومین کربلا سے اپنی ہمدردی اور محبت کا اظہار کریں تو اس سے ان کے بارے میں اہل سنت کے دلوں میں محبت پیدا ہونی چاہیے نہ کہ اور اختلافات ابھریں۔ اس کھچاؤ میں ہم کہاں تک ایک امت ہو کر رہ سکتے ہیں۔

محرم کی شیعہ مجالس پر ایک سرسری نظر

دونوں حلقوں (شیعہ سنی) میں اہل بیت کرام سے مشترکہ محبت وعقیدت کے باوجود چند سال پہلے ایک بار محرم میں جو کھچاؤ ایک شہر میں دیکھا گیا اس کے تصور سے بھی وہاں کی سڑکیں لرزتی اور دل تڑپتے نظر آتے ہیں، پاکستان کے ایک روزنامہ امت کراچی کے ایک کالم نگار یونس عالم اس کے 19 نومبر 2013 کے شمارہ میں محرم کی ایک ماتمی مجلس کا آنکھوں دیکھا حال اور اپنا کانوں سنا قال بیان کرتے ہیں جسے ہم آگے نقل کریں گے۔

محرم کے دنوں میں ہونے والی ماتمی مجالس کا مقصد حضرت امام حسین کی مظلومانہ شہادت پر اظہار رنج و غم ہے یا اس کے پیچھے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے متعلق غیض وغضب کا اظہار اور اپنے عقائد کا کھلا انکار ہے جس کی ایک ادنی سے ادنی مسلمان سے توقع نہیں کی جاسکتی یہ ایک غیر جانبدار کالم نگار جناب یونس عالم کی تحریر ہے۔

"یکم محرم الحرام سے لیکر دس محرم الحرام تک چوک چوراہوں پر ہونے والی مجلسوں میں تاریخ اسلام کی مقدس ہستیوں کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اس پر کسی نے کان دھرنے کی کوشش کی؟ چوک چوراہوں کو چھوڑیئے اندرون خانہ مجلسوں کو بھی چھوڑیئے وہ تمام مجلسیں اٹھا کر دیکھ لینی چاہیے جن کو ہمارا میڈیا دس دن تک براہ راست نشر کرتا رہا ہے........... الخ

آٹھ محرم الحرام کو راولپنڈی میں تین گھنٹے کی ایک مجلس ماتم کا اہتمام کیا گیا

ذاکر کو بطور خاص لکھنو سے بلوایا گیا دوستوں نے تعریف کی۔ دعوت دی میں بھی پہنچ گیا۔ نوحوں مرثیوں کے بعد لکھنو کے ذاکر نے خطبے کا آغاز کیا تو زبان و بیان پر بے مثال دسترس دیکھ طبیعت عش عش کر اٹھی روانی اور ربط اس قدر شاندار کہ لمحہ بھر کو یکسوئی متاثر نہ ہوئی۔ ایک دوسرے کی گردن پر سوار لفظوں کا بہاؤ ایسا کہ ہماری عیاش سماعتیں بہتی چلیں گئیں ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد لکھنو کے ذاکر نے دشنام طرازی کا ادیبانہ جوہر دیکھایا تو دماغ سے گھنٹیاں سی بجنے لگیں. آج اپنے کانوں سے سنا تو مجھ پر تبرا کا مفہوم واضح ہونے لگا ذاکر نے دین اسلام کی مستند ترین اور مقدس ترین ہستیوں کی پشت پر ایسے تازیانے برسانے شروع کیے کہ خون کا دوران تیز ہوتا چلا گیا" (روزنامہ امت کراچی 19 نومبر 2013 بروز منگل)

اس ایک مثال سے ہم اپنے قارئین کے سامنے یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ باوجود یہ کہ ہم دونوں فریق اہل بیت کی محبت و عقیدت میں مشترک ہیں کیوں ایک امت بن نہیں پائے اس کی اصل وجہ اثنا عشریوں کا یہ عمل تبرا ہے جسے وہ ملت شیعہ کی ضروریات دین میں سے سمجھتے ہیں شیعہ اگر آج بھی اس دوغلی پالیسی کو چھوڑ دیں تو وہ اپنے ان دور کے فاصلوں کے باوجود ہمارے ساتھ ایک صف اسلام میں بیٹھ سکتے ہیں اہل سنت نے اس کے لیے کبھی اپنے دروازے بند نہیں کیے۔

ان کے بڑے بڑے آیت اللہ قم اور نجف اشرف کے مجتہدین جب عوام میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نام لیں گے تو بڑے احترام کا اظہار کریں گے اور جب ان کا دوسرا اگلا کھلے گا تو وہ تبرا اگلتے ہی دکھائی دیں گے۔ ان کے نجف اشرف کا ایک مجتہد حضرت ام المومنین کو اس طرح ماں کہنے کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس کے بعد اگلی سطر میں ہی اپنی زبان سے دی گئی اس عزت کی الٹی کر دیتا ہے اس کی یہ تحریر پڑھیے اور اس کے مجتہد ہونے پر سر دھنیے جب ان کے بڑے عالموں کا یہ حال ہے تو ان کے چھوٹے کیوں بندر کی طرح اس تبرا کو آگے نقل کرنے اور بغلیں بجاتے سنائی نہ دیں گے۔

قارئین کرام یہ ان کا موقف تبرا ہے جس کی وجہ سے وہ عام مسلمانوں کے ساتھ

ایک صف اسلام میں بیٹھنے کے لائق نہیں سمجھے جاتے۔ باوجود یہ کہ اہل بیت کرام کی عقیدت و محبت دونوں میں مشترک ہے وہ بالکل دو تین ایک نہیں ہو پاتے۔

نجف اشرف کے یہ مجتہد سرگودھا کے جناب ڈھکو صاحب مناظر اسلام حضرت مولانا کرم الدین دبیر رحمۃ اللہ علیہ کے جواب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عائشہ مومنوں کی ماں ہیں ہم نے ان کے ماں ہونے کا کب انکار کیا ہے مگر اس سے ان کا مومنہ ہونا تو ثابت نہیں ہوتا ماں ہونا اور بات ہے اور مومنہ ہونا اور"

(تجلیات صداقت ص557 طبع دوم)

ماں کے نام سے پہلے حضرت لکھنا بھی انہیں نصیب نہیں ہوا۔ اب آیت کے الفاظ أَزْوَاجُهُ أُمَّهٰتُهُمْ میں لفظ أُمَّهٰتُهُمْ کے اوپر غور کریں یہ مرکب اضافی جس طرح الف لام تعریف اپنے اسم کو معرفہ بناتا ہے اس طرح اضافت بھی معرفہ بنا دیتی ہے لفظ أُمَّهٰتُهُمْ میں ماں ہونا ایک اکرامی نسبت ہے حقیقی نہیں، حقیقی نسبت ہوتی تو امہات المومنین صحابہ سے پردہ نہ کرتیں۔ تو اکرامی نسبت سے ماں ہونا اس میں ان کو وہ نسبت دی گئی جو واقعی اکرام کو متضمن ہو اور اس اکرامی نسبت کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کو بھی مضاف الی المومنین کی وجہ سے مومنہ مانا جائے جب ان کو یہ عزت مومنوں کی ماں ہونے کی وجہ سے ملی تو کیا وہ خود مومنہ نہ ہوں گی جس کی وجہ سے ان کی ماں ہونے کی یہ اکرامی نسبت انہیں حاصل ہوئی۔ ڈھکو صاحب نے جو اس کا انکار کیا ہے انہوں نے اسے حقیقی نسبت سمجھا ہے یہ حقیقی نسبت نہیں ایک اکرامی نسبت ہے یہ اسی طرح ہے جس طرح حضرت معاویہ کو خال المومنین کہنا ایک اکرامی نسبت ہے حقیقی نہیں اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کے ماموں ہونے کی وجہ سے ان کا نکاح امت کی کسی خاتون سے نہیں ہو سکتا افسوس کہ ڈھکو صاحب حقیقی اور اکرامی نسبت میں فرق نہیں کر پائے۔ واللہُ اعلم وعلمہ اتم واحکم

محرم کی دس راتوں کو یہ نسبت کن کی وجہ سے ملی

اس میں کسی شک کو راہ نہیں دی جاسکتی کہ سانحہ کربلا پر دو فریق اہل سنت والجماعت

اور شیعہ اثناء عشریہ یکساں غمگین ہیں اور دونوں عقیدہ رکھتے ہیں کہ سیدنا حسین کے عراق آنے والے قافلہ پر بہت ظلم ہوا اور تمام شہداء کربلا کی شہادت مظلومانہ ہوئی لیکن اس احساس میں دونوں فریق کا اعتقاد اپنا اپنا ہے اہل سنت ان مجالس محرم میں شہداء کربلا کی ایک تاریخی یاد بیان کرتے ہیں اور شیعہ ان مجالس میں اپنا ایک شرعی عمل بجالاتے ہیں اہل سنت عقیدہ رکھتے ہیں کہ جس محرم الحرام میں حضرت حسین اور ان کے بھائی حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بیٹے علی اصغر رحمۃ اللہ علیہ اور علی اکبر رحمۃ اللہ علیہ مظلومانہ شہید ہوئے آئندہ آنے والے محرم اس محرم کی صرف تاریخی یاد ہیں لیکن شیعہ کے ہاں ہر سالانہ محرم ایک شرعی حیثیت رکھتا ہے ہم اس سالانہ رسم ماتم کو جائز نہیں سمجھتے ہمارے ہاں سوگ کے دن صرف تین ہیں جو اس محرم میں پورے ہوگئے تھے، جس میں حضرت حسین شہید ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ان کے بھائی حضرت عثمان رحمۃ اللہ علیہ شہید ہوئے تھے۔

یہ اسی طرح ہے کہ ہم کہیں جس ربیع الاول میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی آئندہ آنے والے ربیع الاول اس ربیع الاول کی صرف تاریخی یاد ہیں ان کی وہ حیثیت نہیں ہے جو اس پہلے ربیع الاول کی تھی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ہوئی تھی اسی طرح عظیم الشان رجب وہ نہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفر معراج پر گئے آئندہ آنے والے رجب اس رجب کی تاریخی یاد تو ہوسکتے ہیں لیکن ان کی کوئی اپنی شرعی حیثیت نہیں اس طرح اہلسنت کے ہاں محرم کی یہ دس راتیں اس محرم کی صرف تاریخی یاد ہیں ان کی اپنی کوئی شرعی حیثیت نہیں اہلسنت کے لئے آئندہ آنے والے محرم قرآن کریم کی اس آیت کی رو سے صرف صبر کے مظاہر ہیں اور یہ صابرین کا ایک اپنا عمل ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (پ2، البقرۃ156)

ترجمہ: وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

اہل سنت اپنے ہاں یہ دس راتیں اس لئے منعقد کرتے ہیں کہ ہمارے اہل سنت بھائی

شیعہ کی ان مجالس میں نہ جائیں اور ان کے ذاکروں کے صحابہ کرام کے خلاف کسی عمل تبرا سے کوئی بدامنی کی صورت پیدا نہ ہو اگر اہل سنت کے علماء کو پتہ چلے کہ ادھر اکابر صحابہ کرام اور امہات المومنین کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں اور ہمارے لوگ انہیں سن رہے ہیں تو وہ کم از کم اپنے بھائیوں کے عقائد و نظریات کے گرد حفاظت کا پہرہ دے سکیں، اور اہل سنت میں کہیں بھی ارتداد کا پل نہ بننے دیں۔

پچھلی صدی میں اس اہم دینی ضرورت اور امن پروری کے لئے اہل سنت کے ایک بڑے عالم امام اہل سنت مولانا عبدالشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفسار کیا گیا تو انہوں نے محرم میں اہل سنت کے دینی حلقوں میں محرم کی دس راتیں منعقد کر کے ان میں مصائب صحابہ کرام اور مصائب اہل بیت کرام بیان کرنے کی عام اجازت دی جس پر ہم ایک (امام اہل سنت اور اپنی راقم الحروف کی ایک) تحریر نقل کر رہے ہیں۔

ایام محرم میں سنیوں کے "شہادت حسین" کے جلسے

بعض شہروں میں سنیوں کے بھی محرم کے جلوس نکلتے ہیں لکھنؤ اور ملتان میں بھی ایسے جلوس نکلتے رہے۔ پھر سنیوں کے ہاں بھی ان دنوں شہادت حسین پر جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اخباروں میں بھی ان وقائع کربلا کا عام ذکر ملتا ہوتا ہے۔ حضرت حسین کی عظیم قربانی کی یاد منانا کیسا ہے؟

نیکیوں کی نیکی کا تذکرہ کہیں بھی کسی وقت کیا جاسکتا ہے اس کے لئے شریعت میں کسی ماہ اور وقت کی قید نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کسی مستحب یا مباح کام کو اپنی طرف سے تخصیص دینا مثلاً یہ کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لئے چاند کی گیارہویں تاریخ کا تعین گو اپنی ذات میں بدعت نہ تھا مگر اپنی موجودہ ہئیت اور غایت میں بے شک بدعت ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ التزام اپنی بات کو کیا شریعت بنانا نہیں ہے؟

سوال یہ ہے کہ کیا سنی حضرات بھی ایام محرم میں حضرت حسین کی یاد میں جلسے نہیں کرتے؟ یہ فی الجملہ ایک نیک کام کے لئے وقت کی تخصیص ہے اس کا نتیجہ یہ رہا کہ بعض جگہ سنی لوگ بھی محرم میں تعزیہ کے جلوس نکالنے لگے اور اس کے لائسنس بھی لیتے رہے؟

الجواب: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰی:

ایسے جلسے اور جلوس ایک وقتی مصلحت کے تحت ہوں اور ساتھ یہ اعلان بھی برابر کیا جاتا ہو کہ یہ شریعت کے اعمال نہیں ہیں ان کی ان دنوں سے کوئی تخصیص نہیں ہے۔ صیانۃ المسلمین کے لئے اسے وقتی طور پر اختیار کیا گیا ہے تو اسے اس نظریہ ضرورت کے تحت عمل میں لایا جاسکتا ہے بشرطیکہ جب حالات میں مقابل سمت سے مظنہ اضلال نہ رہے تو اسے یکسر چھوڑ دیا جائے۔

لکھنؤ ایک وقت میں شیعہ عزاداری کا ایک مرکز تھا۔ محرم میں ان کے بڑے بڑے اجتماع ہوتے اور بہت سے دین سے واقف سنی بھی محض محبت حسین میں وہاں جا بیٹھتے۔ اس صورت حال پر شیعہ تبصرہ ملاحظہ ہو۔ مدرسۃ الواعظین کے ہفت روزہ الواعظ میں ہے:

''یہی وہ ادارہ ہے جو سنیوں کی تعداد میں کمی اور شیعوں کی تعداد میں برابر اضافہ کررہا ہے'' (الواعظ لکھنؤ یکم جون 1939ء)

امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ اپنے دور میں فقہ کے بھی امام تھے علمی حلقوں میں ان کا پہلا تعارف علم الفقہ کی چھ جلدوں سے ہوا۔ آپ لکھنؤ میں رہتے تھے اور آپ اس صورتحال کے عینی گواہ ہیں۔ اس فقیہ النفس عالم کی رائے ملاحظہ ہو:

''بات صرف اتنی ہے کہ سنیوں کو بہکانے اور صحابہ کرام سے بدظن کرنے کے لئے جلوس کی شکل میں (شیعہ مذہب کی) تبلیغ کی جاتی ہے اس لئے اس کا ازالہ بھی کماحقہ جلوس ہی کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ جلوس کی شکل میں جتنی تبلیغ ہوتی ہے وعظ کی محفلوں اور رسالوں سے اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوسکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ (مدحِ صحابہ کے) جلوس کی مزاحمت ہو رہی ہے اس لئے اس پر (ہماری طرف سے) اصرار کیا جارہا ہے اور جب تک یہ مزاحمت دفع نہ ہو ان شاء اللہ تعالی یہ اصرار (کہ مدح صحابہ کا جلوس نکلے) قائم رہے گا۔ تیسری بات سب سے بڑی یہ ہے کہ مدح صحابہ کے جلوس نے لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار میں سنیوں سے تعزیہ داری ترک کرادی ہے۔ لکھنؤ میں سنیوں کے گیارہ سو کے قریب تعزیے نکلتے

تھے جن میں کچھ مواعظ بند ہوئے اور اب سنیوں کے صرف گیارہ بارہ تعزیے شیعوں کی زرپاشی کی وجہ سے باقی رہ گئے ہیں۔"

(ماہنامہ الداعی لکھنؤ جمادی الاولیٰ 1361ھ)

یہ ایک وقتی مصلحت ہے عوام اسے شریعت نہ سمجھیں۔ اس کے لئے امام اہل سنت نے اعلان کیا:

"اس حقیر نے بار بار اعلان کیا ہے کہ اگر جلوس مدح صحابہ سے پابندیاں ہٹ جائیں تو ہم اپنے جلوس کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔" (ایضا)

شیعہ لوگوں نے جب دیکھا کہ تحریک مدح صحابہ کی بدولت سنیوں کے جلوس تعزیہ داری ختم ہوتے جارہے ہیں تو انہوں نے علماء دیوبند کے وہابی ہونے کا اعلان کرادیا۔ ہفت روزہ الواعظ لکھنؤ نے لکھا:

"اسی وقت وہابی مسلک کا طبقہ پوری طرح اس کشمکش میں منہمک ہے کہ کسی نہ کسی ترکیب و تدبیر سے عزاداری کو نقصان پہنچے۔۔۔۔ اسی خیال کے پیش نظر مدح صحابہ کی تحریک بروئے کارلائی گئی۔" (الواعظ 8 جون 1939ء)

اہل سنت کو وہابی کہنے کی تحریک شیعوں نے صرف اس لیے شروع کی کہ جس طرح بھی ہوسکے لکھنؤ کے سنی تعزیے باقی رکھے جائیں اس لیے کہ اس کے بغیر سنیوں کو کمزور کرنے کی ان کے ہاں اور کوئی راہ نہ بنتی تھی۔ اب پاکستان میں بھی آپ کو کئی لوگ یہ کہتے ملیں گے کہ شیعہ سنی اختلاف محض فروعی ہیں شیعہ سنی بھائی بھائی ہیں یہ صرف وہابی ہیں جو شیعوں کے جلوس عزا کی مخالفت کرتے ہیں معلوم نہیں یہ لوگ کہاں سے آگئے ہیں۔ کوئی لاکھ کہے یہ وہابی نہیں ہیں اہل سنت ہیں وہ اپنی رٹ برابر لگاتے رہیں گے تو شیعوں کے یہ چھپے رستم جب گیارہویں کی بڑی محفل کرتے ہیں تو اس میں گیارہ منٹ تک یہ ترانہ پڑھا جاتا ہے۔

شیعہ سنی بھائی بھائی
تیسری قوم کہاں سے آئی

لکھنؤ میں شیعہ علماء تو تقیہ کی چادر تانے شیعہ سنی بھائی بھائی کہتے رہے لیکن شیعہ مفکرین جو دوسرے مسلمانوں سے بالکل علیحدہ رہے ہیں اپنا تحفظ ضروری سمجھتے تھے انہوں نے برملا کہا کہ ہمارے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان اختلافات فروعی نہیں ہیں اصولی ہیں اور ظاہر ہے کہ اصولوں پر کبھی کوئی قوم سودا نہیں کرتی۔ ان کے ممتاز قانون دان سید وزیر حسین سابق چیف جج چیف کورٹ اودھ نے 5 فروری 1941ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک تقریر میں کہا:

”اگر ہندوستان کے شیعوں کو ایک الگ نیشن (ایک الگ قوم) نہ کہا جائے تو کم از کم وہ ایک مستقل اور علیحدہ فرقہ ضرور ہیں جس کی امتیازی خصوصیات اسے دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ کرتی ہیں۔۔۔ توحید الوہیت، کلام مجید، رسالت، خلافت، نماز روزہ، عقد اور تدفین غرض تمام بنیادی اور فروعی امور کی تعبیر میں زبردست اختلاف ہے جو ایک دوسرے کو بالکل علیحدہ کر دیتا ہے۔۔۔ ہماری تاریخ جدا ہے ہماری روایات جدا ہیں کیا آپ انکار کریں گے کہ ہمارے قانونی مسائل جن کے مرکز پر ہماری قانونی زندگی دور کرتی ہے علیحدہ نہیں ہیں؟ (استفہام انکاری) ہمارے قانون عقد قانون طلاق اور قانون وراثت کو دیکھئے سب علیحدہ ہیں لہذا ہمارے اور ان کے درمیان اتحاد کس بنیاد پر ہو سکتا ہے؟“

(اخبار سرفراز لکھنؤ 9 فروری 1941ء)

برصغیر پاک وہند میں کسی مقتدر شیعہ عالم نے اس بیان کی تردید نہ کی یہاں تک کہ پاکستان میں اس کی وضاحت میں شہر شہر اور قریہ قریہ ان کے علیحدہ قوم ہونے پر محنت ہوئی اور کوئی شیعہ ادارہ جرات سے سید وزیر حسین کے مذکورہ بالا بیان کو غلط نہیں کہہ سکا۔

تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر کہیں لکھنؤ میں ہندوؤں اور شیعوں میں کوئی تصادم ہوا تو علماء دیوبند نے ہندوؤں کے خلاف شیعوں سے اپنے قومی اشتراک کو قائم رکھا۔ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے بھی ایک موقع پر یہی رائے دی تھی کہ ہندو شیعوں کی مخالفت اس لیے نہیں کر رہے کہ ان کے عزاداری کے یہ جلوس بدعت ہیں وہ انہیں

مسلمانوں کی ایک رسم سمجھ کر اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ سو اس مقدمے میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا ساتھ نہ دینا چاہیے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم شیعوں کے ان عزاداری کے جلوسوں کو جائز سمجھتے ہیں۔ تاہم ان جلوسوں کے غلط اثرات کو روکنے کے لیے اگر محرم میں ہی متبادل جلسے کریں تو یہ تدبیر ان جلسوں جلوسوں کے اثرات کو روکنے کے لیے ایک وقتی تدبیر ہو گی۔ کسی مستحب یا مباح کام کے لیے اپنی طرف سے کوئی تخصیص نہ ہو گی۔ یہ صرف ایک وقتی مصلحت ہو سکتی ہے بذاتِ خود کوئی نیکی نہیں۔ شریعت نے جس کام کو کسی وقت سے خاص نہیں کیا ہم اعتقاداً اسے یہ تخصیص دیں تو اسکے بدعت ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا۔ جس طرح دین میں کوئی نیا عمل پیدا کرنا جائز نہیں بدعت ہے۔ اسی طرح کسی پہلے کے جائز عمل کو اپنے درجے سے اٹھانا یا مطلق میں کسی خاص وقت کی ہیئت لانا یہ بھی دین میں ایک نئی چیز پیدا کرنا ہے اعاذنا اللہ منہا۔

مصلحت کے تقاضے طباعت ثانی

مصلحت کے تقاضے محض وقتی ہوتے ہیں اور شریعت کے احکام ہمیشہ کے لیے۔ غیر مسلم معاشرے میں کئی مذاہب کے پیرو اپنے بڑوں کا تعارف عام جلوسوں سے کراتے ہیں عیسائی ملکوں میں کرسمس کے دنوں میں حضرت عیسیٰ ابن مریم کے نام کی کئی تقریبات ہوتی ہیں اور ان لوگوں نے حضور پیغمبر اسلام ﷺ کا نام تک نہیں سنا ہوتا اب اگر ان ملکوں کے آباد مسلمان بھی اس طرح اپنے پیغمبر کا تعارف کرائیں تو یہ ایک وقتی تدبیر کہلائے گی۔ اس سے حضور ﷺ کے نام سے سالانہ جلوس نکالنے کا جواز کشید نہ کیا جا سکے گا لیکن ایک وقتی مصلحت سے کسی وقت ایک مقابلے کی تدبیر اختیار کرنا بدعت نہیں بنتا۔ بدعت یہ ہے کہ کرنیوالا اسے صرف ایک تقاضا یا مصلحت وقت نہیں ایک کارِ ثواب سمجھے اور اسے دین کا ایک مسئلہ قرار دے۔ اہل بدعت اور اہل سنت کے کئی مشترکہ امور میں حدِ فاصل ہی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس مقدمہ کے آخر میں اہل سنت کے دور قریب کے

تین بڑے اکابر (1) امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنویؒ (2) حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمیؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور (3) مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ صاحب (دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا عظمت صحابہ کرام پر ایک ایک مضمون ہدیہ قارئین کر دیں گے۔ اور اسی طرح اقبال بھی اس ضرورت کا احساس ان اشعار میں بیان کرتے ہیں کہ:

ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام
خون حسین بازدہ کوفہ و شام خویش را

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک استاد مولانا فیصل احمد بھٹکلی نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کا ایک مجموعہ مجالس حسنہ کے نام سے شائع کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ بھی ہر سال ایسی مجالس میں خطاب فرماتے رہے ہیں۔

مناسب رہے گا کہ ہم ان کی 26 مئی 1996ء کی ایک مجلس کا بھی یہاں ذکر کر دیں جس میں حضرت مولانا، ایران کے خمینی صاحب، مولانا مودودی صاحب اور مولانا منظور احمد نعمانی صاحب کے ایک جگہ موجود ہونے کا ذکر ہے اور پھر وہاں کچھ علمی لطائف بھی چل گئے:

"فرمایا (مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے) ہم مکہ مکرمہ میں رابطہ عالم اسلامی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے، مولانا مودودی اور مولانا منظور نعمانی بھی موجود تھے ہم بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک صاحب نمودار ہوئے، ہم چونکہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں، اس لئے سمجھ گئے کہ یہ شیعہ مجتہد ہیں، معلوم ہوا کہ یہ امام خمینی ہیں جو اسی جلسے کے لئے تشریف لائے ہیں، مفتی امین الحسینی ان کو جانتے تھے، وہ کچھ سال ایران میں رہ چکے تھے، اس زمانے میں خمینی صاحب سے بھی تعارف ہوا تھا، مفتی صاحب ان کے استقبال کے لئے اٹھے اور بیٹھے ہوئے تمام ارکان کا تعارف کرایا، یہ مولانا مودودی ہیں، یہ فلاں ہیں، اور ہمارے بارے میں کہا: یہ استاد ابوالحسن علی الحسنی الندوی ہیں، تو انہوں نے کہا: نعم نعم، اعرفه من خلال

کتابہ "ردۃ ولا ابا بکر لھا"، یالیتہ سماہ ردۃ ولا اباحسن لھا۔ ہم نے کہا: لیس ھکذا یقول العرب، یقول العرب: ردۃ ولا ابا بکر لھا، وقضیۃ ولا اباحسن لھا۔

دوسرا لطیفہ یہ پیش آیا،

چونکہ رابطہ کے ارکان کے لئے بیت اللہ کا دروازہ کھولا جاتا ہے، ہم سب وہاں گئے، لیکن مطاف میں بہت بھیڑ تھی، مولانا مودودی باب السلام کے پاس چلے، ہم اور مولانا منظور صاحب بھی وہی گئے، ادھر خمینی صاحب بھی تھے، جب طواف کرنے لگے تو انہوں نے اپنے خاص ایرانی لہجہ میں دعاء کی: رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ۔۔۔۔۔۔ (حضرت نے بھی انہی کے لہجے میں پڑھ کر سنایا) پھر حضرت نے فرمایا: وہ اتنا ہی کہتے تھے، آگے نہیں پڑھتے تھے، ہم نے زور سے کہا: "وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" مولانا مودودی کہنے لگے: آپ نے چپت لگا ہی دی۔ چوں کہ ان کے دلوں میں کینہ ہے صحابہ کا، اس لئے وہ یہ دعاء کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

(مجالس حسنہ صفحہ 129 شائع کردہ مجلس نشریات اسلام کراچی)

ہم نے اسلامک اکیڈمی مانچسٹر میں محرم کی دس راتوں میں سانحہ کربلا اور مصائب اہل بیت کرام صحیح پیرائے میں ہدیہ قارئین کیے تھے جنہیں ضلع اوکاڑہ کے مولانا عبد اللہ صاحب نے منضبط کیا اور پھر انہیں کتابی شکل دینے کے لئے اس پر محنت کی برنلے لنکا شائر کے مولانا محمد ثقلین جاوید صاحب نے اور اب سن 2019ء میں یہ مسلکی خدمت آپ کے ہاتھوں میں ہے ان مجالس محرم کے اصل محرک جناب حافظ الیاس احمد بٹ صاحبؒ تھے جو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

نامناسب نہ ہو گا کہ صحابہ کرام کے بارے میں چودھویں صدی ہجری کے ان تین اکابر (امام اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ، حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ اور مولانا ابو الحسن علی ندویؒ) کے تین مضامین بھی اس مقدمہ میں ہدیہ قارئین کر دیں جن کے

پڑھنے سے سب اہل حق اپنے دل و دماغ میں ایمان کی پر بہار تازگی اور خدمت اسلام کی بے مثال شیفتگی محسوس کریں گے اور پھر ان سب خدمات کا ایصال ثواب حافظ الیاس احمد بٹ صاحب مرحوم کے نام کر دیں اور وہ تمام حضرات جو اس کو اس شکل تک پہنچانے والے ہیں ان کے نام کر دیں۔ اللہ تعالی ان سب کی خدمات کو درجہ بہ درجہ قبول فرمائے۔

طباعت ثانی

اللہ رب العزت کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جس نے اس کتاب کو اتنی مقبولیت بخشی کہ دو ماہ میں اسکا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے اور اب یہ دوسرا ایڈیشن مزید کچھ اضافہ جات، ترمیم اور نظر ثانی کے بعد پیش خدمت ہے۔

اس کتاب کے آخر میں راقم الحروف کا اپنا ایک مدت پہلے شائع کردہ رسالہ بنام "اہل بیت کرام" شامل کیا جارہا ہے اور ابتدائی مضامین میں عزیز محترم مولانا محمد ثقلین جاوید سلمہ کی خواہش پر میرا ایک مدت پہلے لکھا گیا مضمون "اسلام میں صحابہ کا مقام" بھی ہدیہ قارئین کیا جارہا ہے۔ عزیز موصوف کی محنت اور شوق ورغبت کے باعث آج یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے اور انکی ان دینی مساعی کو مشکور بنائے۔

خالد محمود عفا اللہ عنہ

صحابہ کرام اور ان کا اکرام واحترام

صحابہ کرام کی محبت وسیلہ نجات ہے اور ان کا ذکر ذخیرہ آخرت ہے

از امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی.....اَمَّا بَعْدُ!

حق تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب اور آخری شریعت کا محافظ اور نگہبان اور اس کا مبلغ ومعلم جن حضرات کو بنایا ان کو اہل اسلام ”صحابہ کرام“ کہتے ہیں۔

سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے اور قیامت تک کے لئے ہادی و پیشوا بن کر ملک عرب میں تشریف لائے اور ۲۳ برس اس خاکدان فانی میں قیام فرمایا اور اپنے فرائض کو باحسن وجوہ پورا کرنے کر کے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے آپ کے بعد تمام عالم میں اسلام کی تبلیغ کرنے والے اور ساری دنیا میں اس بات کی شہادت دینے والے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور اپنے کانوں سے ان کی اعلان نبوت کو سنا ہے اور ان کے معجزات ودلائل نبوت کا ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے اور ہم نے خود انہی سے تعلیم پائی ہے وہ صحابہ کرام ہی تھے۔

خداوند کریم نے بہترین انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع کمالات بنایا اور بہت سے کمالات آپ کو ایسے عطا فرمائے کہ آپ سے پہلے کسی کو نہیں ملے منجملہ ان مخصوص کمالات کے ایک نمایاں کمال آپ کو سرعت تاثیر کا عطا فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام آپ سے ۲۳ برس میں انجام کو پہنچا انبیاء سابقین سے اس سے دونی چوگنی مدت میں بھی نہ ہو سکا حضرت کی ۹۵۰ برس کی محنت کا نتیجہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَمَا آمَنَ مَعَہٗ اِلَّا قَلِیْلٌ اور آنحضرت کی ۲۳ برس کی کوشش کا نتیجہ یوں بیان فرمایا گیا: وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا یہی وجہ ہے کہ جو کثرت آپ کے اصحاب کو ہے اور جیسے کمالات ان میں

ہیں یہ بات اور کہیں نہیں مل سکتی غزوہ بدر میں آنحضرت ﷺ کے ہمراہ تین سو چودہ صحابی تھے اور حدیبیہ میں پندرہ سو۔ فتح مکہ میں دس ہزار۔ حنین میں بارہ ہزار۔ حجۃ الوداع میں چالیس ہزار غزوہ تبوک میں ستر ہزار اور بوقت وفات ایک لاکھ 24 ہزار (دیکھو مجمع بحار الانوار)

دین اسلام میں صحابہ کا مرتبہ بہت بڑا ہے ان کا تقوی و تقدس ان کے فضائل و کمالات مابعد والوں کو نصیب نہیں ہو سکتے کوئی بڑے سے بڑا ولی کسی ادنی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پا سکتا صحابہ کرام کی محبت وسیلہ نجات ہے اور ان کا ذکر ذخیرہ آخرت ہے۔

فطرت انسانی کا ایک ممتاز خاصہ ہے کہ اخلاف اپنے اسلاف کی عزت کریں اور اسلاف کے کارناموں کو زندہ رکھیں اسی فطرت کی مطابق ہر امت نے اپنے نبی کے اصحاب کا احترام مذہب کا اہم ترین فریضہ قرار دیا آج جس عیسائی سے چاہو پوچھ کر دیکھ لو وہ حضرت عیسی علیہ السلام کے حواریوں کی کس قدر عزت کرتا ہے علی ھٰذا یہودیوں کو دیکھو کہ وہ اصحاب موسی کو کس قدر مانتے ہیں اور ان کی فضیلت کا کیسا راسخ اعتقاد رکھتے ہیں۔

اہل اسلام بھی اسی فطرت کے مطابق صحابہ کرام کو افضل امت مانتے ہیں علاوہ اس تقاضائے فطرت کے صحابہ کی فضیلت اور ان کی تقدس وطہارت کے متعلق حسب ذیل عقلی و نقلی دلائل بھی ہیں جو ہر کلمہ گو کو صحابہ کا معتقد بنانے کے لئے کافی ہیں یہاں ہم بنظر اختصار چند دلائل کو درج کرتے ہیں

قرآن مجید کو دیکھئے تو صحابہ کرام کی متعلق ایسی آیتیں آپ کو ملیں گی جن کے بعد کوئی مسلمان صحابہ کرام کے فضائل کا انکار نہیں کر سکتا اس وقت ان سب آیتوں کو تو نہیں لکھا جا سکتا البتہ ان کے مضامین کی نوعیت بطور مثال بیان کی جاتی ہے۔

کچھ آیتیں وہ ہیں جن میں مطلقا تمام صحابہ کے فضائل کا بیان ہے مثلا فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنادیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں میں رچا دیا ہے اور کفر فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا ہے (پ26۔ الحجرات) یہ صفات جن کی ہوں ان کے کمال ایمان اور مقدس و متقی ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے اور مثلا یہ آیت کہ اللہ تعالی نے

صفت تقوی کو ان کے لئے لازم کر دیا ہے کہ اب وہ ان سے جدا نہیں ہو سکتی اور وہ اس انعام کے سب سے زیادہ مستحق اور اہل تھے (پ26۔ سورہ الفتح)

کچھ آیتیں وہ ہیں جن میں خاص مہاجرین و انصار کے فضائل کا بیان ہے مثلا فرمایا وہ مہاجرین وانصار جنہوں نے سب سے پہلے اس کام میں سبقت کی اور نیز وہ لوگ جو نیکی میں ان کے پیرو ہیں اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ باغوں میں رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے (سورہ توبہ 100)

کچھ آیتیں وہ ہیں جن میں خلفائے راشدین کے خلیفہ برحق ہونے کا بیان ہے مثلا آیت استخلاف جس میں حق تعالی نے نزول آیت کے وقت جو مومنین موجود تھے ان کو مخاطب کر کے خلافت اور تمکین دین اور تبدیل خوف امن کا وعدہ فرمایا ہے (پ18۔ سورہ النور) اور سب مانتے ہیں کہ اس وقت کے مسلمانوں میں یہ تینوں چیزیں سوائے حضرات خلفاء ثلاثہ کے کسی میں نہ تھیں اور آیت تمکین جس میں حق تعالی نے یہ بیان فرمایا ہے کہ مہاجرین میں سے جس کو بھی زمین کی تمکنت ملے گی وہ نماز قائم کرے گا زکوۃ دے گا ہماری مرضیات کا حکم دے گا اور ہماری نامرضیات سے روکے گا ان دونوں آیتوں کی مستقل تفسیریں شائع ہو چکی ہیں ان کو دیکھ کر پورا استدلال معلوم ہو سکتا ہے۔

ان آیات قرآنیہ کے بعد احادیث نبویہ کو دیکھو تو ایک سے ایک بڑا دفتر ہے المختصر یہ عقلی و نقلی دلائل ہیں جو اہل اسلام کو بلکہ بعض دلائل غیر مسلمین کو بھی صحابہ کے متعلق اعلی ترین اعتقاد پر مجبور کرتے ہیں...... (ماخوذ از ماہنامہ مدینہ لاہور نومبر دسمبر ۱۹۷۰ء)



صحابہ کرامؓ کا مقام و مرتبہ

جب تک قرآن رہے گا امت میں صحابہ کا چرچا اور ان پر تفوق رہے گا

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی..... اَمَّا بَعْدُ!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مقدس ترین طبقہ نبی کے بلا واسطہ فیض یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے جن کا اصطلاحی لقب "صحابہ کرام" ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

خدا اور اس کی رسول نے من حیث الطبقہ اگر کسی گروہ کی تقدیس کی ہے تو وہ صرف حضرات صحابہ کا طبقہ ہے ان کے سوا کسی طبقہ کو من حیث الطبقہ مقدس نہیں فرمایا کہ طبقہ کے طبقہ کی تقدیس کی ہو مگر اس پورے کے پورے طبقہ کو راشد و مرشد، راضی مرضی، تقی القلب، پاک باطن، مستمر الطاعت، محسن و صادق اور موعود بالجنۃ فرمایا پھر ان کی عمومی مقبولیت و شہرت کو کسی خاص قرن اور دور کے ساتھ مخصوص اور محدود نہیں رکھا بلکہ عمومی گردانا کتب سابقہ میں ان کے تذکروں کی خبر دے کر بتلایا کہ وہ اگلوں میں بھی جانے پہچانے لوگ تھے اور قرآن کریم میں ان کے مدائح و مناقب کا ذکر کر کے بتلایا کہ وہ پچھلوں میں بھی جانے پہچانے ہیں اور قیامت تک رہیں گے جب تک قرآن کریم رہے گا زبانوں پر دلوں میں ہر وقت کی تلاوت میں پنج وقتہ نمازوں میں خطبات و موعظت میں مسجدوں میں اور معبدوں میں مدرسوں اور خانقاہوں میں خلوتوں اور جلوتوں میں غرض جہاں بھی اور جب بھی اور جس نوعیت سے بھی قرآن کریم پڑھا جاتا رہے گا وہیں ان کا چرچا اور امت پر ان کا تفوق نمایاں ہوتا رہے گا پس بلحاظ مدح و ثناء وہ امت میں یکتا و بے نظیر ہیں جن کی انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے بعد اول و آخر کوئی نظیر نہیں ملتی مگر علماء دیوبند نے اپنے اس مسلک میں جو صحابہ کرام کی بابت عرض کیا گیا رشتہ اعتدال کو ہاتھ

سے نہیں جانے دیا اور کسی گوشہ سے بھی اس میں افراط و تفریط اور غلو آنے نہیں دیا۔

مثلاً وہ عظمت و جلالت کے معیار سے صحابہ کرام میں تفریق کے قائل نہیں کہ کسی کو لائق محبت سمجھیں اور کسی کو معاذ اللہ لائق عداوت سمجھیں کسی کی مدح میں رطب اللسان ہوں اور عیاذ باللہ کسی کی مذمت میں یا انہیں سب و شتم اور قتل و غارت کرنے پر اتر آئیں اور ان کا خون بہانے پر اتر آئیں اور ان کا خون بہانے میں بھی کسر نہ چھوڑیں اور پھر ان میں سے بعض کو نبوت سے بھی اونچا مقام دینے پر آجائیں انہیں معصوم سمجھنے لگیں حتی کہ ان میں بعض میں حلول خداوندی ماننے لگیں۔

علماء دیوبند کے مسلک پر یہ سب حضرات مقدسین تقدس کے انتہائی مقام پر ہیں مگر نبی یا خدا نہیں بلکہ بشریت کی صفات سے متصف لوازم بشریت اور ضروریات بشری کے پابند ہیں مگر عام بشر کی سطح سے بالاتر کچھ غیر معمولی امتیازات بھی رکھتے ہیں جو عام تو بجائے خود اس امت کے اولیاء کرام بھی ان مقامات تک نہیں پہنچ سکے یہی وہ نقطہ اعتدال ہے جو حضرات صحابہ کرام کے بارے میں علماء دیوبند نے اختیار کیا ہوا ہے ان کے نزدیک تمام صحابہ کرام شرف صحابیت اور صحابیت کی برگزیدگی میں یکساں ہیں اس لئے محبت و عظمت میں بھی یکساں ہیں تاہم ان میں باہم فرق مراتب بھی ہے لیکن یہ فرق چونکہ نفس صحابیت کا فرق نہیں اس لئے اس سے نفس صحابیت کی محبت و عقیدت میں بھی فرق نہیں پڑ سکتا۔

پس اس مسلک میں اَلصَّحَابَةُ كُلُّهُمْ عُدُوْلٌ (صحابہ سب کے سب عادل تھے) کار فرما ہے جو اس دائرہ میں اہل سنت والجماعت کے مسلک کا جو بعینہ مسلک علماء دیوبند ہے اولین سنگ بنیاد ہے۔

اسی طرح علماء دیوبند ان کی اس معمولی عظمت و جلال کی وجہ سے جو انہیں بلا استثناء نجوم ہدایت مانتے ہیں اور یہ کہ بعد والوں کی نجات ان ہی کی علمی و عملی اتباع کے دائرہ میں محدود ہے لیکن انہیں شارع تسلیم نہیں کرتے کہ حق تشریع ان کے لئے ماننے لگیں اور یہ کہ وہ جس کو چاہیں حلال کر دیں اور جسے چاہیں حرام بنا دیں ورنہ نبوت اور صحابیت میں فرق باقی نہیں رہ سکتا پس وہ امتی تھے مگر امت کے مخلص ترین جانثار خادم تھے جن کی بدولت

دین اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور اس نے دنیا میں قدم جمائے اس لئے وہ سب کے سب مجموعی طور پر مخدوم العالم اور خیر الخلائق بعد الانبیاء ہیں ہاں مگر یہ حضرات اس مسلک کی روسے گو شارع تو نہ تھے مگر فَانِی فِی الشریعۃ تھے، شریعت ان کا اوڑھنا بچھونا بن گئی تھی اور وہ اس میں گم ہو کر اس کے درجہ کمال پر آ گئے تھے جو مدارِ اطاعت ہوتا ہے اس لئے علماء دیوبند انہیں شریعت کے بارہ میں العیاذ باللہ خائن متساہل یا بدنیت یا حب جاہ و جلال کا اسیر کہنے کی معصیت میں مبتلا نہیں ان کے نزدیک یہ سب مقدسین دین کی روایت کے راوی اول دینی درایت کے مبصر اول دینی مفہومات کے فہیم اول اور پوری امت کے مربی اول حسب فرمودہ نبوی امت کے حق و باطل تھے جن کی روسے فرقوں کے حق و باطل کا سراغ لگایا جاسکتا ہے اگر ان کی محبت و عظمت دل میں ہے اور بلا استثناء ہے تو وہ فرقہ حقہ کا فرد ہے اور اگر ذرا بھی ان کی عظمت و عقیدت میں کمی یا دل میں ان کی نسبت سے سوء ظن ہے تو اسی نسبت سے وہ فرقہ ناجیہ سے الگ ہے پس حق و باطل کے پرکھنے کی پہلی کسوٹی ان کی محبت و عظمت اور ان کی دیانت اور تقوی باطن کا اعتراف اور ان کی نسبت قلبی اذعان و اعتماد ہے اس لئے جو فرقہ بھی بلا استثناء انہیں عدول و متقن مانتا ہے وہی حسب ارشاد نبوی فرقہ حقہ ہے اور وہ الحمد للہ اہل سنت والجماعت ہیں اور جو ان کے بارہ میں بدگمانی یا بدزبانی کا شکار ہے تو وہ حقانیت سے ہٹا ہوا ہے اس لئے شریعت کے باب میں ان کے بارے میں کسی ادنی دخل و فصل کا تو ہم پورے دین پر سے اعتماد اٹھا دیتا ہے اگر وہ بھی معاذ اللہ دین کے بارے میں ادھر ادھر ہٹے ہوئے تھے تو بعد والوں کے لئے راہ مستقیم پر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پوری امت اول سے آخر تک ناقابل اعتبار ہو کر رہ جاتی ہے اس لئے حسب مسلک علماء دیوبند جہاں وہ منفردا اپنی اپنی ذوات کے لحاظ سے تقی و نقی اور صَفِی ووَفِی ہیں وہیں بحیثیت مجموعی امت کی نجات بھی ان ہی کے اتباع میں منحصر ہے اور وہ بحیثیت قرن خیر من حیث الطبقہ پوری امت کے لئے نبی کے قائم مقام اور معیار حق تھے پس جیسے نبوت کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے ایسے ہی ان کے اجماع کا منکر بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے حتی کہ ان کا تعامل بھی بعض ائمہ ہدایت کے یہاں شرعی حجت تسلیم کیا گیا ہے

اس لئے جذباتی رنگ سے انہیں گھٹانا بڑھانا یا چڑھانا اور گرانا جس طرح عقل و نقل قبول نہیں کرتی اسی طرح علماء دیوبند کا جامع عقل و نقل مسلک بھی اسے قبول نہیں کر سکتا علماء دیوبند ان کی غیر معمولی دینی عظمتوں کے پیش نظر انہیں سرتاج اولیاء مانتے ہیں مگر ان کے معصوم ہونے کے قائل نہیں البتہ انہیں محفوظ من اللہ مانتے ہیں جو ولایت کا انتہائی مقام ہے جس میں تقوی کی انتہا بشاشت ایمان جو ہر نفس ہو جاتی ہے اور سنت اللہ کے مطابق صدور معصیت عادۃ ناممکن ہو جاتا ہے ذلك إذا خالط بشاشة الايمان القلوب اس مقام کے تقاضا سے ان کا تقوی باطن ہمہ وقت ان کے لئے مذکر رہتا تھا پس معصوم نہ ہونے کی وجہ سے ان میں معصیت کا امکان تھا مگر محفوظ من اللہ ہونے کی وجہ سے ان میں معصیت کا صدور اور ذنوب کا اقدام نہ تھا پھر اس طبقہ میں یہ امکانی معصیت کا احتمال بھی بیرونی عوارض یا طبیعت کی حد تک تھا قلبی و دواعی کی حد تک نہ تھا کیونکہ ان کے قلوب کی تطہیر اور ان کے تقوی کے پرکھے پر کھائے ہونے کی شہادت قرآن کریم دے رہا ہے اس لئے اگر عوام صحابہ کرام میں سے کسی سے ابتدائی منزل میں طبقا کوئی لغزش سرزد بھی ہوئی تو جیسا کہ وہ قلبی داعیہ یا گناہ کے کسی ملکہ سے جو دل میں جڑ پکڑے ہوئے ہو سرزد شدہ نہ تھی ایسے ہی اس کا اثر بھی ان کے قلبی ملکات و احوال یا باطنی تقوی تک نہ پہنچ سکتا تھا اس لئے ایسی اتفاق لغزش بھی ان کی باطنی بزرگی جس کی خدا تعالیٰ نے شہادت دی ہے متہم نہیں ٹھہر سکتی۔ (ماخوذ از.........ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک جلد نومبر ۱۹۹۵ء)



شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۷۲۸ھ) کی تحریرات کی روشنی میں

صحابہ کرام پر جرح و تنقید کی حیثیت

از قلم: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی..... اَمَّا بَعْدُ!

حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ بات تواتر سے عوام و خواص کے نزدیک ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصی تعلق تھا اور ان تینوں حضرات کو آپ کا قرب و اختصاص حاصل تھا اور ان تینوں کے آپ کے ساتھ رشتے ہیں دو صحابہ کی صاحبزادیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں اور ایک کے نکاح میں آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں اور کہیں اس کا ذکر نہیں آتا کہ آپ ان کی مذمت کرتے تھے یا ان پر لعنت کرتے تھے بلکہ معروف یہی ہے کہ آپ ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی تعریف فرماتے تھے اب دو حال سے خالی نہیں یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تینوں حضرات آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد ظاہراً و باطناً صالح وفادار اور سلیم العقیدہ اور صحیح العمل تھے یا یہ کہ وہ تینوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد استقامت پر نہیں تھے اور (معاذ اللہ) دین سے منحرف تھے دوسری صورت میں اگر اس حالت اور انحراف کے باوجود ان کو آپ کا تقرب حاصل تھا تو دو میں سے ایک بات ماننی پڑے گی یا تو آپ کو ان کے حالات کا علم نہیں تھا یا علم تھا لیکن آپ معاذ اللہ مداہنت کرتے تھے ان دونوں صورتوں میں سے ہر صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر بڑا دھبہ اور بہت بڑا اعتراض ہے تو وہی بات ہو گی جو شاعر نے کی ہے:

فان کنت لا تدری فتلك مصیبة
وان کنت تدری فالمصیبة اعظم

اور اگر یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ کی زندگی تک تو وہ راہ راست پر تھے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت کے خواص اور اکابر اصحاب کے بارے میں بڑا دھوکا اور ناکامی ہوئی ہے جس شخص کو اپنے بعد کی اطلاعیں دی گئی تھیں اور جس نے اپنے بعد ہونے والے واقعات کی خبر دی اس کو اتنی بات نہیں معلوم تھی کہ اس کے اخص الخواص اسی طرح منحرف ہو جائیں گے اور احتیاط کا تو یہی تقاضا تھا کہ امت کو آپ اس کی خبر دے جاتے تا کہ وہ غلطی سے کہیں ان کو خلیفہ نہ بنائیں اور جس شخص سے یہ وعدہ کیا گیا کہ اس کا دین تمام ادیان پر غالب ہو گا اس کے اکابر وخواص کیسے مرتد ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی باتوں سے روافض رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر بہت بڑا اعتراض کرتے ہیں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح فرمایا ہے کہ دراصل روافض (اسی طرح وہ لوگ جو عدالت صحابہ کو مجروح کرنا چاہتے ہیں) نے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو مطعون کرنا چاہا تا کہ لوگ کہیں کہ برے آدمی تھے اس لئے ان کے برے ساتھی تھے اگر اچھے آدمی ہوتے تو ان کے ساتھی بھی اچھے ہوتے اس لئے اہل علم کا قول ہے کہ رفض زندقہ کی ایک سازش ہے۔" (منہاج السنۃ ج۴ ص۱۲۳)

فضائل صحابہ قطعی اور متواتر ہیں

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام کی عدالت کو اسلام کی ایک اہم بنیاد مانتے ہیں اور ان کو ان کی صداقت اور ثقاہت پر بڑا یقین ہے وہ ان کو اسلام کی تعلیم کا سچا نمونہ اور رسول اللہ ﷺ کی تربیت اور فیض صحبت کا بہترین نتیجہ تسلیم کرتے ہیں ان کے نزدیک صحابہ کرام کے فضائل ایسے قطعی اور متواتر ہیں اور قرآن مجید کی ایسی صریح نصوص و آیات سے اور ایسی احادیث و روایات سے ثابت ہیں کہ وہ کسی تاریخی روایت یا کسی غریب اور شاذ حدیث سے مشکوک نہیں ہو سکتے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب کتاب وسنت اور نقل متواتر سے صحابہ کرام کے محاسن و فضائل ثابت ہو چکے ہیں تو یہ درست نہیں کہ وہ ایسی منقولات سے رد ہو جائیں جن میں سے بعض

منقطع اور بعض محرف ہیں اور بعض ایسی روایات ہیں جن سے ان ثابت شدہ حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ یقین شک سے زائل نہیں ہوا کرتا ہم کو کتاب وسنت اور اپنے پیشرؤوں کے اجماع اور ان کی مؤید اور متواتر روایات اور عقلی دلائل سے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ صحابہ انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل الخلق تھے اس یقینی اور متواتر چیز پر ان امور کا اثر نہیں پڑ سکتا جو مشکوک و مشتبہ ہیں چہ جائے کہ جن کا باطل ہونا ظاہر ہو چکا ہے۔" (ج۳ص۲۰۹)

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے قائل نہیں کہ صحابہ کرام انبیا علیہم السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم تھے ان سے گناہ کا صدور ہو ہی نہیں سکتا لیکن وہ ضرور اس کے قائل ہیں کہ امت کے تمام لوگوں میں وہ سب سے زیادہ عادل خدا ترس صادق القول امین اور راست باز تھے اگر ان سے غلطیاں یا گناہ ہوئے تو اس کے مقابلہ میں ان سے ایسے اعمال حسنہ اور خدا اور سول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنے والے کام ہوئے جو ان سیئات کا کفارہ بن گئے اور بہر حال ان کے حسنات اور اعمال کا پلہ ان کی تقصیرات پر بھاری ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے بھی گناہوں سے معصوم ہونے کے قائل نہیں چہ جائے کہ خطاء فی الاجتہاد کے بھی قائل نہ ہوں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

(پ24۔ الزمر 33۔34)

ترجمہ: اور جو سچی بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی پرہیز گار ہیں ان کے لئے جو کچھ وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس موجود ہو گا نیکو کاروں کا یہی بدلہ ہے تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کر دے جو انہوں نے کی تھیں اور اللہ ان کو ان کا اجر دے ان نیک کاموں کے بدلہ میں جو وہ کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالی دوسری جگہ فرماتے ہیں:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ○

(پ25، الاحقاف16)

(ترجمہ) یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہم وہ نیک عمل قبول کرتے ہیں جو انہوں نے کئے اور جنتیوں میں شامل کر کے ان کے گناہوں سے در گزر کرتے ہیں یہ اس سچے وعدے کے مطابق ہے جو ان سے کیا گیا تھا۔

صحابہ کرام کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی

وہ کہتے ہیں کہ ان بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو انسانیت کا لازمہ ہیں مجموعی حیثیت سے انبیا علیہم السلام کے علاوہ افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور انسانوں کی کوئی نسل صحابہ کرام سے بہتر سیرت و کردار کی نظر نہیں آتی اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں کچھ ہلکے سے دھبے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے سفید کرتے میں کہیں بھی تھوڑی سی سیاہی نظر آجائے یہ عیب چینوں کا قصور ہے کہ ان کو اس کپڑے میں سیاہی کا نقط تو نظر آیا اور اس کپڑے کی سفیدی نظر نہ آئی۔ دوسری جماعتوں کا تو حال یہ ہے کہ ان کا سارا نامہ اعمال سیاہ نظر آتا ہے کہیں کہیں ان سے سفیدی نظر آتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”صحابہ کرام اخیار امت ہیں امت محمدی میں کوئی گروہ ایسا نہیں ہے جو ان سے زیادہ ہدایت اور دین حق پر مجتمع اور تفرق واختلاف سے دور ہو ان کی زندگی میں کوئی نقص کی بات بھی نظر آتی ہے تو اگر اس کا کسی دوسری امت کے حالات زندگی سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی غلطی اس شکل کی ہے جس کو سفید کپڑے کی تھوڑی سی سیاہی تو نظر آتی ہے مگر سیاہ کپڑے کی تھوڑی سی سفیدی نظر نہیں آتی یہ بڑی نادانی اور بڑا ظلم ہے اگر ان اکابر کا اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو پھر ان کی فوقیت اور ان کی ترجیح

ظاہر ہو۔ باقی یہ کہ کوئی شخص اپنے دل میں کوئی خیالی تصویر بنائے یا کوئی معیار تجویز کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہ کیا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ایک شخص اپنے دل میں ایک امام معصوم کا تصور قائم کر لیتا ہے ایک شخص ایک اور ایسے امام کا تصور قائم کرتا ہے جس میں اور معصوم میں کوئی فرق نہیں اگر چہ اس کو صاف صاف معصوم نہیں کہتا اور وہ تجویز کرتا ہے کہ عالم کو یا شیخ کو یا امیر کو یا بادشاہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے اور خواہ وہ کیسا ہی کثیر العلم کیسا ہی دیندار صاحب محاسن ہو اور اس کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے کیسے ہی خیر کے کام کرائے ہوں لیکن یہ تجویز کرتا ہے کہ اس کو ایسا کامل العلم ہونا چاہیے کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو اور وہ کسی بھی مسئلہ میں غلطی نہ کرے وہ بشریت کے لوازم و خصائص سے پاک ہو کبھی اس کو غصہ نہ آتا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں بلکہ بہت سے لوگ تو ان ائمہ کے متعلق وہ تجویز کرتے جو انبیاء تک کے لئے تجویز نہیں کرتے ہیں۔" (منہاج السنہ ج ۳ ص ۲۴۲)

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس پر بڑا زور دیتے ہیں کہ جس شخص کی ساری تاریخ پر نظر ہو گی اور اس نے مختلف قوموں اور امتوں اور ملتوں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجربہ کیا ہو گا اس کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ صحابہ کرام سے زیادہ متحد حق کا پیرو فتنہ اور افتراق سے نفور اور نفسانیت و دنیاداری سے دور کوئی جماعت نہیں گزری۔ وہ لکھتے ہیں:

"جس شخص نے دنیا کے تمام فرقوں کے حالات اور واقعات کا اہتمام سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے حالات کا تتبع کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کوئی گروہ ایسا نہیں گزرا جو ہدایت و رشد پر صحابہ کرام سے زیادہ مجتمع اور تفرق و اختلاف سے ان سے زیادہ دور ہو ان صحابہ کرام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے کہ وہ اس کی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں وہ فرماتا ہے تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہو تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو ہم مسلمانوں میں جو کچھ خیر ہے صحابہ کرام کی برکت ہے۔"

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ یہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس علم و دین کا جو کچھ سرمایہ ہے خیر و برکت کا جو کچھ ذخیرہ ہے شعائر اسلام کی بلندی اسلام کی اشاعت عمل خیر کے جو کچھ محرکات اور جو کچھ توفیق خیر ہے اور یہ پوچھئے تو عالم میں اس وقت جو کچھ صلاح و خیر نظر آرہی ہے وہ سب صحابہ کرام کی جانفشانیوں اخلاص علو ہمت ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے نفوس قدسیہ کی برکت و نورانیت ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے جوش سے لکھتے ہیں:

واما الخلفاء والصحابة فكل خير فيه المسلمون الى يوم القيامة من الايمان والاسلام والقرآن والعلم والمعارف والعبادات ودخول الجنة والنجاة من النار وانتصارهم على الكفار وعلو كلمة الله فانما هو ببركة ما فعله الصحابة الذين بلغوا الدين وجاهدوا فى سبيل الله وكل مؤمن آمن بالله فالصحابة رضى الله عنهم عليه فضل الى يوم القيامة وكل خير فيه الشيعة وغيرهم فهو ببركة الصحابة وغير الصحابة تبع لخير الخلفاء الراشدين فهم كانوا اقوم بكل خير فى الدين والدنيا من سائر الصحابة

اس وقت سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کے پاس جو کچھ خیر ہے مثلا ایمان واسلام قرآن علوم و معارف عبادات دخول جنت جہنم سے نجات کفار پر غلبہ اللہ کے نام کی بلندی وہ سب صحابہ کرام کی کوششوں کی برکت ہے جنہوں نے دین کی تبلیغ کی اور اللہ کے رستہ میں جہاد کیا جو مؤمن بھی اللہ پر ایمان لایا اس پر صحابہ کرام کا احسان قیامت تک رہے گا اور شیعہ لوگوں کو بھی کچھ خیر حاصل ہے وہ بھی صحابہ کرام کی برکت سے اور صحابہ کرام کی خیر خلفائے راشدین کی خیر کے تابع ہے اس لئے کہ وہ دین و دنیا کی ہر خیر کے ذمہ دار اور سرچشمہ ہیں............(ماخوذ از ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک اپریل ۱۹۷۷ء)



اسلام میں صحابہ کا مقام

محقق العصر حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ العالی
(ڈائریکٹر اسلامک اکیڈمی مانچسٹر)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی.....اَمَّا بَعْدُ!

حضرت خاتم النبیین ﷺ کی رسالت پر جو لوگ ایمان لائے وہ آپ کی امت اجابت ہیں اور جن کی طرف آپ مبعوث ہوئے وہ اس دور کے ہوں یا اس دور کے، وہ آپ پر ایمان لائے ہوں یا نہ، یہ سب آپ کی امت دعوت ہیں۔ اس جہت سے تمام یہود و نصاریٰ، ہندو اور بدھ آپ کی امت دعوت ہیں۔ اور وہ سب اس کے مکلف ہیں کہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی تصدیق کریں۔ جنہوں نے آپکی نبوت، رسالت اور خاتمیت کی تصدیق کی اور اسے تسلیم کیا وہ آپ کی امت اجابت ہو گئے۔ پہلے وہ صرف امت دعوت تھے۔ جب اس دور کے رسول آپ ہیں تو اس وقت کے تمام بنی نوع انسان آپ کی امت دعوت ہیں۔

امت کا پہلا طبقہ جنہوں نے آپ ﷺ کا دور پایا اور وہ آپ کے سامنے ایمان لائے، انہیں صحابہ کہا جاتا ہے اور وہ امت کا پہلا دستہ ہیں، اور اس کا اولین طبقہ ہیں۔ پھر ان کے دو طبقے ہیں ایک مہاجرین اور دوسرے انصار، انہی کو مجموعی طور پر صحابہ کہا جاتا ہے۔

① منافقین صحابہ کے پیرائے میں جلیس نبوت نہ تھے:

جو لوگ ظاہراً اسلام لائے اور اندر سے مومن نہ تھے انہیں منافق کہتے ہیں۔ ان کا مسلمانوں کے ساتھ عام اٹھنا بیٹھنا نہ تھا اور وہ مسلمانوں کی قومی ضروریات پر خرچ کرنا بھی مشکل جانتے تھے۔ وہ مسلمانوں میں چلتے پھرتے بھی غیر دکھائی دیتے تھے۔ البتہ اس وقت اجازت نہ تھی کہ انہیں زیادہ نمایاں کیا جائے۔ انہیں ابھی پردے میں رکھنے میں بہتری تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے کردار اور اطوار میں مسلمانوں سے صاف علیحدہ

نظر آتے تھے۔

صحابہ کرام ماشاء اللہ اپنے ایمان اور اسلام میں بہت پختہ تھے۔ ان سے غلطیاں بھی ہو تیں، کئی قصور سرزد ہوتے لیکن آنحضرت ﷺ کے فیض تربیت سے ان کا بتدریج تزکیہ ہوا۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آپہنچے کہ حضور ﷺ کے سامنے ایمان کا معیار قرار پاگئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں منافقوں کے دعویٰ ایمان کو مسترد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (پ:1، البقرہ:137)

ترجمہ: سو اگر یہ ایمان لائیں جیسا کہ تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ (تمہیں معیار ماننے سے) منہ پھیریں تو سمجھ لو کہ یہ ہیں دوسری طرف کے لوگ۔۔

اور قرآن کریم میں یہ بھی ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ (پ:1، البقرہ:13)

ترجمہ: اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جیسا کہ یہ پیغمبر کے ساتھ کے لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لائیں

یہ آیات بتلاتی ہیں کہ منافق کبھی بھی مسلمانوں سے ملتبس (Veiled) نہ ہو پائے تھے کہ پتہ نہ چلے کہ کوئی اندر سے کیا ہے؟ اگر ان میں کوئی امتیاز نہ ہوتا تو انکی اس طرح یہ علیحدہ علیحدہ باتیں کیوں ہوتیں جو قرآن کریم نقل کر رہا ہے۔ حضور کوئی ایسا مخلوط معاشرہ نہ ترتیب دے رہے تھے کہ پتہ نہ چلے کہ کوئی اندر سے کیا ہے۔ ملتبس سوسائٹی قائم کرنا پیغمبرانہ شان نہیں ہے۔ سو صحیح یہ ہے کہ جنہیں آنحضرت نے اپنا صحابی بنایا انہیں اپنے قریب رہنے کا موقع دیا۔ ان پر ہر گز کسی شبہے کا چھینٹا نہیں ہے۔ جو اندر سے مسلمان نہ ہو وہ جلیس نبوت نہ ہوتے تھے۔

② ان کی پیروی رضائے خداوندی کانشان ٹھہری

وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ(پ:11،التوبہ:100)

ترجمہ: اور جو لوگ قدیم ہیں پہلے ہجرت کرنے والے اور پہلے مدد کرنے والے اور وہ لوگ جنہوں نے ان مہاجرین وانصار کی پورے اخلاص سے پیروی کی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے۔

سو جن لوگوں کی پیروی رضائے خداوندی کا نشان قرار دی گئی وہ لوگ خود کس قدر اللہ تعالی کی آغوشِ محبت میں ہوں گے۔ یوں سمجھیے وہ ہدایت کے ستارے ہیں جن کی پیروی ہدایت کی ضمانت اور رضائے خداوندی کے حصول کی بشارت ہے۔ حدیث اصحابی کالنجوم میں اسی طرف اشارہ ہے اور اس کا مضمون قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔

سوال: کیا یہ صرف سابقین اولین ہیں جن کی پیروی رضائے خداوندی کا نشان ٹھہری یا تمام صحابہ آسمانِ ہدایت کے ستارے ہیں کہ ان کی پیروی کی جاسکے۔

جواب: جو سابقین اولین کے بعد اسلام لائے وہ بھی تو ان سابقین اولین کی پیروی میں ہی چلے ہیں۔ وہ اسی رستے پر آئے جس پر سابقین اولین پہلے آچکے تھے۔ اور وہ انہی کی پیروی کرنے والوں میں سے تھے۔ پھر کیا یہ وہی لوگ تو نہیں جن سے اللہ تعالی نے اپنے راضی ہونے کی خبر دی ہے۔ سابقین اولین کے پیرو دونوں طبقوں میں سے ہیں ① صحابہ کرام میں سے بھی ② اور تابعین میں سے بھی۔ ان سابقین کی پیروی تبھی رضائے الٰہی کا نشان ہو سکتی ہے کہ انکی زندگی نمایاں ہو، ملتبس نہ ہو، لوگ انہیں اور انکی پیروی کرنے والوں کو پہچانتے ہوں۔

③ اس امت کی صف اول خیر الامت قرار دی گئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ(پ:4، آل عمران:110)

ترجمہ: تم خیر امت (بہترین لوگ) ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کیلئے سامنے

لائے گئے۔ تم حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور تم منکرات سے روکنے والے ہو اور تم ایمان لائے ہوئے ہو۔

یہاں تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ اور تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ میں نصیحت نہیں کی جارہی۔ ان کے حالات اور ان کے ایمان کی خبر دی جارہی ہے۔ سو صف اول کے لوگ اگر علی العموم مسلمان نہ ہوں تو اس پوری آیت کی تکذیب لازم آتی ہے۔۔ مسلمان سارے سمجھے جائیں گے اور منافق کوئی کوئی۔۔۔ صالحین سارے۔۔۔ گنہگار کوئی کوئی۔

صحابہ رضی اللہ عنہم مقتدا تبھی بن سکیں گے کہ ان کی زندگیاں نمایاں ہوں، چھپی نہ ہوں وہ ملتبس رہیں تو یہ اسوہ کیسے بنیں گے جن کے ظاہر و باطن میں فرق ہو وہ کبھی کسی قوم کے پیشوا نہیں ہو سکتے۔

⑷ امت محمدیہ کی صف اول خیر البریۃ قرار دی گئی ہے:

صحابہ کرام اپنے وقت میں کل بنی آدم کا بہترین طبقہ ہیں۔ بریہ کی جمع برایا ہے، جیسے رعیت کی جمع رعایا۔ وَ كُنْتَ قُلْتَ فِيهِمْ:

وفی التنزیل ھم خیر البرایا
وخیر الملك من رحم الرعایا
قد انتشروا اذا بر او بحرا
وکانوا خیر من رکب المطایا

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ

(پ:30، البینۃ:7)

ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ بہترین لوگ ہیں۔

یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیر البریہ ہونے کی خبر انہی حضرات کے بارے میں دی گئی ہے۔ جس طرح وہ امت کا خیر تھے وہ کل بریہ کا بھی خیر ہیں اور خیر الخلائق بھی

ہیں۔

⑤ صحابہ کرام اقوام عالم کا قبلہ بنائے گئے:

دنیا میں کچھ قومیں دوسری قوموں کے لیے پیشوا کا درجہ رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر سلسلہ نبوت ختم کرنے کے بعد آئندہ کے لئے جو لوگ اقوام عالم کا قبلہ بنائے وہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ قرآن کریم میں انہیں امۃ وسطا کہا گیا ہے۔ یہ امت (صحابہ کرام) حضرت خاتم النبیین ﷺ اور دیگر اقوام عالم کے مابین ایک درمیانے درجے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کہ وہ اپنا پیشوا حضور ختمی مرتبت ﷺ کو جانیں اور دوسروں کے لئے خود پیشوا بنیں۔ اللہ تعالی نے جب مسلمانوں کو بیت المقدس سے ہٹا کر مسجد حرام کے قبلہ پر ڈالا تو فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (پ:2، البقرہ:143)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا تا کہ تم لوگوں پر (دین خداوندی) کے گواہ رہو اور اللہ کا رسول تم پر (دین خداوندی کا) گواہ ہو۔

اس سے پتہ چلا کہ خاتم النبیین ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں جو دوسرے لوگوں کے لیے نمونے کے لوگ ہیں اور یہ سب عادل ہیں، ان کی مرسل روایت بھی متصل کا درجہ رکھتی ہے۔ جس طرح ستاروں سے روشنی ہی ملتی ہے (وہ کم ہو یا زیادہ) صحابہ سے روشنی ہی ملے گی۔ ان سے اندھیرا کبھی نہیں پھیلا۔ قرآن کریم نے اس آیت میں صحابہ کرام کو قبلہ اقوام عالم بتایا ہے جس طرح خانہ خدا نماز کا قبلہ ہے، صحابہ اقوام عالم کا قبلہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کو ان کے اس پیشوا حیثیت کا پتہ ان الفاظ میں دیا تھا:

انكم ايها الرهط ائمة يقتدى بكم الناس (رواه مالك)

ترجمہ: اے قافلے والو تم بے شک ائمہ ہو، بعد کے آنے والے تمہاری پیروی میں چلیں گے۔

اب آپ ہی بتائیں یہ آسمان ہدایت کے ستارے نہیں تو اور کیا ہیں۔

⑥ صحابہ کی جبلت میں مومنوں سے خیر خواہی اور کافروں سے نفرت:

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (پ:26، الفتح:29)

ترجمہ: محمد (ﷺ) رسول اللہ کا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر۔ نرم دل ہیں آپس میں۔ تو دیکھے ان کو رکوع میں اور سجدہ میں ڈھونڈتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی خوشی۔ نشانی ان کی ان کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر سے۔

یہاں صرف وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فرمایا، وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مَعَهٗ نہیں کہا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کے ساتھ تھے ہی ایمان والے۔ جو منافق بغیر ایمان کے مسلمانوں میں گھس آئے وہ حضور ﷺ کے پاس حاضری تو دیتے لیکن مجلس کی دولت نہ پاسکتے تھے۔ یہ صرف صحابہ کرام ہیں جو آنحضرت ﷺ کے ساتھی سمجھے گئے۔ اور یہ ان کی صفات میں ہے کہ اپنوں میں دل کے انتہائی نرم اور کافروں پر انتہائی سخت تھے۔

⑦ پہلے ایمان لانے والے اور بعد میں ایمان لانے والے دونوں طبقے جنتی ہیں

فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے اور سختیاں جھیلنے والے یقیناً ان حضرات سے افضل واعلیٰ اور بلند و بالا ہیں جو بعد میں ایمان لائے لیکن جنت کا وعدہ دونوں سے ہے۔ بلکہ جو ان کی پیروی میں چلا وہ بھی جنت کو پا گیا۔ دوزخ کے قریب پھٹکنا تو درکنار آگ کے شعلوں کی سرسراہٹ تک ان کے کانوں میں نہ جاسکے گی:

لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ۚ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (پ:27، الحدید:10)

ترجمہ: برابر نہیں تم میں جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور لڑائی کی۔ ان

لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو کہ خرچ کریں اسکے بعد اور لڑائی کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے جنت کا۔

اور پھر یہ بھی فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ ۙ لَا یَسۡمَعُوۡنَ حَسِیۡسَهَا ۚ وَ هُمۡ فِیۡ مَا اشۡتَهَتۡ اَنۡفُسُهُمۡ خٰلِدُوۡنَ ۚ لَا یَحۡزُنُهُمُ الۡفَزَعُ الۡاَکۡبَرُ (پ:17، الانبیاء:103-101)

ترجمہ: جن کے لیے پہلے سے ٹھہر چکی ہماری طرف سے جنت وہ اس آگ سے دور رہیں گے نہیں سنیں گے اس کی آہٹ اور وہ اپنے جی کے مزوں میں سدا رہیں گے نہ غم ہو گا ان کو اس بڑی گھبراہٹ میں

⑧ امت کو حضور ﷺ کے زمانے کے مومنین کی راہ پر چلنے کی دعوت:

وَمَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ۝

(پ:5، النساء:115)

ترجمہ: اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو اسی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بری جگہ پہنچنے کی۔

حضور ﷺ کے زمانے کے یہ مومنین کون ہیں؟ یہ وہی حضرات ہیں جنہیں ہم صحابہ کرام کہتے ہیں۔ ان کی راہ کو اللہ تعالی نے اپنے پیغمبر کی راہ سے جوڑا ہے۔ اور اس راہ کو چھوڑنے والوں کو جہنمی فرمایا ہے۔ یہ بدوں اس کے نہیں ہو سکتا کہ صحابہ کرام کا عام عمل لوگوں کے لئے کھلے بندوں شریعت کے آئینہ میں اترتا نظر آئے اور ان کا ہر عمل حضور ﷺ کی اتباع میں ہو جو زندگی ملتبس ہو وہ کبھی آئینہ نہیں بنتی۔

⑨ محسنین امت یہی ہیں جنکا ساری امت پر احسان ہے:

آئندہ آنے والے لوگوں کو دین انہی صحابہ کرام سے ملا ہے اور یہ حضرات یقیناً پوری

امت کے محسنین ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے دین انہی حضرات نے لیا اور سیکھا اور پھر اسے آگے پہنچایا اور سکھایا۔ قرآن کریم نے انہیں متقین کہا ہے کہ یہی اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور ان کے لیے خوشخبری سنائی گئی:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ○ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ○ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ○ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ○ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ○

(پ:26، الذاریات:19-15)

ترجمہ: البتہ ڈرنے والے باغوں میں ہیں اور چشموں میں۔ لیتے ہیں جو دیا ان کو ان کے رب نے، وہ تھے اس سے پہلے نیکی والے۔ وہ تھے رات کو تھوڑا سوتے اور صبح کے وقتوں میں معافی مانگتے اور ان کے مال میں حصہ تھا مانگنے والوں کا اور ہارے ہوئے لوگوں کا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صحابہ کی سیرت کا یہی نقشہ کھینچا ہے:

لقد رأيت أصحاب محمد صلى الله عليه وآله فما أرى أحدا يشبههم، لقد كانوا يصبحون شعثا غبرا وقد باتوا سجدا وقياما يراوحون بين جباههم وخدودهم ويقفون على مثل الجمر من ذكر معادهم۔ كأن بين أعينهم ركب المعزى من طول سجودهم۔ إذا ذكر الله هملت أعينهم حتى تبل جيوبهم۔ ومادوا كما يميد الشجر يوم الريح العاصف خوفا من العقاب ورجاء الثواب

(نہج البلاغہ، ج:1، خطبہ:97، ص:189)

ترجمہ: میں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو دیکھا ہے میں تم میں سے کسی کو بھی ان جیسا نہیں پاتا وہ صبح کو دھول میں اٹے ہوتے تھے اور رات کو سجدوں اور قیام کی حالت میں گزار دیتے تھے وہ کبھی اپنی پیشانیاں زمین پر رکھتے تھے اور کبھی رخسار۔ وہ اپنی آخرت یاد کرتے تو معلوم ہوتا کہ انگاروں پر کھڑے

ہیں۔ ان کی آنکھوں کے درمیان لمبے سجدے کرنے کے باعث مینڈھے کے گھٹوں جیسا گھٹا ہوتا تھا۔ جب اللہ کا ذکر ہوتا تو ان کی آنکھیں آنسو برساتیں یہاں تک کہ گریبان تر ہو جاتے اور عذاب کے خوف اور ثواب کی امید سے اچھے لرزتے اور کپکپاتے جیسے تیز آندھی میں درخت کی حالت ہوتی ہے (اردو ترجمہ، ج:1، ص:71)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں:

إخواني الذين تلوا القرآن فأحكموه، وتدبروا الفرض فأقاموه، أحيوا السنة وأماتوا البدعة. دعوا للجهاد فأجابوا، ووثقوا بالقائد فاتبعوه (نہج البلاغہ، ج:2، خطبہ:182، ص:109)

ترجمہ: میرے وہ بھائی (آج ہوتے) جنہوں نے قرآن پڑھا تو اس پر خوب عمل کیا اور فرائض میں انہوں نے تدبر کیا تو انہیں قائم کر دکھایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو انہوں نے زندہ کیا اور بدعات کا خاتمہ کیا۔ جب جہاد کی طرف بلائے گئے تو انہوں نے اپنی جانوں کو پیش کر دیا۔ اور زندہ ہونے کی حالت میں اپنے قائد (یعنی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم) پر پورا پورا اعتماد کرتے ہوئے اس کی پوری اتباع کی۔

⑩ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایمان لکھا جا چکا تھا:

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کے بارے میں فرمایا:

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ

(پ:28، المجادلہ:22)

ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھا اور روح القدس سے ان کی مدد کی۔

اسلام میں صحابہ کا مقام کیا ہے اس پر یہ دس آیتیں یاد رکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کے دلوں کی خبر دے دی۔ دلوں میں لکھا ایمان کوئی منقبت نہیں جب تک کہ ظاہر سراپا اسلام نہ ہو سو اب اس سے چارہ نہیں کہ ہم تمام صحابہ کرام کو خاص طور پر ان افراد کو جن پر خدا کا وعدہ خلافت پورا ہوا مومن کامل سمجھیں۔ وہ وعدہ یہ تھا:

وَعَدَ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا

(پ:18، النور:55)

ترجمہ: وعدہ کر لیا اللہ تعالی نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کئے۔ کہ انہیں ضرور خلافت دے گا زمین میں جیسا کہ اس نے حاکم کیا تھا ان سے پہلے لوگوں کو اور جما دے گا ان کے لئے دین ان کا جسے اس نے پسند کیا ان کے واسطے اور اللہ تعالیٰ انہیں خوف کے بدلے امن عطا فرمائیں گے۔

حضور ﷺ سے پہلے کبھی نہیں ہوا کہ کسی کو خلافت براہ راست نہیں غصب ہو کر ملی ہو۔ سو اس امت میں بھی صحابہ کرام کو خلافت بلا غصب ملی۔ پھر یہ بھی کبھی نہیں ہوا تھا کہ خلفاء خلافت میں بھی خوف میں دبے رہیں۔ سو اس امت میں بھی خلافت قوت اور طاقت پر قائم ہو گی، ڈر اور تقیہ میں نہ گھری رہے گی۔ پھر یہ وعدہ انہی لوگوں پر پورا ہوا جن سے یہ عہد باندھا گیا تھا۔ یہ عقیدہ کہ یہ وعدہ قیامت کے موقع پر حضرت امام مہدی کے ہاتھوں پورا ہو گا یہ اس وعدہ خلافت سے کھلا مذاق ہے۔ جس سے تسلی تو صحابہ کرام کو دی گئی اور اس کے پورا ہونے کا وقت ہزاروں سال بعد ٹھہرایا گیا۔

قرآن کریم کی رو سے صحابہ کے بارے میں یہ ماننا ضروری ہے کہ ان پر اللہ تعالی کا وعدہ پورا ہوا اور وہ اس خلافت کو پا گئے۔

صحابہ کا مقام صحابیت کی رو سے

دنیا میں انسان کو جو مراتب و درجات ملتے ہیں وہ دو طرح کے ہیں، عطائی اور اکتسابی۔ حافظ قرآن، عالم دین، محدث وقت، مفسر قرآن، وکیلوں اور ڈاکٹروں کے جملہ مناصب اکتسابی ہیں اور محنت اور ریاضت سے حاصل ہوئے ہیں لیکن نبوت و رسالت اور صحابیت یہ سب مناصب عطاءِ الٰہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ انبیاء و مرسلین کا تو انتخاب ہی خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور صحابہ وہ ہیں جنہیں اللہ تعالی نے کسی پیغمبر کے وقت میں پیدا کر دیا۔ اور وہ

اس پر ایمان لے آئے، ایمان لانا تو بیشک ان کا اکتساب ہے اور بھی ہزاروں لوگ ایمان لاتے ہیں لیکن اس خاص وقت میں پیدا ہونا یہ تو اپنے اختیار کی بات نہ تھی۔ یہ خدا کی عنایت خاصہ ہے کہ اس نے انہیں ایسے وقت میں پیدا کر دیا کہ انہوں نے دور نبوت کو پالیا اور نبی پر ایمان لا کر وہ صحابیت کی دولت پا گئے۔ یہ وہ مقام ہے جسے وہ محض اپنی محنت سے نہ پا سکتے تھے اور اس پہلو سے یہ مقام بھی اللہ کی ایک عطا ہے۔ اور یہ ایک ایسی عطا ہے جو انکے سب اعمال پر فائز ہے۔

عطاء الٰہی پانے والوں کے اپنے اعمال سے بحث نہیں ہوتی:

ایک حافظ پر اور ایک عالم پر آپ تنقید کر سکتے ہیں اس کی غلطیاں نکال سکتے ہیں لیکن کسی صحابی پر تنقید نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ایک الٰہی منصب ہے جو اس کو عطا الٰہی سے حاصل ہوا ہے۔ حافظ اور عالم ہونا یہ دونوں منصب اس سے نیچے ہیں۔ حافظ کے حفظ سے، عالم کے علم سے، ڈاکٹر کے نسخہ سے، وکیل کی دلیل سے بحث ہو سکتی ہے مگر صحابی پر کسی طرح تنقید نہیں ہو سکتی، اس کو صحابی ماننا اس کے اور پیغمبر کے ایک تعلق کو تسلیم کرنا ہے اور یہ تعلق اس کی کسی اپنی کمزوری کے باعث کمزور نہ پڑ سکے گا۔ صحابیت صحابیت ہے گو کسی درجے میں ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرے بعد میرے صحابہ کو ہدف ملامت نہ بنانا ان سے تمہارا پیار میرے پیار کے باعث ہے اور جو ان سے بغض رکھے اس کا وہ بغض میرے ساتھ ہو گا۔ سو صحابہ کے بارے میں صحیح عقیدہ یہ ہے کہ ان پر تنقید جائز نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے غلطی ہو نہیں سکتی۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کی غلطی نکالنے کا حق نہیں۔ ؎ خطاء بزرگاں گرفتن خطا است۔

امتی اور نبی کے درمیان جو فاصلے ہیں صحابہ پر تنقید کرنے سے وہ اور بڑھیں گے۔ اور صحابہ کی عقیدت سے وہ کم ہوں گے۔ اس وجہ سے بڑے بڑے علماء اسلام نے ان کے بارے میں زبان بند رکھنے کا امر فرمایا ہے۔

نامناسب نہ ہو گا کہ ہم صحابہ کی بے مثال قربانیوں کی وہ تصویر جو ہندوستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے کھینچی ہے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ پاکستان میں ہمیں صحابہ کا

مقام اس سے بھی اوپر سمجھنا چاہئے اس کے بغیر شاید ہم اسے ایک اسلامی سلطنت نہ بنا سکیں:

”محبت ایمان کی اس آزمائش میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کرلی اور وہ محتاج بیان نہیں بلاشبہ وہ مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہوگا جیسا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے راہ حق میں کیا۔ انہوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کردیا جو انسان کرسکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پاسکتی ہے۔

سابقون الاولون کی محبت ایمانی کا یہی حال تھا ہر شخص جو ان کی زندگی کے سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہ حق کی مصیبتیں صرف جھیلیں ہی نہیں بلکہ دل کی پوری خوش حالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کرڈالیں۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں ایمان لائے تھے ان پر شب و روز کے جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے 23 برس گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہیں دیتی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی کھلی ہو، انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ کی گویا دنیا جہاں کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لئے فراہم ہوگئی ہیں اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا تو اس طرح خوشی خوشی گردنیں کٹوادیں گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں موت میں تھی۔ (ترجمان القرآن، ج:2، ص143)

طلبہ کے سوالات اور جوابات:

① شیعہ لوگ بعض صحابہ کی بڑی بڑی غلطیاں سامنے لاتے ہیں اور ان کی تحقیق چاہتے ہیں۔ ان کا اصولی جواب کیا دینا چاہیے؟

الجواب: ایسے تمام واقعات ان کے دوران تربیت سے تعلق رکھتے ہیں

آنحضرت ﷺ کی رسالت کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ان کی تربیت اور ان کے تزکیہ قلب کی بھی تھی۔ اور آپ ﷺ نے ان کی تدریجی اصلاح فرمائی۔ اب ظاہر ہے کہ وہ خامیاں جو ان سے دوران تربیت صادر ہوئیں ان پر ان کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں رضی اللہ عنہم کی سند دے دی تو پہلے کی سب غلطیاں اور کمزوریاں اس انعام کے نتیجے میں کالعدم کر دی گئیں۔

② جو واقعات حضور ﷺ کے بعد پیش آئے وہ تو دوران تربیت کے نہ ہوں گے؟

الجواب: آپ اس پر بھی نظر رکھیں کہ کیا اس قسم کے واقعات حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم سے بھی ملتے ہیں؟ سو جو تاویل ان کے بچاؤ میں کریں گے وہی آپ ان دوسرے صحابہ کے بارے میں کر لیں۔ تاہم جہاں تک مجھے تجربہ ہے شیعہ کے اکثر پیش کردہ حوالے غلط ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی حوالہ صحیح ہے تو اس کے معنی مراد میں یہ لوگ غلطی کرتے ہیں۔ آپ حقیقت معلوم کریں۔

③ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے زیادہ واقعات ہمیں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ملتے ہیں یا حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم سے؟ پھر حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا سے حضور ﷺ کے حالات زیادہ ملیں گے یا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے؟

الجواب: حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضور ﷺ کے دوست تھے اور تقریباً برابر کی عمر کے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے سامنے بچے تھے اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما تو اور بھی چھوٹے بچے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی کے زیادہ واقعات اور مکہ میں گزرے حالات آپ کو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ ملیں گے۔ اسی طرح حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی وفات کے بعد صرف چھ ماہ اس دنیا میں رہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پچاس سال کے قریب۔ اب ظاہر ہے کہ درس و تدریس کا جو موقع ان کو ملا، وہ انکو نہیں مل سکا۔ پھر حضور ﷺ کی مدینہ منورہ کی زندگی میں ان کا زیادہ وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ گزرا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حضور انور ختمی مرتبت ﷺ کے ساتھ۔ ان تفصیلات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے وقائع

حیات اور آپ ﷺ پر گزرے حالات آپ کو زیادہ حضور ﷺ کے صحابہ سے ملیں گے اور آپ ﷺ کی گھر کی زندگی کی روایات آپ کو زیادہ ازواج مطہرات سے ملیں گی۔

④ بیشتر شیعہ عام مجالس میں کہتے ہیں کہ ہم صحابہ کو ہرگز برا نہیں کہتے یہ ہم پر محض الزام ہے کہ ہم ان کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔

الجواب: اسمبلی میں اگر کوئی شخص یہ بل پیش کرتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عزتوں کا تحفظ بذریعہ قانون ہونا چاہیے تاکہ کوئی شخص ان حضرات کے خلاف کوئی نازیبا بات نہ کہہ سکے تو اس پر شیعہ ممبروں کا ردعمل دیکھنا چاہیے اگر وہ اس بل کی حمایت کریں تو بے شک صحابہ کو برا کہنے والے شمار نہ ہوں گے اور اگر وہ اسی بل کی مخالفت کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ان پر کوئی الزام نہیں امر واقع یہی ہے۔

⑤ صحابہ کو برا نہ کہنے کا مطلب کیا ہے کس طرح ان کے بارے میں نیک گمان رکھا جاسکتا ہے؟

الجواب:(1) آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جانشین رسول مانا ان کے اس فیصلے میں ان کی بدنیتی یا ان کی کمزوری کو کوئی دخل نہ تھا انہوں نے اپنے سیاسی مستقبل کا جو فیصلہ کیا اپنی پوری دیانت سے کیا۔

(2) صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے بعد قرآن پاک کو جس ترتیب سے ایک کتابی شکل دی اسکی یہ ترتیب بالکل وہی ہے جس سے یہ لوح محفوظ پر لکھا ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس قرآن میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔

(3) حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا پہلے تین خلفاء سے پورا تعاون کرنا اور ان کے ساتھ مل کر رہنا مخلصانہ تھا، ہرگز منافقانہ نہ تھا۔

ان تین باتوں کے التزام سے ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نیک گمان رکھتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا انکار ہو تو ہم صحابہ کے بارے میں نیک گمان نہ رکھ سکیں گے۔

صحابہ کے موضوع پر اٹھائے گئے سوالات کے لیے مفید کتابیں:

مندرجہ ذیل کتابیں آپ کے پاس مستقل رہنی چاہئیں:

① تحفہ اثنا عشریہ — حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ
② آیات بینات — جناب نواب محسن الملک مرحوم
③ اجوبہ اربعین — حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ
④ تالیفات — حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ
⑤ تالیفات — حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ
⑥ خلفائے راشدین — راقم الحروف خالد محمود عفا اللہ عنہ
⑦ رحما بینہم — جناب مولانا محمد نافع دامت برکاتہم (جھنگ)
⑧ آفتاب ہدایت — جناب مولانا کرم دین دبیر چکوالی رحمہ اللہ
⑨ عبقات من باب الاستفسارات۔ راقم الحروف خالد محمود عفا اللہ عنہ
⑩ معیار صحابیت — راقم الحروف خالد محمود عفا اللہ عنہ

کربلا

کٹا کر گردنیں اپنی بتلا گئے یہ کربلا والے
کبھی طاقت کے آگے جھک نہیں سکتے خداوالے

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ لاشِ جگر گوشۂ بتولؓ

حسینؓ کے خون سے تو رنگین ہوگئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسولؐ

کرتی رہے گی پیش شہادت حسینؓ کی
آزادی حیات کا یہ سَرمَدِی اصول

کٹ جائے سر تیرا تلوار کی نوک سے
یزیدیوں کی بیعت ہر گز نہ کر قبول

پہلی رات (پہلی نشست)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ... أَمَّا بَعْدُ!

جس طرح سن ہجری کی ابتداء محرم سے ہوتی ہے تو اسی ماہ کے ابتداء میں ایک عالمی سانحہ پیش آتا ہے اور وہ سیدنا حضرت عمر کی شہادت کا سانحہ ہے۔ اتنی بڑی شخصیت اور کس طرح مسجد کے ایک دروازے کے پیچھے ایک آتش پرست کی ایک معمولی حرکت کہ اس کا آپ پر وار چل گیا۔ حضرت عمر نے زخمی ہوتے ہی اس بے چینی میں پوچھا، بتاؤ میرا قاتل کون ہے کوئی مسلمان ہے یا کافر؟ جب آپ کو بتلایا گیا کہ کافر ہے تو آپ نے کھلے طور پر کہا الحمدللہ! میں کسی مسلمان کے ہاتھوں اب سفر آخرت پر نہیں جارہا اس۔۔۔۔۔۔ صدائے ایمانی میں یہ نکتہ لپٹا تھا کہ میرے قصاص میں کسی مسلمان کا خون نہ بہے گا، میرے قصاص کی تلوار کسی غیر مسلم پر ہی چلے گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے دل میں مسلمانوں کی خیر خواہی کس طرح سمائی ہوئی تھی اور مسلمان کی محبت کس قدر موجزن تھی کسی مومن سے محبت کسی مومن کو ہی ہوسکتی ہے۔ کسی غیر مسلم کو نہیں۔ یہ واقعہ ذی الحجہ کے آخری ایام میں پیش آیا اور آپ کا جنازہ یکم محرم کو پڑھا گیا۔ آج یہ رات بھی محرم کی ہی پہلی رات ہے اہل سنت کے ہاں یکم محرم ایک اعتقادی تقریب ہے وہ اس دن اور کسی موضوع پر نہیں جاتے۔

حضرت عمر کی تاریخی عظمت

اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ دیئے جو ہدایت کے آسمان پر روشن ستارے تھے اور قرآن کی رو سے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (پ26 الفتح) کی آسمانی تصدیق رکھتے تھے۔

مہ مے گوید کہ اصحابی نجوم
للسریٰ قدوۃ وللطاغی رجوم

چاند کہتا ہے میرے گرد ستارے ہیں وہ بڑے لوگوں کی قیادت کرتے ہیں اور بروں پر پتھر ہو کر برستے ہیں۔

بایں ہمہ جلیل القدر نبوت کی منتظر نگاہیں حضرت عمر کے آنے پر لگی تھیں آپ سے پہلے دائرہ اسلام میں آنے والے سب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے مریدین تھے اور حضرت عمر وہ مراد مصطفی تھے جنہیں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مانگ کر اللہ سے لیا تھا۔

حضرت عمر نے کس طرح امت کو ہر انتشار سے بچایا:

حضرت عمر ایسے اونچے سیاستدان تھے جنہوں نے تاریخ کے ہر موڑ پر مسلمانوں کو ہر ممکن انتشار سے بچایا اور دین کے ہر ضروری کام پر لگایا مثلاً:

① جمع قرآن کی ضرورت کا احساس پہلے کس کے ذہن میں اترا؟

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات ہوئی اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر نازل ہوا قرآن اب بھی متفرق تحریرات کی صورت میں تھا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پڑھنے کے مطابق ایک کتابی صورت میں نہ آیا تھا۔ حضرت عمر نے قرآن کو یکجا جمع کرنے کی ضرورت اول خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیق کے سامنے رکھی۔ یہ ضرورت سب سے پہلے ان کے ذہن میں اٹھی اور حضرت ابو بکر کا پہلا جواب یہ رہا کہ میں وہ کام کیسے کروں جو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہیں کیا۔ کئی دنوں کے بعد حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے میرا شرح صدر کر دیا ہے جس کی طرف تو نے مجھے توجہ دلائی تھی اور آپ نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے عہد کے بڑے کاتب حضرت زید بن ثابت کو جمع قرآن کا حکم دیا۔

نامناسب نہ ہو گا کہ ہم یہاں قرآن کی ان چھ منزلوں کا بھی ذکر کر دیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہونی چاہئیں۔

اول: لوح محفوظ۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (سورۃ البروج 22)

دوم: حضرت جبریل علیہ السلام۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعراء 122)

سوم: قلب رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (الشعراء 123)

چہارم: کاتبین وحی وہ صحابہ جو حضور ﷺ کے کہنے پر وحی لکھنے پر مامور تھے

پنجم: اول خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

ششم: حضرت عثمان غنی۔ جو قرآن کریم کو ایک قراءت (لغت قریش) پر لائے۔

جب تک کوئی شخص اس قرآن پر ایمان نہ لائے جو حضور ﷺ پر نازل ہوا اور حضرت عثمان غنی نے اسے ایک لغت قریش میں لکھوایا اس وقت تک وہ صفِ اسلام میں نہیں آسکتا۔ اس کا لوح محفوظ میں رکھے قرآن پر ایمان لانا اس سے اسے قرآن پر ایمان رکھنے والا نہیں جانا اور مانا سمجھا جا سکتا۔

یہ حضرت عمر کی پہلی فکر تھی جس سے قرآن ایک کتابی صورت میں آیا۔ آفاقی پیرائے میں اسے حضرت ابو بکر صدیق نے جمع کیا اور ایک لغت قریش میں اسے حضرت عثمان نے۔

جمع قرآن میں یہ حضرت عمر پھر حضرت ابو بکر اور پھر حضرت عثمان کی خدمات ہیں جن کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا لیکن اس خدمت کی ضرورت سب سے پہلے حضرت عمر کے ذہن میں اتری۔[1]

---

(1) اللہ رب العزت نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود لیا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون (پ14، الحجر 9)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اسی طرح اللہ رب العزت نے رسالت ماب ﷺ سے اس کتاب مبین کو جمع کرنے کا وعدہ بھی فرمایا:

انا علینا جمعه وقرانه (پ29، القیامہ 17)

ترجمہ: قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوا دینا ہمارا ذمہ ہے۔

اس پر استاذنا المکرم مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی لکھتے ہیں:

”جمع قرآن کا ذمہ اللہ رب العزت نے لے رکھا ہے اور اس نے شروع سے ہی حضور ﷺ کو اس کا یقین دلایا تھا (إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ۔ القیامہ 17) اب یہ ناممکن تھا کہ

۲ مسلمانوں کو مختلف گروہ بندیوں میں بٹنے سے روکنا:

حضرت ابو بکر کے منصبِ خلافت پر آنے کے بعد سیدنا حضرت عمر نے مسلمانوں کو مختلف گروہ بندیوں میں بیٹھنے سے بڑی سختی سے روکا مبادا اس طرح بیٹھنے سے شیطان رجیم کہیں کسی کے کان میں کوئی اپنی شرارت نہ پھونک دے جس سے مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا ہو۔ اس کے لئے آپ کو حضرت ابو بکر صدیق نے نہ بھیجا تھا، یہ قومی فکر سیدنا حضرت عمر کے اپنے ذہن میں اٹھی تھی اور آپ خود اس قومی اور سیاسی تحفظ کے لئے اس راہ عمل میں نکل پڑے اور جو لوگ حضرت علی کے گھر میں حضور ﷺ کی تعزیت میں بیٹھے رہتے انہیں سختی سے وہاں سے اٹھایا اور اس میں بھی شک نہیں کہ حضور ﷺ کی خلافت کے لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکر کا نام آپ نے تجویز کیا تھا ورنہ حضرت ابو بکر تو پہلے خلیفہ راشد کے لئے حضرت عمر کا نام ہی تجویز کر رہے تھے۔

۳ وصال نبوی ﷺ کے وقت حضرت عمر کی حالت:

یہ دین اگرچہ حضور ﷺ پر مکمل ہو چکا تھا اور صحابہ کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (پ6 المائدہ 3) کی بشارت بھی

قرآن جمع نہ ہو پائے یا جمع ہو مگر اس میں کچھ غلطیاں رہ جائیں، اللہ اپنے رسولوں سے کیے گئے وعدوں کے خلاف نہیں کرتا، وہ ہاتھ کتنے مبارک تھے جس سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ پورا ہوا"

(آثار التنزیل ج1، ص229)

بلاشبہ حضرات خلفائے ثلاثہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم وہ بزرگ و پاکباز ہستیاں ہیں جن کے مبارک ہاتھوں اللہ رب العزت نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دیا چنانچہ یہاں ان لوگوں کے لیے غور کرنے کا مقام ہے جن کا عقیدہ اور مستقل مشغلہ ہی بالخصوص ان تین پاکباز بزرگ ہستیوں کی شخصیت اور کردار کو مجروح کرنا اور بھولی بھالی عوام کو ان سے بد ظن کرنا ہوتا ہے کیونکہ اگر ان تین بزرگ ہستیوں پر سے ہی اعتماد اٹھ جائے تو ان کے تدوین و مدون کردہ اللہ کے کلام (موجودہ شکل میں موجود قرآن کریم) پر یقین رکھنا بھی پھر مشکل ہو جائے گا اور اگر کوئی (معاذ اللہ) قرآن کریم کے متعلق ہی شک و شبہ میں پڑ جائے تو بھلا اس کے پلے رہ ہی کیا جائے گا!؟ فاعتبروا یا اولی الالباب۔

مل چکی تھی لیکن حضرت عمر کے ذہن میں چند ایسے مسائل کھٹک رہے تھے کہ ان کی وضاحت کے بغیر آپ ﷺ اس دنیا سے نہ جائیں گے۔ آپ کے لئے وفاتِ نبی کی خبر سننا ہی بہت بوجھل ہو گیا۔ آپ نے کھلے طور پر کہا جو ایسا کہے گا میں اسے مار دوں گا۔ یہ صورت حال بتلاتی ہے کہ آپ کے ذہن میں اسلام کی جامعیت شان اور وسعتِ شریعت اس پیرائے میں روشن تھی کہ آپ اسی احساس ضرورت میں حضور ﷺ کی وفات کا ہی کھلے بندوں انکار کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب حضرت ابو بکر صدیق نے خطبہ دیا تو آپ نے وفات نبوی کا اس طرح اقرار کیا کہ گویا یہ آیات ابھی اتری ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شریعت محمدیہ کی جامعیت شان کتنے گہرے نقوش سے آپ کے ذہن میں اتری ہوئی تھی۔ (1)

(1) وصال نبوی ﷺ کے موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وقوع موت کا ادراک نہ کر سکنے پر استاذنا المکرم امام المتکلمین، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی نے ایک جگہ بہت دقیق اور نفیس کلام فرمایا ہے جسے ہم اہل علم قارئین کے افادہ کی خاطر یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں:

”بات دراصل یہ تھی کہ جس طرح نزول وحی کی بعض کیفیات میں اس دنیا کے احساسات سے تعطل ہو جاتا تھا، مگر حیات کی نفی نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ پر ورود وفات کچھ ایسے طریق سے ہوا کہ حیات کلیۃً منتفی نہ ہوئی تھی، صرف آثار حیات سلب ہو گئے تھے (اور یہ بھی اس لیے تھا کہ عالم برزخ میں انتقال ہو سکے اور پردہ قبر میں تشریف لے جا سکیں) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی نگاہیں اس حیات قلب تک پہنچ رہی تھیں، جو زیر پردہ مستور تھی (آخر محدثیت کا مقام کچھ کم منبع عرفان نہ تھا) اور اسکے ہوتے ہوئے وہ وقوع موت کا ادراک نہ کر سکے تھے۔ اس وجود حیات کو اس ورود وفات سے تطبیق دینا ان کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ آنحضرت رضی اللہ عنہ کی وفات کے متعلق ان کا اعتقاد یہی تھا کہ آپ پر بھی اسی طرح موت آئے گی جس طرح کہ عام دوسرے انسانوں پر وارد ہوتی ہے اور چونکہ صورت پیش افتادہ اور حالت واقعہ ایسی نہ تھی، اس لیے وہ آپ ﷺ پر ورود وفات کا یقین نہ کر سکے اور خیال کیا کہ یہ مرحلہ ابھی باقی ہے۔ پیشتر ازیں وہ آیت شریفہ **انك ميت و انهم ميتون** کے پیش نظر آپ ﷺ پر قرائن موت کا تتبع نہ کر سکے تھے۔ پھر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس صورت

پیش افتادہ اور کیفیت واقعہ ہی کو وفات النبی ﷺ کہا اور آیات قرآنیہ، جن میں آپ ﷺ پر ورود وفات کی پیشگوئیوں یا امکان کا بیان تھا۔ ان کا منشاء اسی قسم کی حالت کو قرار دیا تو اب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سمجھے کہ آیات مذکورہ اپنے عمومی مفہوم میں نہ تھیں اور انہیں شرح صدر ہو گیا کہ ان آیات شریفہ کا منشاء وفات النبی ﷺ کے متعلق کیا ہے فرماتے ہیں کہ ان آیات کا مفہوم مجھ پر یوں منکشف ہوا:

"گویا کہ میں نے پہلے وہ آیات پڑھی ہی نہ تھیں"

مقام غور ہے کہ اگر یہ آیات شریفہ اپنے اسی عام مفہوم میں ہوتیں، جیسا کہ ابتدائی سطح میں متبادر ہوتا ہے، تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ان آیات کے متعلق اتنا اہم اعلان نہ فرماتے۔ حضور ﷺ کے متعلق وعدہ موت اگر انہی معنوں میں ہوتا، جن میں کہ موت عام ماحول عرب میں متعارف تھی، تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حافظ قرآن اور نہایت ذکی الطبع ہوتے ہوئے یہ ہرگز ارشاد نہ فرماتے:

کانی لم اقراھا الا یومئذ

ترجمہ: گویا کہ وہ آیات میں نے اس دن کے سوا کبھی پڑھی ہی نہ تھیں۔

بات صاف ہے کہ آنحضرت ﷺ پر وفات شریفہ کا ورود کچھ ایسے طریق سے ہوا، جو عام دوسرے انسانوں سے مختلف تھا۔ آپ کے جسد میت سے قرائن موت کچھ ایسے جلی نہ تھے کہ کسی کو شک کی گنجائش نہ مل سکے۔ آپ پر کچھ ایسی کیفیات تھیں کہ موت کا یقین نہ ہوتا تھا۔ اسی کیفیت نے جو زیر پردہ مستور تھی، اشتباہ پیدا کر رکھا تھا، جن کے خیال میں اس کیفیت کی قرائن موت سے تطبیق محال تھی، وہ ان قرائن کو غشی سمجھتے رہے کیونکہ انکے حاشیہ فکر میں موت کے صرف وہی معنی تھے، جو عام طور پر معروف ہیں اور جس ہستی مقدس کو رازدار نبوت ہونے کا شرف حاصل تھا اس نے اس کیفیت باطنہ کو جو زیر پردہ مستور تھی، ورود وفات سے متصادم نہ جانا تھا۔ اس وجود حیات اور وقوع وفات میں کوئی تعارض خیال نہ کیا۔ اعلان فرمایا:

فان محمدا قد مات (بخاری شریف، ج2، ص640)

ترجمہ: حضور ﷺ موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔

جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس صورت افتادہ ہی کو وفات پیغمبر قرار دے دیا تو پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آپ پر قرائن موت کا تتبع شروع کیا اور بالآخر ورود وفات کے قائل ہو گئے۔۔۔ الخ" (مقام حیات، ص580)

④ اسلام کے اخلاقی نظام میں حضرت عمر کی روشن امیدیں:

عربوں میں شراب نوشی دورِ جاہلیت سے چلی آرہی تھی۔ اسلام نے اسے ابتداءِ وحی میں نہ روکا تھا، صرف اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ یہ رزقِ حسن نہیں ہے۔ اسی طرح مسلم عورتوں کے لئے پردہ کے احکام بھی کچھ تاخیر میں اترے۔ حضرت عمر کے ذہن میں شراب نوشی اور عورتوں کی بے پردگی اسلام کے اخلاقی نظام سے لگا نہ کھاتی تھی۔ حضرت عمر کے اور بھی کئی موافقات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے ان کی امیدوں پر قرآن اتارا۔ صحابہ میں یہ شرف اور اعزاز حضرت عمر کا ہی ہے کہ ان کی تمناؤں پر قرآن اترا۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر کے ہر اہم موٴقف پر انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل تھی۔ آپ کافروں پر سخت اور مسلمان پر بہت نرم تھے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تقابلی فضائل میں پہلے حضرت ابو بکر کا نام لیا اور پھر حضرت عمر کا رضی اللہ عنہما لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت ﷺ کی معیت پانے والوں میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ پہلے بتائے اور رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا ان کے بعد ذکر فرمایا۔ حدیث کے الفاظ:

ارحم امتی بامتی ابو بکر واشدھم فی امر اللہ عمر

(ترمذی ج2، ص220)

اور قرآن کے الفاظ:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (پ:26، الفتح:29)

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی نظر محبت جتنی حضرت ابو بکر پر تھی کہ ہجرت میں انہی کو ساتھ لے کر گئے، اتنی رحمت اور محبت اللہ تعالیٰ کی حضرت عمر پر تھی۔ حضور ﷺ کا حضرت عمر کے بارے میں یہ کہنا کہ لو کان بعدی نبی لکان عمر بہت معنی خیز ہے کہ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ رسالت کے لائق کون ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (پ:8، الانعام:124)

اللہ ہی جانتا ہے کہ رسالت کے لائق کون ہے۔

حضرت ابو بکر حضور ﷺ کے دار ارقم کے رفیق تھے لیکن جس دن حضرت عمر اسلام لائے آپ نے کھل کر کعبہ میں نماز پڑھی۔ دارِ ارقم حضور ﷺ کی امت کا گھر تھا اور بیت اللہ شریف اللہ کا گھر تھا۔

⑤ صحابہ اپنی اپنی پسند کے امام کے پیچھے نماز تراویح نہ پڑھتے رہیں:

آنحضرت ﷺ نے رمضان شریف میں صرف تین رات جماعت سے تراویح پڑھیں۔ آنحضرت ﷺ کو خیال گزرا کہ کہیں یہ نماز بھی امت پر فرض نہ ہو جائے آپ نے امت کے اس احساس محبت میں مسجد میں نماز تراویح پڑھانا چھوڑ دی لیکن صحابہ کرام مسجد میں مختلف اطراف مسجد میں نماز تراویح جماعت سے پڑھتے رہے۔ حضور ﷺ کو بھی اس کا علم تھا اور آپ نے انہیں اس سے منع نہ فرمایا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد اس کا اندیشہ نہ تھا کہ کہیں یہ نماز بھی فرض نہ ہو جائے، حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں تمام صحابہ کرام کو پھر ایک امام پر جمع کرنے کا اہتمام کیا اور مسجد کو اتنا روشن کیا کہ سب مسلمان مسجد نبوی میں پھر سے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنے لگے۔

حضرت عمر کی اس سیاسی سوچ میں صحابہ کے تراویح کے لئے اپنے علیحدہ گروپ بنانے کا کوئی موقع نہ رہا تھا۔ آپ نے حضرت علی کے مشورہ سے سب کو پھر ایک امام پر جمع کر دیا اور حضور ﷺ کے تین رات تراویح پڑھنے کو آپ نے پورے رمضان میں وسیع اور ممتد کر دیا کیونکہ اب کوئی امکان نہ تھا کہ نماز تراویح فرض ہو جائے۔ شریعت نبی سے قائم ہوتی ہے، کسی امتی کو شریعت کا کوئی مسئلہ وضع کرنے کا حق نہیں ہے۔

حضرت عمر نے اپنے اس اقدام سے مسلمانوں کو اپنے اندر گروپ بندی کے ہر پہلو اور امکان سے بچالیا آپ نے اس یکجا تراویح پڑھنے کو نعمت البدعۃ ھذہٖ نہ کہا تھا، مسجد میں جو شاندار روشنیاں ہو رہی تھیں آپ نے ان کو کہا تھا کہ یہ نئی بات ہے۔ پہلے مسجد نبوی

میں اس طرح روشنی نہ ہو پاتی تھی۔[1] یہاں بدعت کا لفظ اپنے لغوی معنی میں ہے شرعی معنی میں نہیں۔ شرعی مسئلہ یہی ہے: **کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار**۔ اور اگر کوئی اس سے نماز تراویح مراد لے تو پھر اس سے پہلے **ان کانت ھذہ بدعۃ فنعمت البدعۃ ھذہ** کے شرطیہ الفاظ بھی وارد ملیں گے۔

اس وقت ہمیں تراویح کے مسئلہ سے بحث نہیں اس وقت ہم سیدنا حضرت عمر کی اس سیاسی سوچ کو خراجِ تحسین ادا کر رہے ہیں کہ آپ نے کس طرح حضور ﷺ کی امت کو گروہ بندی اور فرقہ بندی سے بچائے رکھا۔

آپ اپنے عہدِ خلافت میں اکابر صحابہ کرام کو مدینہ سے نکل کر اطراف سلطنت میں

(1) علامہ الرویانی (502ھ) لکھتے ہیں:

انما جمعھم علی امام واحد لئلا یودی الی الشتات والاختلاف وامر لسراج القنادیل راحۃ للناس و تنویراً للمسجد و روی ان عثمان قال انھا بدعۃ و نعمت البدعۃ یعنی القنادیل و جمعھم علی امام واحد و قال علی لما رای القنادیل رحم اللہ عمرو نور قبرہ کما نور مساجدنا بالقرآن واجتمعت الصحابۃ علی ذلک وانقرض عصرھم علیہ فھو اجماع

(بحر المذہب فی فروع المذہب الشافعی، ج:2، ص:230)

ترجمہ: آپ نے مسلمانوں کو باہمی تفرقہ اور اختلاف سے بچانے کے لیے اس وقت کے تقاضے میں ایک امام پر جمع کیا تو لوگوں کے آرام کے لیے اور مسجد کو روشن کرنے کے لیے مسجد میں قندیلیں روشن کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس قندیلیں روشن کرنے اور انہیں امام پر جمع کرنے کو ایک نئی بات کہا جو پہلے نہ تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے (اپنے دور میں) قندیلوں کو روشن دیکھا تو یہ دعا فرمائی: **رحم اللہ عمرو نور قبرہ کما نور مساجدنا بالقرآن**

اس پر علامہ الرویانی لکھتے ہیں:

واجتمعت الصحابہ علی ذلک انقرض عصرھم علیہ فھو اجماع۔

ترجمہ: اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس عمل پر جمع ہو گئے اور ان کا دور اسی پر ختم ہوا اسے اجماع کا درجہ حاصل ہے۔

(بحوالہ، مقدمہ، بدعت اور اہل بدعت اسلام کی نظر میں، ص:40)

جاکر آباد ہونے سے روکتے تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ جب قوم میں غیر صحابہ کی کثرت ہو جائے گی تو مختلف اطراف سلطنت میں جو کوئی صحابی بھی آباد ہو گا وہ وہاں مسلمانوں کی آنکھوں کا تارا اور ان کا پیشوا بن جائے گا، اس میں امکان ہے کہ مسلمانوں میں مختلف نظریات اور مختلف دینی مسائل کہیں فرقہ بندی کی صورت اختیار نہ کر لیں۔

آپ کی اس سیاسی سوچ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آپ نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی کہ حضور ﷺ کی امت کو جہاں تک ہو سکے باہمی تقسیم اور۔۔۔۔ٹوٹنے سے بچایا جائے، جس طرح حضور اکرم ﷺ آخری نبی ہیں حضور کی امت بھی قیامت تک ایک امت ہو کر رہے۔ قیامت سے اس طرح متصل رہے جس طرح ہاتھ کی یہ دو انگلیاں آپس میں متصل ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

انا آخر الانبیاء وانتم آخر الامم او کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم رواہ ابو امامۃ الباھلی (سنن ابن ماجہ ص307)

آپ کی امت ایک ہی رہے جو آئندہ والے مسلمانوں کی دینی پیشوائی کرے اور ان لفظوں سے ایمانی پیشوا ہو:

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (پ4، آل عمران 110)

اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس سے بڑھ کر قرآن کریم سے صحابہ کے ایمان پر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ ان کے ایک ہونے کا ثبوت اور ان کا اقوام عالم کے پیشوا ہونے کا عنوان اس سے بڑا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان کے دلوں کی بات جان چکا اور ان کے ایمان کی کھلے عام تصدیق کی:

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا

(پ26، الفتح)

جب ہم حضرت عمر کی اس بلند پایہ سیاسی سوچ کی تحمید کرتے ہیں تو بعض ناقدین

صحابہ ہم سے سوال کرتے ہیں کہ حضرت علی میں کون سی کمی تھی کہ ان کو خلافت کرنے کا موقع نہ دیا گیا تو ہم کہتے ہیں کہ ان میں کوئی کمزوری نہ تھی سوائے ایک کے کہ وہ حضور ﷺ کے قریبی رشتہ دار تھے اور حضور ﷺ نہ چاہتے تھے کہ ان پر کوئی کنبہ پروری کا الزام آئے۔ اس خاندان کی تو یہ شان استغناء تھی کہ انہیں حکومت دینی آتی تھی لینی نہیں۔ حضرت حسن کی تو یہ شان تھی کہ عراق میں حضرت علی کے بعد حضرت حسن کو خلیفہ چن لیا گیا اور وہاں چھ ماہ خلافت کرتے بھی رہے لیکن قوم کو پھر سے ایک کرنے کے شوق میں آپ نے ایک بنی بنائی حکومت حضرت معاویہ کے سپرد کر دی۔ تاریخ اسلام میں فاطمہ کے لال کی یہ عظیم قربانی آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ حضورؐ جب پہلے حضرت ابو بکر کے حق میں خلافت لکھوانا چاہتے تھے تو جب آپ پر یہ تکوینی حکمت روشن ہوئی تو آپ نے اپنے اس خیال سے رجوع فرمایا اور کہا کہ مؤمنین اپنی رائے میں بھی ابو بکر کے سوا کسی کو اپنے انتخاب میں نہ لائیں گے تو اب اس پر کسی نامزدگی کی ضرورت ہی کیا ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا:

حضرت عمر اسلام لائے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور اکرم ﷺ کو ان کی آسمانی شوکت کی خبر دی:

اے محمد! تمام اہل اسلام حضرت عمر کے اسلام لانے سے مسرور ہیں۔

حضرت مولانا روم رحمہ اللہ نے آپ سے اپنی عقیدت کا اس طرح اظہار فرمایا:

بد عمر را نام اینجا بت پرست
لیک مؤمن بود نامش در الست

ترجمہ: حضرت عمر کا نام یہاں اس دنیا میں بیشک بت پرست تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے جب عالم ارواح میں اپنی ربوبیت کا عہد لیا وہاں آپ کا نام مومن تھا۔

حضرت عمر جب اسلام لانے کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں دارِ ارقم میں آئے تو صحابہ بہت تردد اور تشویش میں تھے کوئی دروازہ کھولنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

دروازہ کھول دو اور آنے دو اگر اللہ تعالیٰ نے عمر کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے تو اللہ اس کو ہدایت دے گا اور اسلام لے آئے گا۔

ہم نے اپنے مسلک کے مطابق محرم کی پہلی رات کی نشست اول میں صف عقیدت سجا دی ہے اور اگلی نشست سے ان شاء اللہ العزیز تمام لوگوں کے انتظار پر محرم کی دس راتوں کا آغاز ہو گا۔ واللہ ھو الموفق لما یحبہ ویرضیٰ بہ[1]



(1) قارئین کرام! دوم خلیفہ راشد، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت و شخصیت پر تفصیلی مطالعہ کیلئے حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی دو جلدوں پر مشتمل مایہ ناز تالیف ”خلفائے راشدین“ اور حضرت مولانا محمد اقبال رنگونی مدظلہ العالی کی کتاب ”نور القمر بسیرۃ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ“ (دو جلدوں) کی مراجعت فرمائیں۔

پہلی رات (دوسری نشست)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ اَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا
لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ○ (پ2، البقرۃ 156)
صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

عزاداری اور تاریخی یاد میں فرق:

حضرات بزرگان محترم و مومنین کرام! آج ہم یہاں جو جمع ہیں، وہ ایک تاریخی یاد کے لئے جمع ہیں "عزاداری کے لئے نہیں"یعنی جو "سانحہ" کربلا میں سیدنا حضرت حسین اور ان کے قافلے پر گزرا، اس کی تاریخی یاد کے طور پر جمع ہیں، لیکن عزاداری کے لئے نہیں۔

ایک شرعی مسئلہ ہے، اسے میں آپ کے سامنے اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق گذارش کرتا ہوں کہ سب سے بڑا صدمہ مسلمانوں کے لئے، مؤمنین کے لئے کون سا تھا؟"(جواب: بارہ ربیع الاول گزشتہ)"۔ جس وقت آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اپنے سفر آخرت پر گئے، ظاہر ہے کہ اس دن جو مسلمانوں کا حال تھا وہ پوچھنا ہو تو حضرت فاطمہ سے پوچھئے وہ اس وقت کہتی ہیں کہ:

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّھَا
صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

ترجمہ: مجھ پر اتنے مصائب ٹوٹ پڑے کہ اگر وہ مصائب دنوں پر ڈالے

جاتے تو وہ بھی راتیں ہو جاتیں۔

اور حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

من اصیب مصیبۃ فلیذکر مصابہ بالنبی فانہ من اعظم المصائب (اصول کافی، ج1:، ص:155)

جو شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو اس کو چاہئے کہ وہ اپنی مصیبت کو آنحضرت کی مصیبت سے یاد کرے کیونکہ آپ کا وصال تمام مصائب سے بڑی مصیبت تھا۔

اس سے بڑا صدمے کا دن اور کوئی نہیں گزرا، لیکن صحابہ کرام اور آئمہ اہل بیت کی تاریخ میں کوئی ایسا دن یا کوئی ایسا وقت اس کے تکرار کا نہیں ملتا کہ اس پر اظہار افسوس کیا گیا ہو۔ کیوں؟ یہ اس لئے کہ اسلام نے کہا ہے کہ بڑے سے بڑا صدمہ بھی ہو تو تین دن سے زیادہ تم نے اس کا سوگ نہیں کرنا، جب تین دن ختم ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا کا اقرار کرتے ہوئے صبر کا حکم ہے کہ صبر کریں لیکن جو ایک واقعہ گزر چکا اس کو تاریخی یاد تو کہتے ہیں اور اس تاریخی یاد میں اپنے ایمان کو تازہ کر سکتے ہیں۔

سوگ اور سنت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

لیکن ماتم کو دہرانا، سوگ کو دہرانا اور ان تین دنوں کو واپس لانا اور صرف تین دن ہی میں نہیں بلکہ دس راتوں میں ان کے لئے مجالس قائم کرنا، یہ بات قرآن کریم اور سنت کی روشنی میں سمجھنی بہت مشکل ہے۔ ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا سانحہ بھی ہو حتیٰ کہ میں نے آپ کے سامنے "بارہ ربیع الاول" کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے زیادہ کوئی بڑا صدمہ ہو سکتا ہے؟ (سامعین: نہیں) پھر جنگ احد میں، جس شہید کو پیغمبر کی زبان نے سید کہا، لسانِ رسالت سے یہ آواز آئی کہ وہ "سید الشہداء" ہے۔ وہ کون ہے؟ (سامعین: حضرت حمزہؓ) حضرت حمزہؓ کو شہید ہوئے مدت گزری، لیکن حضرت حمزہؓ کی یاد میں کوئی "مجلس ماتم" نہ صحابہ کے ہاں اور نہ ہی اہل بیت کے ہاں ملتی ہے، تو ہم اس دین پر چل سکتے ہیں اور اسی دین پر ہمیں چلنا چاہیے جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے Introduce کیا اور جس کا تعارف کروایا۔۔ اور وہ دین کیا ہے؟ جو کتاب و سنت کی روشنی میں اور صحابہ کی تاریخ میں

ملتا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں جب کوئی بڑے سے بڑا صدمہ بھی گزرتا ہے تو انسان کے آنسو تو آ ہی جاتے ہیں۔۔ کیوں؟

دل ہی تو ہے نہ کہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

تو رونا آ ہی جاتا ہے، غم کے آنسو ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن ہمیں حکم دیا گیا کہ یہ ساری چیزیں "انفرادی طور" پر تو ہوں لیکن مل کر اجتماعی شکل میں آنسو گرانا اور ٹسوئے بہانا اور مل کر اجتماعی شکل میں ماتم کی صفیں قائم کرنا اور پھر سینکڑوں سالوں کے بعد......؟ اس کی اسلام میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ سانحہ کربلا میں تمام مسلمانوں کے اور "اہل سنت والجماعت" کے دل جو ہیں وہ حضرت حسینؓ کو ایک مظلوم سمجھتے ہیں، انکی مظلومانہ شہادت جس طرح واقع ہوئی اس پر کون ہے جس کا دل غمگین نہ ہو اور آنکھ اشکبار نہ ہو!! لیکن غم کو تازہ کرنا اور ایسے حالات پیدا کرنا کہ پھر ایک ماتم کی مجلس بچھ جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ماتم کی کوئی مجلس شرعاً ہوتی تو سانحہ فاجعہ (حضور ﷺ کی وفات) کے اگلے سال ربیع الاول میں ہوتی۔

وفات رسول ﷺ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسوہ حسنہ

تو حضور ﷺ کی یاد میں حضرت فاطمہ اسے (مجلس) قائم نہ کرتیں؟ ام المؤمنین حضرت عائشہ اسے قائم نہ کرتیں؟ جب انہوں نے قائم نہیں کی بلکہ مجھے یاد آرہا ہے کہ سیدنا حضرت علی المرتضی جب حضور ﷺ کو غسل دے رہے تھے تو انہوں نے اسوقت (جو تین دن کے اندر کی بات ہے تین دن کے باہر کی نہیں) جب وہ غسل دے رہے تھے تو انہوں نے حضور کے سامنے حضور کے چہرے پر نظر کر کے جو بیان دیا وہ مؤرخین نے تاریخ میں محفوظ کر لیا ہے آپ نے غسل دیتے ہوئے کہا:

لَقدِ انقطع بِموتِك (یا رسول الله) مالم ینقطِع بِموتِ غیرك من

النبوۃ والانباء واَخبار السماء۔[1]

ترجمہ: اے اللہ کے پیغمبر ﷺ! آپ کی وفات سے وہ چیز منقطع ہوئی جو پہلے کبھی کسی کی وفات پر اس کا انقطاع نہ ہوا تھا۔

پیغمبر پہلے بھی آتے رہے اور آئے، ان کی وفات سے پیغمبر کی وفات تو ہوتی رہی لیکن "نبوت کی نہیں" آپ ﷺ کی "وفات سے" صرف آپ کی "وفات نہیں" نبوت کا انقطاع ہو گیا اس کی Interruption ہو گئی، آئندہ کسی کو نبوت نہ دی جائے گی۔ ع

فرما گئے یہ ھادی لا نبی بعدی

Wahi e Nubuwout has been interrupted forever.

اب وحی رسالت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہے۔ اب جبریل کا نزول زمین پر بہ پیرایہ وحی کبھی نہیں ہو گا تو حضرت علی مرتضی نے کہا "لَقَدِ انقطع بِموتِك يارسول اللهِ" اے اللہ کے پاک رسول ﷺ! آپکی وفات سے وہ چیز منقطع ہوئی "مالم ینقطع بموت غیرك" جو آپ سے پہلے کسی کے لیے نہیں ہوئی تھی اور پھر حضور آپ نے اگر ہمیں غم کرنے، جزع و فزع کرنے، ہائے ہائے کرنے سے منع نہ کیا ہوتا "ولولا انك امرت بالصبر و نهيت عن الجزع لا نفدنا عليك ماء الشؤن[2]" آپ نے ہمیں جزع فزع سے منع نہ کیا ہوتا تو آج ہم آپکی یاد میں اتنے آنسو بہاتے کہ دماغ کی آخری نمی تک خشک ہو جاتی۔ لیکن حضرت علی المرتضی نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم حضرت علی کے پیرو ہیں کہ نہیں۔ اگر ہم سچے دل سے حضرت علی کو اپنا پیشوا مانتے ہیں تو ان کی اس بات کو بھی مانیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو وصیت

اگر ان کی بھی نہیں تو حضرت حسین کی تو مانیں۔ حضرت حسین کو جب شہادت کا سامنا کرنا پڑا، جب ظالموں کی تلوار ان کے لئے اٹھی، تو اس سے پہلے وہ اپنی بہن زینب کو

(1) نہج البلاغہ، جلد:2، ص:628۔ ناشر: ادارہ نشر معارف اسلامی، لاہور۔

(2) امالی شیخ مفید:103۔ نہج البلاغہ، جلد:2، ص:628۔

جو کربلا میں موجود تھیں۔ یہ وصیت کر کے نکلے کہ اس مرنے پر صبر کرنا، خیمے سے فاطمہ کا لعل وہ کیا نصیحت کر کے نکلا؟ ملا محمد باقر مجلسی نے جلاء العیون میں اور دیگر کتابوں میں ان کی وصیت محفوظ کی گئی ہے، ترجمہ اس کا فارسی میں باقر مجلسی نے جو کیا اس کے چند الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

اے خواہر گرامی چوں من از تیغ اہل جفا بعالم بقا رحلت نمایم گریبان چاک مکنید ورو مخراشید واویلا مکنید (جلاء العیون، ص:۲۳۷)

کہ فرمایا حضرت حسین نے اپنی بہن کو "اے خواہر گرامی" اے میری عزت والی بہن! جب میں ظالموں کی تلوار سے اُس جہان میں چلا جاؤں جو جہان بقا ہے، جس میں ہمیشہ رہنا ہے اور جس سے پھر یہاں اس دنیا میں واپس نہیں آنا، اپنے کپڑوں کو میرے لئے پھاڑنا نہیں، چہرے پر اپنے (میری بہن) ہاتھ مارنا نہیں، وہی تو نے عمل کرنا ہے جیسا کہ حضرت فاطمۃ الزھراء نے پیغمبر ﷺ کی وفات پر کیا تھا، یعنی صبر کرنا ہے۔

اسلام کی تعلیم صبر کیوں ہے

تو ہم ان (اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی پیروی میں تبھی چل سکتے ہیں، جب اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہو کہ مصیبت آئے تو تین دن تک اظہار غم تو ہو سکتا ہے، کیونکہ آپ Out of Control ہوتے ہیں۔ اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ آپ سنبھل نہیں سکتے، اسی لئے شریعت نے کہا کہ اگر کسی کے ہاں یہ سانحہ ہو جائے تو گھر والے اس غم میں گھرے ہوئے ہیں، تو انکو کھانا بھی اعزہ واقارب یا ہمسائے لا کر دیں، وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ اپنا کھانا پکا سکیں، چنانچہ یہ تو ایک فطری چیز ہے، لیکن جب تین دن ہو جائیں تو تین دن کے بعد یہ کہنا، اے اللہ! ہم تیری رضا کا اقرار کرتے ہیں "رضینا باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا ونبیا" ہم راضی ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے فیصلے پر۔ وہ مومن، مومن ہی کیا جو اللہ کے فیصلے پر راضی نہ ہو؟ اور ہم حضور ﷺ کو اس کا رسول اور نبی مانتے ہیں۔

تین دن کے بعد تو یہی حکم ہے اب پھر اُس غم کو اسی طرح تازہ کرنا یہ روایات صحابہ اور اہل بیت سے نہیں۔ ہم اس پر کسی فرقے کو مطعون نہیں کرتے اور نہ اس وقت کسی کی تردید مقصود ہے، ہمیں اپنے دل کی کیفیت بیان کرنا ہے کہ یہ اسلام نے یا حضرت علی

المرتضی نے یا سیدنا حسین نے، یہ تعلیم کیوں دی کہ تم نے صبر کرنا ہے؟ اس لئے کہ جو قومیں پچھلے غموں پر صبر کرتی ہیں وہ اگلے مواقع کے لئے آئندہ کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے اور آئندہ کے صدمات کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں کہ نئے حالات کے لئے نئی قوت آتی ہے، نئی زندگی آتی ہے، قوم میں نیا خون آتا ہے۔

تو اگر پچھلے واقعات کو ہی یاد کرتے رہیں اور ان پر روتے رہیں تو نئے میدان کب بنیں گے؟ نئے میدان کے لئے مومنین "حسین" کی پیروی میں اپنی جان کا تحفہ کس انداز میں پیش کریں گے؟ ہمارے بزرگ محترم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ پڑھا کرتے تھے۔ ع

حوادث میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

کہ کتنے بھی صدمے کیوں نہ آئیں "حوادث میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے" مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا" حالات کتنے ہی کیوں نہ آجائیں لیکن اللہ کی رضا میں قربانی کرنا اور جان دینا جس طرح شہداء کربلا نے دی، یہ مسلمانوں کی ایک نہایت روشن تاریخ ہے۔ ع

حوادث میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اَشک برسانا نہیں آتا
نگاہیں جن کی پڑ جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
انہیں ماضی کے اَفسانوں کو دہرانا نہیں آتا

آج ہم اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ بہت ظلم ہوا، ہمارے دل آپ کی محبت میں گم ہیں۔ ہمارے عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے "کہ اہل بیت کی محبت جزو ایمان ہے" جس کو اہل بیت رضی اللہ عنہم سے محبت نہیں بھلا کیا وہ بھی کوئی مسلمان ہے؟ (سامعین: نہیں) لیکن ہم اس طرح ماتم کی صفیں نہیں بچھاتے کہ اللہ کے تکوینی فیصلوں پر ناراضگی کا اظہار کریں۔

ماتم اور اجتماعی جلوس

قرآن پاک میں اجتماعی طور پر ماتم کرنا، اجتماعی طور پر اس کے لئے جلوس نکالنا، اس

کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے ہم اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ اسلام میں اجتماعی ماتمی جلوس کی کوئی ہدایت نہیں ملی۔ قرآن کریم میں اجتماعی طور پر سوائے اس کے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب حضرت یوسف کو کنویں میں اتار کر اپنے والد کے پاس گئے تو انہوں نے بے شک ایک اجتماعی جلوس نکالا، قرآن میں ہے اللہ تعالی نے فرمایا:

وَجَآءُوٓا اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ (پ:12، یوسف:16)

کہ حضرت یوسف کے بھائی (جو تھے) وہ (ایک اجتماعی شکل میں) اپنے باپ کے پاس آئے روتے ہوئے ہائے یوسف ہائے یوسف کہتے ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اجتماعی رونا اور جلوس نکالنا قرآن و سنت میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا ذکر جو قرآن نے کیا وہ مقام محمود نہیں تھا بلکہ وہ ایک فرضی اور اپنے جھوٹ کو چھپانے کی غرض سے کیا گیا تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ جب خواب کی تعبیر مکمل ہوئی تو انہوں نے اپنے اس عمل پر اظہار شرمندگی کیا اور معافی مانگی حضرت یوسف علیہ السلام سے، تو اس ایک منظر کے سوا اور کوئی ذکر نہیں ملتا۔ (1)

---

(1) استاذنا المکرم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی ایک مقام پر ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"رہا یہ عذر کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ الصلاۃ و السلام کو موت کے کنویں میں اُتارنے کا جو جرم کیا اسے اللہ تعالیٰ نے ان کے ماتمی جلوس نکالنے کے سبب معاف کر دیا۔ یہ لائق پذیرائی نہیں۔ قرآن کریم میں جہاں اس جلوس عزاداری کا ذکر ہے۔ وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ الصلاۃ والسلام نے اسے ہرگز پسند نہ کیا تھا۔ وہ اس ہیئت سے ہی سمجھ گئے کہ خود کوئی کاروائی کرکے آئے ہیں اور اب اپنے جرم کو چھپانے کے لیے انہوں نے یہ ادا اختیار کی ہے۔ اہل سنت کے ہاں برادرانِ یوسف کے اس اجتماعی ماتم میں کوئی پہلو لائق ستائش اور محل سعادت نہیں۔ واللہ اعلم۔" (عبقات، ج:1، ص:66)

نیز غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تک نہ تو کسی کا خون پہنچتا ہے اور نہ ہی غم۔ بلکہ اصل کرنے کا کام تو یہ ہے کہ ان کے اس قابل فخر کردار اور قابل تقلید حیات سے سبق حاصل کیا جائے اور اس اسوہ کو اپنا کر اپنے مولا کو راضی کیا جائے۔ تاہم اجتماعی رونے، ماتم کرنے اور پھر جلوس

عزاداری اور سانحہ کربلا

تو میں توجہ اس طرف دلاتا ہوں کہ سانحہ کربلا پر "اہل سنت والجماعت" کے دل غمگین ہیں اور ہمارے دل اُن مظلوموں کے ساتھ ہیں۔ لیکن ہم اگر یہ مجالس قائم کریں اور بیان کریں تو تاریخی یاد کے طور پر تو بیان کریں لیکن ہم اس کا نام عزاداری نہیں رکھتے....... کیوں؟ اس لئے کہ ہم اللہ کے فیصلے پر راضی ہیں۔ اے اللہ! تیرے فیصلے پر ہم راضی ہیں، اور اس کو قبول کرتے ہیں اور نہ بھی کریں تو ہم کر کیا سکتے ہیں؟

لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا؟ جس طرح عوام (Public) حکومتوں کے خلاف احتجاج کرتی ہے، بادشاہوں کے خلاف احتجاج ہوتے ہیں، تو جو لوگ اللہ کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، کیا ان کے ہاں اللہ تعالی کی تقدیر کو ماننے کا پہلو پایا جاتا ہے؟ (سامعین: نہیں)

کیا اللہ کے فیصلے کو ماننے کی اس میں کوئی جھلک ہے؟ (سامعین: نہیں)

آج میں انہیں کلمات پر اپنی بات ختم کرتا ہوں اللہ تبارک وتعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو ان شاء اللہ کل کچھ عرض کر سکوں گا، کل ذرا وقت زیادہ لے کر آئیں کیونکہ دوسری مجلس کچھ طویل ہو سکتی ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ



نکالنے کی شرعی حیثیت جاننے کے لیے اور ایسا عمل کرنے والے گروہ کے دلائل کا جائزہ لینے کیلئے حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی کتابِ لاجواب "تجلیاتِ آفتاب" جلد دوم (باب: جزع و فزع درویشاں باقرار جرم خویشاں، سالانہ ماتمی جلوس اور انکی ظاہری ہائے ہائے، صدمہ پہنچنے پر غم اور سوگ کی فطری اجازت)، حضرت مولانا عبد الستار تونسوی رحمہ اللہ کا مختصر رسالہ "حقیقت ماتم" حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "بشارت الدارین بالصبر علی شهادت الحسین" حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ کا مضمون "ماتم کا مسئلہ اسلام کی نظروں میں، فوائد نافعہ، جلد دوم" اور حضرت مولانا محمد اقبال رنگونی صاحب مدظلہ العالی کی کتاب "ماتم نہ کیجئے" کا مطالعہ فرمائیں۔

دوسری رات (مجلس:2)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى خُصُوْصًا عَلٰى سَيِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِيَاءِ وَعَلٰى آلِهِ الْاَتْقِيَاءِ وَاَصْحَابِهِ الْاَصْفِيَاءِ أَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا
لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ (پ:2، البقرۃ:156)
صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ

اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے نبی پاک ﷺ کو ایک ایسے ملک میں مبعوث فرمایا، ایک ایسے ملک سے اٹھایا، ایک ایسے ملک میں بھیجا، جس میں قبیلے آپس میں ہمیشہ لڑتے ہی رہتے تھے، عرب میں خاندانوں کے اتنے امتیازات تھے کہ ان میں کبھی کوئی حکومت قائم ہی نہ ہو سکی۔ اور ملکوں میں جیسے مصر، ایران، شام، یمن اور کئی دیگر ممالک ہیں تو وہاں ان میں اس وقت بادشاہتیں تھیں، اس لئے وہاں کوئی نظام حکومت تھا، لیکن خاص خطۂ عرب میں جس میں کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالی نے بھیجا، اس میں کوئی نظام حکومت نہیں تھا، یہ سارے کہیں یکجا نہیں تھے، قبائل کی جنگیں اتنی دیرینہ اور لمبی ہوتیں کہ پچھلے بزرگ اپنی اگلی نسلوں کو وصیت کر کے جاتے کہ فلاں فلاں سے لڑتے ہی رہنا۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے نبی پاک ﷺ کو ایسے ملک میں بھیج کر، وہ ساری جو جنگیں تھیں اور سارے جو اختلافات تھے اور قبائل میں جتنا بھی کھچاؤ تھا، سب کو ٹھنڈا کر دیا، ختم کر دیا۔ اور وہ قوم ایک ہو گئی جو ایک ہونے والے ہی نہ تھے۔

دیرینہ تعصبات و جنگیں اور اہل سنت کا صحیح مؤقف:

ہمارا ”اہل سنت والجماعت“ کا یہ اعتقاد ہے، کہ نبی پاک ﷺ کی تشریف آوری پر

عرب لوگ جو متفرق زندگی گزار رہے تھے وہ ایک ہوئے، اور جو دیرینہ جنگیں اور جو تعصبات کی لہریں تھیں، وہ ساری دب گئیں، ختم ہو گئیں اور قوم ایک ہو گئی، یہ ہمارا (اہل سنت کا) عقیدہ ہے۔ لیکن اہل سنت والجماعت کے اس عقیدے کے متوازی، اس کے مقابلے میں ایک بات یہی کہی جا رہی ہے کہ وہ تعصبات پر برابر جمے رہے! محرم کے ایام میں اس بات کو اور زیادہ High Light کیا جاتا ہے، وہ کیا؟ مثلاً کہ جی خود مکہ میں کیا دو متقابل نہ تھے؟ اور دونوں عبد مناف کی اولاد تھے۔

- اموی لوگ اور ہاشمی لوگ
- اموی قبائل اور ہاشمی قبائل

یہ آپس میں ایک نہیں تھے بلکہ نبرد آزما تھے، انکی لڑائیاں تھیں۔ نبی پاک ﷺ ہاشمی تھے ان کے مقابلے میں کون آیا؟ ابوسفیان اموی

بدر و اُحد میں حضور ﷺ کا مقابلہ کن سے رہا

بدر اور دوسرے موقعوں پر جنگوں میں اور احد کے دن قیادت میں کون آیا؟ حضور ﷺ ہاشمی تھے اور جو مقابلے میں آیا وہ اموی (ابوسفیان)۔ اور نبی کے بعد علی رضی اللہ عنہ ہاشمی تھے اور ان کے مقابلے میں کون آیا؟ (ابوسفیان کا بیٹا معاویہؓ)۔ اس کے بعد کیا ہوا جب علیؓ گئے تو انکے بعد، ان کا بیٹا حسینؓ ہاشمی اور پھر معاویہؓ کا بیٹا یزید، تو یہ ایک خاندانی طور پر جو پرانی چیز چلی آ رہی تھی، جو عداوت چلی آ رہی تھی، اسی کو اس موقع پر زیادہ High Light کر کے کہا جاتا ہے کہ:

حضور ﷺ کے مقابل............ابوسفیان

علیؓ کے مقابل......................ابوسفیان کا بیٹا (معاویہؓ)

پھر حسینؓ کے مقابل...............اس کا بیٹا (یزید)

تو لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ یہ خاندانی عداوت پہلے سے چلی آ رہی تھی اور یہ حضور ﷺ کی آمد پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اور بھڑکی اور یہ آگ ایسی بھڑکی کہ ہر مقابلے میں اِدھر وہ اور اُدھر وہ۔

اِدھر یہ................ نبیؐ ہے... علیؓ ہے... حسینؓ ہے

اوراُدھر مقابلے میں..... ابوسفیانؓ ہے، معاویہؓ ہے، اوریزید ہے

سو محرم کی ابتدا میں لوگوں کو ذہنی طور پر یہ بات بتلائی جاتی ہے کہ ایک وہ سلسلہ چلا آرہاہے اور ایک یہ سلسلہ چلا آرہاہے، ایک شجرہ اِس قسم کا اور ایک شجرہ اُس قسم کا۔ شیعہ لوگ بڑے اہتمام سے اسے ایک شجرہ عداوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

جاہلیت کی چنگاریاں اور نبی ﷺ کا معجزہ

تو میں آپ کو اس طرف توجہ دلانا چاہتاہوں، کہ ان کے ہاں سانحہ کربلا کی بنیاد اس پرانی عداوت پر ڈالی گئی ہے۔ اس واقعہ کی شرح کے لئے اس میں پچھلی پوری تاریخ عرب کو دہرایاجاتاہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے وقت جو حالات پیش آئے، انقلابات آئے، ان کو بالکل ایک طرف کر کے ایک ایسی مصروف منطق دی گئی جس کو کہ قرآن قبول نہیں کرتا۔ قرآن صاف کہتاہے:

كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا

(پارہ۴، آل عمران:۱۰۲)

ترجمہ: تم پہلے دشمن چلے آرہے تھے اس پیغمبر کی بعثت سے تم ہو گئے آپس میں بھائی بھائی۔

آپ ذرا غور کریں یہ شجرہ عداوت والے کیااِس قرآن پر ایمان رکھنے والے ہوسکتے ہیں؟

پھر توجہ دلاتا ہوں مگر پہلے ایک عنوان عرض کرتا ہوں آپ اس میں خود غور کریں۔ جب جاہلیت کی چنگاریاں اور جاہلیت کی آگ تھی تب قومیں قوموں سے ٹکراتی تھیں، قبائل سے قبائل ٹکراتے تھے۔

تو نبی پاک ﷺ کی تشریف آوری پر وہ آگ ٹھنڈی ہوگئی اور حضور ﷺ کی رسالت کا یہ ایک اعجاز تھا کہ حضورؐ نے ان کو ایک کیاجو ایک ہونے والے نہ تھے۔ تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضور نے انکو ایک کیا اور عرب میں لوگ حقیقی طور پر ایک ہو گئے۔

ہمارے نبی کا یہ معجزہ اور اسلام کا یہ انقلاب کوئی عارضی نہ تھا۔

مگر اس کے مقابلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ جی حضور کا مقابلہ جاری رہا اور جاہلیت کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو اسی تناظر میں واقعہ کربلا کو بھی بیان کیا جاتا ہے تو آپ ذرا اس پر غور فرمائیں۔۔۔بنیاد تو آپ کے ذہن میں آگئی نا؟۔تو غور کریں کہ کیا یہ حضور کے لائے انقلاب کا کھلا انکار ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ قرآن کا کھلا انکار ہے یا نہیں؟

حضور نبی اکرم ﷺ کی اپنے مشن میں کامیابی

تو بات دراصل یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنے اس مشن میں حقیقی طور پر کامیاب ہوئے۔۔ آپؐ دنیا سے کامیاب ہو کر گئے یا (معاذ اللہ) ناکام گئے؟۔۔ اگر کہا جائے کہ وہ چنگاریاں پھر اڑ پڑیں اور وہ جو آگ حضورؐ نے بجھائی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی تو آپ خود غور کریں کہ اس کا داغ پھر کس پر آتا ہے؟ داغ آتا ہے رسالت پر کہ آپکی رسالت اپنے مشن میں کامیاب نہ رہی (معاذ اللہ) کہ جو نہی پیغمبر کی دنیا سے وفات ہوئی امت ساری باغی ہو گئی (ثم معاذ اللہ)۔۔ اور جو حضور ﷺ کی جانشینی تھی اس کے بارے میں جب یہ تصور دیا جائے کہ جانشینی تھی جناب علی المرتضیٰؓ کی لیکن قوم نے بات چلنے نہیں دی۔ (تو واقعات کیا ہیں، کیا نہیں اس وقت میں اس پر تبصرہ نہیں کرتا کیوں کہ ان حالات میں خاص طور پر اس ملک میں ان معاملات کی تفصیل میں نہیں جانا۔)

لیکن آپ خود سوچیں کہ اگر حضور ﷺ جنہوں نے ہر طرح کی قربانیاں بھی کیں، جنگیں بھی لڑیں، وطن کو بھی چھوڑا اور پھر اللہ تعالی نے انکو بدر میں بھی فتح عطا فرمائی، دوسری جنگوں میں بھی فتح عطا فرمائی تو کیا وفات کے وقت وہ اپنی ساری محنت میں ناکام ہو گئے؟ معاذاللہ ثم معاذاللہ۔ کیا آپکا دل و دماغ اس بات کو تسلیم کرتا ہے؟ کہ حضور دنیا سے ناکام ہو کر گئے؟ اگر حضور کا مشن یہ تھا کہ میرے بعد نظام اس طرح چلے اور لوگوں نے معاذ اللہ اسے چلنے نہ دیا تو پھر غالب کون آیا؟ یہ شجرہ عداوت والے یا اللہ سے اذا جاء

نصر اللہ والفتح کی بشارت پانے والے ؟[1]

(1) قرآن کریم اللہ رب العزت کی طرف سے حضور نبی کریم ﷺ پر نازل کردہ، وہ لاریب کتاب ہے جس سے علم و عمل کے لاتعداد سوتے پھوٹتے ہیں جس سے بنی نوع انسان کو دنیا میں رہنے کا ایک کامل ضابطہ حیات اور ایک مکمل لائحہ عمل ملتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے حضور خاتم النبیین ﷺ کی رسالت ایک کامیاب رسالت کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ قرآن کریم کی کئی آیات اس پر شاہد ہیں کہ حضور خاتم النبیین ﷺ اپنے مشن میں کامیاب ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ حضرت علامہ صاحب اطال اللہ حیاتہ اپنے اس بیان میں یہاں قرآن کریم کی آخری سورۃ 114 نمبر النصر کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ (1) وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (2)
فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (3)

ترجمہ: جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور تم لوگوں کو دیکھ کو کہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں، تو اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اسکی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت مانگو۔ یقین جانو وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

اس پر امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”اس سورت میں حق تعالی نے اپنے دو انعام ذکر فرمائے ہیں: اول فتح مکہ۔ دوم لوگوں کا بکثرت دین الہی میں داخل ہونا۔ پھر انعامات پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مذہب شیعہ کی بنا پر کسی طرح یہ آیت صادق نہیں ہو سکتی کیونکہ آیت بتارہی ہے کہ فوجوں کی فوجیں دین الہی میں داخل ہوئیں اور مذہب شیعہ یہ تعلیم دیتا ہے کہ صرف معدودے چند صدق دل سے مسلمان ہوئے تھے باقی سب منافقانہ طور پر اظہار اسلام کرتے تھے اور بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتد ہوگئے تھے (معاذ اللہ منہ) بھلا کوئی کہہ سکتا ہے کہ معدودے چند لوگوں کو افواج کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یا منافقانہ طور پر اظہار اسلام کرنے کو دین الہی میں داخل ہونا کہا جا سکتا ہے اور پھر یہ منافقانہ اسلام اور وہ بھی چند روز کے لیے انعام الہی میں شمار ہو سکتا ہے۔ حاشا ثم حاشا۔“

محقق العصر حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

”اس کا نام ہی سورہ نصر ہے اور یہ خدا کی طرف سے حضور ﷺ کی رسالت کی آسمانی نصرت کا اظہار ہے۔ کیا یہ حضور ﷺ کے اپنے مشن میں کامیابی پر مہر نہیں ہے؟ اس سے پہلے

پ 26 میں بھی حضور کو فتح مبین کی خبر دی گئی۔ قرآن کریم کے ان دو حوالوں کی روشنی میں اثنا عشریوں کی یہ بات کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے کہ حضور ﷺ اپنے مشن میں (معاذاللہ) ناکام رہے. سورہ نصر میں آپ ﷺ سے جو الٰہی نصرت کا وعدہ کیا گیا یہ وہ نصرت نہیں جو آخرت میں ہو بلکہ اس میں فوجی نصرت کا بیان ہے۔ یدخلون فی دین اللہ افواجا۔ اور حضور ﷺ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا گیا کہ اپنی اس کامیابی کو آپ انہی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا اور تو دیکھے گا لوگوں کو داخل ہوتے دین میں فوج در فوج۔ جب آپ کی رسالت اپنے اس نقطہ کامیابی پر پہنچے۔ پھر آپ بیشک تسبیحات میں لگیں، اسباب کی دنیا میں آپ اپنے تمام معرکوں میں پورے کامیاب ہو چکے۔ لیکن روافض کا عقیدہ کے آپ ﷺ اپنے مشن میں (معاذاللہ) ناکام رہے یہ عقیدہ قطعاً صحیح نہیں۔"

(تجلیاتِ آفتاب، ج2، ص411)

سو قرآن کریم مسلمانوں کو یہ عقیدہ اور درس دیتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کو جو ذمہ داری دے کر بھیجا گیا تھا آپ اسے پورا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہے۔ آپ نے جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم پڑھ کر سنایا، انہیں کتاب و سنت کی تعلیم دی، اور تزکیہ کی محنت سے ایک بے مثال جماعت تیار کی جس کی نظیر نہ کہیں ان سے پہلے ملتی ہے اور نہ کہیں ان سے بعد۔ مگر ناقدین صحابہ کرام جو واقعات اپنی ایک خاص منطق کے ذریعے عوام الناس میں بیان کرتے ہیں ان سے وہ رسالت مآب ﷺ کو صاف صاف اپنے مشن میں ناکام رہنے کا تاثر دیتے ہیں۔ ان واقعات میں سے چند ایک کو یہاں حضرت علامہ صاحب کی ایک کتاب سے نقل کیا جاتا ہے:

"حضور ﷺ اپنے آخری دور علالت میں اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبد المطلب کو اپنی مسجد میں امام بنانا چاہتے تھے مگر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی بات چلنے نہ دی اور اپنے باپ کو مسجد نبوی میں امام کھڑا کر دیا۔

آپ نے اپنے بستر علالت پر وصیت لکھانے کے لئے کاغذ اور قلم مانگا مگر آپ ﷺ کی سوسائٹی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اتنا رعب تھا کہ آپ کو کاغذ اور قلم نہ دیا گیا اور حضور ﷺ نے بھی اس کے بعد باوجودیکہ کئی دن اپنے بستر پر رہے پھر کاغذ اور قلم کا کوئی سوال نہ کیا۔

جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی تو آپ ﷺ کے جسد اطہر کو آپ کے خاندان کے سپرد کر کے انصار صحابہ خلافت قائم کرنے لگ گئے (معاذ اللہ) آپ ﷺ کے جنازہ تک کی پرواہ نہ کی

نبی کریم ﷺ کا مشن آپ کے وصال کے بعد

اگر حضور ﷺ کے مشن کو حضور کی وفات کے بعد معاذاللہ صحابہؓ نے چلنے نہ دیا، اور جاہلیت کی وہی پرانی چنگاریاں۔۔۔۔ پھر سے بھڑک اٹھیں، اختلافات کی جس آگ کو حضور نے ٹھنڈا کیا تھا وہ آگ پھر لگ گئی اور پھر قبیلے سے قبیلے ٹکرائے اور یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ برابر کہا جاتا ہے کہ پہلے

گئی۔استغفر اللہ العظیم

آپ ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر جو لوگ بھی تعزیت کے لیے جمع ہوتے رہے تھے انہیں وہاں آنے سے سختی سے روک دیا گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں آگ لگانے تک کی دھمکی دی۔استغفر اللہ العظیم

پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جب خلیفہ اول سے اپنے والد کی میراث لینے گئیں تو انھیں فدک کی زمین نہ دی گئی۔

قرآن کریم میں حضور ﷺ کو اپنے مشن میں چار ذمہ داریاں دی گئی تھیں ان میں ایک ذمہ دار یہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دلوں پر تزکیہ کی محنت تھی۔ شیعہ نادان سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ اپنے دن رات ملنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کا تزکیہ بھی نہ کر پائے۔ انھیں قرآن پہنچانے کی ذمہ داری بھی صحیح ادا نہ کی جو قرآن جمع کیا گیا وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ قرآن سے مختلف ہے تو امت تک صحیح قرآن نہ پہنچا۔ کیا یہ عام امت کی اصل قرآن سے محرومی نہیں؟ یہ (معاذاللہ) حضور ﷺ کی اپنے مشن میں ناکامی سمجھی جائے گی کہ آپ وہ کام نہ کر پائے جو آپ کے مقاصد بعثت تھے۔" (تجلیات آفتاب، ج2، ص410)

شیعہ ذاکر اور علماء تو ان واقعات میں دبے الفاظ میں ناکامی کا تاثر دیتے ہیں مگر ان کے امام خمینی تو صاف الفاظ میں یہ کہتے ہیں:

"جو نبی بھی آئے وہ انصاف کے نفاذ کے لئے آئے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا میں انصاف کا نفاذ کریں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے یہاں تک کہ ختم المرسلین (ص) جو انسان کی اصلاح کے لئے آئے تھے اور انصاف کا نفاذ کرنے کے لیے آئے تھے انسان کی تربیت کے لیے آئے تھے لیکن وہ اپنے زمانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔" (اتحاد و یک جہتی، ص15)

دلائل کے ساتھ خمینی صاحب کے اس غلط عقیدہ کی تردید اگلے حاشیے میں ملاحظہ فرمائیں۔

دادا لڑا............. حضور ﷺ سے

پھر اسکا بیٹا معاویہ لڑا........ حضرت علی سے

پھر اسکا بیٹا یزید لڑا........... حضرت حسین سے

اور کربلا کا واقعہ پھر اسکے نتیجے میں واقع ہوا تو یہ ایک ایسی تشریح ہے جو اپنے قیاس سے اور اس منطق سے عوام کے ذہن میں اتاری جائے تو عوام سمجھتے ہیں کہ "اچھا"!! یہ واقعات اس طرح ہوئے!!! لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر واقعات کو اس طرح تسلیم کر لیا جائے تو ناکامی کا داغ کس پر آتا ہے؟۔ آپ ہی بتائیں کہ کیا پھر ناکامی کا داغ حضور ﷺ پر ہی نہ آئے گا؟ کہ حضور ﷺ معاذ اللہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوئے۔

قرآن کریم کو مانیں یا ان بیان کردہ غلط واقعات کو؟

اب ہم نے ان واقعات کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھنا ہے یا قرآن کے آئینہ میں؟۔ قرآن پکار پکار کر حضور ﷺ کو غلبے کی خبر دیتا ہے۔ اللہ تعالی قرآن کریم میں حضور ﷺ کو غلبے کی خبر دیتے ہیں:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (پارہ:30، سورۃ الضحیٰ:5)

ترجمہ: اللہ تعالی آپ کو وہ کچھ دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

الم یجدك یتیما فاوی، کس طرح اللہ تعالی نے ایک یتیم کو اٹھایا اور بادشاہ بنا دیا، کس طرح وہ رات کا مسافر جو مکہ سے رات کے وقت ایک ساتھی کو لیکر نکلا جس کے پیچھے تعاقب کرنے والے دوڑ رہے تھے، پیچھے پکڑنے والے آرہے تھے لیکن اللہ نے ان سب کو ناکام کر کے اسی یتیم کو اسی سلطنت کا بادشاہ بنایا۔۔ میں بادشاہ کا لفظ بھی ایک بات سمجھانے کے لئے کہہ رہا ہوں ورنہ آپ تو بادشاہوں کے بادشاہ تھے، بادشاہ کی کیا نسبت ہے آپکی ذات سے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ اگر اس فلسفۂ فکر کو قبول کر لیا جائے جو محرم کے ایام میں عام لوگوں کے ذہن میں اتارا جاتا ہے کہ جاہلیت کی وہی پرانی چنگاریاں پھر سے بھڑک اٹھی تھیں اور عرب کا سارا نظام بدل گیا تھا۔

اب آپ کے سامنے یہ مسئلہ آنا چاہیے کہ حضور ﷺ اپنے مشن میں کامیاب نہیں تو پھر یہ قرآن کا بیان غلط ہے معاذ اللہ، اور اس فلسفے کو اگر جگہ دی جائے تو پھر یہ ناکامی حضرت علی کی نہیں کیونکہ خلافت انہیں نہ ملی۔ اور حضرت حسین کی بھی نہیں کہ یزید کی فوجوں کی تلواروں سے وہ بچ نہ سکے، پھر ناکامی کا داغ جو ہے وہ خود پیغمبر ﷺ پر آتا ہے جس کے ساتھ خدا کے وعدے قرآن میں ہیں اور اب تک یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ حضور ﷺ اپنے مشن میں کامیاب ہیں، اگر کامیاب مانا جائے تو کیا یہ عداوت اور دشمنی کے پھیلاؤ والی باتیں یہود اور دشمنانِ اسلام کی پیدا کردہ معلوم نہیں ہوتیں؟ جو حضور ﷺ کی امت کو یکجا دیکھنے سے سخت پریشان تھے۔

حضور ﷺ کی کامیابی اور اہل سنت کا عقیدہ

دیکھیں! ہم اپنا عقیدہ صاف آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں، ہم حضور اکرم ﷺ کو اس درجہ میں کامیاب اور منصور سمجھتے ہیں، کہ صحابہؓ اور اہل بیتؓ دونوں ہی حق اور دونوں ہی حضور ﷺ کے تابعدار اور دونوں مل کر چلنے والے تھے اور عرب میں جو انقلاب آیا وہ واقعی ہی انقلاب تھا، وہ دکھاوا نہیں تھا۔ (1)

(1) قرآن کریم میں رسالت مآب ﷺ کی بعثت کے یہ چار مقاصد بتائے گئے ہیں: تلاوتِ قرآن، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

(پارہ:2، البقرہ:151)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

(پارہ:28، الجمعہ:2)

اور ہم مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اس ذمہ داری کو نبھانے میں، اللہ کا پیغام پہنچنے میں اور اپنے مشن رسالت میں پوری طرح کامیاب ہو کر سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ جیسا کہ

اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ (پارہ:28،المجادلہ:21)

جب اللہ رب العزت یہ فرمارہے ہیں کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے تو پھر اس کے برخلاف اگر کوئی انکی ناکامی کا عقیدہ و نظریہ رکھے تو وہ بلاشبہ قرآن کریم کی ان آیات سے کھلم کھلا ٹکرا رہا ہے۔ تاہم حضرت علامہ صاحب مدظلہ العالی فرماتے ہیں:

''آنحضرت ﷺ بھی دنیا سے تب گئے جب مکہ پر آپ کا قبضہ ہو گیا۔ مکہ مشرکوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ کفر کی طاقتیں سرنگوں ہوئیں اور آپ اپنے مشن میں کامیاب رہے اور یہ بات قرآن میں پہلے سے بتادی گئی کہ آپ کامیاب ہوں گے۔ مکہ میں حق کا پرچم لہرایا اور باطل شکست فاش سے دوچار ہوا:

وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

(پارہ:15،بنی اسرائیل:81)

ترجمہ: حق آیا اور باطل نے پاؤں چھوڑ دیے اور باطل ہے ہی جڑ سے کٹنے کے لئے۔

اور قرآن کی یہ سورت ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ سن چکے ہیں:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۔ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا

(پارہ:30،النصر:1-2)

قرآن نے تو یہاں تک بتلا دیا کہ اب آپ کا قدم کامیابی ہی کی طرف بڑھتا رہے گا آپ کا مشن کامیاب ہو گا اور ہر بعد کی آنے والی گھڑی آپ کے لیے پہلے سے بہتر ہوتی جائے گی:

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ

(پارہ:30،الضحیٰ:4-5)

ترجمہ: اور ہر بعد کی گھڑی آپ کے لیے پہلی سے بہتر ہو گی اور آپ کو آپ کا رب وہ کچھ دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

ہمیں خمینی کے اس عقیدہ سے قطعاً متفق نہیں کہ حضرت خاتم النبیین ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد پوری دنیا میں عدل و انصاف کا اپنی زندگی میں نفاذ تھا۔ آپ کا مقصدِ رسالت، اللہ کی بات لوگوں کو پہنچانا تھا ان پر مسلط ہونا نہیں۔ لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (پارہ:30، الغاشیہ:22) ہاں آپ کا مقصد بعثت اس دین حق کو دوسرے تمام سب مذاہب پر علماً اور اشاعةً

غالب کرنا تھا اور تاریخ گواہ ہے کہ آپ ان تمام مقاصد میں کامیاب ہو کر گئے۔

قرآن کریم میں آپ کے مقاصد بعثت مذکور ہیں: تلاوت قرآن، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ کیا آپ اپنے ان بعثت کے مقاصد میں ناکام ہو گئے ہیں۔ کیا آپ نے قرآن نہیں سنایا۔ کیا آپ نے کتاب و سنت کی تعلیم سے لوگوں کی زندگی نہیں بدلی۔ کیا آپ نے لوگوں کی قلبی تطہیر نہیں کی۔ علامہ خمینی کا یہ کہنا کہ آپ کا مشن ناکام ہوا ہے قرآن کی روشنی میں سو فیصد غلط ہے۔ قرآن نے آپ کا جو مشن بتلایا جب تک آپ اس میں کامیاب نہ ہوئے اللہ نے آپ کو اپنے پاس نہیں بلایا۔ بلایا اسی وقت جب آپ اپنے اس مشن میں کامیاب ہو گئے اور اس دین حق کا غلبہ سب نے دیکھ لیا۔ قرآن کی ان آیات پر بھی ایک نظر کریں شاید آپ کچھ سمجھ پائیں:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (پارہ:6، المائدہ:67)

ترجمہ: اے رسول آپ آگے پہنچائیں جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے اتارا گیا اگر آپ نے اسے نہ پہنچایا تو آپ نے رسالت کی ذمہ داری ادا نہ کی اور اللہ آپ کو ان لوگوں سے بچائے گا (یعنی آپ کو تقیہ کی ضرورت نہ پڑے گی)

لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۔ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ۔ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ

(پارہ:30، الغاشیہ:22،23،24)

ترجمہ: آپ ان پر داروغہ مقرر نہیں کیے گئے کہ وہ ضرور ایمان لائیں مگر یہ کہ جو کوئی روگردانی کرے اور کفر کرے تو اللہ تعالی اسے بڑے عذاب میں مبتلا کرے گا۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا (پارہ:10، التوبہ:33. پارہ:26، الفتح:28)

ترجمہ: اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر۔

دوسرے مذاہب کے بارے میں آپ کے اعلان بھی سن لیں:

① یہودیوں کے بارے میں ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ ... وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ

(پارہ:4، آل عمران:112)

② عیسائیوں کے بارے میں ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (ایضاً:63)

قوموں کا اتحاد

آپ ”کربلا“ کے اس سارے پس منظر کو جب تک اس انداز سے نہ دیکھیں اس وقت تک بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ توجہ اس طرف کرنی چاہیے، عرض یہ ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ نبی پاک ﷺ نے قبائل میں جاہلیت کی آگ بجھا دی تھی، جو صدیوں سے ایک دوسرے سے دشمنی چلی آرہی تھی اور قبائل آپس میں لڑتے رہتے تھے اس پیغمبر انقلاب نے ان سب کو ناکام کر دیا۔ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے تو قرآن اس کی تائید کرتا ہے اور اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قبیلے آپس میں دل سے نہیں ملے تھے بلکہ اوپر اوپر سے ملے تھے۔ تو پھر یہ قوموں کا اتحاد ہوگا یا ڈرامہ؟ کیا خیال ہے؟ کہ حضور کے آنے پر اگر قومیں آپس میں ایک ہوئیں تھیں تو یہ اوپر اوپر سے ہوئیں تھیں؟ دلوں میں بغض و عناد وہی باقی

---

③ ایران کے بارے میں قدمات کسری فلا کسری بعدہ

(صحیح مسلم، ج:2، ص:396)

④ رومیوں کے بارے میں واذا هلك قيصر فلا قيصر بعده (ایضاً)

⑤ ہندوستان کے بارے میں عصابة من امتي تغزو الهند

(سنن نسائی، ج:2، ص:63)

پھر آپ کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ساری دنیا آپ کے قدموں تلے آئے گی:

ان الله زوى لي الارض فرايت مشارقها و مغاربها و ان امتي سيبلغ ملكها ما زوي لي منها (صحیح مسلم، ج:2، ص:390)

کیا اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ناکامی اور بے بسی میں دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور آپ اپنے مشن میں معاذاللہ ناکام رہے تھے۔ آپ پوری دنیا میں اپنا کلمہ پہنچنے اور اسلام پھیلنے کی بشارت دے کر گئے اور خود سفر آخرت پر روانہ ہونے کے لیے اپنی رضا دی، اگر آپ کا مشن ابھی رہتا تھا تو آپ سفر آخرت کے لیے تیار کیوں ہوئے اور اپنی رضا کیوں دی؟

(تجلیات آفتاب، ج:2، ص:328-326)

علامہ خمینی کی اس عبارت کا مکمل محققانہ اور عالمانہ جواب پڑھنے کے لیے حضرت علامہ صاحب کی مذکورہ بالا کتاب تجلیات آفتاب جلد دوم میں ”مناظرہ ڈربن“ کی مراجعت فرمائیں۔

تھا؟ جاہلیت کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں؟ پیغمبر جب پردے میں گئے تو وہی پرانی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں اور پھر دو سلسلے قائم ہو گئے کہ حضرت علی کے مقابلے میں حضرت معاویہ اور حضرت حسین کے مقابلے میں یزید؟

مجموعی نتیجہ کو سامنے رکھیں:

وہ فلسفہ فکر اور وہ سوچ جو انکی طرف سے پیش کی جاتی ہے، آپ اس کے مجموعی نتیجے کو کیوں نہیں سامنے رکھتے؟ واقعات اور جزئیات میں کہاں تک ہم بحث کریں اور کہاں تک چلتے جائیں!! خلاصہ یہ دیکھنا ہے کہ مشن میں حضور ﷺ اگر کامیاب ہیں تو آپکے بعد آپ کی امت نے، آپ کے دین کو، آپ کے مشن کو، صحیح سنبھالا اور خلفائے راشدین حق پر تھے، اہل بیت حضرت علی وہ بھی حق پر تھے اور حضرت علی خلفائے ثلثہ (حضرت ابو بکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم) کے ساتھ پورے ایک ہو کر چلے، سو اس سے آپ کا اپنا ذہن بنے گا، آپ کا ایمان بنے گا کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر عرب کے انقلاب قائم کرنے میں سو (100) فیصد کامیاب ہوئے، ایک یتیم اٹھا اور سارے عرب پر چھا گیا۔

حضور ﷺ کی حکومت کا دائرہ

لیکن جب ان کا سفر آخرت پیش آیا، تو وہ ایک ملک کے بادشاہ تھے، جس کے غلام اس کی بادشاہی کے نتیجے میں پھر پوری دنیا میں پھرے اور پھر

- عراق.................میں
- شام...............میں
- مصر................میں
- یمن....................میں

اِن کی سلطنتیں اس طرح قائم ہو گئیں کہ دنیا نے ایسا کوئی انقلاب دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور اس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ اوپر اوپر سے ہی تھا اور یہ سارا ایک ڈرامہ تھا تو قرآن اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ کے امتیازات و اختلافات

میں ایک بات آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ حضور ﷺ کس خاندان کے تھے؟ آپ کے خاندان کا نام بنو ہاشم تھا۔ اور مکہ میں جس خاندان سے آپ کی رقابت تھی اس کا نام بنو امیہ تھا۔ یہ دونوں خاندان آپس میں کزن تھے۔ دونوں عبد مناف کی اولاد تھے۔ عبد مناف کی اولاد میں سے ہی بنو ہاشم تھے، اور عبد مناف کی اولاد میں سے ہی بنو امیہ تھے۔ تو جس طرح خاندان میں ایک رقابت چلتی ہے کہ ہم آگے بڑھیں، دوسرا کہتا ہے ہم آگے بڑھیں، ان دونوں میں یہ جذبہ کار فرما تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی امانت کہاں اتاری؟ (بنو ہاشم میں)۔ بنو ہاشم اپنی شرافت میں زیادہ ممتاز تھے، اور بنو امیہ اپنی سرداری میں اپنی چوہدراہٹ میں زیادہ آگے تھے۔ دونوں کے اپنے اپنے امتیازات تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری امانت آمنہ کی گود میں بنو ہاشم میں اتاری۔ تو نبی پاک ﷺ کی مخالفت میں بنو ہاشم میں سے کیا ابو لہب سب سے آگے نہیں رہا؟ جتنی مخالفت ہو سکی ابو لہب نے کی، ابو جہل نے کی، اور جو بنو امیہ تھے ان میں سے ابو سفیانؓ نے کی۔ جنگ بدر میں ابو سفیان حضور ﷺ کے مقابلے میں آیا، جنگ احد میں وہی آیا، جنگ احزاب میں قوموں کو جمع کر کے وہی لایا اور فوجوں کو جمع کر کے مختلف قبیلوں میں جو آگ لگی تھی ان سب کو اکھٹا کر کے وہی آگے بڑھا۔ لیکن نبی پاک ﷺ کے پیچھے اور آپ کے صحابہ کے پیچھے اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کا ہاتھ تھا۔ ید اللہ فوق ایدیھم (پ:26، الفتح:10)

فتح مکہ کے دوران ابو سفیان اور حضرت عباس کی ملاقات:

اللہ تعالیٰ نے جب حضور ﷺ کو کامیاب کر دیا اور تاریخ کی بہت سی منازل طے کرنے کے بعد ہم اس پھاٹک پر آتے ہیں جس میں نبی پاک ﷺ بطور کامیاب پھر مکہ میں داخل ہوئے۔ تو نبی پاک ﷺ کے چچا حضرت عباس وہ بنو ہاشم میں بڑے تھے، اور ابو سفیان بنو امیہ میں بڑا تھا، تو جب حضور ﷺ داخل ہو رہے تھے تو ابو سفیان کو اندازہ ہو گیا کہ اب میری بات چل نہیں سکے گی۔ تو اس نے لشکر اسلام آتے دیکھا کہ لشکر اسلام

کس طرح مکہ میں داخل ہو رہا ہے۔ اور وہ یتیم جو رات کی تنہائی میں یہاں سے چھپ چھپا کر نکلا تھا آج کس طرح بادشاہ ہو کر آرہا ہے تو ابوسفیان درختوں کی جھاڑیوں کے پیچھے سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

اس انقلاب نے وہ یادیں بھی تازہ کرادیں کہ کس طرح یہ یتیم راتوں رات گیا تھا اور لوگ پیچھے عداوت میں اسے تلاش کر رہے تھے لیکن آج یہ کس طرح کامیاب ہو کر آیا تو حضرت عباس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا، دونوں ایک خاندان عبد مناف کی اولاد تھے، تو عباس نے کہا ابوسفیان! اب تو تو نے حق کے چڑھتے سورج کو دیکھ لیا ہے۔ بھلا کوئی اکیلا یتیم اس مقام پر آسکتا ہے؟ اور حالات کے اتنے تھپیڑوں میں اور اتنے انقلابات کا سامنا کر کے آسکتا ہے؟۔ اب تو اس سچائی کو قبول کر لے، تو ابوسفیان نے عباس کو کہا کہ بھائی ہم ایک ہی خاندان کے ہیں، کزن ہیں، بات تیری صحیح ہے، چڑھتا سورج مجھے بھی نظر آرہا ہے۔

حضرت ابوسفیان کا قبول اسلام

اور یہ یقیناً اللہ کے رسول ہیں کوئی انسان اپنی چال سے کتنا ہی وہ چال باز کیوں نہ ہو، اتنا بڑا انقلاب کیسے لا سکتا ہے؟ اور وہ بھی گنتی کے چند سالوں میں۔ اور قوموں کی زندگی میں دس بارہ سال کیا کوئی عرصہ ہوتا ہے؟ گنتی کے سالوں میں اس مقام پر جو اللہ تعالی نے انکو پہنچایا تو یقیناً خدا بھی ایک ہے اور یہ اس کے پیغمبر ہیں، میرے بھائی میرا دل مان رہا ہے، لیکن میں اس طرح تمہارے ہاتھ پر اسلام قبول نہیں کروں گا۔ میں عرب کا بڑا سردار ہوں، بڑا چوہدری ہوں، عرب کے وہ سب لوگ مجھے کیا کہیں گے!؟ وہ کہیں گے ڈر کر اب آگیا ہے! اب جب دیکھا کہ کچھ نہیں بات پلٹی تو اس نے ڈر کر اسلام قبول کیا ہے۔ تو میں اس طرح تمہارے کہنے پر قبول نہیں کروں گا۔

جب حضور مکہ میں اندر آجائیں گے، اور کعبہ میں بیٹھے ہوں گے، میں پھر خود جا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا اور سچائی قبول کروں گا۔ کیوں؟ اسلئے کہ بڑے لوگ اور بادشاہ لوگ جب سچائی کے آگے جھکتے ہیں تو اس میں یہ بادشاہی انداز ہوتا ہے کہ ہم مجبور ہو کر نہیں آرہے ہم دل سے مان رہے ہیں کہ سورج چڑھ آیا ہے۔

ابوسفیان کی آمد اور صحابہ کاڈسپلن

پھر ابوسفیان جب مسلمان ہوئے حضور اکرم ﷺ کے پاس جب وہ آرہے تھے تو ”صحابہ کرام“ اتنے ڈسپلن (Discipline) والے تھے کہ مجال ہے کہ ”ابوسفیان“ کو آتے دیکھیں کہ دشمن آگیا ہے چنانچہ اسے مار دیں۔ ”نہ“ ایسا نہیں۔۔ وہ قوم بڑی بیدار تھی، ڈسپلن ان میں قائم تھا، وہ (صحابہ کرام) اپنا ضبط رکھتے تھے، ابوسفیان آرہا ہے پر مجال ہے کہ کسی کا ہاتھ اٹھے اس پر۔ یا کوئی اسکو سخت لفظ بولے۔ آرہا ہے اور وہ حقیقت میں آ نہیں رہا تھا بلکہ اللہ اسے لا رہا تھا۔۔ اللہ تعالی جس نے حضور کو اتنی مشکلات سے گزارا اور کامیاب کیا اور وہ دیکھ رہا تھا۔ تو ابوسفیان آکر ”رحمۃ للعالمین ﷺ“ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر اسکی بیوی بھی۔ جب یہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمہ پڑھا، آنحضرت ﷺ کا چہرہ چمک اٹھا خوشی سے۔ ہمارے جیسا آدمی اگر وہاں ہوتا تو کہتا کہ حضور کو اتنی کامیابی دی اللہ نے کہ اب تو دشمن بھی سرنگوں ہو رہے ہیں۔

ابوسفیان کا کلمہ پڑھنا دل سے تھا

سو ابوسفیان کے دل میں ایمان کی روشنی اتر چکی تھی، کہ جب اس نے حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور کلمہ پڑھا تو اس کے سابقہ گناہ بخشے گئے کیونکہ حضور ﷺ فرماتے ہیں: الاسلام یھدم ما کان قبلہ (صحیح مسلم، ج:1، کتاب الایمان) اسلام قبول کرنے سے، ایمان لانے سے، سابقہ گناہ ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر ابوسفیان خود بھی اور ان کے بیٹے بھی بعد کی جنگوں میں اپنے آقا کے ہر دم، ہر وقت ساتھ رہے اور پھر حضور نے بھی ابوسفیان اور ان کے بیٹوں کو ذمہ داریاں دیں، تو کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ابوسفیان نے دل سے کلمہ پڑھا تھا؟ بالکل انہوں نے دل سے کلمہ پڑھا تھا۔

اب اس پر جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ جی بنو امیہ میں اور بنو ہاشم میں پرانی دشمنی تھی، وہ حضور ﷺ کے مقابلہ میں، یہ علی کے مقابلے میں، پھر اس کا بیٹا حسین کے مقابلے میں، تو یہ سطحی طور پر بات کو سوچا جاتا ہے، یہ لوگ اپنے قیاس سے کام لیتے ہیں، قرآن سے

نہیں۔ اسلام کی برکت سے اب یہ دونوں خاندان ایک ہو گئے تھے۔[1]

---

(1) اللہ جل شانہ نے اسلام کی برکت سے ان خاندانوں کی آپسی رنجش کو بالکل ختم کر دیا تھا اور حضرت ابو سفیان سمیت آپکا پورا گھرانہ قبول اسلام کے بعد دیگر صحابہ کرام کی طرح اپنے آقا و مولا کی وفاداری اور جانثاری میں کسی سے پیچھے نہ رہا تھا۔ قبول اسلام کے بعد پیش آنے والے غزوات میں آپ نے اپنے بیٹوں سمیت ان مہمات میں بھرپور شرکت کی۔ آپ دین اسلام کی خدمت کے لیے نبی کریم ﷺ کے حکم کے منتظر رہتے اور آپ کے ہر ایک ارشاد کردہ حکم کو بڑی بخوبی سے سرانجام دیتے تھے اور نبی کریم ﷺ بھی حضرت ابو سفیان اور آپ کے بیٹوں پر مکمل اعتماد فرماتے تھے۔ جس کا واضح ثبوت انہیں مختلف ذمہ داریاں سونپنا اور دیگر مناصب ان کے سپرد کرنا ہے۔ حضرت الاستاذ ڈاکٹر علامہ خالد محمود صاحب دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے بعد طلقاء کرام کو بھی بڑے بڑے عہدے دیئے۔ عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا والی بنایا۔ عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو کعبہ کا کلید بردار رہنے دیا۔ ابو سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کو نجران کا عامل بنایا۔ ان کے بیٹے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو علاقہ تیماء کا والی بنایا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو کتابتِ وحی کی ذمہ داری سونپی۔ یہ صورت حال پتہ دیتی ہے کہ آپ ﷺ کو یہ معلوم تھا کہ یہ لوگ استسلام (اوپر سے ماتحتی قبول کر کے) سے مسلمانوں میں نہیں آئے اسلام میں داخل ہو کر جھکے ہیں۔ آپ کو قرآن کریم کی اس خبر پر کہ فتح مکہ کے دن لوگ اسلام میں داخل ہوں گے، پورا پورا یقین تھا۔ قرآن کریم کی بشارت ہر وقت آپ کے سامنے تھی:

یدخلون فی دین اللہ افواجا (پارہ:30، النصر:3)

ترجمہ: لوگ فتح مکہ پر فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوں گے۔"

(عبقات، جلد اول:400)

حضرت علامہ صاحب ایک اور مقام پر سیرت نبوی ﷺ کے ایک منفرد پہلو سے اس موضوع پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ جہاں الٰہی امانت کے امین اور آسمانی رشد و عصمت کے در ثمین تھے، وہاں حیات انسانی کے نہایت بلند پایہ جوہر شناس اور انسانی قدروں کو پہچاننے اور ان کے اثرات کو بھانپنے میں نہایت عمیق النظر اور حساس تھے۔ صحابہ کی عظیم جماعت کے ہوتے

ہوئے بھی آپ کی نگاہیں احد العمرین (حضرت عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام) کی منتظر تھیں۔۔ آخر کیوں؟ نظر رسالت کی باریک بینی کہیئے یا اسے رب العزت کی حکمت تکوینی سے تعبیر کیجیے کہ جذب محمدی نے ان جواہر گراں مایہ کو ایک ایک کر کے کھینچا اور جو لوگ اپنی جاہلیت میں بڑے سمجھے گئے تھے، ان کی انسانی قدروں نے جب اسلام کی جلا پائی تو اسلامی معاشرے نے بھی عزت کا تاج انہی کے سروں پر رکھا۔ آنحضرت ﷺ کی اس مردم شناسی کا اشارہ اس حدیث میں بھی ملتا ہے:

عن ابی هريره قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم الناس معادن كمعادن الذهب والفضة خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا (رواه مسلم) (مشکوۃ المصابیح، ص32، مطبوعہ دہلی، 1889ء)

آنحضرت ﷺ کی عربوں کے قومی مزاج، ان کے روایتی مفاخر، ان کے جوہر مناصب اور عالمی عائلی اثرات پر گہری نظر تھی۔ آپ کے مختلف نکاحوں نے جس طرح مختلف خاندانوں کو ایک امت میں جوڑ دیا، تاریخ نفسیات اسے خراج تحسین ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے عظیم جرنیل اسلام میں اسی دروازے سے داخل ہوئے تھے۔ انحضرت ﷺ خوب جانتے تھے کہ کون کون سا فرد کس کس کام میں کس کس درجے تک کامیاب رہ سکتا ہے۔ اسی جوہر شناسی کا اثر تھا کہ آپ نے تقسیم مناصب اور امت کو ذمہ داریاں سپرد کرنے میں قدیم الاسلام اور حدیث الاسلام کا فیصلہ کہیں دخیل نہ ہونے دیا۔ یہ تو بتایا کہ اللہ کے ہاں جو فضیلت پہلوں کو ہے وہ پچھلوں کو نہیں: لَا يَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا (پارہ:27، الحدید:10)۔ لیکن نظم امور میں نظر ذاتی جوہر اور فطری استعداد پر رکھی اور آپ نے اس کے مطابق سلطنت اسلامی کا ربط انتظامی کیا۔ جو کل اسلام لائے انہیں آج بڑی بڑی ذمہ داریاں سونپ دیں اور اس میں قطعاً اور عملا کوئی بات قابل اعتراض نہ تھی۔ بیشتر اشراف مکہ بالکل آخری دور میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے لیکن حضور ان میں سے ایک ایک کو اس کی سوچ اور محنت کی استعداد سے پہچانتے تھے۔ قدیم الاسلام صحابہ بھی ان تمام تقاضوں کو جانتے تھے اور انہوں نے اس پہلو سے سیرت نبوی پر کبھی انگلی نہیں اٹھائی تھی۔ سب سراپا تھے۔ تقسیم غنائم میں حضور کی ان پر فرداً فرداً نظر ہوتی تھی اور اس کے مطابق اس

میں کمی بیشی فرماتے تھے۔ سوائے منافقین کے کوئی اس کو غیر مساوی تقسیم اور غیر عادلانہ نظام نہ کہہ سکتا تھا۔"

(پیش لفظ، حضرت ابوسفیان اور انکی اہلیہ، مولفہ حضرت مولانا محمد نافع صاحب، ص:13-12)

حضرت علامہ صاحب ایک اور مقام پر ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"حضور ﷺ نے یہ جانتے ہوئے کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ ہر معرکے میں مسلمانوں کے خلاف رہے ہیں، ان حضرات کو کیوں آگے کیا۔ ہم اس سوال کی جسارت نہیں کر سکتے، حضور ﷺ کو ان کے اخلاص و ایمان پر پورا بھروسہ تھا تبھی تو وہ انہیں اپنے ابتداء اسلام میں ہی اسلام کے کاموں کے لیے آگے بڑھا رہے تھے، کیا حضور ﷺ نے ابوسفیان کو اسلام لاتے ہی نجران کا والی نہ بنادیا تھا۔"(نسب قریش:122)(عبقات، ج:1، ص:170)

سو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو علاقہ نجران پر والی مقرر کرنے سے صاف صاف حضور نبی کریم ﷺ کا ان پر مکمل اعتماد ثابت ہوتا ہے اور مزید یہ کہ ان دو خاندانوں کی آپسی رنجش ختم ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جب ان ہر دو خاندان نے آپس میں رشتے داریاں قائم کی ہوں، آپس میں نکاح منعقد کیے ہوں!! یہ بات تو کسی اہل علم و دانش سے مخفی نہیں کہ ماسوائے اہل کتاب کے اسلام میں مومن مرد اور مومن عورت میں ہی نکاح منعقد ہو سکتا ہے جیسا کہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ (پارہ:2، البقرہ:221)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ (پارہ:28، الممتحنہ:10)

ان دو خاندانوں کے آپس میں قائم کردہ رشتوں میں سے فی الوقت یہاں دو رشتوں کا بطور نمونہ کے ذکر کیا جاتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوسفیان کی بیٹی تھیں اور اس رشتہ کی وجہ سے ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خال المومنین کہا جاتا ہے۔

حضرت ابوسفیان کا حضور ﷺ سے رشتہ

آپ حضرات جو نبی پاک ﷺ کی امت ہیں یہ بات سمجھیں کہ ابوسفیان کا حضور اکرم ﷺ سے کیا رشتہ ہے؟، وہ یہ کہ ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہؓ حضورؐ کی حرم محترم ہیں اور ام المؤمنین ہیں۔[1] میں اسوقت اس تفصیل میں نہیں جاتا میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ یہ عقیدہ رکھیں کہ مخالف طاقتیں مجبور ہو کر ساتھ مل گئیں تھیں دل سے ساتھ نہیں تھیں، بنوہاشم سے برابر دشمنی تھی لیکن جو لوگ آکر جھک گئے وہ اوپر اوپر سے تھے اندر سے نہیں تو ایسے معاملے میں کیا کیا جائے؟ کیا اتنے بڑے انقلاب کو محض انسانی سوچ کہا جا سکتا ہے۔

صحابہ کرام کے متعلق قرآن کا فیصلہ

میں ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟ اگر تو ان کے دل اللہ نے جوڑے، اور قرآن نے تصدیق کی، پیغمبر کو بتا دیا کہ یہ جو آیا ہے اس کا دل اللہ نے روشن کر دیا ہے تو قرآن کے فیصلے کے مقابلے میں تاریخ کا فیصلہ کیا کوئی وزن رکھتا ہے؟ کیا خیال ہے؟ (سامعین: نہیں) قیاس؟ ''نہیں''، حالات پر نظر کر کے اپنا قیاس دوڑانا اور کہنا کہ وہ مجبور ہو کر ماتحت ہوئے تھے اور انہوں نے کلمہ حضور کا اندر سے نہیں پڑھا تھا، اندر سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، تو پھر اس کا نام کیا ہو گا؟ پھر اس کا نام ڈرامہ ہو گا حقیقت

خاندان نبوی ﷺ کے ساتھ حضرت ابوسفیان کی دوسری رشتہ داری کچھ اس طرح تھی کہ میمونہ (بنت حضرت ابوسفیان) کی دختر لیلیٰ (بنت ابی مرۃ بن عروۃ بن مسعود ثقفی) سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں۔ [یعنی حضور نبی کریم ﷺ کے نواسہ کے نکاح میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی نواسی تھیں] جن کے بطن سے علی اکبر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے اور میدان کربلا میں جام شہادت نوش فرمایا۔

(حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور انکی اہلیہ: 27)

(1) حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی شخصیت و سوانح پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ کی کتاب ''حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ'' کی مراجعت فرمائیں۔

نہیں۔ اب میں آپ حضرات سے یہ التماس کرتا ہوں کہ آؤ ہم اللہ کی کتاب سے فیصلہ لیں، کہ اللہ کی کتاب کیا کہتی ہے۔ دسواں پارہ سورہ انفال آیت نمبر 62 ذرا اس پر غور کریں اللہ تبارک وتعالی نے قرآن کریم میں فرمایا، سنو!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۳﴾ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾

(پ:10، الانفال:62،63)

اللہ تعالی فرماتے ہیں "وَاِنْ یُّرِیْدُوْٓا" اگر یہ کافر لوگ ارادہ کریں "اَنْ یَّخْدَعُوْكَ" کہ تجھے دھوکا دیں، یعنی اندر سے تو مسلمان نہ ہوں "اِنْ یُّرِیْدُوْٓا" اگر یہ ارادہ کریں "اَنْ یَّخْدَعُوْكَ" کہ تجھ کو دھوکا دیں، فریب کریں، تیرے ساتھ اندر سے نہ ہوں، تمہیں نہ مانیں، اوپر اوپر سے تیرے ساتھ چلتے رہیں، تیرے ساتھ ساتھ پھریں، "فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ" تو تجھے اللہ کافی ہے، اللہ تمہارے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے دھوکے کو کامیاب نہیں ہونے دیگا، اللہ تیرے ساتھ ہے۔ اللہ فرماتے ہیں حضور کو کہ تو میرا پیغمبر ہے، میں تیرے ساتھ ہوں، تیرے ساتھ یہ کتنا مکر و فریب کیوں نہ کریں، "اِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ" اگر یہ ارادہ کرلیں کہ یہ تجھے دھوکا دیں "فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ" اللہ تجھے کافی ہے "هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ" اللہ نے تجھے زور دیا تجھے اللہ نے قوت دی "بِنَصْرِهٖ" اپنی مدد دے کر "وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ" اور اللہ تعالیٰ نے تیری مدد کی مومنین کو تیرے ساتھ لگا کر، اگر اس نبی کے ساتھ لگنے والے مومنین نہیں تو قرآن کیوں کہہ رہا ہے "وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ" مومنین کے ساتھ تیری مدد کی۔ کاش کہ قم اور نجف اشرف کے مجتہدین اسے سمجھ پاتے۔[1]

(1) امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ اس آیت پر لکھتے ہیں:

فائدہ: ان دونوں آیتوں میں صحابہ کرام کے متعلق وہ باتیں بیان فرمائی ہیں کہ ان کے مان لینے کے بعد مذہب شیعہ قطعاً فنا ہو جاتا ہے۔

ایک مضمون ان دونوں آیتوں میں مشترک ہے اور ایک ایک غیر مشترک۔

مشترک مضمون یہ ہے کہ خداوند کریم نے خبر دی کہ صحابہ کرام میں قبل اسلام باہم ایسی سخت عداوت تھی کہ اس کا دور کر دینا انسانی طاقت سے بالا تر تھا حتی کہ سید الانبیاء ﷺ کی بابت فرمایا ہے کہ آپ بھی تمام دنیا کی دولت خرچ کر کے ان کی عداوت زائل نہ کر سکتے تھے خداوند کریم نے اپنی قدرت کاملہ سے اس عداوت کو دور کر کے ان میں باہم الفت پیدا کر دی کہ وہ بھائی بھائی ہو گئے۔ ان کی اس باہمی الفت کو خدا نے اپنی نعمت فرمایا۔ اس مضمون سے دو نتیجہ بر آمد ہوئے۔

اول یہ کہ قرآن شریف یہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام میں باہم الفت و محبت تھی اور ایسی الفت و محبت جو خدا کی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ تھی ان کی اس باہمی محبت کو ایک اور آیت میں **رحماء بینھم** کے لفظ سے تعبیر فرمایا اور ایک اور آیت میں **اذلۃ علی المومنین** کے لفظ سے۔ غرضیکہ جابجا مختلف کلمات میں اس کو بیان فرمایا ہے مگر مذہب شیعہ یہ بیان کرتا ہے کہ صحابہ کرام کی وہ دیرینہ عداوتیں بدستور قائم تھیں، بنی امیہ اور بنی ہاشم میں باہم وہی بغض و عناد اپنا کام کر رہا تھا۔ اور اسی بغض و عناد کی وجہ سے حضرت علی کو پہلی خلافت نہ مل سکی اور ان پر طرح طرح کے ظلم ہوئے **(نعوذ باللہ من ذلك)**

دوم یہ کہ قرآن شریف یہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرام مخلصین کی ایک بڑی جماعت تھی مگر مذہب شیعہ کی تعلیم یہ ہے کہ صرف چار پانچ اشخاص مخلص تھے، باقی سب منافق تھے یہ تعلیم کھلم کھلا قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ ان چار پانچ اشخاص میں نہ تو پہلے سے کوئی عداوت تھی نہ چار پانچ اشخاص میں الفت پیدا کر دینا کوئی ایسا بڑا کام ہے جس کو اس اہتمام سے بیان کیا جائے اور اس کو خدا کی قدرت کا کرشمہ کہا جائے۔ تینوں خلفاء کو مومن کامل اور خلیفہ برحق نہ ماننے سے شیعوں کو یہ دو صریح مخالفتیں قرآن کی کرنی پڑیں۔ لیکن وہ مخالفت قرآن کی کچھ پرواہ نہیں کرتے **ختم اللہ علی قلوبھم** کوئی شیعہ خدا کے لئے بتادے کہ وہ کون لوگ تھے جن میں باہم عداوت تھی اور ایسی عداوت کے کسی طرح زائل نہ ہو سکتی تھی اور خدا نے ان کی عداوت کو دور کر کے ان کو بھائی بھائی بنا دیا یقیناً قیامت تک کوئی شیعہ اپنے مذہب کی رو سے اس

حضور ﷺ کے ساتھ جڑنے والے دل سے جڑے

اللہ تو اس نبی کے ساتھ لگنے والوں کو کہے مومنین، اور یہ لوگ کہیں منافقین، **انا للہ وانا الیہ راجعون**، اس سے بڑی تاریخِ اسلام پر اور ظلمت کیا ہو گی؟ اور اندھیرا کیا ہو گا؟ کہ اللہ تو کہے "**بِالْمُؤْمِنِيْنَ**" اور یہ کہیں کہ ساتھ لگنے والے اوپر اوپر سے تھے، اللہ کا فیصلہ قرآن کا فیصلہ، اللہ تعالیٰ دلوں کو جاننے والا ہے، جو کوئی کسی کو دھوکا دیتا ہے وہ دھوکا اوپر سے تو دیتا ہے، لیکن اندر دل کی بات تو خدا جانتا ہے۔ اور جو اندر کی بات جاننے والا ہے وہ خود کہہ رہا ہے، اور قرآن پکار کر کہہ رہا ہے، **وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ**۔ لیکن اللہ تعالیٰ

کو نہیں بتا سکتا۔ اگر شیعہ کہیں کہ رسول خدا ﷺ کے زمانہ میں بے شک ان کی عداوتیں زائل ہو گئی تھیں اور وہ باہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے لیکن آپ کی وفات کے بعد ان میں وہ عداوتیں پھر عود کر آئیں۔ لہٰذا آیت کا مضمون سچا ہے اور مذہب شیعہ کی تعلیم اس کے خلاف نہیں ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو یہ بات مسلمات مذہب شیعہ کے خلاف ہے کیونکہ شیعہ صحابہ کرام کو اول روز سے مومن نہیں مانتے، کہتے ہیں کہ منافقانہ ایمان لائے تھے۔ دوسرے یہ کہ جو نعمت اس قدر قلیل مدت کے لئے ان کو ملی تھی اور پھر ان سے لے لی گئی اس کا احسان رکھنا خداوند عالم الغیب کی شان سے بعید اور بہت بعید ہے۔

غیر مشترک مضمون یہ ہے کہ پہلی آیت میں ارشاد ہوا کہ اصحاب نبی تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے خدا نے تم کو اس سے نجات دی اور دوسری آیت میں فرمایا کہ اے نبی آپ کی مدد کے لیے وہ مومنین کافی ہیں جو آپ کے پیرو ہو چکے ہیں ان دونوں مضمونوں کی تصدیق مذہب شیعہ کی تعلیم پر ناممکن ہے اس لئے کہ تینوں خلیفہ کے مومن اور خلیفہ برحق نہ ہونے سے تمام صحابہ کرام کو باستثناء چار پانچ اشخاص کے منافع و مرتد ماننا پڑتا ہے لہٰذا وہ دوزخ سے نجات یافتہ نہیں ہو سکتے یا بعبارت دیگر خدا جس کے نجات یافتہ ہونے کی خبر دے وہ منافق و مرتد نہیں ہو سکتا۔ نیز جب کے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم مرتد قرار دیے گئے منافق مانے گئے تو چار پانچ اشخاص آنحضرت ﷺ کی مدد کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتے اور حضرت علی تنہا اگر مدد کے لیے کافی ہوتے تو آنحضرت ﷺ کے بعد بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کیوں کر لیتے۔ الخ"

(تفسیر آیات خلافت وامامت: 544-543، ناشر: مکتبہ فاروقیہ لکھنؤ، دسمبر 2014)

نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔

بنو امیہ اور بنو ہاشم کے دلوں میں محبت

"وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ": اللہ نے ان کے دل جوڑ دیئے۔ قرآن کہے کہ اللہ نے دل جوڑ دیئے، یہ کہتے ہیں نہیں، یہ دو لائینیں لگی ہوئیں تھیں، پہلے ابو سفیان، اس کے بعد اس کا بیٹا، پھر اس کے بعد اس کا بیٹا۔ اور اِدھر نبی ﷺ، اِن کے بعد علیؓ اور اس کے بعد حسینؓ، یہ دونوں لائنیں ٹکرا رہی ہیں، تو اللہ فرمارہے ہیں "وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ": اللہ نے انکے دل جوڑ دیے۔ تو بنو امیہ اور بنو ہاشم میں ایمان لانے والوں کو جوڑ دیا، ابو سفیان اور محمد ﷺ کو جوڑ دیا، ابو سفیان کو محمد مصطفی ﷺ کی غلامی میں ان کے قدموں میں بٹھا دیا، اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو اطلاع دے دی کہ اب ان کے جوڑ کا میں گواہ ہوں۔ اور ہم اہل سنت اسے قرآن کی روشنی میں دلوں کا جڑنا کہہ رہے ہیں۔

جاہلیت کی آگ اور حضور ﷺ کی تربیت

تو مؤمنین کرام! کچھ غور تو کریں، کہ یہ جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے، کہ جاہلیت کی آگ پھر سے بھڑک اٹھی تھی، اور جاہلیت کی چنگاریاں جو تھیں وہ پھر سے سلگیں، اسکو قبول کرنے کی عقل و فکر کسی پہلو سے اجازت دیتی ہے؟ "ہرگز نہیں"۔ کیا آپ کی عقل مانتی ہے؟ آپ حضرات سے التماس ہے کہ پارہ دسواں اور سورۃ الانفال آیت نمبر 62 کو سامنے رکھیں۔

آگے فرمایا "وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ" اللہ نے ان قبائل کے دل آپس میں جوڑ دیئے، لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا، اے میرے محبوب! تو اگر ساری دنیا کے خزانے بھی خرچ کرتا تو انہیں کبھی نہ جوڑ سکتا۔ عربوں کو جوڑنے کے لئے صرف ایک ملک نہیں، ملکوں کے خزانے تو ہیں اپنے اپنے، جیسے ہم کہیں کہ امریکہ کے خزانے یہ ہیں، برطانیہ کے خزانے یہ ہیں، پاکستان کے خزانے یہ ہیں، جس طرح عموماً کہتے ہیں لیکن دنیا کے خزانے ان سب کو اپنی لپیٹ میں لے آئے۔ اور یہ اس کا کہنا ہے جو ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔

تو فرمایا "لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا": اے میرے پیغمبر! اگر تو ساری دنیا کے خزانے بھی خرچ کر ڈالتا انکو اکٹھا کرنے کے لئے۔ "مَآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ" انکو اکٹھا کرنے کے لئے کوئی ان کو جوڑ نہیں سکتا تھا، کتنا پیسہ دیا جائے قرضے نہیں، کتنی امدادیں دی جائیں، ایک ملک دوسرے ملک کی کتنی ضروریات میں اس کا کفیل بنے، تاہم سب کو جوڑنے کے لئے آپ دنیا بھر کے خزانے خرچ کر دیں، "مَآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ" آپ ان کے دلوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے "وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ" لیکن اللہ نے ان کے دل جوڑے تیری رسالت کے لئے، تیری رسالت کو کامیاب کرنے کے لئے اللہ نے ان کے دل جوڑے، اب اللہ کی کتاب تو کہہ رہی ہے، کہ ان کے دل جوڑے، اور ایک طبقہ اپنی محرم کی مجالس میں یہ کہے کہ نہیں

یہ چنگاریاں پھر سے بھڑک اٹھی .... تھیں
یہ دو قبیلے .... تھے
پرانے لڑ رہے .... تھے
پرانے خاندان لڑ رہے .... تھے
اور جاہلیت کی چنگاریاں پھر سے سلگ اٹھی تھیں۔۔۔۔۔۔۔

ہم کہتے ہیں جاہلیت کی آگ "محمد عربی ﷺ کے" قدموں کے نیچے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔[1] وہ لوگ جو دنیا دار ہوتے ہیں، وہ تو خرچے پر، لالچ پر مرتے ہیں، اللہ نے کہہ دیا کہ

(1) حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم اسی مضمون کو ایک اور آیت کریمہ سے اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ عرب اپنی خاندانی رقابتوں میں دور تک شہرت رکھتے تھے لیکن بنو امیہ اور بنو ہاشم آپس میں بہت قریب تھے اپنے مورث اعلی عبد مناف سے بہت قریب العہد تھے اور آپس کا بھائی چارہ ان میں برابر قائم تھا۔ یہ بات صحیح نہیں کہ کفر واسلام کے معرکے میں ان کے عقائد نہیں خاندانی رقابتیں آپس میں لڑ رہی تھیں اور اسی جاہلی جذبے سے وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے افسوس کہ ہم اس سے اتفاق نہیں کر سکتے:

حضرت عمر کو اپنے زمانے کے آخر میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں ہیں جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں پھر نہ جاگ اٹھیں۔۔۔ قبائلیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں جن کا شعلہ خلافت راشدہ کے نظام کو ہی پھونک کر رہا۔

یہ دعوے کہ اسلام کے نور سے یہ خاندانی رقابتیں صرف دبی تھیں بجھی نہ تھیں قرآن کریم اس تصور کے قطعاً خلاف ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًاۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

(آل عمران:103)

ترجمہ: اور یاد کرو اللہ کا احسان اپنے اوپر۔۔ جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر جوڑ دیے اللہ نے دل تمہارے۔۔ سو تم ہو گئے اللہ کے فضل سے آپس میں بھائی۔۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے کہ اللہ نے تمہیں وہاں سے نجات دے دی۔

سو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کے آب رحمت نے پشتینی رقابتوں کی وہ آگ یکسر بجھا دی تھی جس میں قبائل پہلے جل رہے تھے اور اب اگر ان میں کچھ اختلافات ہوئے تو اس کے عوامل Factors اور ہو سکتے ہیں۔ جاہلیت کی چنگاریاں نہیں۔

کیا اختلافات نئے سرے سے پیدا نہیں ہو سکتے؟ کیا ضرورت ہے کہ ہم ان اختلافات کی آگ کو پہلی جاہلیت سے متصل کریں۔ کیا اس سے قرآن کریم کی تردید نہ ہو گی؟ کیا یہی وہ اخوت اسلامی ہے جو چند سال میں دم توڑ گئی اگر اسے اسی طرح لیا جائے کہ اسلام کی دعوت سے جاہلیت کی چنگاریاں صرف دبی تھیں بجھی نہ تھیں تو کیا اس سے حضور ﷺ کی فتح مبین اور غلبہ رسالت پر حرف نہ آئے گا؟ اگر ان غلط تاریخی روایات کو جوں کا توں لے لیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ معاذ اللہ آنحضرت ﷺ اپنے مشن میں معاذ اللہ ناکام رہے۔ شیعہ کے مقتدر انقلابی رہنما علامہ خمینی اپنا عقیدہ ان الفاظ میں درج کرتے ہیں:

"جو نبی بھی آئے وہ انصاف کے نفاذ کے لیے آئے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ تمام دنیا میں انصاف کا نفاذ کریں۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے یہاں تک کہ ختم المرسلین (ص) جو انسان کی اصلاح کے لیے آئے تھے اور انصاف کا نفاذ کرنے کے لیے آئے تھے۔ انسان کی تربیت کیلئے آئے تھے لیکن وہ اپنے

ساری دنیا کے خزانے بھی دو، تو عرب لوگ اکھٹے نہیں ہوتے تھے، لیکن اب انکو اکٹھا کیا ہے کس نے؟(سامعین: اللہ نے)"إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ"۔"یایھا النبی" اے میرے پیارے نبی "حسبك الله" تجھے اللہ کافی ہے، "ومن اتبعك من المومنين" اور جو مومنین تیرے ساتھ چل رہے ہیں وہ تجھے کافی ہیں، تو جو مومنین حضور کے ساتھ ساتھ چلے وہ کافی ہیں کہ نہیں؟ کیا حضور ﷺ کے مشن کو آگے لے جانے میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے جو کام کیا دنیا نے اس کی مثال دیکھی؟(سامعین: نہیں)تو عرض یہ ہے کہ حضرت حسینؓ جو تھے ان کی بات شروع کہاں سے ہوئی؟

حضرت معاویہ حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی نظر میں

ایک سوال ہے، اس کا جواب دیں، میں بات ختم کرتا ہوں ذرا توجہ فرمائیں، کہ حضرت حسین رہتے کہاں تھے؟(مدینہ میں)۔اور حکومت کس کی تھی؟حضرت معاویہ کی۔ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ جب مدینہ منورہ آئے، اور عراق میں یہ پہلے اپنے والد کی زندگی میں رہ چکے تھے، ان کی پرورش زیادہ عراق میں ہوئی، پھر جب حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ آگئے تو اسوقت حکومت کس کی تھی؟

اس وقت حکومت تھی امیر معاویہؓ کی، تو جب حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ آگئے تھے، اور دونوں نے حضرت معاویہؓ کی بیعت کر کے ان کی حکومت کو تسلیم کر لیا، اور ان کے وظائف اور اخراجات، سارے کے سارے امیر معاویہؓ انہیں پیش کرتے تھے،

زمانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔"(اتحاد و یک جہتی:15)

قران کریم غلبہ رسالت کی خبر دیتا ہے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا مژدہ سناتا ہے حضور ﷺ کے لائے ہوئے انقلاب کو فتح مبین قرار دیتا ہے اور آنحضرت ﷺ بھی اپنے صحابہ کے دور کو خیر القرون کہتے ہیں اور تابعین بھی پھر انہی کی راہ پر چلے ہیں تو پھر اس ساری کاوش کو کس طرح کہہ دیا جائے کہ جاہلیت کی چنگاریاں صرف دبی تھیں بجھی نہ تھیں اور خود صحابہ کے دور میں ہی جاہلیت کے سیلاب پھر سے امڈ آئے تھے اور مشن رسالت یکدم ناکام ہو کر رہ گیا تھا۔معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔(خلفائے راشدین، جلد:1،ص:451)

اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ بھائی سنو! جنہوں نے حضرت معاویہؓ کی حکومت کو تسلیم کیا، دونوں بھائیوں نے، جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی تھے نا؟(سامعین: جی ہاں) تو حضرت حسنؓ اور حسینؓ دونوں بھائیوں نے حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت کو تسلیم کیا۔

حضرت امیر معاویہ اور یزید میں فرق

حضرت معاویہ اور یزید میں یہ تاریخی فرق ہے کہ یزید کے عہد حکومت میں حضرت حسین نے اسے ناپسند کیا اور رات کی تنہائی میں عراق چل دیے۔

اب حضرت حسنؓ کا تو پہلے وصال ہو چکا تھا اور حضرت حسینؓ اکیلے رہ گئے تو حضرت حسینؓ نے یزید کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا۔ اب جو لوگ یزید کو اور حضرت معاویہ کو ایک کرتے ہیں کہ باپ بیٹا دونوں میں فرق نہیں تو کیا یہ انصاف ہے؟(نہیں)۔ تو فرق کیا ہے؟ کہ معاویہؓ کا وہ مقام ہے کہ حسنؓ و حسینؓ دونوں نے انہیں قبول کیا اور یزید کی حکومت کو حضرت حسینؓ نے قبول نہیں کیا بلکہ راتوں رات مدینہ سے چل دیئے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی اور امین رسالت ہیں:

اب انصاف یہ ہے کہ دونوں کا مقام اپنا اپنا تسلیم کیا جائے۔ یہ صرف اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، کہ وہ حضرت امیر معاویہؓ کو وہ پوری عظمت دیتے ہیں جو ایک صحابی رسول کی تھی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی اترتی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جن حضرات کو وحی لکھنے کا کہتے، ان کو کہتے ہیں کاتبین وحی، تو معاویہ کا یہ مقام ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین وحی میں سے تھے۔(1)

---

(1) جب اسلام آیا تو اس وقت مکہ میں چند افراد تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان چند افراد میں ایک شخصیت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بھی تھی۔ جب آپ فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کتابت وحی اور اپنے خطوط تحریر کرنے کے ان دو اہم امور پر فائز کیا جو بلاشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے بہت بڑے اعزاز اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان پر کامل اور مکمل اعتماد کا ثبوت پیش

کرتے ہیں۔ حضرت علامہ صاحب ایک استفسار کے جواب میں فرماتے ہیں:

"یہ صحیح نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے بعد مکہ ہی رہے تھے، مدینہ نہ آئے تھے۔ آپ کا مدینہ منورہ آنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہمہ وقت رہنا اور کاتبِ وحی کی یہ خدمات سر انجام دینا ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز۔" (عبقات، جلد اول:399)

محدثین کرام اور محققین اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی تھے اور یہ صرف اہل سنت حضرات ہی نہیں بلکہ اہل تشیع حضرات کی کتب سے بھی حضرت معاویہ کے کاتب وحی ہونے کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ یہاں ہم بطور نمونہ دو حوالہ جات پیش کیے دیتے ہیں:

شیعہ مؤرخ احمد بن ابی یعقوب عباسی (258ء) لکھتے ہیں:

وکان کتابه الذین یکتبون الوحی والکتب والعهود علی بن ابی طالب وعثمان بن عفان وخالد بن سعید ومعاویة بن ابی سفیان...الخ

(تاریخ یعقوبی، ج:2، ص:80)

شیعہ مؤرخ محمد بن علی طباطبا (709ء) لکھتے ہیں:

اسلم معاویة وکتب الوحی فی جملة من کتبه بین یدی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (کتاب الفخری:109)

لہٰذا ان شہادتوں کے بعد ان لوگوں کی اس غلط بیانی کی کوئی وقعت نہیں رہتی جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کاتب وحی نہ تھے۔

اور اس سے ان لوگوں کے اس غلط موقف کی بھی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صرف وصرف رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مکتوب نگار تھے یا صرف منشی تھے۔ نیز اس دوسرے طبقے کے لیے غور کرنے کا مقام ہے کہ ذرا سوچو! حضور خاتم النبیین وامام المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا منشی ہونا کیا کوئی کم اعزاز کی بات ہے!؟ اور بالفرض اگر آپ صرف مکتوب نگار ہی تھے تو کیا رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکتوب نگاری کرنا کیا کوئی کم اعزاز کی بات ہے!؟ یہ عمل بھی تو حضرت معاویہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل اعتماد ثابت کر رہا ہے۔ سو اہل سنت کا صحابہ کرام اور اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کے متعلق جو مسلک اعتدال ہے اسی میں خیر وعافیت مرکوز ہے۔

اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ کی کتاب "سیرت حضرت امیر

حضرت حسینؓ کا یزید سے اختلاف خاندانی نہیں تھا:

اب حضرت حسینؓ نے جو یزید کا انکار کیا، تو یزید کے ساتھ ان کا جو اختلاف ہوا، جو بھی ہوا وہ یہیں سے اٹھا، یا خاندانی تھا؟ (سامعین: یہیں سے اٹھا تھا)۔ اگر کہیں خاندانی تھا، تو تاریخ سوال کرے گی کہ حضرت حسنؓ نے اور حسینؓ نے معاویہ کو تسلیم کیوں کیا؟ اگر یہ خاندانی تھا تو انکو تسلیم کیا اور اس کو نہ کیا، معلوم ہوا:

- یزید اور ہے ہم اس کی عزت کرنے والے یا اسے ماننے والے نہیں ہیں۔
- اور اس کا باپ اور ہے اور اسے وہ مقام عزت حاصل ہے جو کاتبین وحی کو حاصل تھی۔

ان کے والد کا مقام حضور ﷺ کے صحابہ میں، حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے دوستوں میں اور کیا تھا؟ اور حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا انکے بارے میں کیا نظریہ تھا؟ وہ اسوقت نہیں، موقع ملا تو پھر میں ان شاء اللہ کسی اگلی مجلس میں یہ ذکر کروں گا۔

آپ حضرات یہ بتائیں کہ جو لوگ کہ یزید اور معاویہؓ کو ایک ہی لائن میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاذ اللہ یہ ایک شجرہ پہلے سے ہی مخالفت میں ہے، تو انہوں نے قرآن کے اس فیصلے کو کہ "وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ" کو، کیا قرآن کے اس فیصلے کو مانا کہ نہیں مانا؟ (سامعین: نہیں مانا)۔ اور آپ نے؟ (سامعین: مانا)۔ آپ نے مانا اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو کہا کہ آپ اگر ساری دنیا کے خزانے بھی خرچ کرتے تو عربوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے۔

ہم صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم دونوں کے غلام ہیں

ہم نے اپنے اقتباس میں دونوں کو جوڑا ہے، آپ کا اگر اسی پر ایمان ہو تو پھر آپ کو ماننا پڑے گا کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ برحق ہے۔ ہم صحابہ اور اہل بیت دونوں کے غلام ہیں، ہم دونوں کی عزت کرتے ہیں، دونوں کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں اور ہماری بڑی

معاویہ رضی اللہ عنہ"، مولانا محمد اقبال رنگونی صاحب کا رسالہ "تقاضاء ایمان در مناقب سیدنا معاویۃ بن ابی سفیان" اور مولانا محمد ظفر اقبال صاحب کی کتاب "سیدنا معاویہ گمراہ کن غلط فہمیوں کا ازالہ" کی مراجعت فرمائیں۔

کتابوں میں جیسے صحیح بخاری صحیح مسلم وغیرہ میں جہاں یہ باب باندھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے فضائل کیا ہیں، تو یہ باب بھی باندھے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حسنؓ کے فضائل کیا ہیں، بخاری شریف ہماری کتاب ہے، مسلم شریف ہماری کتاب ہے، ترمذی شریف ہماری کتاب ہے ان کتابوں میں اور دوسری حدیث کی کتابوں میں پورے باب باندھے ہیں۔ تو ہم جہاں حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو پورے دل کی گہرائیوں سے عقیدت کا سلام پیش کرتے ہیں تو ہم اہل بیتؓ کو، حضرت علی مرتضیٰؓ کو، حضرت حسنؓ کو حضرت حسینؓ کو بھی اسی طرح عقیدت کا سلام پیش کرتے ہیں۔

ہم آل محمد ﷺ کو ماننے والے ہیں۔ جو شخص آلِ محمد ﷺ کو ماننے والا نہیں وہ صفِ اسلام میں شمار نہیں ہوتا۔ (1) عملی زندگی میں اسلام کو اپنانے کے لئے حضرت ابو بکر و

---

(1) اہل سنت کے ہاں اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم کی عقیدت و محبت جزوایمان اور ضروریات مذہب میں سے ہے۔ حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

> صحیح العقائد مسلمانوں میں جس طرح صحابہ کرام کے ایمان اور خلفائے راشدین کی عظمت کا اعتقاد ضروریات مسلک میں سے ہے، اسی طرح جو اہل بیت کرام کی شان میں گستاخی کرے وہ بھی اہل سنت کے دائرہ حقہ میں شمار کے لائق نہیں رہتا۔
>
> (مقام اہل بیت کرام: 1، طبع 1998، ناشر: اسلامک اکیڈمی مانچسٹر)
>
> اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کے اہل بیت سے محبت ہونی چاہیے۔ سنی مسلمانوں کو چاہیے کہ حضور ﷺ کے ایک ایک رشتہ دار کے آگے عقیدت کی آنکھیں بچھائیں۔ (ایضاً: 25)

حضرت علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل بیت سے محبت جذبات کی حد تک ہو کیونکہ اہل بیت سے محبت آنحضرت ﷺ سے محبت کی ہی فرع ہے:

> آنحضرت ﷺ بھی نوع انسانی میں سے تھے اور آپ کے سینہ میں بھی اپنی اولاد کے لیے ایک انسان کا دل تھا۔ ہمارے احساسات آپ ﷺ کی اولاد کے بارے میں جو ہوں گے ان کا عکس قلب رسالت پر بھی پڑے گا۔ کاش آپ کبھی اس پہلو سے بھی اہل بیت کی محبت کا احساس کرتے اور اس نتیجہ پر پہنچتے کہ اہل بیت رسالت کی محبت حضور ﷺ کی محبت کا ہی ایک دلآویز

نقش ہے جو ہر مومن کے دل پر لگا ہونا چاہیے۔(اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم:2)

اہل بیت سے محبت و مودت دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی فرع ہے۔اس کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کل عترت لائق مودت اور موردِ ولایت ہے۔اہل سنت اسی عقیدہ پر ہیں۔جہاں سادات کرام ملیں یہ جھٹ انہیں آغوش محبت میں لے لیتے ہیں۔یہ ان میں تفریق نہیں کرتے۔شیعہ ان میں تفریق کرتے ہیں اور صرف اوصیاء کو لائق تمسک سمجھتے ہیں۔شیعہ حضرات کی یہ زیادتی ہے کہ وہ اپنے تصور وصیت کی اساس پر ہزاروں سادات کرام کے اہل بیت سے ہونے کا انکار کر دیتے ہیں۔(اہل بیت کرام:14)

اسی لیے جس طرح عقائد کی کتابوں میں صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ اہل بیت کا نام جڑا رہا ہے اسی طرح حضرات محدثین رحمۃ اللہ علیہم نے بھی جہاں جہاں حضرات صحابہ کرام حضرت ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے فضائل کے باب باندھے ہیں وہاں حضرت عائشہ، حضرت فاطمہ، حضرت علی و حسنین رضی اللہ عنہم کے فضائل کے باب بھی باندھے ہیں۔حضرت علامہ صاحب فرماتے ہیں:

حدیث کی کتابیں گلستان رسالت ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تئیس سالہ دور رسالت میں یہ باغ لگایا۔انہیں دیکھیں تو جگہ جگہ اہل بیت رسالت کے زمزمے سنائی دیتے ہیں۔کوئی کتاب انکے مناقب و فضائل سے خالی نہیں۔سانحہ کربلا کے بعد حضرت علی بن الحسین (امام زین العابدین) جب مدینہ آئے تو مسجد نبویؐ میں ان کے گرد تانتا بندھا ہوتا تھا۔ان کے گرد محدثین کے جھمگٹے لگتے۔اور علماء آگے بڑھ بڑھ کر ان سے احادیث لیتے تھے اور انہیں آگے روایت کرتے تھے۔واقعہ کربلا عام مسلمانوں اور اہل بیت رسالت میں اگر کوئی اصولی خط متارکہ قائم کرتا تو حضرت علی بن الحسین اس اعزاز و اکرام سے اہل سنت محدثین میں نہ بیٹھتے اور حدیث کی کتابوں میں آل ابی بکر، آل عمر اور آل علی کے اکٹھے چرچے نہ ہوتے۔الخ

(ایضاً:16)

سو اس سے پتہ چلا کہ اہل سنت کے خلاف اس پراپیگنڈا کی کوئی حقیقت نہیں کہ اہل سنت کے ہاں اہل بیت پر کوئی کام نہیں کیا گیا۔بلکہ حضرت علامہ صاحب کی مذکورہ بالا تحریر یہ واضح کرتی ہے کہ اہل سنت تو اس وقت سے صحابہ و اہل بیت کی عزت و عظمت کے جھنڈے سربلند کیے ہوئے ہیں جب ابھی اہل تشیع کے پہلے محدث ملا محمد بن یعقوب الکلینی کا دور دور تک نام تک بھی نہ تھا۔نیز پہلے دور کی خدمات تو اپنی جگہ مسلم رہیں قارئین یہاں برصغیر پاک و ہند کی اہل بیت پر اِس دور کی چند مشہور کتب کے نام

حضرت عمر کی غلامی کو تسلیم کرنا ہو گا، اور ان کے قدموں میں بیٹھنا ہو گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ۔ ع

اسلام ما اطاعت خلفائے راشدین

ایمان ما محبت الِ محمد است

اہل سنت کی عقائد کی کتابوں میں اہل بیت کی محبت لازم ٹھہرائی گئی ہے۔

وما علینا الا البلاغ



ملاحظہ فرمائیں: "اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم" از علامہ ڈاکٹر خالد محمود۔ "خوشبوئے نبوتؐ و اہلبیت رضی اللہ عنہم" از مولانا مہر محمد میانوالوی۔ "سیرت عائشہ رضی اللہ عنہا" از مولانا سید سلیمان ندوی۔ "بنات اربعہ" از مولانا محمد نافع۔ "حضرت سیدۃ فاطمہ رضی اللہ عنہا" از مولانا محمد اقبال رنگونی۔ "المرتضیٰ رضی اللہ عنہ" از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ "سیرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ" از مولانا محمد نافع۔ "سیرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ" از مولانا محمد اقبال رنگونی۔ "سیرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم" از مولانا عبدالشکور لکھنوی۔ "خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم" از علامہ ڈاکٹر خالد محمود۔ "سیرت حسنین شریفین رضی اللہ عنہما" از مولانا محمد نافع۔

یہ بطور نمونہ کے صرف ایک خطہ میں لکھی گئی چند کتب کے نام ذکر کیے گئے ہیں جن میں اہل بیت کی ایک ایک شخصیت کی حیات اور سیرت پر پوری پوری کتاب رقم کی گئی ہے۔ لہذا اہل علم و دانش کے ہاں ان لوگوں کے اس اعتراض میں کوئی جان نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اہل سنت نے اہل بیت کرام پر کوئی کام نہیں کیا۔

جہاں بھی جب کوئی فتنہ اٹھا ہے
انہیں کے شر سے وہ برپا ہوا ہے
مدینہ کوفہ و بغداد ہی کیا
اہم شاہد تو اس کا کربلا ہے
جہاں سبط نبی ابن علی کو
بلا کر قتل بھی خود ہی کیا ہے
کہ اب تک سینہ کوبی کر رہے ہیں
وہ خون ایسا ابھی تک سر چڑھا ہے
یہ تھا شیعان علی کا سب جور وفا
معتبر ان کتابوں میں جو ہے لکھا ہوا
دیکھ لو تم کوفہ کے وہ جملہ شیعان علی
قلب کے کوڑھی تھے وہ اور پر دغا تھے وہ سدا
چلتے سب خطرات پہ جن کے محبان حسین
روتے ہیں اور سینہ کوبی سے نہیں ٹلتے ذرا
کام ان کا ہے یہی آباء و اجداد سے
چل بسیں گے اس جہاں سے کرتے یہ آہ و بکاء

تیسری رات (مجلس 3)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ أَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ○ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ○ (پ:2، البقرۃ:156)

صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، کہ ہر چیز کو جب اس کی جڑ سے اور بنیاد سے سمجھا جائے تو بات سمجھنی بڑی آسان ہو جاتی ہے، واقعہ کربلا میں جہاں تک حضرت حسین کے مسئلے کا تعلق ہے کہ بات کرتے ہی، عنوان اختیار کرتے ہی مکمل بات سمجھ میں آجائے کہ اصل اختلاف کیا ہے؟

واقعہ کربلا میں مرکزی نکتہء اختلاف تاریخ کی روشنی میں

تو اختلاف یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ کی وفات کے بعد، جب یزید برسر اقتدار آیا، تو حضرت حسینؓ نے اس کے اقتدار کو دل سے ماننے سے ایک پیرائے میں انکار کر دیا، یہ جو پیرایہ انکار ہے جس میں انہوں نے انکار کیا، اس کی میں وضاحت ان شاء اللہ آگے کروں گا، لیکن بات تو اتنی ہے کہ یزید جب برسر حکومت آیا تو حضرت حسینؓ اس وقت اس کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ تو موضوع کیا بنا؟ تو موضوع جو سامنے آتا ہے وہ اسلام کا عہدہ خلافت ہے۔

خلافت پر اول دن سے اختلاف نہیں ہے

آپ حضرات کو ہمیشہ یہ بات ذہن میں تازہ رکھنی چاہیے کہ خلافت پر اول دن سے

کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ آج کی اس مجلس میں سوچیئے کہ اگر خلافت پر پہلے دن سے اختلاف ہوتا تو حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد فوراً ہوتا، جب حضورؐ کے جانشین حضرت ابو بکر صدیقؓ بنے۔ اور اگر اسی وقت خلافت نکتہء اختلاف ہوتی، تو اس وقت ہی خلافت پر کچھ لوگ اٹھتے، تو کیا کربلا پہلے دن ہی قائم نہ ہو جاتی!؟۔۔ اب جو اتنے سالوں کے بعد واقعہ کربلا پیش آیا، تو معلوم ہوا کہ پہلے دور کی خلافت حضرت حسینؓ کو، ان کے بھائی حضرت حسنؓ کو اوران کے والد حضرت علیؓ کو بالاتفاق منظور تھی۔ اور وہ ان پہلی تینوں خلافتوں کے ساتھ برابر تعاون کرتے رہے، اور ہر خلافت کو تسلیم کرتے رہے۔ اس لیے مسلمانوں کا شیرازہ ایک رہا، یہاں تک کہ حضرت امیر معاویہؓ کی جب وفات ہوئی تو اس کے بعد پھر یہ اختلاف اس صورت میں سامنے آیا۔

ذرا غور کریں اگر پہلی خلافتوں (حضرت ابو بکر وعمر عثمان کی خلافتوں) کے ساتھ بھی اختلاف ہوتا، تو پہلے دن ہی یہ حادثہ ظاہر ہو جاتا۔ مگر آپ اندازہ کریں اس وقت ایسا کوئی واقعہ سامنے نہ آیا؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ خلفائے راشدین کو حق پر سمجھتے تھے:

اب میں ایک تمثیل کے پیرائے میں پوچھتا ہوں، کہ بیان کیا جاتا ہے اور تاریخ میں ملتا ہے، کہ حضرت حسینؓ اور انکے اس قافلے کو جو مدینہ سے چل کر آیا تھا، ان پر پانی بھی بند کیا گیا۔ اور آپ نے یہ بات بھی سنی ہوگی کہ حسینؓ کا ننھا بیٹا، چھوٹا گودکا، علی اصغرؓ وہ بھی ظالموں کے تیر سے شہید ہوا۔ یہ آپ نے کئی دفعہ سنا ہے!

اب ذرا غور کریں، کہ جب میدان آخرت میں اللہ تعالی کے ہاں سب پیش ہونگے جس کا ہم سب نماز کے اول و آخر میں اقرار کرتے ہیں **مالك يوم الدين** اور **يوم يقوم الحساب**، ظالم اور مظلوم سب آئیں گے۔ جب حساب کی گھڑی قائم ہوگی تو وہاں اگر وہ بچہ علی اصغرؒ ہی حضرت حسین کے خلاف کھڑا ہو جائے، اور کہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافتوں کو قبول کر کے اپنی خلافت کی قربانی کی اور اپنے بچوں کو بچالیا اور وہ بچ گئے۔ مگر ہم نے کیا گناہ کیا تھا کہ ہمارے باپ نے ہمیں میدان کربلا میں تیروں

کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اگر یہ بات ہو تو حضرت حسینؓ کے پاس اس کا کیا جواب ہو گا؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قبول کیوں کیا

اگر اس کا مقدمہ یہی ہو، میں یہ "اگر" کے ساتھ کہہ رہا ہوں، تا کہ آپ حضرات اس پر غور کر سکیں، اگر وہ بچہ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عرض کرے، کہ اے پروردگار میرے والد نے میدان کربلا میں مجھے ہاتھ میں یا گود میں اٹھایا، اور مجھے تیروں کے سامنے کر دیا، تو میرا کیا قصور تھا کہ اگر خلیفہ یا حکمران غلط اور اسکو ماننا بھی اگر جائز تھا تو میرے باپ نے کیوں نہ مانا؟ اور اگر ناجائز تھا تو میرے دادا (علی) نے کیوں مانا؟ مسئلہ یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰؓ جو حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے والد تھے انہوں نے پہلی خلافتوں کو حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کو۔۔۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کو۔۔۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کو۔۔۔ قبول کیا کہ نہیں؟ (سامعین: قبول کیا)۔

حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کو قبول کرنا:

اور حضرت حسینؓ کے بڑے بھائی حضرت حسنؓ نے اور خود حضرت حسینؓ نے بھی حضرت معاویہؓ کی خلافت کو قبول کیا کہ نہیں؟ اگر انہوں نے ان کو قبول کیا اور یزید کو نہ کیا تو معلوم ہوا کہ پہلے خلفاء حق پر تھے، اس لئے حضرت علی المرتضیٰؓ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ نے انہیں قبول کیا۔ اور یزید اپنے باپ امیر معاویہؓ کی لائن پر نہیں تھا، اس لئے حضرت حسینؓ نے مدینہ منورہ میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا۔ تو آپ ذرا غور کریں کہ اہل سنت والجماعت جو کہتے ہیں کہ خلفائے راشدین بر حق ہیں، حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافت بر حق تھی، اپنے حق میں وہ جو دلیل پیش کرتے ہیں، کہ غلط حکمرانوں کے ہاتھوں میں ہاتھ نہیں دیا جا سکتا، علیؓ نے جو دیا تو ان کی خلافت حق تھی۔

حضرت حسنؓ نے دل سے حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کو قبول کیا تھا:

اس کے مقابلے میں کبھی یہ لوگ یہ کہہ دیتے ہیں، کہ جی "تقیہ"[1] کے طور سے

---

(1) انسان کبھی کبھی ایسے حالات سے دوچار ہو جاتا ہے جس میں اس کی جان یا اسکی اولاد کی جان جانے کا

شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اس حال میں اگر کوئی ایسی بات یا ایسا عمل اختیار کر لیا جائے جس کا تعلق صرف اسکی زبان کی حد تک ہو یا وہ عمل صرف ظاہر میں دکھائی دے تو اسلام میں اس کی گنجائش دی گئی ہے اور اس حالت کا نام اضطرار ہے۔ یعنی ایسی مجبوری کی حالت جس میں وہ اس عمل کو اپنا لے تو گو کہ وہ قول اور عمل فی نفسہ اپنی جگہ کفر اور حرام ہے عند اللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ ہاں اگر وہ قول اور عمل صرف زبان تک نہ رہے دل میں اتر آئے اور دل سے بھی وہ اس کو درست سمجھے تو یہ کفر ہو گا اور اس کا یہ عمل حرام ہو گا۔ مثلاً اضطراری حالت میں خنزیر کا گوشت اتنا کھالینا کہ جس سے اس کی جان بچ جائے یا شراب کے چند گھونٹ صرف اسلئے پی لینا کہ اس سے جان بچ جائے اسلام میں اس کی گنجائش ہے گو کہ خنزیر اور شراب کی حرمت اپنی جگہ باقی ہی رہے گی البتہ وہ اللہ کے ہاں اس گناہ سے اس لئے معاف کر دیا جائے گا کہ وہ حالت اضطرار میں تھا لیکن اگر وہ خنزیر اور شراب کو حلال سمجھ کر کھائے اور پئے گا تو وہ اسی وقت اسلام سے نکل جائے گا کیونکہ ان دونوں کی حرمت قرآن اور احادیث سے ثابت شدہ ہے۔

مزید ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص کافروں کے نرغے میں ہے اور اس کی جان کو شدید خطرہ لاحق ہے اوراس شرط پر اس کی جان چھوٹ سکتی ہے کہ وہ کوئی کفریہ اور شرکیہ جملہ بول دے تو ایسی حالت میں وہ اپنی اور اپنی اولاد کی جان کے بچاؤ کے لئے ایسا جملہ کہہ دیتا ہے تو اس پر عند اللہ گرفت نہیں ہو گی کیونکہ وہ اس وقت اضطراری حالت سے دوچار ہے۔ ہاں اگر وہ اس جملے کی دل سے بھی تصدیق کرے اور اس جملے پر اس کے دل میں کوئی ملال تک نہ ہو تو یہ کفر ہے اور ایسا آدمی کافر ہو جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھئے کہ حالت اضطرار میں جو قول و عمل اختیار کیا جاتا ہے اسے کسی نے بھی عبادت نہیں سمجھا اور نہ ہی اس کو افضل عمل کہا ہے یہ ایک وقتی ضرورت کے تحت تھا جو نہی وقتی ضرورت پوری ہوگئی اضطرار اور رخصت ختم ہوگئی ۔اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جب تک اضطراری حالت سے دوچار ہے اس وقت تک تو اس قول اور عمل کی گنجائش اور رخصت دی گئی ہے اور جیسے ہی حالت اضطرار سے نکل آئے اب یہ گنجاش اور رخصت ختم ہو جائے گی۔ اب اگر اس نے ایسی بات کہی تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔

پھر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ حالت اضطرار میں یہ گنجائش اور رخصت عام مسلمانوں کے لئے ہے انبیاء کرام کی ذوات مقدسہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ حضرات اہل عزیمت ہیں چونکہ ان کی ایک ایک بات اور عمل امت کے لئے حجت ہے اس لئے انہیں اس کی اجازت نہیں۔ یہ حضرات اپنے موقف پر عزیمت کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے خواہ اپنے موقف

پر استقامت کی وجہ سے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔انبیاء کرام کے سوا اللہ کے بہت سے ایسے بندے بھی ہوئے جن کے لئے رخصت پر عمل کرنے کی گنجائش بہرحال موجود تھی لیکن انہوں نے عزیمت کی راہ اختیار کی اور وہ صاحب عزیمت بن کر اپنی جان خدا کے حوالے کر گئے۔امت مسلمہ حضرت خبیب حضرت خباب حضرت حسین بن علی اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم کو دل کی گہرائیوں سے سلام عقیدت پیش کرتی ہے۔

اس کے بالمقابل شیعہ دوستوں نے ایک لفظ تقیہ وضع کیا ہے جس کا مطلب سچ اور حق کو چھپا کر جھوٹ اور باطل کا اظہار ہے۔اور یہ صرف گنجائش یا جواز کی حد تک ہی نہیں بلکہ واجب بھی ہے خواہ وہ حالت اضطراری ہو یا غیر اضطراری۔عام مسلمان ہو یا انبیاء کرام اور دوسرے صاحب عزیمت لوگ سب کے لئے کھلی گنجائش ہے کہ وہ جب چاہیں سچ کو دبا کر جھوٹ بولیں اور حق کو چھپا کر باطل کا پرچار کریں۔اور ان حضرات کے نزدیک ایسا کرنا افضل ترین اعمال میں سے ہے اور اس پر اجر وثواب بھی ملتا ہے ان کے نزدیک تقیہ دین کا ایک حصہ ہے اور جس نے تقیہ نہیں کیا اس کا دین ہی نہیں ہے بلکہ جو شخص اس بات کا منکر ہو ان کے نزدیک ایسا شخص کافر اور مرتد ہے۔یہ حضرات اپنے مذہب پر جو دلائل لاتے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان باتوں اور کاموں کا تقیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے یہ صرف ایک وقتی ضرورت کے تحت کہی یا کی گئی بات ہے جو ضرورت کے پورا ہوتے ہی ختم ہو گئی تھی۔

غور کیجئے کہ اگر انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بھی یہ بات سچ مان لی جائے کہ ان کے لئے تقیہ کرنا یعنی سچ کو جھوٹ اور حق کو باطل بنا کر دکھانا جائز بلکہ واجب اور افضل ہے تو کیا اس سے انبیاء کرام علیہم السلام کی باتوں اور کاموں میں شک پیدا نہیں ہو گا۔کیسے معلوم ہو گا کہ یہ بات حقیقت میں کہی جا رہی ہے یا تقیہ کرتے ہوئے بتلائی جا رہی ہے۔اسی طرح یہ لوگ ائمہ کرام کے متضاد دینی مسائل کو بھی تقیہ کی چھتری تلے رکھتے ہیں ایک مسئلہ امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا جاتا ہے وہ اپنے دور میں اس کا حکم بتلاتے ہیں پھر وہی سوال امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا جاتا ہے تو آپ اس کے خلاف مسئلہ بتلاتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ میرے والد تقیہ کرتے تھے میں نہیں کرتا۔کیا اس سے پورا دین مشکوک نہیں ہو جائے گا۔ شیعہ حضرات اگر ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچیں کہ ان کے اس عقیدہ تقیہ سے ائمہ اہل بیت بالخصوص حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی عزت کتنی مجروح ہوتی ہے تو وہ کبھی اس کو تسلیم نہ کریں۔غور کریں کہ جب حضرت علی مرتضی، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے عہد خلافت میں ان کے پیچھے پنج وقتہ نمازیں اور جمعہ وعیدین پڑھتے تھے تو وہ کیا وہ دل سے نہ پڑھتے تھے؟ جو

قبول کیا تھا، اندر سے نہیں، صرف اوپر سے کیا تھا۔ تقیہ کے طور پر غلط حکومتوں کو قبول کیا جاسکتا ہے، اس لئے حضرت علی المرتضیٰؓ نے ان کو قبول کیا۔۔۔ تقیہ کے طور پر یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ جی تقیہ کے طور پر قبول کیا تھا، تو پھر کیا سوال یہ نہیں اٹھتا کہ "حضرت حسینؓ نے تقیہ کیوں نہ کیا"؟؟۔۔اگر ایسے حکمرانوں کے سامنے تقیہ کر کے ان کی اطاعت کی جاسکتی ہے تو پھر حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کی؟ اور اگر نہیں کی جاسکتی تو حضرت علیؓ نے کیوں کی؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب بارہ سو سال سے یہ لوگ نہیں دے سکے، جو صحابہ کرامؓ پر اور خاص طور پر حضرت ابو بکرؓ و حضرت عمرؓ پر اعتراض کرتے ہیں، تو مسئلہ بالکل دو ٹوک ہے۔ آپ سے سادہ زبان میں پوچھا جائے ایک ہی مسئلہ، کہ اگر حکمران غلط ہوں، تو ان کو قبول کرنا جائز ہے کہ نہیں؟

اگر "جائز ہے" تو حضرت حسینؓ نے کیوں نہ کیا؟ اور اگر ناجائز ہے تو حضرت علیؓ نے کیوں کیا؟ بھائی میں آپ سے پوچھتا ہوں میرا سوال سمجھ آیا؟؟

لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ پڑھتے تو تھے مگر تقیہ کر کے پڑھتے تھے اور گھر آکر اپنی نمازیں اور جمعہ اور عیدین دوبارہ پڑھتے تھے تو ایمانداری سے بتلائیں کیا اس بیان سے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی ذات اور آپ کی ایمانی شان مجروح نہیں ہو گی۔ کیا کوئی مسلمان یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہے کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ دو چہرے والے شخص تھے؟ دکھانے کے لئے آپ ان کے پیچھے نمازیں تو پڑھ لیتے مگر آپ اس نماز کو نماز نہیں سمجھتے تھے۔ العیاذ باللہ۔

سچی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے عقیدے میں تقیہ جیسی دوطرفہ پالیسی کو وضع کیا اس سے ان کا مذہب تو مشکوک ہوا ہی ہے حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ اہل بیت کی حسین اور پاکیزہ زندگی کو بھی مجروح کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے۔ جو لوگ اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور ہوں اور یہ حالت اضطرار کی بھی نہ ہو بلکہ دائمی ہو اور کیا عوام اور کیا خواص حتی کہ انبیاء کرام جیسے صاحب عزیمت لوگوں کے لئے بھی اس کی گنجائش نکال کر ان پر بھی واجب کر دی جائے تو کوئی شخص یہ کیسے یقین کر سکتا ہے کہ ان حضرات کی کونسی بات حقیقت پر مبنی ہے اور کونسی تقیہ کے پردے میں کہی گئی ہے۔

قارئین اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے "تقیہ کی حقیقت" از امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ اور "تقیہ نہ کیجیے"، "تجلیات آفتاب جلد دوم" از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم کی مراجعت فرمائیں۔

تو اسی پر اگر میدان آخرت میں وہ ننھا علی اصغرؓ آکر اپنے والد کے متعلق یہ کہے کہ میرے والد نے میدان کربلا میں مجھ معصوم کو شہید کرا یا، تو کیوں انہوں نے غلط حکومت کو نہ مان لیا؟ اگر تقیہ کے طور پر غلط حکومت کو ماننا جائز ہوتا، تو میرے باپ نے کیوں نہیں مانا؟ اور اگر ناجائز تھا تو میرے دادا (حضرت علی المرتضی) نے ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافتوں کو اپنے دور میں اسوقت کیوں قبول کیا؟

میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں، کہ یہ سوال آپ کے ذہن میں آگیا کہ نہیں؟ آپ بتائیں کہ کیا اسکا کوئی جواب ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں ہر چھوٹے ذاکر سے لے کر بڑے سے بڑا آیت اللہ بھی خاموش نظر آئے گا۔

عقیدہ خلافت کے سب سے بڑے محسن

تو میں اہل سنت والجماعت کو کہا کرتا ہوں کہ آپ کے عقیدہ خلافت کے سب سے بڑے "محسن" تاریخ میں کون ہیں؟ (سامعین: حضرت حسینؓ)۔ حضرت حسینؓ نے اپنا خون دے کر، اپنی قربانی دے کر، یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ ہم وہ لوگ ہیں جو حق کی خاطر جانیں دینا جانتے ہیں، قربانی کرنا جانتے ہیں مگر باطل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہیں۔
شہادت کیا ہے؟

شہادت کیا ہے اک ورثہ محمدؐ کے صحابہ کا
نیا عنوان ہے یہ حق و باطل کے فسانے کا
شہید عشق ہی واقف ہے اسرار محبت سے
وگرنہ کس کو آتا ہے سلیقہ سر کٹانے کا

آپ حضرات کے سامنے یہ بات کہ حضرت حسینؓ۔۔۔۔ آیا مقابلے میں نکلے ہیں کہ نہیں؟ اللہ تعالی نے توفیق عطا فرمائی تو کل کی مجلس میں ان شاء اللہ اس کا بیان ہو گا۔ اس وقت آپ یہ جانیں۔

حضرت حسین اقتدار کی طلب میں شہید نہیں ہوئے

اس وقت میں اس بات کی طرف توجہ دلاؤں گا، کہ حالات کے پیش نظر موضوع

اختلاف کیا ہے؟ اقتدار و حکومت۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ حضرت حسین اسی لئے لڑے تھے، کہ وہ خود خلیفہ بننا چاہتے تھے، تو مان لو یہ بات غلط ہے۔۔ ان حضرات کا کردار کیا ہے، کہ حضرت حسنؓ نے تو اپنے ہاتھ میں جو حکومت تھی، جو حکومت انہوں نے اپنے والد کے بعد عراق میں وراثت میں پائی تھی اور اس کے بعد عراق کے لوگوں نے ان کی خلافت کو قبول کیا تھا تو حضرت حسنؓ نے اپنی بنی بنائی حکومت جتنی بھی تھی وہ حضرت معاویہ کو دے دی۔ تو اب کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ فاطمہؓ کے لعل جس طرح حسینؓ ہیں اسی طرح حضرت حسنؓ بھی تھے، تو حضرت حسنؓ نے آئی حکومت دے دی تو کیا حضرت حسینؓ کا کردار یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کی خاطر نکلے ہوں!؟ یہ بالکل غلط ہے۔۔ وہ اقتدار کے بھوکے نہ تھے، نہ اقتدار کی طلب میں آئے تھے، جن مؤرخین نے اس طرح ان کی تصویر کھینچی ہے، اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق وہ تصویر غلط ہے۔ حضرت فاطمہؓ کے بچے اس کردار کے تھے، کہ وہ بنیں حکومتیں دینا جانتے ہیں۔۔ لینے کے لئے وہ کبھی اٹھیں گے؟ اقتدار کے وہ کبھی بھوکے ہو سکتے ہیں؟ "ہرگز نہیں"۔

حضرت ابو بکرؓ جانشینی کے لیے کیسے چنے گئے اور کہاں چنے گئے

تاہم میں آپ کی اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں، کہ نبی پاک ﷺ کے بعد آپ کا جانشین کون ہوا؟ آپ ﷺ کا خلیفہ کون تھا؟ حضور ﷺ کا جانشین کون تھا؟[1] "کیا

(1) حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم نے اس مجلس میں اور اگلی مجلس میں خلافت اور جانشینی کے موضوع پر بحث کی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصراً خلافت کا مفہوم و مراد اور اس کی حیثیت بیان کر دی جائے۔

اہل سنت کے نزدیک خلافت سے مراد اور اسکی حیثیت

آنحضرت ﷺ کے وصال مبارک پر نبوت کا آسمانی عہدہ اختتام پذیر ہوا۔ جب نبوت کے خاتم آنحضرت ﷺ ٹھہرے تو پھر عصمت کے خاتم بھی آپؐ ہی قرار پائے اور وہ اس لیے کہ جب نبوت کا سلسلہ ہی ختم ہو چکا اور جب اب کوئی اور نبی پیدا ہی نہیں ہو گا تو پھر اب کوئی انسانوں میں انبیاء کی طرح معصوم عن الخطاء بھی نہ کہلائے گا کیونکہ "عصمت" نبوت کا خاصا ہے جو بنی نوع انسان میں صرف انبیاء

کرام علیہم السلام کے ساتھ ہی فرداً فرداً مخصوص ہے۔ اس لیے اہل سنت، نبوت کے بعد خلافت کو آسمانی عہدہ تصور نہیں کرتے بلکہ اسے ایک زمینی انتظامی عہدہ بتلاتے ہیں جس کے لیے امیر، خلیفہ یا حاکم کے انتخاب کا اختیار اہل حل و عقد (شوری) کے پاس ہوتا ہے۔ جس کا واضح ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے بعد کسی کو خلیفہ نامزد نہ کرنا ہے اور اسکے انتخاب کا معاملہ بعد والوں پر چھوڑ جانا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

ہر مسئلے کا ایک موضوع ہے اور ایک اسکی غایت ہوتی ہے۔

① توحید کا موضوع اللہ کی ذات سے ہے اور اسکی غایت ایک کی عبادت سے ہے۔

② رسالت کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور اسکی غایت حکم الٰہی کا بندوں تک پہنچانا ہے۔

③ خلافت کا موضوع ولایت ارضی (زمین کی حاکمیت) ہے اور اسکی غایت ولایت ارضی کا انتظام ہے۔

④ قیامت کا موضوع دنیا کا اختتام ہے اور اس کی غایت یہاں رہتے وہاں کی زندگی کو سنوارنا ہے۔

ہمارا آج کا موضوع خلافت ہے۔ باعتبار غایت یہ کوئی آسمانی عہدہ نہیں ایک انتظامی منصب ہے۔ ولایت ارضی کی یہ ایک عملی ذمہ داری ہے جس کی غایت زمین پر امن کا قیام، عوام کا حسن انتظام، سرحدوں کا استحکام، قرآن و سنت کی نشر و اشاعت اور مظلوموں کی نصرت و حمایت ہے۔

شیعوں کے ہاں امامت ایک آسمانی عہدہ ہے جس طرح نبوت اور رسالت آسمانی عہدے ہیں ان کے ہاں امام بھی خدا مقرر کرتا ہے اور نبیوں کی طرح امام بھی مفترض الطاعۃ ہوتے ہیں۔

یہاں ایک دلچسپ سوال سامنے آتا ہے کہ رسول تو اس لیے معصوم ہیں کہ اللہ تعالی کی بات آگے پہنچانے میں ان سے کوئی غلطی نہ ہو پائے اور عملاً وہ قوم کو اپنی اتباع کی دعوت دے سکیں۔ لیکن جب حکم الٰہی معلوم ہو چکا اور رسول اس کا پتہ دے چکا اور اب صرف اس کا انتظام اور نفاذ ہے تو اس کے لئے آسمانی عہدے کی کیا ضرورت ہے؟ آسمانی عہدہ (رسالت) تو محض اس لئے تھا کہ اللہ تعالی کی مرضیات اور اسکی نامرضیات پر اطلاع ہو سکے۔ جب یہ باب علم تمام

ہو لیا تو اب صرف انتظام ہی انتظام ہے اور اس کی اساس شوریٰ پر ہے۔ پیغمبر بھی انتظامی امور میں ساتھیوں سے مشورہ کرتے رہے سو خلیفہ کو بھی جب کوئی امر مہم پیش آئے تو اس کی راہ یہی ہے کہ وہ شوریٰ سے پوچھے نہ کہ خدا سے۔ خدا کے بتلانے کے دن (وحی الٰہی) پورے ہو چکے اور وہ الیوم اکملت لکم دینکم کی بشارت دے چکا ہے. اب اس کے بعد کوئی نیا دینی اصول قائم نہ ہو گا۔ امت کتاب و سنت کی اسی لائن پر چلے گی جو حضور ختمی مرتبت ﷺ خود طے فرما چکے ہیں۔ اب کوئی اور نیا باب علم نہ کھلے گا۔ سو خلافت محض ایک انتظامی امر ہے نہ کہ کوئی آسمانی عہدہ۔ جس پر فرشتے اتریں اور اس پر حلال و حرام جاننے کا مدار ہو۔ اس کا ماننا فرض ہو اور اس کا انکار کفر ٹھہرے۔ (مقالہ: اسلام اور خلافت۔ ماہنامہ الہلال مانچسٹر نومبر 1995)

سو معلوم ہوا کہ حضور خاتم النبیین ﷺ پر آسمانی عہدہ ختم ہو چکا اس لیے اہل سنت کے ہاں نبوت کے بعد خلافت ہے جو ایک انتظامی امر ہے نہ کہ کوئی آسمانی عہدہ۔ اب یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ جو نبوت کے بعد خلافت کا کہا جا رہا ہے، تو اس خلافت کا کہیں سے کوئی ثبوت بھی ہے کہ نہیں؟ تو اس سوال کا جواب اثبات میں ہے کہ اللہ رب العزت قرآن کریم میں مسلمانوں کو خلافت دینے کا وعدہ فرماتے ہیں:

"قرآن کریم میں جس طرح آنحضرت ﷺ کو فتح مکہ کی خبر دی گئی اسی طرح مسلمانوں کو یہ وعدہ دیا گیا تھا کہ آپ کے بعد آپ کا یہ مشن تسلسل سے جاری رہے گا۔ گھبرائیں نہیں۔ مسلمانوں کا خوف امن سے بدل جائے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ۚ وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (پ:18، النور:55)

ترجمہ: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اور نیک اعمال کئے ہیں اللہ تعالی فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسے ان سے پہلے کے نیک لوگوں کو بھی خلافت دی تھی اور جس دین کو اللہ تعالی نے ان کے لئے پسند کیا اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد انہیں امن دے گا وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جو شخص (اس وعدے کی) ناشکری کرے گا وہ سب لوگ فاسق ہوں گے۔

آپ نے کسی کو اپنا سیاسی جانشین بنایا؟ جواب یہ ہے کہ آپ نے اقتدار میں اپنا جانشین نہیں بنایا" حضور اکرم ﷺ نے اپنا سیاسی جانشین یا مدینہ کا حکمران کسی کو نامزد نہیں کیا سو یہ بات پکی یاد رکھیں!

لیکن پھر آپ نے کیا کیا؟ جو تعلق بندے کا خدا کے ساتھ ہونا چاہیے، جو رشتہ خدا کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اس میں تو حضور ﷺ نے اپنا جانشین مقرر کیا اور وہ کیا ہے؟ "امامت صغری" حضور ﷺ مسجد میں نماز پڑھاتے تھے آپ امام تھے، جب حضور اکرم ﷺ پر بیماری کا دور آیا تو علم الہی میں تھا، کہ اب حضور کو سفر آخرت پیش آئے گا تو نبی پاک ﷺ نے اپنے قائم مقام اپنی مسجد میں کس کو امام مقرر کیا؟ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو۔

حضور ﷺ کا خود ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امامت نماز کا حکم نہ دینے میں کیا حکمت تھی؟

اور حضورؐ نے حضرت ابو بکر کو مقرر بھی خود نہیں کیا، بلکہ صحابہ کو کہا:

مُرُوْا اَبَابَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ (ابو داود، ج:۲ ص:۵۸۲)

"مُرُوْا اَبَابَكْرٍ" کہ تم مل کر کہو ابو بکر کو کہ وہ نماز پڑھائے، تم مل کر کہو۔۔ خود کیوں نہیں کہہ دیا؟ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود کیوں نہیں کہہ دیا، کہ تم نماز پڑھاؤ؟ تو خود نہیں کہا بلکہ اہل بیت و صحابہ کرام کو کہا کہ ابو بکر سے کہیں کہ وہ نماز کی امامت کروائیں۔ اب اس میں دو حکمتیں تھیں۔ ایک تو یہ بات بتلانی تھی کہ میں ابو بکرؓ کی امامت سے راضی اور خوش ہوں، اس کی سیرت و کردار سے خوش ہوں، میں اس کے ایمان اور اعمال صالحہ سے خوش ہوں، اس کی رفاقت سے خوش ہوں۔

حضور ﷺ کے سامنے یہ بات تھی کہ جب میرے ساتھ کوئی نہ تھا، جب ہم مکہ سے رات کو نکلے تھے اور جب غار میں میرے ساتھ کوئی نہیں تھا، تو یہ (ابو بکر) ہے جو اس وقت

اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی حضور ﷺ کے وقت کے مسلمانوں سے وعدہ فرمائیں کہ تمہیں زمین پر خلافت دوں گا اور تمہارے خوف کو امن سے بدلوں گا۔ اور شیعہ کا عقیدہ یہ ہو کہ مسلمانوں کو خلافت نہیں ملی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یوں ہی حکومت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور خوف امن سے نہ بدلا تھا۔(استغفر اللہ العظیم)(مقالہ: ایضاً)

میرے ساتھ تھا۔ لہذا یہ سب حضور ﷺ کو پتہ تھا اس لیے حضور نے اپنی یہ رائے بتادی، اور کہا کہ ابو بکر کو کہو نماز پڑھائے، لیکن آپ نے یہ خود حضرت ابو بکر کو نہیں کہا۔ ایسا کیوں؟ اس میں آپ نے اشارہ دیا کہ کل کا فیصلہ (خلافت کا) بھی تمہیں خود کرنا ہے۔

خلیفہ اول کا انتخاب شوریٰ سے

حضور ﷺ نے "اشارہ دے دیا کہ کل کا فیصلہ تم کو خود کرنا ہے"۔ سو یاد رکھیں! مسلمانوں کا نظام قائم ہوتا ہے شوری سے۔[1] اللہ تعالی نے قران کریم میں فرمایا:

(1) اس پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ایک مفید تحریر یہاں ہدیہ قارئین کی جاتی ہے:

"زمانہ قدیم میں نسلی موروثی حکومت اور نسل در نسل ایک خاندان کی روحانی و دینی پیشوائی کا رواج تھا اور جس وقت کہ اسلام آیا اور اس کا عروج شروع ہوا اس وقت دنیا ان دو موروثی و خاندانی سلطنتوں (دنیاوی و دینی) کے بوجھ سے دبی کچلی چلی آرہی تھی، ایک دنیوی و انتظامی حکومت تھی جو مطلق العنان بادشاہوں کی ملکیت تھی اور باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی یا خاندانوں کے کسی فرد سے اس کی وصیت کے بموجب دوسرے فرد کو، یا کسی قسمت آزما فرد کو اپنے زور بازو اور حسن تدبیر سے مل جاتی بلا کسی صلاحیت و استحقاق کے اور بلا اس لحاظ کے کہ ملک اور قوم کے لیے ساز گار ہے یا نہیں، ملک کی تمام آمدنیاں ان بادشاہوں کی ملکیت ہوا کرتی تھیں، مال کے خزانے بھرنے، اعلیٰ ترین اور گرانقدر اشیاء اور تحائف کو اکٹھا کرنے اور عیش و آرام کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے اور زندگی کو باغ و بہار بنانے اور مال و عظمت کے مظاہر میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش میں لوگ افسانوی اور ناقابل یقین حد تک پہنچ گئے تھے، (ملاحظہ ہو "السیرۃ النبویہ" از مؤلف، ص:36-35) سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے تاریخ قدیم کا مطالعہ کیا ہے، دوسروں کے لئے اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، یہ شاہانِ وقت موروثی طور پر حکومت کے مالک ہوتے اور اپنے کو بنی نوع انسان سے بلند کوئی نوع تصور کرتے، عوام یہ سمجھتے کہ ان کی رگوں میں مقدس اور الٰہی خون ہے۔

دوسری طرف عوام انتہائی ناداری تنگ حالی، مشقت، بے کاری اور مایوسی اور گریہ وزاری کی زندگی گزار رہے تھے، جن کے قصے آج بھی دل کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور آنکھیں

آنسو بہاتی ہیں، یہ مفلوک الحال عوام پیٹ کی آگ بجھانے اور ستر چھپانے کے لیے سخت ترین مشقتیں برداشت کرتے تھے نت نئے ٹیکس اور خراج کے بوجھ تلے سسک رہے تھے، آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے چکی کے دو پاٹ میں پس رہے تھے، ان کی زندگی جانوروں سے ممتاز نہیں تھی۔(تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" از مؤلف۔ فصل: عصر جاہلی میں سیاسی و مالی نظام)

دوسری سلطنت روحانی اور دینی قیادت کی شکل میں تھی، یہ دینی سربراہی کا خاص نظام تھا جس میں سیادت ایک خاص خاندان اور خاندان کی معین شاخ کو حاصل ہوتی، دینی رہنمائی اس کی جاگیر ہوتی اور اس کا وہ احترام کیا جاتا جو تقدیس کی حد تک پہنچ جاتا، یہ دینی تقدس نسل در نسل باپ سے بیٹے کو اور ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا اور یہ "جاگیر دار" بھی اپنے اقتصادی منافع اور اپنی نفسانی اور شہوانی خواہشات کو پورا کرنے کی دھن میں لگا رہتا یہ "خالق و مخلوق" "بندے اور خدا" کے درمیان واسطہ بنا ہوا تھا، اکثر حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیتا، اور آزادی کے ساتھ مذہبی قوانین بناتا اور ان کو نافذ کرتا، اللہ تبارک وتعالی نے قرآن مجید میں اس صورتحال کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے زیادہ باریک بینی کے ساتھ کوئی بیان نہیں کر سکتا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورۃ توبہ:34)

مومنو!(اہل کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور (ان کو) راہ خدا سے روکتے ہیں۔

عیسائیوں میں اس طبقہ کو "اکلیروس[اکلیروس کے معنی (یونانی میں) حصہ یا ورثہ کے ہیں] (Clergy) کہا جاتا تھا، لبنانی عیسائی دانشور و محقق بطرس البستانی اس لفظ کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اس نام کا اطلاق عیسائیوں کے نزدیک دنیا کی خدمت گاروں پر ہوتا ہے ان کا یہ لقب اس مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ خدائی حصہ ہیں یا اس کی میراث جس طرح حضرت موسی کی وحی میں سبط لاوی کو میراث رب کہا گیا ہے، قدیم مصری قوم اور عبرانیوں کے نزدیک ایک طبقہ عبادت ادا کرنے کے لئے مقرر تھا، مسیحی کلیسا میں ابتدا ہی سے کچھ نگراں ہوتے تھے جو اس کی پالیسیاں بناتے اگر کلیسا کو کچھ فراغت اور خوشحالی حاصل ہوتی تو ان پادریوں کی بن آتی،

یہ لوگ محض دینی خدمت گار اور روحانی مربی ہی نہیں تھے بلکہ اس وقت تمام علم و دانش کے محور بھی سمجھے جاتے تھے، رومی شہنشاہیت کے زمانہ میں یہ پادری عوام ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتے تھے اور ان سے کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ عوامی بہبود کا کوئی کام کریں ان کو بھی ایک طرح کی حکومت حاصل تھی اپنے دائرہ کے اندر بھی اور دائرہ کے باہر عوام پر بھی۔"

(دائرۃ المعارف للبستانی۔ ج:4، ص:146 طبع بیروت 1876ء)

یہی قدیم ایران (فارس) کا حال تھا دینی سیادت کی نمائندگی کوئی خاص قبیلہ کرتا تھا گزشتہ زمانوں میں "میدیا" قبیلے کو یہ سیادت ملی ہوئی تھی اور زردشت کے پیروکاروں کے زمانہ میں قبیلہ "المغان" کو یہ روحانی نفوذ حاصل تھا۔

روحانی قبیلہ کے لوگ زمین پر سایہ خداوندی سمجھے جاتے جو خدائی حکومت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور ایسا حاکم صرف اسی قبیلہ میں پیدا ہو سکتا تھا اور وہ ذات خداوندی میں مدغم سمجھا جاتا اور آتش خانے کی حفاظت اور رکھوالی اس گھرانہ کی میراث ہوتی۔ (ملاحظہ ہو کتاب "ایران بعہد ساسانیان" از آرتھر کرسٹن سین۔)

ہندوستان میں برہمنوں کی نوعیت اس طرح کی تھی مذہب اور تقدس کے یہ جاگیر دار تھے اور ہندی قانون کے بموجب انہیں ایک اعلیٰ مرکز اور بلند مرتبہ حاصل ہوتا جس میں ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا تھا، برہمن کے متعلق یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ بخشا بخشایا ہوا ہے خواہ وہ اپنے گناہوں سے تینوں عالم کو تباہ کر ڈالے، محاصل سے وہ مستثنیٰ تھے اگر وہ کسی کو قتل کرتے تو کسی حال میں بھی ان سے بدلہ نہ لیا جاتا دینی رسوم و عبادات کی ادائیگی ان ہی کے ذریعہ ممکن تھی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "السیرۃ النبویۃ" ص:38 بحوالہ "منوشاستر"۔)

اسلام نے موروثی جاگیر داری کے ان دونوں طریقوں کا خاتمہ کر دیا جنہوں نے انسانیت پر ظلم کے ایسے پہاڑ توڑے جن کے نمونے اور مثالیں روم، ایران اور ہندوستان کی تاریخوں میں دیکھی جا سکتی ہیں (ملاحظہ ہو کتاب "ایران بعہد ساسانیان" از آرتھر کرسٹن سین)، اسلام نے خلیفہ کے منتخب کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں اور اہل سنت اور اہل شوریٰ اور اہل علم و اخلاص کے سپرد کر دی اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد اپنے جانشین کے بارے میں نہیں بتایا کہ کون مسلمانوں کا خلیفہ اور سربراہ ہوگا، اگر ایسا کرنا دینی فرائض میں داخل ہوتا اور اس کو صراحت کے ساتھ بتا دینا ضروری ہوتا تو آپ ﷺ نے اس حکم کی تنفیذ ضرور فرماتے کیونکہ

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (پ:25، شوریٰ:38)[1]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآ اَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (سورۃ المائدہ:67)

اے پیغمبرؐ! جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقۡدُوۡرًا ۔ اۨلَّذِيۡنَ يُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخۡشَوۡنَهٗ وَلَا يَخۡشَوۡنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا

(سورۃ الاحزاب:39-38)

اور جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے اور خدا کا حکم ٹھیر چکا ہے اور جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور خدا ہی حساب کرنے کو کافی ہے۔ (المرتضی کرم اللہ وجہہ:119-114)

(1) استاذنا المکرم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب اطال اللہ حیاتہ اس موضوع پر ایک جگہ نہایت عمدہ تحریر فرماتے ہیں:

"عرب جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے پہلے کبھی کسی کی قیادت قبول نہ کی تھی اور نہ اسلام سے پہلے وہاں کوئی باقاعدہ نظام حکومت تھا، کسی ایسے نظام حکومت کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے جو نسلی امتیازات پر مبنی ہو بلکہ وہ فطرتاً جمہوریت پسند تھے اور جمہوریت پسند رہے تھے، ہر قبیلے کا اپنا اپنا سردار ہوتا تھا اور اسے کسی قسم کی نسلی مرکزیت کے ماتحت نہ سمجھا جاتا تھا، جب وہ لوگ دولت اسلام سے بہرہ مند ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے ایک باقاعدہ نظام حکومت کے قیام کے باوجود عربوں کی اس فطری جمہوریت پسندی کو قائم رکھا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو (باوجودیکہ آپ نبی تھے مگر آئندہ کے لئے ایک اصول قائم کر دینے کے پیش نظر) خالص دنیوی معاملات میں شوری قائم کرنے کا حکم دیا، قرآن کہتا ہے:

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (پ:25، شوریٰ:38)

ترجمہ: آپ معاملات حکومت میں اپنے صحابہ سے مشورہ لیتے رہیں۔

آپ کے بعد دین مکمل اور شریعت محفوظ تھی اس لئے کسی قسم کے آسمانی منصب کی

ترجمہ: اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

کہ مسلمانوں کا نظام حکومت باہمی شوری سے قائم ہوتا ہے، اس لیے تم (صحابہ کرام و اہل بیت عظام) ابو بکر کو کہو کہ وہ نماز پڑھائے۔ سو اس میں اشارہ کیا تھا؟ کہ کل وقت آرہا ہے، اور تمہیں فیصلہ کرنا ہے، کہ کس کو آگے کریں؟ تو میں نے اپنی پسند بتا دی ہے، آگے کہنا تمہارا کام ہے۔

نبی کریم ﷺ کا خود نہ کہنے کی ایک اور وجہ کیا تھی؟ وہ یہ کہ جو حکمران ہوتا ہے، اس سے کہیں اختلاف بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ جو بھی حکمران ہو اس سے کسی مسئلہ میں، کسی رائے میں اختلاف بھی تو ہو سکتا ہے یا نہیں؟

قوموں کے کئی معرکے ہوتے ہیں، دوسرے ممالک کے ساتھ کئی روابط ہوتے ہیں، کبھی جنگیں پیش آتی ہیں، کہیں صلح کرنی ہوتی ہے، کہیں لڑائی کرنا ہوتی ہے، تو حکمرانوں کو کئی معاملات پیش آتے ہیں اور اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اب جس کو حضور ﷺ مقرر کر دیں کہ میں اس کو تمہارا حکمران مقرر کرتا ہوں تو کیا اس کے سامنے کوئی بول سکے گا؟ کیا خیال ہے؟ سب لوگوں کو پتہ ہو گا کہ اسے تو "حضور ﷺ نے بنایا ہے" اور اگر کوئی اس پر اعتراض بھی کرے تو وہ بھی جواب میں کہہ سکتا ہے کہ مجھے تو حضور ﷺ نے مقرر کیا ہے، تم کون ہوتے ہو انگلی اٹھانے والے؟ تو چونکہ رعایا کا یہ حق ہے، کہ سلطنت کے معاملات میں جو سمجھ آئے اس کے مطابق سوال اٹھائیں بھی اور جواب پائیں بھی، لہذا اگر خلیفہ حضور ﷺ کا نامزد کردہ ہو تو اس کے ساتھ سوال و جواب نہیں ہو سکتے، لیکن حضور کے ہاں نکتہ یہ تھا کہ میرے جو جانشین بنیں ان پر سوال بھی ہوں، اور وہ جواب دینے کے

ضرورت باقی نہ رہی تھی، پس آپ کے بعد امیر کا انتخاب بھی شوری پر مبنی قرار پایا، سلسلہ نبوت کے ختم ہو جانے کے باعث یہ منصب ایک خالص "ارضی منصب" رہ گیا تھا، امیر کی ضرورت صرف اسی لئے تھی کہ وہ سلطنت اسلامیہ کا انتظام کرے اس کی امارت میں سرحدیں محفوظ رہیں، عدالتیں قائم ہوں اور کمزور زبردست سے اپنا حق لے سکے، اللہ کی حدیں قائم کی جائیں اور بدمعاشوں کا کھٹکا نہ رہے، یہ نہیں کہ امرا کو امارت کا ربانی حق حاصل ہو۔

(خلفائے راشدین، ج:1، ص:410)

ذمہ دار بھی ہوں۔(1)

وقت کے حکمران سے رعایا کو سوال کرنے کا حق

(1) اس پر حضرت امام اہل سنت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ کی ایک اصولی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

"اہل سنت کہتے ہیں کہ معصوم ہونا، خاصۂ انبیاء ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو آپ کا مثل اور معصوم و مفترض الطاعۃ ماننا شرک فی النبوت اور ختم نبوت کا انکار ہے۔ امام معصوم مفترض الطاعۃ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کے بعد کوئی معصوم، مفترض الطاعۃ نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے، البتہ امام بمعنی مطلق پیشوا اس امت میں بہت ہوئے اور ہیں اور ہونگے جو نہ بارہ میں منحصر، نہ بارہ کروڑ میں، ان کا شمار سوا خدا کے کوئی نہیں جان سکتا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کوئی معمولی تعلیم نہ تھی اس تعلیم نے بے تعداد انسانوں کو کامل و مکمل بنا دیا ہزاروں اس تعلیم کی بدولت منصب پیشوائی ورہنمائی پر فائز ہوئے اور ہوں گے۔

جس طرح نماز جماعت میں چاہے کتنی بڑی جماعت ہو امام ایک ہوتا ہے اور اگر صفیں مقتدیوں کی زیادہ ہوں تو ہر ہر صف میں دو ایک مکبر مقرر کر دیئے جاتے ہیں کہ وہ تکبیر کہہ کر امام کے رکوع و سجود کی اطلاع پچھلی صفوں کو دیا کرتے ہیں بالکل یہی معاملہ یہاں بھی ہے جس طرح تمام جماعت کا امام حقیقتاً ایک ہے صف اول سے لیکر صف آخر تک ہر مقتدی نے اسی کے پیچھے نماز پڑھنے کی نیت ہے اسی کو اپنا امام بنایا ہے اسی طرح امت محمدیہ کے امام مفترض الطاعۃ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر قیامت تک ہر مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر ایمان لاتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اپنا پیشوائے حقیقی مانتا ہے اور جس طرح جماعت نماز میں ان مکبروں کو بھی اس معنی میں امام کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی صفیں انہیں کی تکبیر کی تابع ہیں مگر وہ حقیقتاً امام نہیں کیونکہ وہ امام کے حالات کی نقل کرنے والے ہیں اپنی اطاعت کا حکم نہیں دیتے، اکابرین دین علمائے شرع متین اور خلفاء کو امام کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں مگر وہ حقیقتاً امام نہیں کیونکہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے نقل کرنے والے ہیں، نہ اپنے احکام کے۔ (تفسیر آیات خلافت و امامت: 24۔ ایڈیشن، دسمبر 2014 لکھنؤ)

نیز اس اصول کی عملی تائید حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس خطبہ سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ارشاد فرمایا تھا، جس میں آپ نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا کہ جب تک میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا رہوں تم میری اطاعت کرتے رہنا اور جب میں ان کی نافرمانی کروں تو تم میری اطاعت نہ کرنا۔

جیسے ایک مشہور واقعہ آپ نے بارہا سنا ہو گا، کہ حضرت عمر نے ایک دفعہ ایک لمبی قمیص پہنی تھی، جو دو چادروں سے بنی تھی، اور ہر ایک کو مال غنیمت سے ایک ایک چادر ملی تھی، تو ایک شخص اٹھ کر کہتا ہے کہ "آپ کی جو لمبی قمیص ہے دو چادروں سے بنی ہے، تو جب ہر ایک کو ایک ایک چادر ملی تو آپ کو دو چادریں کیسے مل گئیں؟" حضرت عمرؓ نے یہ نہیں کہا، کہ تم کون ہو سوال کرنے والے؟ آپ نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے اپنے بیٹے کو اشارہ کیا، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کہا! کہ جو "میری چادر تھی میں نے اپنے باپ کو دے دی تھی"۔ اب حضرت عمرؓ نے جو جواب دیا یہ بتاتا ہے، کہ سوال کرنا جائز تھا درست تھا، اور یہ حضور ﷺ کی اس وقت بصیرت تھی، کہ آپ نے حکمرانوں کو خود مقرر نہیں کیا، اور انکو قوم کے سپرد کیا، کہ تم کرو اور میں اپنی پسند بتا دیتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کے بارے میں اتنا بتا گئے کہ "اگر میرے بعد کوئی پیغمبر ہوتے تو عمر ہوتے[1]" معلوم ہوا حضور ﷺ کی نظر رضا اور نظر پسند ان پر تھی، ابو بکرؓ کے بارے میں بھی اپنی رائے دے چکے تھے اب آں حضرت ﷺ نے کہا کہ "تم ابو بکر کو کہو کہ نماز پڑھائے" تو ابو بکر صدیقؓ آپ کے ایام علالت میں نماز پڑھاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے تھے

---

(1) قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَوْ كَانَ نَبِيٌّ بَعْدِي لَكَانَ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ (جامع ترمذی: 563)

حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم اس حدیث مبارکہ پر ارشاد فرماتے ہیں:

"اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ولایت الٰہی کے جملہ مراتب وہ صغریٰ ہوں یا کبریٰ طے کر چکے ہوئے تھے اور آگے نبوت پر اس لیے نہ گئے کہ ان کے عرفان میں کچھ کمی تھی بلکہ اس لیے کہ آگے دروازہ ہی لگا ہوا تھا۔ دوسرا کوئی شخص اس مقام کے لائق تھا تو آپ ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم تھے اگر آپ کے بعد نبوت کسی کو ملنی ہوتی تو آپ کے بیٹے ضرور اس عمر کو پہنچتے جس میں نبیوں کو یہ ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ آپ بچپن میں ہی فوت ہو گئے اور اس جہت سے آپ کا زندہ رہنا ممکنات میں سے نہ تھا کوئی غیر تشریعی منصب نبوت بھی باقی ہوتا تو آپ زندہ رہتے اور اسے پا لیتے، نبوت کا دروازہ ہر پہلو سے بند تھا۔"

(خلفائے راشدین، جلد اول، صفحہ: 332)

کہ ایک وقت آئے گا کہ تقیہ کے پرستار جن کا تقیہ پر اعتقاد ہے وہ یہ اعتراض کریں گے کہ جی حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تو بیمار تھے، لہذا ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اپنے والد کو مصلی امامت پر کھڑا کر دیا، اور وہاں دوسرے لوگوں کی کوئی چلی نہیں کیونکہ ام المؤمنینؓ کے سامنے کوئی بول نہیں سکتا تھا۔

مرض الوفات میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مسجد میں آنا

تو اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے، ایک دن حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر افاقہ وارد کیا کہ بیماری تقریباً ختم ہو گئی، افاقہ ہو گیا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے اندر قوت محسوس کی اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارادہ ظاہر کیا کہ آج میں بھی مسجد میں جاؤں۔ حضرت عباسؓ کو اور حضرت علیؓ کو ساتھ لیا اور انہوں نے دونوں بازوں کو سنبھالا، اور حضور کو بڑی محبت اور احتیاط سے اور عزت اور اعزاز کے ساتھ مسجد میں لائے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کو دیکھ لیا، کہ وہ نماز پڑھا رہے ہیں۔[1]

صدیق اکبر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کا نماز میں حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خوشبو پا جانا

حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خوشبو آجایا کرتی تھی۔ آپؓ نے خوشبو سے محسوس کیا کہ حضورؐ آرہے ہیں تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے دل میں ارادہ کر لیا، کیا ارادہ کیا؟ کہ جب حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آئیں گے میں پیچھے ہٹ جاؤں گا اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو آگے کھڑا کروں گا، حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی ابو بکر صدیقؓ کے اس ارادے کو پہچان لیا، آپ نے وہیں سے کہا! "مَكَانَكَ" کہ تم اپنی جگہ رہو یعنی نماز پڑھاتے رہو، اور سارے مسلمانوں نے یہ آواز سن لی، اب معلوم ہوا کہ ابو بکر صدیقؓ کی جو امامت تھی وہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نظروں میں تھی، یہ نہیں کہ "ام المؤمنین نے ان کو کھڑا کر دیا تھا" تو جن لوگوں نے آئندہ دور میں یہ پروپیگنڈا کرنا تھا، کہ ام المؤمنینؓ نے ان کو کھڑا کر دیا تھا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہیں، تو حضور کو افاقہ اللہ نے اس لئے دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ حکمت باری تعالی بھی یہی تھی کہ دنیا دیکھ

(1) صحیح بخاری، باب مرض النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم۔

لے کہ حضور ﷺ کی نظر میں سیدنا صدیق اکبرؓ کا کیا مقام ہے۔ اور یہ کہ ان کی امامت کو آپ کی رضا شامل رہے۔

توجہ فرمائیں کہ حضور ﷺ کی جب وفات ہوئی تو حضرت علی مرتضیٰؓ فرماتے ہیں حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے "الاستیعاب فی معرفة الاصحاب"[1] میں یہ بات نقل کی، کہ جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو صحابہؓ جو تھے آپس میں مل کر بیٹھے تو حضرت علی المرتضیٰ فرماتے ہیں کہ "مَرِضَ رسولُ اللہِ ﷺ ایامًا ولَیالِیًا" حضور ﷺ بیمار ہوئے اور کئی دن بیمار رہے اور میں تندرست تھا بیمار نہ تھا، اور میں حاضر تھا غائب نہیں تھا، حضور اگر مجھے کہتے کہ تم نماز پڑھاؤ، تو کوئی شخص روک نہیں سکتا تھا، لیکن آپ ﷺ نے ابو بکرؓ کو کہا، مگر جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی، ہم نے پھر معاملے میں غور کیا، اور اپنی دنیا کے لئے اس کو چنا، جس کو حضور نے ہمارے دین کے لئے چنا تھا۔

نماز کیا ہے؟ یہ دین کی اساس ہے "الصلوٰۃُ عِمادُ الدین" نماز دین کا ستون ہے حضرت علیؓ کے یہ کلمات سنئے، کیسے سنہری الفاظ ہیں، کہ ہم نے اپنی دنیا کے لئے یعنی خلافت کے لئے آپکی سیاسی جانشینی کے لئے اس کو چنا، جس کو حضور ﷺ نے ہمارے دین کے لئے چنا تھا[2]، خلافت کا نمونہ آپ دے گئے تو حضرت ابو بکر صدیق حضور ﷺ کے

---

(1) الاستیعاب، ج،2ص:291۔

(2) دین اسلام کے پانچ ستون ہیں: کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نہ صرف نماز میں بلکہ دین کے ان پانچوں ستونوں میں دیگر صحابہ پر نمایاں سبقت حاصل تھی۔

(کلمہ): آنحضرت ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا اور جب آنحضرت ﷺ کو اللہ کی طرف سے کھلے عام مجمع میں کلمہ کی دعوت دینے کا حکم ملا تب سب سے پہلے رسالت مآب ﷺ کے فرمانے پر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہی بھرے مجمع میں دعوت حق پیش کی۔ اس لیے اسلام کے پہلے خطیب آپ کہلائے۔

(نماز): آنحضرت ﷺ نے آخری وقت میں دیگر صحابہ کرام کے ہوتے ہوئے مسجد نبوی شریف میں نماز کی امامت کے واسطے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا۔

اس طرح سائے میں رہے کہ آپ ﷺ کا جو طریقہ تھا، اور آپ کی جو سیرت اور بصیرت تھی وہ ابو بکر صدیق نے کس طرح اپنے اندر جذب کی ہوئی تھی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تقرر

جب حضرت ابو بکر صدیقؓ کا آخری وقت آیا، تو انہوں نے خود حضرت عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا۔۔۔ ایسا کیوں؟ اس لئے کہ اگر آپ حالات پر چھوڑ جائیں، تو وہ موقع جو حضور ﷺ کے چھوڑنے پر تھا اس وقت تو سارے ہی صحابہ تھے، حضورؐ کی جب وفات ہوئی، تو سارے ہی مسلمان جو مدینہ منورہ میں تھے وہ صحابہؓ تھے اور نہایت اونچے درجے کے متقی تھے، تو انہوں نے تو اس مسئلے کو یوں طے کیا، کہ جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمارے دین کے لئے چنا، ہم اس کو اپنی دنیا کے لئے چنتے ہیں۔

لیکن اس نئے مرحلہ میں (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کرنے میں) ہو سکتا تھا کہ کوئی اختلاف ہو جائے؟ عقلی طور پر، اور تجرباتی طور پر اس بات کا اندیشہ تھا، تو حضرت ابو بکر

(حج): جب نو ہجری میں حج فرض ہوا تو پہلے حج کے امیر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی بنائے گئے اور ان بنیادی ارکان میں نماز اور حج دو ہی ایسی عبادتیں ہیں جن کے لیے کسی امام یا امیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت سر فہرست ہے۔

(روزہ): روزہ سے مقصود تقویٰ حاصل کرنا ہے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے قرآن أتقٰی کے الفاظ ارشاد فرماتا ہے۔

(زکوٰۃ): زکوٰۃ کیا ہے کہ ہر سال صاحبِ نصاب مسلمان اپنے مال کا اڑھائی فیصد ادا کرے جس سے اسکا مال پاک ہو اور اللہ کا قرب حاصل ہو۔ سو اس حوالے سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بالخصوص سورہ والیل میں ارشادِ پاک موجود ہے] سو اس پاکباز شخصیت کے ہوتے ہوئے اور کوئی اس عہدے کا اہل ہو ہی نہیں سکتا جس کا نمایاں ثبوت حضرت علی المرتضیٰ کا یہ ارشاد ہے:

فرضینا لدنیانا من رضی رسول اللہ ﷺ لدیننا فقدمنا ابابکر

(الاستیعاب، ج2 ص 251، طبقات ابن سعد، ج3 ص 183)

ترجمہ: پس رسول اللہ نے جس کو ہمارے دین کا پیشوا (نماز کا امام) بنایا تھا ہم نے اس کو اپنی دنیا کا پیشوا بنالیا اور ابو بکر کو ہم نے اس باب میں آگے کر لیا۔

صدیق کی بصیرت کی نظر کہاں پہنچی!؟ اس لیے انہوں نے شوری پر نہیں چھوڑا بلکہ خود نامزد کر دیا، کیونکہ آپؓ کو وہ اندیشہ نہیں تھا کہ میرا جانشین جو ہے وہ یہ کہے کہ "میں تو اللہ کے رسول کا مقرر کردہ ہوں"۔ سب کو پتہ تھا کہ یہ ابو بکرؓ کا مقرر کردہ ہے، کیونکہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خود لوگوں کو حق دیتے تھے کہ تم سوال کر سکتے ہو یا اگر تمہارے ذہن میں کوئی اعتراض ہو تو پوچھ سکتے ہو تو حضرت عمر جو ان کے جانشین تھے ان کے بارے میں حضرت ابو بکر صدیق کو کوئی اندیشہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہہ سکیں گے کہ میں تو ابو بکرؓ کا مقرر کردہ ہوں اس لیے مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ ہاں اگر رسول اللہ کا نام لیکر کہیں کہ میں ان کا مقرر کردہ ہوں پھر تو کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے کو سوال کرنے کا حق نہیں، کیوں کہ جو پیغمبر کا فیصلہ ہے کون مسلمان اس کے بارے میں زبان کھولے گا، تو ابو بکر صدیقؓ نے اس مصلحت کے لئے کہ میری پوزیشن، وہ رسالت والی نہیں۔ میرا جانشین کبھی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ "مجھے فلاں نے مقرر کیا" اس لئے انہوں نے مقرر کر دیا، تو حضرت عمر پر پھر جس طرح ابو بکر صدیقؓ کی امامت پر۔۔۔۔ اور ان کی خلافت پر۔۔۔ ان کی قیادت پر۔۔۔۔ ان کی سیادت پر۔۔۔۔ ان کی سرداری پر سارے لوگ جمع تھے وہ سارے کے سارے پورے اتفاق کے ساتھ حضرت عمرؓ پر بھی جمع ہوئے اور کوئی اختلاف نہیں ہوا۔

سیدنا ابو بکرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو سمجھتے تھے

اب یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سیاسی جانشین خود طے کیا یا امت پر چھوڑا؟ "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کے مطابق وہ بات امت پر چھوڑی، اور حضرت ابو بکر صدیق نے خود جانشین مقرر کیا یا امت پر بات چھوڑی؟ حضرت سیدنا ابو بکر صدیقؓ نے خود جانشین مقرر کیا۔ اس وقت سارے مسلمانوں میں سے کسی نے حضرت ابو بکر صدیق کے اس عمل پر انگلی اٹھائی؟ (سامعین: نہیں) کہ دیکھو ابو بکر نے کیا کیا؟ حدیث کے خلاف کیا، سنت کے خلاف کیا، حضور کی سنت تو یہ تھی، کہ آپ نے کوئی سیاسی جانشین مقرر نہیں کیا، اور ابو بکرؓ نے کیا اور حدیث کی مخالفت کی، تو معلوم ہوا کہ یہ پروپیگنڈا کر دینا کہ جی حدیث کی مخالفت کر دی درست نہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ اس

حدیث کو کون روایت کر رہا ہے "کہ حضور ﷺ نے جانشین مقرر نہیں کیا"۔ حضرت ابو بکرؓ جانتے تھے، حقیقت حال پہچانتے تھے، لیکن انہوں نے اس پر عمل نہیں کیا۔۔۔ کیوں؟ حضرت ابو بکر صدیقؓ خود "مجتہد" تھے، تو معلوم ہوا کہ مجتہد جانتا ہے کہ کسی حدیث کی وسعت کہاں تک ہے، اور اس کے پیچھے علت کون سی ہے، بنیاد کیا ہے۔

مجتہد کی نظر حدیث اور حکم کی علت پر ہوتی ہے

ہر حدیث اور حکم کی علت کو مجتہدین جانتے اور پہچانتے ہیں، تو ابو بکر صدیق جیسے حضرات یا حضرت عمرؓ جیسے حضرات وہ اتنے اونچے درجے کے مجتہد تھے، کہ اگر وہ کسی حدیث پر عمل نہ کریں تو یہ پروپیگنڈا نہ کرو کہ حدیث چھوڑ دی، اجتہاد کرنے لگے۔

یہ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کی فقہ تھی، کہ میں جس کو مقرر کروں گا لوگ اس سے سوال کرنے کا اختیار رکھ سکیں گے اور لوگ یہ نہیں سمجھیں گے کہ یہ پیغمبر کا مقرر کردہ ہے کیونکہ میں امتی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے اس لئے مقرر نہیں کیا تھا تاکہ امت کو سوال کرنے اور بات اٹھانے کا حق رہے۔

بہر حال حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بطور مجتہد کے نظر علت پر تھی، مجتہد کی نظر حدیث کی علت پر ہوتی ہے، (1) وہ اگر اس حدیث پر عمل نہ کرے، تو یہ پروپیگنڈا کرنا کہ جی حدیث

---

(1) فی الوقت یہاں اس عنوان پر سیرت نبوی ﷺ سے صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے:

آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک زانیہ باندی کو درے لگانے کا حکم دیا آپ اس کے پاس گئے تو دیکھا اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے آپ نے اس پر حد جاری نہ کی اور واپس آکر حضور ﷺ کی خدمت میں صورت حال عرض کر دی آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس اجتہاد کی تحسین کی اور فرمایا:

احسنت وزادہ فی روایۃ اتر کھا حتی تماثل

(صحیح مسلم، جلد:2، ص:72۔ جامع ترمذی، جلد:1، ص:174)

ترجمہ: تم نے اچھا کیا اس پر حد مؤخر رکھو یہاں تک کہ بچہ بڑا ہو جائے۔

آپ کا یہ اجتہاد بظاہر نص کے مقابلہ میں تھا لیکن مجتہد کی نظر علت، سبب اور حالت تینوں پر ہوتی ہے۔ آجکل کا دور ہوتا تو کوئی مولوی کہہ دیتے کہ دیکھو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حدیث پر عمل نہ کیا اور اپنی

چھوڑ دی، مجتہدین کے پیچھے لگ گئے، فقہ کے پیچھے لگ گئے (ایسا کہنا ٹھیک نہیں) چنانچہ بات لمبی ہو گئی ہے، پھر سہی، لیکن آگے چلیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بطور خلیفہ کے انتخاب

پھر حضرت عمرؓ کی جب باری آئی، حضرت عمر پر جب حملہ ہوا تو حضرت عمرؓ کی شہادت کب ہوئی؟ حملہ تو ان پر ذوالحجہ کے آخر میں ہوا، اور تکفین آپؓ کی یکم محرم کو ہوئی، تو میں توجہ دلا رہا ہوں اس طرف کہ حضرت عمرؓ کی جب باری آئی، حضرت عمرؓ نے آخری وقت میں کہا کہ "میں کیا کروں" اگر میں کوئی جانشین مقرر نہ کروں تو یہ بھی میرے لئے ٹھیک ہے کیوں کہ حضور نے نہیں کیا تھا۔ اور اگر کسی کو مقرر کر دوں، تو یہ بھی ٹھیک ہے، کہ میرے پیشوا جو مجھ سے

- اعلیٰ تھے،
- جو مجھ سے افضل تھے
- اول تھے

انہوں نے مقرر کیا۔ اب میں کسی کو مقرر کروں یہ بھی ٹھیک ہے نہ مقرر کروں تو بھی ٹھیک ہے، تو معلوم ہوا کہ مجتہد جو ہے، وہ حدیثوں کو اس طرح نہیں کہ بالکل ظاہری الفاظ کے لحاظ سے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا اسی کی پابندی کرے بلکہ وہ ظاہری الفاظ کے ساتھ ساتھ فہم، بصیرت اور سمجھ بھی حاصل کرتا ہے اس لیے مجتہد کی نظر دور تک جاتی ہے، وہ ہر علت کو پہچانتی ہے، اب آپ کے سامنے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جانشین مقرر کرنے میں حضور کے طریقے پر عمل کیا؟ (سامعین: نہیں) تو یہ نہیں کہا جاسکتا، کہ یہ حدیث کے خلاف ہے، مجتہد جو ہوتا ہے وہ حدیث کی علت، جڑ اور بنیاد پر نظر رکھتا ہے۔ اس پر وہ بات کو پہچان لیتا ہے، اگر وہ علت پر نظر کر کے دوسرا حکم لائے تو امت کے لئے یہی ہے، کہ وہ مجتہدین کے پیچھے چلیں، خود رائی اختیار نہ کریں۔ پھر حضرت عمرؓ نے

رائے حدیث میں داخل کی یہ تو اہل فقہ کیا کرتے ہیں۔

(علامہ خالد محمود، آثار التشریع، جلد: 1، ص: 151)

جو خطبہ دیا، اس میں یہ کہا کہ اگر میں مقرر نہ کروں، تو بھی ٹھیک ہے، حضور نے نہیں کیا، اگر کروں یہ بھی ٹھیک ہے، کیوں کہ ابو بکرؓ نے کیا:

ان اترك فقد ترك من هو خير مني رسول الله ﷺ وان استخلف فقد استخلف من هو خير مني ابوبكر

(مسند احمد ج 1، ص 71 و ص 77۔ تاریخ عمر ص 245، ریاض ج 1 ص 414)

وہ مقرر کر گیا جو مجھ سے بہتر تھا تو حضرت عمرؓ نے ایک تیسری لائن نکالی، کہا، میں کسی ایک شخص کو مقرر نہیں کرتا لیکن میں ایک کمیٹی مقرر کرتا ہوں چھ آدمیوں کی، کہ ان میں سے جس کو چاہو چن لو، چھ آدمیوں کی کمیٹی حضرت عمرؓ نے مقرر کر دی، اور ان چھ آدمیوں کو مقرر کیا اور وہ چھ بھی حضرت عمر کا انتخاب نہیں تھے، یہ بھی حضور کا انتخاب تھے۔

صحابہ کرام میں فضیلت کے مراتب

حضور اکرم ﷺ نے صحابہ میں سب سے آگے چن کر کن کو کیا تھا؟ کہ یہ ہیں وہ جو سب سے اونچے ہیں۔ یہ وہ "دس اصحاب تھے" جن کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے، عشرہ مبشرہ دس اصحاب جو جنت کی بشارت پائے ہوئے تھے۔ پھر بدری صحابہ بھی تھے جو بہت اونچے درجے کے تھے۔ پھر بیعت رضوان کے چودہ سو پاک باز انسان تھے جن سے حضور ﷺ نے درخت کے سائے میں بیعت لی تھی، اور جن کی بیعت کو خدا نے کہا، کہ اے میرے محبوب! ان کے ہاتھوں پر تیرا ہاتھ نہیں میرا ہاتھ ہے، "يد الله فوق ايديهم" تو صحابہ میں ان کو اصحاب رضوان کہا جاتا ہے جو حدیبیہ کے مقام پر تھے، اور انہوں نے حضور ﷺ کی بیعت کی تھی، یہ بھی اونچے درجے کے تھے۔

تاہم اصحاب رضوان سے اونچے درجے کے وہ لوگ ہیں، جن کو بدری صحابہ کہا جاتا ہے، اور ان میں سب سے نمایاں کون ہیں؟ "دس"۔ جن کو کہا جاتا ہے عشرہ مبشرہ۔ تو یہ عشرہ مبشرہ حضورؐ کا انتخاب تھے، حضور نے نام لے لے کر کہا تھا یہ جنتی، یہ جنتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جب سفر آخرت پیش آیا اس سے پہلے انہوں نے جو کمیٹی بنائی تو آپکو پتہ ہے کہ اسوقت ان دس میں سے کتنے باقی تھے؟ ان دس میں جن کو عشرہ مبشرہ کہا جاتا ہے کیا

ابو بکر صدیقؓ موجود تھے؟ (نہیں) ابو عبیدہ بن جراح موجود تھے؟ (نہیں) حضرت عمرؓ؟ وہ اب جارہے ہیں، وہ بھی وفات پا گئے، تو ان دس میں سے کتنے رہ گئے تھے؟ "سات"۔ یہ تین تو ان ناموں میں نہیں آسکتے تھے:

- حضرت ابو بکر صدیق،
- حضرت عمر،
- حضرت ابو عبیدہ بن جراح،

یہ تین تو سفر آخرت پر جاچکے، باقی رہ گئے سات، ان میں سے ایک تھے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے۔ انہوں نے اپنے رشتہ دار کو نکال دیا، تاکہ ان کو یہ کوئی نہ کہے کہ انہوں نے اپنے رشتہ دار کو مقرر کیا، اس کو نکال کر باقی چھ وہ ہی ہیں جو اس کمیٹی کے افراد تھے، جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھوڑی تھی، تو معلوم ہوا ان چھ کو بھی حضرت عمر نے اپنے انتخاب پر نہیں چنا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نظرِ انتخاب پر نظر کی۔ تو مسئلہ یہ چلا کہ جانشین مقرر کرنے میں

- ایک طریقہ تھا "حضور صلی اللہ علیہ وسلم" کا
- پھر ایک طریقہ "حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ" کا
- پھر ایک طریقہ ہے "حضرت عمر رضی اللہ عنہ" کا

پھر جس طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت براہ راست ہوئی اسی طرح چوتھے خلیفہ راشد حضرت علیؓ کا انتخاب بھی اس طرح ہوا،(1) تو میں آپ حضرات کی اس طرف توجہ

---

(1) حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم نے اپنی مایہ ناز تالیف "خلفائے راشدین" میں حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافتوں کا تقابلی جائزہ "بسط الیدین للجمع بین الخلافتین" کے عنوان سے پیش کیا ہے جو اربابِ ذوق کے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

① دونوں خلافتیں عام انتخابات سے عمل میں آئیں: خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نامزد کیا۔ عام انتخاب عمل میں نہ آیا۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک چھ رکنی کمیٹی سے چنے گئے عام انتخاب عمل میں نہ آیا۔ صرف

دلانا چاہتا ہوں، کہ اگر مجتہد درجے کے لوگ ہوں جس طرح کے بڑے لوگ علم میں گہرے ہوتے ہیں جن کی احادیث کی علت پر پوری نظر ہو، وہ اگر کوئی فیصلہ کرے، تو کبھی یہ نہ کہو کہ دیکھو انہوں نے فقہ کو حدیث پر مقدم کر دیا۔

صحابہ مزاج شناسان رسول ﷺ تھے:

حدیث کو سمجھنے والے کون ہیں؟ ''وہ جو مزاج شناسان رسول تھے'' تو ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے زیادہ مزاج شناس رسول اور کون ہو سکتا ہے؟ تاہم جہاں تک واقعہ کربلا کا تعلق ہے، اس سے پہلے ہمیں اس پس منظر میں جانا ہو گا، کہ آنحضرت ﷺ نے جو نظام قائم کیا، اس کے مطابق کس طرح حضرت ابو بکر آگے آئے، وہ بات میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی، حضرت عمرؓ پھر کس طرح آئے، میں نے ان کے بارے میں بھی مختصر بات کر دی کہ خلافت کس طرح چلی آ رہی تھی۔

میں عرض یہ کرتا ہوں کہ ان دس میں نمایاں درجے کے کون ہیں؟ وہ خلفائے راشدین تھے۔ تو صحابہ کی ترتیب کیا رہی، کہ سب سے اول درجے میں خلفائے راشدین، اور پھر دوسرے درجہ میں عشرہ مبشرہ،، پھر تیسرے درجہ میں، جن کو اللہ تعالی نے بدر کی سعادت عطا فرمائی، جن کو کہتے ہیں بدری، پھر آگے چوتھے درجے میں اصحاب رضوان جو

پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عام انتخاب میں چنے گئے رضی اللہ عنہم اجمعین۔ پہلی اور چوتھی خلافت کی یہ یکسانیت رہی۔

(خلفائے راشدین، جلد:2، ص:387)

طوالت کے ڈر سے یہاں ہم بقیہ مضمون کی صرف سرخیاں ہدیہ قارئین کیے دیتے ہیں:

② دونوں خلفاء کا انتخاب اچانک عمل میں آیا۔ ③ دونوں خلفاء نے خلافت سے دستبردار ہونے کی خواہش کی۔ ④ دونوں خلفاء کی خلافت مدینہ منورہ میں عمل میں آئی۔ ⑤ باغ فدک کے بارے دونوں کا فیصلہ ایک رہا۔ ⑥ دونوں خلافتوں میں سب لوگ ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے رہے۔ ⑦ دونوں خلافتوں کی بناء اہلبیت پر رہی، وراثت پر نہیں۔ ⑧ دونوں خلافتوں میں قرآن کریم ایک ترتیب پر رہا۔ ⑨ دونوں خلافتوں میں نظام شورائی تھا کوئی خلیفہ آسمانی عہدے کا مدعی نہ تھا۔ ⑩ دونوں خلافتوں میں اندرون سلطنت بغاوتوں کے سیلاب۔ (ایضاً)

چودہ سو پاک باز انسان حدیبیہ کے مقام پر حضور کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ اور اللہ نے کہہ دیا کہ ان کے ہاتھوں پر، اے میرے پیغمبر! تیرا ہاتھ نہیں میرا ہاتھ ہے، یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ۔

تو اس وقت ان کی ترتیب بیان کرنا مقصود نہیں، واقعہ کربلا کی طرف آپ کی توجہ دلا رہا ہوں، کہ خلفائے راشدین کے بعد پھر حکومت کن کے پاس آئی؟ حضرت معاویہ کے پاس آئی۔

حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دو ادوار

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت کے دو حصے ہیں، ایک حصہ وہ جو خلافت راشدہ کے اندر کا ہے، اور اس میں خلیفہ راشد حضرت علیؓ ہیں۔ (1) ہم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس

(1) حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ کے متعلق کیے گئے ایک استفسار اور اسکے جواب کو یہاں ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے:

سوال: حضرت علی رضی اللہ عنہ پوری سلطنت اسلامی کے فرمانروانہ تھے، قلمرو اسلامی کے ایک حصہ پر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا قبضہ تھا۔ انہیں خلفائے راشدین میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے، وہ خلافت تامہ نہ تھی، نہ اس کا پہلے تین خلفاء سے تسلسل تھا۔ ان کے چوتھے خلیفہ راشد ہونے پر دلیل پیش کیجیے؟........ سائل: محمد اسد اللہ قاسمی، خطیب جامع مسجد قطب الدین جھنگ صدر

جواب: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی تو اس وقت آپ کی یہ بیعت خلافت پوری قلمرو اسلامی کے لیے تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی نہ انہیں علم تھا کہ عملاً یہ خلافت مصر و شام تک نہ جا سکے گی، نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آئندہ ہونے والے واقعات کا علم تھا۔ علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ خاصانِ خدا بھی غیب کی وہی بات جان سکتے ہیں جو عالم الغیب بتلائے، سو عقداً یہ خلافت پوری قلمرو اسلامی کے لیے تھی۔ گو عملاً ایسا ظہور میں نہ آیا۔ خلافت کے احکام عقد سے چلتے ہیں عمل سے نہیں۔ دو خلیفہ بنا لیے جائیں تو فیصلہ پہلے کے حق میں ہوتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو اگر پوری سلطنت اسلامی کا حکمران نہ سمجھتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بیعت کے لیے کیوں لکھتے، اور پھر انہیں شام کے گورنر کی حیثیت سے معزول کیوں کرتے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ

دور کا خلیفہ نہیں مانتے۔ اور حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کو خلیفہ نہیں مانا تھا، لیکن خود اپنی خلافت کا دعوی نہیں کیا تھا۔ خود نہیں کہا تھا کہ میں خلیفہ ہوں۔

تو حضرت معاویہؓ اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ میں کون ہوں؟ حضرت علی کو وہ کہا کرتے تھے، کہ میں خلافت کا خود دعوی دار نہیں مگر میری پوزیشن کیا ہے؟

ولانی خلیفتان من قبلك

پوری قلمرو اسلامی کے فرمانروا نہ تھے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان سے قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کو پکڑنے کے لیے نہ کہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ان سے یہ مطالبہ ان کی خلافت کے انکار پر مبنی نہ تھا، یہ صرف بیعت سے توقف تھا اور انہوں نے خلافت قائم ہونے تک اپنی سابق پوزیشن (عاملِ خلافت عثمان رضی اللہ عنہ) بحال رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت سے اصولاً مختلف ہے، اول الذکر بوقتِ عقد پوری قلمرو اسلامی کے فرمانروا تھے اور ثانی الذکر بوقتِ عقد اسی خطہ پر حکمران تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں تھا۔ سو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت باعتبار عقد خلافتِ تامہ ہے اور خلافتِ راشد کی تمام شرطوں کو پورا کرتی ہے۔ پھر یہ خلافت پہلی تین خلافتوں سے مسلسل بھی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ایک مکتوب (نہج البلاغہ، حصہ:3، ص:8) میں صراحت کرتے ہیں کہ میری بیعت انہی لوگوں نے کی ہے جنہوں نے پہلے تین بزرگوں کی بیعت کی اور انہی شرطوں پر انہوں نے مجھے خلیفہ مانا ہے جن شرطوں پر انہوں نے انہیں خلیفہ مانا تھا۔ شیعہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں لوگوں کو تراویح باجماعت سے روک سکے نہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو فدک دے سکے۔ ان کی خلافت پہلی تین خلافتوں کا ہی تتمہ رہی۔ قاضی نور اللہ شوستری (1019ھ) لکھتا ہے:

"اکثر اہل آں زماں را اعتقاد آں بود کہ امامت حضرت امیر مبنی بر امامت ایشاں است و فساد امامت ایشاں را دلیل فساد امامت او مے دانند۔" (مجالس المومنین، ج:1، ص:54)

ترجمہ: اس وقت اکثر لوگوں کا اعتقاد یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت ان پہلے تین کی امامت پر مبنی ہے اور وہ ان کی امامت ٹوٹنے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کو ٹوٹا سمجھتے ہیں۔

یعنی وہ تین صحیح اور جائز خلیفہ ہوں تو یہ چوتھے بھی صحیح اور جائز خلیفہ ہوں گے اور وہ تین خلیفہ برحق نہیں تو یہ چوتھے بھی صحیح خلیفہ نہ ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔"

(عبقات، ج:1، ص:163)

اے علی! آپ سے پہلے دو بڑے آدمی گزرے ہیں، انہوں نے مجھے شام کا گورنر بنایا ہے، انہوں نے مجھے شام کا سربراہ بنایا ہے، اور شام کا ملک انہوں نے مجھے سونپا، وہ دو بڑے آدمی کون تھے؟ ایک حضرت عمرؓ، اور دوسرے حضرت عثمانؓ ہیں۔ حضرت عمرؓ کا دور حکومت اور ان کا دور خلافت تقریباً دس سال، حضرت عثمانؓ کا بارہ سال، تو حضرت معاویہؓ نے کہا وَلَّانِیْ مجھے والی بنایا شام کا، خلیفتان دو خلیفہ نے۔

یزید بن ابی سفیانؓ فاروق اعظمؓ کے دور میں

اس میں ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرتا ہوں کہ شام جب اسلام کے پرچم تلے آیا، تو شام کا پہلا گورنر کون تھا؟ وہ حضرت ابو سفیانؓ کا بڑا بیٹا تھا جس کا نام یزید تھا (یہ وہ یزید نہیں جس کا ذکر کربلا میں آتا ہے)، یہ حضرت معاویہؓ کا بڑا بھائی تھا۔ یہ شام کا پہلا گورنر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں بنا، پھر حضرت عمرؓ کا دور آیا اس میں بھی ابتداً یہ ہی گورنر رہا، پھر اس کی وفات ہو گئی، کس کی؟ (یزید بن ابی سفیان کی) اور اسوقت خلیفہ کون تھے؟ (حضرت عمرؓ)۔ مدینہ میں امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کو جب یہ خبر پہنچی، کہ یزید بن ابی سفیان کی کسی بیماری میں وفات ہو گئی ہے تو حضرت عمرؓ اس کے والد (ابو سفیانؓ جو کہ ابھی زندہ تھے) ابو سفیانؓ کے پاس تعزیت کے لئے گئے، جیسے جب کوئی فوت ہو جائے تو اظہار افسوس کے لئے، اظہار خیر خواہی کے لئے، اظہار ہمدردی کے لئے لوگ جاتے ہیں تو حضرت عمر حضرت ابو سفیان کے پاس گئے۔ (انہی حضرت ابو سفیان کے قبول اسلام کا واقعہ پچھلی مجلس میں گزر چکا ہے، کہ حضور اکرم ﷺ جب فتح مکہ کے سفر پر آئے، تو انہوں نے اسلام قبول کیا تھا)۔

تو حضرت عمرؓ ان کے پاس افسوس کے لئے آئے اور جب فارغ ہو کر واپس آنے لگے تو ابو سفیانؓ نے پوچھا کہ اب میرے بیٹے یزید کے بعد شام کا گورنر کسے بنا رہے ہیں؟

سامعین! کیا آپ سوال سمجھے؟ کیونکہ یہ کام تو امیر المؤمنین نے کرنا ہوتا ہے کہ یہ کسے گورنر مقرر کرتے ہیں۔ سو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اب معاویہ کو گورنر مقرر کر رہا ہوں۔ معاویہ کون تھے؟ (ابو سفیانؓ کا دوسرا بیٹا) تو ابو سفیان نے حیران ہو کر کہا! کہ یہ کیا؟

پہلے بھی وہاں کا گورنر میرا بیٹا، اور اب پھر میرا ہی بیٹا!؟ یہ ابوسفیان نے سوال کیا۔ حضرت عمرؓ سے سوال کرنے والا کون ہے؟ ابوسفیان، جو اپنے وقت میں پورے مکہ کا ایک چوہدری اور نمبر دار تھا، (یعنی کوئی عام آدمی نہیں، بڑا بصیرت والا، گویہ اس کا کفر کا دور تھا جس میں وہ بدر میں سامنے آیا لیکن آدمی بڑا مدبر اور ہر وقت پوری نظر رکھنے والا سیاسی)۔

اس نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں عرض کی حضور اب کس کو مقرر کر رہے ہیں؟ کہا جی آپ کے دوسرے بیٹے کو، تو ابوسفیان نے کہا یہ کیا؟ کیا یہ اسی خاندان کی ذمہ داری رہ گئی ہے؟ ان کا منشا یہ تھا کہ اب کسی اور کو مقرر کریں۔ تو حضرت عمر نے جو جواب دیا وہ بڑا گہرا جواب ہے، آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوسفیان سے فرمایا کہ، ملک کو آپ نے نہیں چلانا بلکہ میں نے چلانا ہے اور مجھے پتہ ہے کہ کون آدمی کہاں ٹھیک ہے۔ مشین کا جو بڑا آپریٹر ہوتا ہے وہی جانتا ہے کہ کس پرزے کو کہاں فٹ کرنا ہے۔ اب یہ کارخانوں میں جو مشینیں چلتی ہیں، تو جو ان کا مرکزی آپریٹر ہوتا ہے، وہی جانتا ہے کہ کونسا پرزہ کہاں کا ہے۔ تو حضرت عمر نے کہا، ملک کو میں نے چلانا ہے، آپ نے نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ مجھ پر چھوڑ دو۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ چپ ہو گئے۔ تاہم حضرت معاویہؓ کو شام کی قیادت، شام کی گورنری ،شام کی ولایت ملی۔ حضرت معاویہ کو شام کی سرداری پر کون لائے؟ (حضرت عمرؓ)

حضرت عثمانؓ کے نکاح میں حضرت معاویہؓ کی بہن تھیں:

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا۔ حضرت عثمان کے پورے دور خلافت میں حضرت معاویہؓ ہی شام کے گورنر رہے، اور حضرت معاویہؓ کی رشتے میں بہن حضرت عثمان کے نکاح میں تھیں۔ حضرت عثمان خود بھی حضرت معاویہ کے چچا کے بیٹے لگتے تھے، گویا حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں والی شام معاویہ ہی رہے۔

حضرت علیؓ کے دور میں حضرت معاویہؓ نے ان کی خلافت کا انکار نہیں کیا:

پھر جب حضرت علی المرتضیٰؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت معاویہ نے ان کی خلافت کا انکار

نہیں کیا۔ کہ آپ خلافت کے اہل نہیں[1] معاذ اللہ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

- اپنی شان میں
- اپنے مقام میں
- اپنے تعارف میں
- اور قربانیوں کے لحاظ سے

اس مقام پر تھے کہ ان کی شان میں کوئی بات اٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔ تو حضرت معاویہؓ نے یہ کہا کہ میرا ایک ہی آپ سے مطالبہ ہے کہ میں یہاں حضرت عثمانؓ کا مقرر کیا ہوا ہوں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد انہوں نے مجھے گورنر مقرر کیا، تو میں ان کا وفادار ہوں اور اس لحاظ سے جب تک عثمان کے قاتلوں کو پکڑا نہ جائے، جب تک آپ عثمان کے قاتلوں کو گرفتار نہ کریں، انہیں سزا نہ دیں، میں آپکی بیعت نہیں کروں گا۔ تو حضرت

(1) قارئین کے لیے یہ قابل غور مقام ہے کہ ایک مخصوص طبقہ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع اور الزامات کی بوچھاڑ کرتا ہے تو اس دوران ایک یہ تاثر بھی پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی بیعت اس لیے نہ کی تھی کہ وہ خود خلافت کے مدعی تھے۔ حالانکہ یہ وہ بے بنیاد کہانی ہے جس کا تاریخ میں کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پوری طرح حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے علم و فضل اور انکے فضائل کے قائل تھے اور آپ کو بجا طور پر خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ لیکن پھر یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سب کے باوجود حضرت معاویہ نے حضرت علی کی بیعت کیوں نہ کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت معاویہ حضرت علی کی خلافت تسلیم کرنے کو فی الفور قصاص عثمان لینے سے مشروط کرتے تھے۔ حضرت علامہ صاحب لکھتے ہیں:

”حضرت معاویہ نے حضرت علی کی خلافت تسلیم کرنے کو قصاص عثمان لینے سے مشروط کیا تھا اور حضرت علی کو بلا شرط خلیفہ نہ مانا تھا آپ نے اپنے لیے بھی خلافت کا اعلان نہ کیا تھا۔ آپ حضرت عثمان کے مقرر کردہ گورنر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ نے حضرت علی کے خلاف چڑھائی نہ کی حضرت علی ان کے خلاف جنگ صفین میں نکلے لیکن آپ نے بھی ان سے کفر و اسلام کا اختلاف نہ کیا صرف یہ کہا اخوانا بغوا علینا ۔ یہ ہمارے بھائی ہیں جنہوں نے ہم سے سرکشی کی ہے سو حضرت علی کا ان سے بھی دینی اختلاف نہ تھا۔“

(خلفائے راشدین، جلد:1، ص:637)

معاویہ نے ان کی بیعت سے انکار کیا مقابلے میں خلیفہ ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ عام لوگ جو سمجھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ ان کے مقابلے میں خود خلافت کے مقام پر آئے، اس طرح کہنا ٹھیک نہیں۔[1] ان کے آپس میں ایک دوسرے کو بھیجے گئے خطوط میں نے مطالعہ کیے ہیں، جن میں حضرت معاویہ حضرت علی سے کہتے ہیں: اے علی! مجھے دو خلیفوں نے آپ سے پہلے شام کا گورنر مقرر کیا ہے، اور میں اپنے اسی حال پر کھڑا ہوں۔ یعنی میں بطور گورنر عثمان کے کام کروں گا جب تک کہ ان کے قاتلوں کو پکڑا نہ جائے، ان کی وفاداری کا تقاضا ہے کہ یہ جو صوبوں کے عامل ہیں، صوبوں کے جو نمائندے ہیں، وہ اپنے مرکز کو اس طرح کمزور نہ کریں، کہ مرکز کو آکر کوئی بھی تباہ کر دے، انہیں شہید کر دے اور کوئی آگے سے اٹھے ہی نہ۔ تو میں خون عثمانؓ کے لئے اٹھوں گا۔ ایک شیعہ مؤرخ نصر بن مزاحم منقری بھی حضرت معاویہ کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ آپ خلافت کے طلبگار نہیں تھے:

واما الخلافة فلسنا نطلبها

(واقعہ صفین، نصر بن مزاحم منقری شیعی ص70 تحت کتاب معاویہ و عمرو الی اہل المدینہ)

ترجمہ: یعنی کہ ہم اس مقام پر خلافت کے طلبگار نہیں۔

حضرت عثمان غنیؓ کی خون سے لت پت قمیص:

جب حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تو جو قمیص انہوں نے پہنی ہوئی تھی، جس پر خون لگا، وہ قمیص کس نے اٹھائی؟ حضرت عثمانؓ کی بیوی نے، جو معاویہ کی رشتے میں بہن تھیں، اور حضرت عثمان کی خون سے لت پت قمیص شام پہنچی ہے، اور جب وہاں قمیص لہرائی گئی، تو پورے شام میں لوگوں کے آنکھوں میں ایک خون آگیا تھا کہ۔۔۔ ہیں!!؟... خلیفہ برحق .... خلیفہ راشد پر............ اتنا ظلم؟

تو حضرت معاویہؓ نے اس وقت لوگوں سے متاثر ہو کر، کہ اگر اب میں نے علیؓ کو

---

(1) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی کہا کہ اگر آپ قاتلانِ عثمان کو سزا دیتے ہیں تو اہل شام میں سے، سب سے پہلے میں آپکے ہاتھ پر بیعت کروں گا: انا اوله من ابايعه من اهل الشام (البدایہ، ج:7، ص:270)

خلیفہ مان لیا تو لوگ کہیں گے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت اور ان کے خون کی ذمہ داری کن پر آتی ہے؟ (ان کے قاتلوں پر)، تو جب تک نیا خلیفہ ان قاتلوں کو پکڑے نہیں۔ (میں بیعت نہیں کروں گا) سو حضرت معاویہ نے حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ کیا اور اس مطالبے میں حضرت عثمان کے بیٹے حضرت ابان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد صحابہ کرام بھی شامل تھے جس کے متعلق سلیم بن قیس ہلالی شیعی بھی کہتا ہے:

ان معاویة یطلب بدم عثمان ومعه ابان بن عثمان وولد عثمان(کتاب سلیم بن قیس الکوفی الھلالی الشیعی العامری، ص:153 ،مطبوعه نجف اشرف تحت بث معاویه قراء الشام وقضاتھم)

سو اس سے پتہ چلتا ہے حضرت امیر معاویہ قصاص کے مطالبے میں اکیلے نہیں تھے۔ (1)

(1) یہ بھی ایک غلط پر اپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مطالبہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ میں اکیلے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کوئی انکے ساتھ اس مطالبے کے دوران نہ تھا، حالانکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ قصاص کا یہ معاملہ والیوں نے میرے سپرد کیا ہے۔ چنانچہ اس پر حضرت علامہ صاحب سے کیا گیا ایک استفسار اور اسکا جواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال: حضرت عثمان کے خون ناحق کے خلاف قصاص طلب کرنے کا حق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کا تھا نہ کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا، وہ کیسے اس قصاص کے مطالب بن گئے؟

جواب: سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بیٹے ابان بن عثمان جن کے نکاح میں حضرت جعفر طیار (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی) کی پوتی ام کلثوم بنت عبد اللہ بن جعفر تھی، وہ بحیثیت ولی قصاص حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ چونکہ بڑے تھے اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عزیزوں نے انہی کو اپنا نمائندہ بنا رکھا تھا۔ سلیم بن قیس الکوفی الھلالی العامری جو حضرت علی کے شاگردوں میں سے ہے، لکھتا ہے:

إن معاویة یطلب دم عثمان ومعه أبان بن عثمان وولد عثمان

(کتاب سلیم بن قیس الشیعی:153، طبع نجف)

قصاص عثمان میں خلیفہ راشد حضرت علی کا مؤقف:

ترجمہ: حضرت معاویہ حضرت عثمان کے قصاص کے لیے اٹھے اور حضرت عثمان کے بیٹے ابان اور حضرت عثمان کے دوسرے بیٹے ان کے ساتھ تھے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس بات کو خود واضح کر رکھا تھا کہ یہ کام والیوں کی طرف سے میرے سپرد کیا ہوا ہے۔ آپ نے ابو مسلم خوالانی کو یہ جواب دیا تھا:

أنا ابن عمه وأنا أطلب بدمه وأمره إلي (البدایہ والنہایہ، ج:8، ص:139)

ترجمہ: میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا چچازاد بھائی ہوں، میں ان کے قصاص کا طالب ہوں اور ان کا معاملہ (والیوں کی طرف سے) میرے ہی سپرد ہے۔ (عبقات، ج:1، ص:155)

پھر ایک یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ قصاصِ عثمان کے مطالبے میں کوئی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاویہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شریک نہ تھا۔ چنانچہ اس سوال کا جواب حضرت علامہ صاحب سے نقل کیا جاتا ہے:

یہ غلط ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہاں کے دیگر صحابہ اس مطالبہ قصاص عثمان میں شامل نہ ہوئے تھے، حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ (34ھ) اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ (32ھ) اکابر صحابہ وہاں موجود تھے اور یہ سب حضرات اس مطالبہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ یہ حضرات خود ہرگز شریک اقتدار نہ تھے کہ ان کے متعلق یہ شبہ راہ پاسکے کہ یہ خود کسی مصلحت سے خون عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے لیے اٹھے ہوں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

وقام في الناس معاوية وجماعة من الصحابة معه يحرضون الناس على المطالبة بدم عثمان ممن قتله من أولئك الخوارج فهم عبادة بن الصامت وأبو الدرداء وأبو أمامة وعمرو بن عنبسة وغيرهم.

(البدایہ والنہایہ، ج:7، ص:227)

ترجمہ: اور لوگوں میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت اٹھ کھڑی ہوئی جو لوگوں کو ان خارجیوں سے جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا خون عثمان کا قصاص لینے کے لیے آمادہ کرتے تھے، ان میں حضرت عبادہ بن صامت، حضرت ابو درداء اور حضرت ابو امامہ اور حضرت عمرو بن عنبسہ سبھی حضرات شامل تھے۔

(عبقات، ج:1، ص:173)

حضرت علیؓ کہتے تھے کہ وہ باغی جو عثمانؓ پر حملہ آور ہوئے، اس قدر وہ پھیلے ہوئے ہیں، کہ ابھی میں ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا، تو حضرت علی المرتضیؓ کے یہ الفاظ نہج البلاغہ میں محفوظ ہیں، کہ **یملکوننا ولانملکھم** کہ جو عثمان کے قاتل ہیں اتنے حالات پر قبضہ کئے ہوئے ہیں، کہ ان کی بات چلتی ہے، میری بات نہیں چلتی، ابھی قوت اتنی نہیں ہوئی، تو حضرت معاویہ کہتے ہیں، کہ اگر آپ اتنے کمزور ہیں، کہ ان کو نہیں پکڑ سکتے تو پھر ہمیں موقع دیں، میں پکڑتا ہوں، لیکن وہ اور صوبہ میں تھے، اور یہ اور صوبہ میں تھے جب اس پر اختلاف ہوا۔

حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ کے متعلق فرمان

اس موقع پر حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کی بصیرت پر قربان جائیں، انہوں نے صاف کہا، فرمایا! لوگوں کو (وہ لوگ جو کہتے تھے معاویہؓ نے علیؓ کو نہیں مانا اور طرح طرح کی باتیں معاویہؓ کے خلاف کرتے ہیں جب بھی محرم آتا ہے اور سیرت حسینؓ کو عوام میں پیش کرتے ہیں تو اس موقع پر وہ اس بات کو اٹھاتے ہیں، جو امیر معاویہؓ کے خلاف جاتی ہے کہ جی انہوں نے علیؓ کو نہیں مانا لیکن علیؓ کا جو اعلان ہے کیا تم نے نہیں پڑھا؟ حضرت علی المرتضیؓ نے خود کہا تھا۔) کہ میرا اور معاویہ کا معاملہ کیا ہے؟ **انا ربنا واحد**۔۔۔ ہمارا خدا ایک، ہمارا نبی دونوں کا ایک، ہمارا دونوں کا قبلہ ایک، ہماری دعوت فی الاسلام ایک، ہم ایک ہیں۔

تو آگے سنو ہمارا خدا ایک، ہمارا نبی ایک، ہماری کتاب ایک، ہمارا قبلہ ایک، **ودعوتنا فی الاسلام واحد**، ہماری دعوت اسلام ایک، **الامر واحد** ہم ایک ہیں تو حضرت علی تو کہیں ہم ایک ہیں، یعنی عقیدے میں ایک ہیں، مسلک میں ایک ہیں، ختم الرسل کو ماننے میں ایک ہیں، توحید کو ماننے میں ایک ہیں، قبلہ ہمارا ایک ہے۔ تو حضرت علی تو کہیں **الامر واحد** اور یہاں ہم ایک طبقے کی مجالس محرم میں دیکھتے ہیں کہ امیر معاویہؓ کے خلاف اتنی غلط باتیں کہی جاتی ہیں اور اتنا زہر اگلا جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کی پوری تاریخ اس کا انکار کرتی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پوری بصیرت اس کا انکار کرتی ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں:

- ہمارا خدا ایک ہے
- ہمارا نبی ایک ہے
- ہمارا قبلہ ایک ہے
- ہماری کتاب ایک ہے
- ہماری دعوت فی الاسلام ایک ہے

الامر واحد الا ما اختلافنا فیہ من دم عثمان ونحن منہ براء

(نہج البلاغہ: جلد:3، ص:114، خطبہ نمبر:58)[1]

---

(1) استاذنا المکرم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی ایک اور مقام پر اس مکتوب سے چند اور حقائق سامنے لاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں:

"حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے مسلمانوں میں کوئی اعتقادی فاصلہ نہ تھا۔ اگر اس پہلے دور میں کسی گروہ میں عقیدہ امامت قائم ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس خط میں کبھی نہ کہتے کہ معاویہ کے اس اختلاف سے پہلے ہم دونوں کا معاملہ ایک سا تھا، الامر واحد۔ دوسری بات اس خط میں یہ بھی لپٹی ہے کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف اٹھنے والوں سے کسی بات میں بھی متفق نہ تھے ورنہ وہ علی الاطلاق یہ نہ کہتے کہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ہر طرح کی کارکردگی اور انکی مخالفت سے بری ہوں۔۔۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا مکتوب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایمان باللہ اور تصدیق رسالت کا پورا اقرار ہے سوانہیں باغی کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ باغی اسے کہتے ہیں جو کسی کو مان کر پھر اس کا مخالف ہو جائے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو شروع سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مانا نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقرر کردہ گورنر شام سمجھتے رہے اور کہتے رہے کہ جب تک حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں کو نہیں پکڑتے میں ان کی بیعت نہیں کرتا۔ یہ گویا ان کا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت سے نہ انکار ہے اور نہ اقرار ہے۔ اب اس صورت حال میں ان کو کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ جنگ صفین میں بھی وہ پہلے نہ نکلے تھے۔ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ بحثیت خلیفہ پہلے ان کے خلاف نکلے تھے اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پھر آپ نے حضرت علی المرتضیٰ

سو اختلاف سارا خون عثمانؓ کے بارے میں ہے اور حضرت علی فرماتے ہیں خدا جانتا ہے، میں اس سے بری ہوں، غلط فہمی پھیلی، کہ یہ ان کے قاتلوں کو پکڑتے نہیں ہیں، حضرت علی بار بار کہتے ہیں کہ خدا جانتا ہے میرے ہاتھ اس خون سے پاک ہیں، میرا اس میں کوئی دخل نہیں۔ مگر جن کی رشتہ داری تھی، انہیں ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ بات کافی محسوس نہ ہوتی تھی۔

حضرت معاویہؓ نے کبھی بھی خلافت کا دعوی نہیں کیا

بات یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جو حضرت علی المرتضیؓ کی خلافت کو نہیں مانا وہ اس لئے نہیں، کہ انہوں نے ان کو خلافت کا اہل نہیں جانا، یا اس لئے نہیں کہ وہ خود خلیفہ ہونے کے مدعی تھے، ان کا برابر Claim یہی رہا کہ میں گورنر ہوں، میرا

پیشوا

میرا مرکز

عثمانؓ موجود نہیں، لیکن ان کا میں یہاں ٹھہرایا ہوا ہوں، میری وفاء تقاضا کرتی ہے، کہ میں ان کے قاتلوں کو پہلے پکڑوں، جب تک قاتل پکڑے نہیں جاتے میں بیعت نہیں کرتا، تو اسی طرح ان پر چار ساڑھے چار سال گزر گئے، یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے وفات سے ایک سال پہلے حضرت معاویہؓ سے ایک عہد کیا کہ ہمارا اختلاف چلا آرہا ہے، اس پر ہم معاہدہ کر لیں، کہ ہم آپس میں لڑیں نہیں، پہلے لڑائیاں بھی ہوئیں ہیں، جیسا کہ صفین وغیرہ میں لڑائیاں ہوئیں، لیکن پھر انہوں نے معاہدہ کیا، کہ ہم لڑیں نہ، تو دونوں اس پر متفق ہوئے، اور ان کا یہ معاہدہ تاریخ میں بھی محفوظ ہے۔ تو الحمد اللہ حضرت علیؓ اپنے شہید ہونے سے پہلے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کر چکے تھے، اور صلح اس بات پر تھی، کہ آپس

رضی اللہ عنہ سے مصالحت بھی کر لی تھی اور اس سے ہر شائبہ بغاوت بھی ان سے اٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: العبرة بالخواتیم اعتبار آخری بات کا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کے سب دھبے دھل جاتے ہیں۔۔ الاسلام یهبط ما کان قبله والهجرة تهدم ما کان قبلها۔۔ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ (معیار صحابیت: 299، طبع چہارم)

میں لڑنا نہیں، جو علاقے اسلامی سلطنت کے آپ کے پاس ہیں، آپ وہاں نظام چلائیں، جو میرے پاس ہیں، میں ان پر نظام چلاتا ہوں، یہ ہمارا پہلا معاہدہ ہے، ہم آپس میں لڑیں نہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالی ہمیں پھر اکٹھا ہونے کا موقع دے دے۔

حضرت حسنؓ کی جانشینی اور حضرت معاویہؓ سے صلح

توجب حضرت علیؓ شہید ہو گئے، توجو حضرت علیؓ کی پارٹی کے لوگ تھے، انہوں نے اپنا نیا امیر حضرت حسنؓ کو بنایا، حضرت علیؓ کا جانشین کن کو بنایا؟ حضرت حسنؓ کو، حضرت حسنؓ کے خلافت پر آتے ہی کچھ ماہ گزرے تو امیر معاویہؓ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے صلح کر لی، اور پھر ایک ہو گئے، توجب ایک ہو گئے تو حضرت حسنؓ نے جب معاویہؓ کے ہاتھ پر صلح کر کے اپنی حکومت ان کے سپرد کر دی اور اس میں آپ کے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ساتھ تھے۔

آج ہم حضرت حسینؓ کو کربلا کے ذکر میں اپنی عقیدت کے پھول پیش کر رہے ہیں، تو ضروری ہے کہ آپ جانیں کہ حضرت حسین اپنے بھائی حضرت حسنؓ کے ساتھ مل کر حضرت امیر معاویہؓ کو قبول کر چکے ہیں، اب جو لوگ امیر معاویہؓ کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں، کیا ان کی بے ادبی سے حضرت حسینؓ کی روح ان سے خوش ہو گی؟ جب حضرت حسنؓ اور حسینؓ دونوں امیر معاویہؓ کو قبول کر چکے، تو اب حضرت امیر معاویہؓ کی حیثیت پہچانی جائے۔[1]

---

(1) حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے بڑے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی دل و جان سے بیعت کی اور اپنے اس عہد و پیماں کی پاسداری کرتے ہوئے حضرت معاویہ کی وفات تک کبھی انکی خلافت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ آپ کے خلوص دل سے بیعت کرنے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں اس حکومت کے ماتحت جہادی سفر کیے۔ تاہم یہاں شیعہ کتاب سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا ملاحظہ فرمائیں۔ رجال کشی میں امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ امام حسن رضی اللہ عنہ، امام حسین رضی اللہ عنہ اور قیس بن سعد

حضرت امیر معاویہؓ کا مقام

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیثیت یہ ہے کہ آپ کاتب وحی تھے۔جب خدا کی وحی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اترتی تھی تو آپ اسے کاتبوں کو لکھوا دیتے تھے، جو وحی لکھتے تھے وہ کاتبینِ وحی کہلاتے تھے۔ پھر حضرت معاویہ کو حضرت عمرؓ نے اتنی قبولیت دی کہ شام میں اپنا گورنر مقرر کیا، اور حضرت عثمانؓ نے بھی انہیں قبول کیا۔ تو جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت وحی کی ذمہ داری دے کر انہیں قبول کیا اور انہیں عزت دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کا والی بنا کر عزت دی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شام کا گورنر بنانے میں عزت دی تو اب صرف اس لئے کہ یزید ان کا بیٹا تھا کیا ان کی ساری پچھلی تاریخ کو بھول جائیں۔۔۔!اب جب ہم اپنی عوام سے پوچھتے ہیں کہ معاویہؓ کون تھے؟ تو انکا جواب یہی ملتا ہے کہ جی یزید کے باپ تھے۔یعنی انکو پہچانتے ہی یزید کے واسطے سے ہیں حالانکہ وہ اتنی بڑی ہستی ہے

- انکو پہچانا جائے رسالت کی نظر سے
- انکو پہچانا جائے حضرت عمرؓ کی نظر سے
- انکو پہچانا جائے حضرت عثمانؓ کی نظر سے

لیکن لوگ کس طرح پہچانتے ہیں؟ میں نے ٹھیک کہا کہ نہیں؟ پہچانتے ہیں کہ جی کون؟ یزید کا باپ۔ حضرت معاویہ پر جن لوگوں نے جرح کرنی ہے وہ کبھی یہ نہیں بتلائیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کس مقام پر بتلایا اور ان سے اسلام کے لئے کیا کیا خدمتیں

بن عبادہ رضی اللہ عنہ انصاری وغیرہ جب شام آئے تو:

فأذن لهم معاوية وأعد لهم الخطباء فقال يا حسن! قم فبايع، ثم قال للحسين عليه السلام: قم فبايع فقام فبايع (رجال کشی، ص:193،ناشر: کتاب خانہ ملی ایران)

ترجمہ: پس امیر معاویہ نے انہیں آنے کی اجازت فرمائی اور ان کے اعزاز میں خطیب بلائے۔ اور امام حسن سے کہا کہ کھڑے ہو کر بیعت فرمائیں۔ امام حسن کھڑے ہوئے اور امیر معاویہ کی بیعت کی۔ پھر امام حسین علیہ السلام سے کہا کہ آپ کھڑے ہوں اور بیعت فرمائیں۔ امام حسین کھڑے ہوئے اور حضرت امیر معاویہ کی بیعت فرمائی۔

لیں، حضرت عمر اور حضرت عثمان نے انہیں کس نظر سے دیکھا تھا۔ یہ لوگ جب بھی بات کریں گے تو یہی کہ وہ یزید کے باپ تھے تاکہ حضرت معاویہ کی ساری عظمتیں چھپی رہیں۔

تو ہم نے یہ جو محرم کی مجالس ہیں، ان میں اپنے قارئین اور اپنے سامعین کو جو موجود ہوتے ہیں، ان کو علم دینا ہے واقعات بتانے ہیں، ان کے جذبات کو بھڑکانا نہیں۔ اب جو باتیں میں نے کہی ہیں، کہ حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ میرا اختلاف معاویہؓ سے دین کا نہیں، صرف خون عثمانؓ کے بارے میں ہے۔ کیا یہ باتیں عوام کو معلوم ہیں؟ (نہیں) لوگ اس پر سوچتے ہی نہیں تو ارادہ تو یہ تھا کہ سوالات جو میرے پاس آئے ہیں انکا جواب دوں، گزشتہ کل بھی وعدہ کیا تھا لیکن مضمون اگر درمیان میں چھوڑ دوں، تو وہ بات پھر سمجھ میں نہیں آتی۔

اب آپ کو اتنی بات تو سمجھ میں آگئی کہ کسی بات کو سمجھنا ہو یا جاننا ہو تو جڑ سے دیکھا جاتا ہے، تو اس واقعہ کو جڑ سے دیکھنے کے لئے، پہلے یہ عقیدہ آپ کا صحیح ہو، کہ

- حضور ﷺ کا جانشین کون؟ اور وہ کیسے بنا؟
- پھر اسکا جانشین آگے کون؟ اور وہ کیسے بنا؟
- پھر اسکے بعد اگلا جانشین کون؟ اور وہ کیسے بنا؟

پھر حضرت علی المرتضی آئے تو اختلاف ہوا، لیکن وہ اختلاف خلافت کا نہیں تھا، خون عثمانؓ کا اور قاتلین عثمانؓ کو پکڑنے کا تھا۔

اہل سنت کے عقیدے کے مطابق خلفاء راشدین چار ہیں

حضرت علیؓ کے خلیفہ برحق ہونے میں، اور خلیفہ راشد ہونے میں کلام نہیں۔ اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ خلفائے راشدین یہ چار ہیں:

- حضرت ابو بکر صدیقؓ
- حضرت عمر فاروقؓ
- حضرت عثمان غنیؓ

۞ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ(1)

(1) خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور خلافتِ موعودہ کے حقدار پہلے چار خلفائے راشدین ہیں۔ حضرت علامہ صاحب ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

سوال: خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کتنے صحابہ ہیں۔ ان کی خلافت مطلق خلافت تھی یا خلافت علی منہاج النبوۃ اور بارہ خلفاء کون کون ہوئے۔ کیا ان سب کی خلافت خلافتِ نبوت رہی ہے یا صرف چار کی خلافت خلافت نبوت کہلاتی ہے؟

جواب: خلفائے راشدین رضی اللہ عنہ چار ہیں۔ انہیں ائمہ اربعہ بھی کہتے ہیں۔ ان کی خلافت مطلق حکومت نہیں، خلافت نبوت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جس پیشگوئی میں بارہ مضبوط حکمرانوں کی خبر دی گئی ہے وہ مطلق حکمران ہیں۔ جن میں اچھے بُرے دونوں طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ہاں غیر مسلموں کے مقابلے میں وہ مضبوط حکومت کے مالک ہوں گے۔ ان بارہ میں پہلے چار کی حکومت خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حکومت تو راشدہ تھی، لیکن غیر تامہ تھی۔ آپ اس سے دستبردار ہو گئے تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت بے شک ایک مضبوط حکومت تھی، نظامِ عدل کتاب و سنت کے موافق تھا۔ مگر آپ کا عقدِ حکومت استخلافاً نہیں صلحاً وجود میں آیا تھا۔ آپ کے بعد پھر عبد الملک بن مروان ایک مضبوط حکمران بنا، یہ چھ پہلے مضبوط حکمران ہیں۔ عبد الملک کی اولاد سے پھر چھ مضبوط حکمران ہوئے۔۔ یہ صحیح نہیں کہ بارہ حکمرانوں کی اس روایت میں ہر ایک کی حکومت عدل و انصاف اور قرآن و سنت پر مبنی بتلائی گئی ہے۔ خلفائے راشدین ان چھ میں سے چار ہیں جو آیت استخلاف کا مصداق ہیں۔ ابو بکر باقلانی (403ھ) اہل السنۃ والجماعت کے تعارف میں لکھتے ہیں:

يعرفون حق السلف الذين اختارهم الله سبحانه لصحبة نبيه صلى الله عليه و سلم ويأخذون بفضائلهم ويمسكون عما شجر بينهم صغيرهم و كبيرهم ويقدمون أبا بكر ثم عمر ثم عثمان ثم علياً رضوان الله عليهم ويقرون أنهم الخلفاء الراشدون المهديون أفضل الناس كلهم بعد النبى صلى الله عليه و سلم ويصدقون بالأحاديث التى جاءت عن رسول الله صلى الله عليه و سلم. (کتاب التمہید: ص:295)

ترجمہ: اہل سنت والجماعت ان اسلاف کا حق پہچانتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے

قصاص دم عثمانؓ میں اہل سنت کا مؤقف

ہم حضرت معاویہؓ کے اس احساس کو، کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمان کو چھوڑ رہے ہیں یا پکڑتے نہیں تو یہ جو گمان ان کا تھا، ہم اس گمان میں انکے ساتھ نہیں ہیں۔ ہمارے جذبات حضرت علیؓ کے ساتھ ہیں۔ آپ چوتھے خلیفہ راشد ہیں، اور ہم آپ کے مؤقف کو برحق مانتے ہیں۔[1]

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور حکومت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے پسند کیا ہوا تھا۔ ان کے فضائل سے وہ تمسک کرتے ہیں، اور جو ان میں اختلافات چلے چھوٹوں میں یا بڑوں میں وہ ان اختلافات سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، اور اقرار کرتے ہیں کہ یہی خلفائے راشدین و مہدیین ہیں اور یہ سب لوگوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل ہیں اور اہل سنت ان تمام احادیث کو سچ مانتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچی ہیں۔ (عبقات، ج:1، ص:286)

اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے "ازالۃ الخفاء" از حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ، "خلافت راشدہ" از حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ۔ "خلفائے راشدین، جلد اول، ص:66-50 بعنوان 'خلفائے راشدین چار ہیں پانچ نہیں' از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی مراجعت فرمائیں۔

(1) حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق اہل سنت اسلاف سے چلے آرہے اپنے اس عقیدے کا اظہار ان الفاظ میں بھی بیان فرماتے ہیں:

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلافتِ راشدہ کے خلیفہ راشد تھے۔ امام مظلوم امیر المؤمنین حضرت عثمان ذو النورین رضی اللہ عنہ کے خون سے بالکل بری اور پاک تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں زیادہ صائب تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی کسی خطائے اجتہادی پر رب العزت کے ہاں مثاب وماجور ہوں۔ مگر احقر اپنے بزرگوں کی اتباع میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہی خلیفہ برحق مانتا ہے۔۔۔ سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا دامن حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے خون سے بالکل بری اور پاک تھا۔

(عبقات، ج:1، ص:182)

تاہم حضرت امیر معاویہؓ کی پھر حکومت کب سے شروع ہوئی؟ (جب کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں اور پوری سلطنت کے آپ (امیر معاویہ) والی ہیں، ہم جو حضرت معاویہ کو مانتے ہیں کہ) وہ مسلمانوں کے امیر تھے اور پوری سلطنت کے اپنے وقت میں خلیفہ تھے تو کب تھے؟ وہ دور جو حضرت علیؓ کا تھا اسے اس میں نہیں لاتے۔

تو یوں بات یاد رکھیں، کہ حضرت امیر معاویہؓ کا دور حکومت کل تقریباً چالیس سال ہے، بیس سال انکے تب جب وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ماتحت وہاں شام کے گورنر کے طور پر رہے، اور جب حضرت علیؓ کی خلافت تھی، تو حضرت معاویہ کا اس کے دوران کا وقت بھی مل جل کر انہیں بیس سال میں بنتا ہے۔ اور جب حضرت حسنؓ نے اپنی پوری خلافت ان کے سپرد کر دی، تو اب حضرت معاویہ کسی ایک علاقے کے سربراہ ہیں یا پوری سلطنت کے؟ (وہ اب پوری سلطنت اسلام کے سربراہ تھے)۔ تو پھر اب وہ اقتدار پر کتنا عرصہ رہے؟ (بیس سال)۔ تو بیس سال وہ اور بیس سال یہ، تقریباً چالیس سال بنتے ہیں، تو سب سے زیادہ حکومت کا دور انکا آیا، اب انکے بعد جو حالات ہوئے، یہاں سے اختلاف شروع ہوتا ہے اور پھر واقعہ کربلا کو سمجھنے کی ضرورت ہے، اگر آپ واقعہ کربلا کو اس سارے مبادی سے سمجھنا چاہتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے، تو آگے اس کا بیان ہو گا ان شاء اللہ۔

سوال جواب کی نشست

سوال:

آپ جب حضرت حسینؓ کا اتنا احترام سے نام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اہل بیت کو ماننے والے ہیں تو آپ ماتم کیوں نہیں کرتے؟ ان کے غم میں کیوں شریک نہیں ہوتے اور کیا یہ ماتم کرنا ان سے یا آگے ان کی اولاد سے منقول ہے؟

جواب:

تو سوال یہ ہے کہ کیا حضرت علیؓ اور انکی اولاد اور اہل بیت کے ائمہ کرام نے یہ سالانہ عزاداری کا طریقہ اختیار کیا تھا؟ اسلام میں سال گزرنے کے بعد اس کی یاد نہیں

منائی جاتی یعنی سال کا جو پیمانہ ہے اس پر واقعات تقسیم نہیں کیے جاتے۔ میں اشارتاً دو چار باتیں کہہ دیتا ہوں، کہ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش کب ہوئی؟ اس میں تاریخ کی کتابوں میں تقریبا دس بارہ اقوال ملتے ہیں، لیکن ہماری تحقیق یہ ہے کہ نو ربیع الاول کو ہوئی، لیکن کتنے اقوال ملتے ہیں؟ (دس بارہ) اس سے بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر حضور ﷺ نے یا صحابہؓ نے کبھی آپکی Birth Day منائی ہوتو کیا یہ اختلاف ہو سکتا تھا؟ (نہیں)

پھر تو تاریخ میں کوئی اختلاف نہ ہوتا یہ جو روایات میں اختلاف ہے، کہ وہ کب پیدا ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے، کہ عربوں میں واقعات کو اس طرح سال بعد دہرانے اور یاد رکھنے اور منانے کا کوئی عمل نہ تھا، انکی سوچ نہ تھی، انکا یہ پیمانہ دانش نہ تھا، لیکن یہاں ہمارے ہاں انگلینڈ میں بچوں کو اپنی برتھ ڈے زبانی یاد ہوتی ہے، اور پھر جب وہ وقت آتا ہے تو وہ اپنے گھروں میں کہتے ہیں، کہ میری برتھ ڈے آرہی ہے، تو ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہاں پابندی کے ساتھ دن منائے جاتے ہیں، کہ اب سال کے بعد دو سال کے بعد، تین سال کے بعد، برتھ ڈے آتی رہے گی، اور ہر سال آئیگی تو بچوں کو اسکی یاد ستائیگی، اور جب وہ موقع آئے گا وہ پھر اسکو منائیں گے، لیکن عربوں میں یہ مزاج نہیں تھا، آپ اندازہ کریں کہ اگر انکا یہ مزاج ہوتا تو حضور ﷺ کی پیدائش میں یہ بارہ اقوال ہوتے؟ (نہیں) دیکھیے حضور کو اللہ تعالی نے معراج کروائی معراج برحق ہے، لیکن معراج کی تاریخ کو بھی اگر کتابوں میں ڈھونڈیں کہ معراج کس تاریخ کو ہوئی، رجب کی کس تاریخ کو ہوئی، تو یہاں بھی پانچ سات اقوال ملتے ہیں، تو جو اللہ تعالی کے لائے واقعات کی یادیں اگلے سالوں میں منائے تو یہ طریقہ عربوں میں نہ تھا ہاں اللہ تعالیٰ جن دنوں کو بار بار لاتا ہے وہ بے شک ہر سال منائے جاتے ہیں، سال کے بعد وہ انہیں منائے تو وہ اللہ کا حکم ہے، مثلا اللہ تعالی ہر سال لیلۃ القدر لاتے ہیں، سال کے بعد، عید ہر سال کے بعد لاتے ہیں، رمضان ہر سال کے بعد لاتے ہیں، تو اللہ تعالی کے ہاں تو یہ نظام ہے کہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا (پ10، توبہ:36)

کہ اللہ کے ہاں گنتی ہے بارہ مہینوں کی تو اللہ تعالی رمضان بھی ہر سال لاتے ہیں کہ

نہیں؟ عیدیں بھی ہر سال لاتے ہیں کہ نہیں؟ لیلۃ القدر بھی ہر سال آتی ہے کہ نہیں؟ لیکن جو واقعہ ایک ہی دفعہ ہوا مثلاً معراج ایک ہی دفعہ ہوا، اسکو سال کے بعد دہرایا نہیں جاتا، پیدائش ایک ہی دفعہ ہوئی تاریخ میں اس کو منانے کا رواج ہی نہیں تھا، وفات بھی ایک ہی دفعہ ہوئی اسکو بھی منانے کا رواج نہیں تھا، تو ایک مزاج چلا آرہا ہے، تو اب یہ حضرت حسین کی جو شہادت ہے وہ محرم میں ہوئی، اور کربلا میں ہوئی۔ اس سے پہلے بڑی بڑی شہادتیں ہو چکی تھیں جیسا کہ حضرت حمزہ سید الشہداء، اور بدر کے شہداء اور احد کے شہیداء۔ لیکن شہادتیں منانے کا کوئی طریقہ نہیں تھا، اب یہ جو سوال کیا گیا ہے، کہ کیا آئمہ اہلبیت اور حضرت علی کی اولاد محرم میں عزاداری کی مجلسیں قائم کرتی تھیں؟ تو میں کہتا ہوں اسلام میں یہ مزاج ہی نہیں اور عربوں میں یہ عام مزاج ہی نہیں تھا۔ تو معلوم ہوتا ہے سوال کرنے والے انگلینڈ کے پروردہ ہیں، کہ جن کے ہاں برتھ ڈے وغیرہ بڑی یاد کے امور ہیں، تو میں بات کرتا ہوں عربوں کی کہ عربوں میں یہ رواج نہیں تھا۔

اب یہ سوال جو ہے کہ کیا حضرت علیؓ اور انکی اولاد یہ عزاداری کے جلوس نکالتے تھے؟ تو میں اسکا جواب نہیں دیتا کیوں کہ کسی کو ناراض تو نہیں کرنا، یہ انہی سے پوچھو جو کرتے ہیں، کہ وہ کرتے تھے کہ نہیں؟ ہم نے تاریخ میں کہیں نہیں پڑھا کہ حضرت علیؓ کی اولاد یا ائمہ اہل بیت میں یہ محرم کے موقعے منائے گئے ہوں، ہمارے دل حضرت حسینؓ کی مظلومیت میں ان کے ساتھ ہیں، ہمیں بڑا صدمہ ہے، ہمارے دل غم محسوس کرتے ہیں لیکن انہیں اپنا سالانہ عمل نہیں بناتے۔

ہندوؤں کا سیاپہ اور محرم کی سینہ کوبی

لیکن ایک ہے غم کا احساس ہونا، اور ایک ہے غم کو منانا، غم کو منانا کسے کہتے ہیں؟ میں نے بھی دیکھا ہے ہندوؤں کے دور کو تو ہمیں پتہ ہے، ہمارے ہمسائے ہندو بھی رہے، ہم نے انکے گھروں کو بھی دیکھا، انکی مذہبی رسوم کو بھی دیکھا، انکے ہاں یہ عقیدہ تھا، کہ جب کوئی مر جائے، تو مرنے والے کی روح گھروں میں بار بار آتی ہے، یعنی فوت شدگان کی روحیں گھروں میں آتی ہیں، تو یہ ہندوں کا عقیدہ تھا، اور یہ (ہندو) کہتے تھے کہ وہ نہ آئیں، تو اسکے

لئے عورتیں جمع ہوتی تھیں، اور کہتی تھیں کہ جو فوت ہو گیا، اب اس کا سیاپہ کرنا ہے، تو سیاپہ کیا تھا؟ کہ عورتیں دائرہ باندھ کر گھر میں کھڑی ہو جاتیں، اور وہ آہستہ آہستہ ہاتھ سروں پر مارتیں، اور پھر دو چار منٹ کے بعد اپنے آپ کی چھاتی کو کوٹنا مارنا شروع کر دیتی اور ہندو اسے کہتے ہیں سیاپہ کرنا، انکے ہاں یہ بہت بڑی نیکی ہے، اور اس کے ساتھ وہ جو روحیں آتیں ہیں، ان کو کہتی ہیں کہ ہماری یہ کتنی خیر خواہ ہیں، کتنے پیارے ہیں، کتنی خیر خواہ ہیں کہ میرے لئے آنسو بہا رہی ہیں اور کتنا خون بہا رہی ہیں، تو یہ سیاپہ کرنا انکا رواج تھا، جنہوں نے وہ دور پایا، اور جو لوگ اب انڈیا گئے ہیں انہوں نے انڈیا آتے جاتے وہاں یہ عمل بار بار دیکھا ہو گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سیاپہ کرنے والیوں سے بھی بچائے، اور سیاپہ کرنے والوں سے بھی بچائے، اب ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت حسینؓ کے اس شہادت کربلا پر یہ جو منظر پیش کیا جاتا ہے، یہ کیسا ہے، کیوں؟ ہم کسی کا نام نہیں لیتے اور کسی کا دل بھی نہیں دکھاتے، اور اس چٹ کا میں جواب نہیں دیتا، کہ حضرت علیؓ کی اولاد ایسا کرتی تھی کہ نہیں یہ ان سے پوچھو جو کرتے ہیں میں نہیں دیتا جواب، کریں وہ اور جواب ہم دیں، یہ کون سا انصاف ہے، ہم سے تو وہ پوچھو جو ہم کرتے ہیں۔

سوال:

کیا سوگ کی اجازت صرف تین دن تک ہے؟

جواب:

یہ اجازت صرف سوگ کی ہے، ماتم کی پھر بھی نہیں، کیوں کہ سوگ اکیلے ہوتا ہے، سوگ کے لئے مجلس نہیں کی جاتی، تو سوگ میں صرف اتنا ہے، کہ اگر کوئی شخص فوت ہو گیا، تو گھر والے کھانا نہیں پکاتے، وہ غم میں بھرے ہوئے ہیں، تو ان کے رشتہ دار یا ہمسائے ان کو کھانا کھلائیں اور تین دن تک یہ کریں، تو یہ تو ہے سوگ، اور تین دن کے بعد اللہ کی رضا پر راضی ہونے کا اعلان کریں، کہ جو گیا وہ تو گیا، اور جو رہ گیا، انہوں نے بھی جانا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، جانے والوں کے لئے انا للہ اور اپنے لئے وانا الیہ راجعون کہ ہم

نے بھی جانا ہے لہذا صبر کرو، تو سوگ کے کتنے دن ہیں؟ (تین دن) لیکن یہ اجتماعی ماتم کرنا کس طرح؟ مثلاً میں اگر آپکو کہوں کہ مؤمنین کرام! حضرت حسینؓ کے غم میں ہم صبح اتنے بجے روئیں گے، اس طرح اگر کسی مجلس میں اعلان کیا جائے، کہ ہم اتنے بجے روئیں گے تو یہ اجتماعی سوگ ہو گا یا انفرادی؟ (اجتماعی)، تو سوگ ہے لیکن انفرادی اسکو اجتماعی شکل نہیں دینی، بلکہ اللہ کی رضا پر راضی ہونا ہے۔ تو یہ وقت مقرر کر کے رونا کہ کتنی دیر روئیں گے وہ کہتا ہے میں اتنے بجے رؤں گا، تیسرا کہتا ہے نہیں میں تو اتنے بجے روؤں گا، تو وقت مقرر کر کے رونا اسکی تو ہمیں سمجھ نہیں آتی، یہ بھی انہی سے پوچھو جو ایسا کرتے ہیں، ہم کیوں جواب دیں۔ (1)

سوال:

قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ صف اول کے مسلمانوں میں ماتم کی مجلسیں کبھی منعقد ہوتی تھیں یا سوگ انفرادی طور پر ہی ہوتا تھا۔

---

(1) یہاں قارئین کے لیے اس عنوان پر حضرت مولانا عبد الستار تونسوی رحمہ اللہ سے کیے گئے ایک استفسار اور اسکے جواب کو بھی نقل کیا جاتا ہے:

سوال: اسلام میں کسی کی موت یا شہادت کے بعد کتنے عرصہ تک سوگ اور غمی کے باعث زیب وزینت ترک کرنے کی اجازت ہے؟

جواب: عورت کا خاوند فوت ہو تو اس کو چار ماہ دس دن تک حکم ہے کہ حالت سوگ میں رہے زیب وزینت نہ کرے خوشبو نہ لگائے اس کے علاوہ کسی کی فوتگی کے بعد تین دن سے زیادہ سوگ میں رہنے کی اجازت نہیں کہ زیب وزینت ترک کیا جائے اور شادی نکاح وغیرہ کو بھی ترک کیا جائے جیسے کہ بعض لوگ کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فلاں فلاں ایام اور فلاں مہینے میں شادی بیاہ نہ کرو کہ اس میں فلاں بزرگ کو تکلیف اور ان کی وفات اور شہادت ہوئی تھی کیونکہ اس طرح تو سارے سال کے کسی مہینے اور دن میں زیب وزینت شادی نکاح کرنے کی اجازت نہ مل سکے گی۔ کیونکہ سال کا کوئی دن ایسا نہیں کہ جس میں کسی نبی، صحابی، امام، ولی، غوث وقطب کی وفات یا شہادت نہ ہوئی ہو۔ تو اس قسم کے اوہام وظنون اور رسم ورواج کی اسلام میں کوئی حقیقت نہیں۔

(مجموعہ رسائل، رسالہ حقیقت ماتم: 203، ناشر: شعبہ نشر واشاعت تنظیم اہل سنت پاکستان)

جواب:

وہ میں نے تو بتادیا، ایک دفعہ ایک مجلس میں کسی ذاکر سے پوچھا گیا کہ یہ ماتھے کو پیٹنا کیسا ہے؟ تو ایک ذاکر کہنے لگے کہ یہ قرآن سے ثابت ہے، کہ ایسا کس نے کیا تھا؟ کہ جی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی نے کیا تھا۔ وہ کہاں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو بیوی ہاجرہ تھیں ان سے جو بیٹے تھے ان کا نام اسماعیل تھا۔ حضرت ہاجرہ کے بیٹے جن کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، ان کا کیا نام تھا؟(حضرت اسمعیل علیہ السلام) جو ہمارے عربوں کے جد اعلی ہیں، ہم ان کی اولاد ہیں۔ تو حضرت اسمعیل تو ہاجرہ کے بیٹے تھے، لیکن حضرت ابراہیم کی جو پہلی بیوی سارہ تھیں ان کا بچہ نہیں تھا۔(تو عورتوں کو بچہ ہونے سے بڑی خوشی ہوتی ہے) وہ ساری عمر محسوس کرتی رہیں، خاص طور پر سولہ سال تک یا غالباً چودہ سال تک کہ میرا بچہ نہیں۔(واللہ اعلم)

اللہ تعالیٰ کو منظور تھا، کہ ان کے ہاں بھی ہو گا تو فرشتے آئے، انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خبر دی، کہ آپ کی بیوی کے ہاں بچہ ہو گا، وَبَشَّرۡنٰهُ بِاِسۡحٰقَ نَبِيًّا(پ27، الصافات: 112) ہم نے ابراہیم کو بشارت دی کہ آپ کے ہاں بچہ ہو گا، اور وہ نبی بھی ہو گا۔ تو قرآن کریم میں ہے کہ حضرت سارہ حیران ہوئیں کیونکہ حضرت سارہ بوڑھی تھیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اسوقت کتنی عمر کے تھے؟(100سال)۔

اور جب حضرت اسمعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے تو اس وقت ان(حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی عمر غالباً 80 یا 87 سال کی تھی۔ خیر اسے چھوڑو۔

تو جب حضرت ابراہیم سو سال کے ہیں تو سارہ بھی تو بوڑھی عورت تھیں۔ جب خدا کے فرشتوں نے آکر پکارا، کہ ان کے ہاں بیٹا ہو گا، تو عورتیں جب حیرانی کی بات سنتی ہیں تو کیا کرتی ہیں؟(انگلی اپنے ہونٹوں پہ رکھتیں ہیں) تو یہ انگلی جب اٹھتی ہے تو تعجب کے لئے ہوتی ہے، یہ ہو گا، ءَاَلِدُ، کہ کیا میں بچہ جنوں گی!؟ کچھ اپنی عمر کا احساس تمنا، جو خاص طور پر پوری ہونے کی تمنا ہوتی ہے، لیکن جب وہ پوری ہونے کے قریب ہو تو تعجب ہی ہو تا ہے تو قرآن پاک نے کہا فَصَكَّتۡ وَجۡهَهَا کہ حضرت ابراہیم کی بیوی نے اپنے چہرے پر ہاتھ مارا

تو جو ہاتھ مارا وہ تعجب کے ساتھ تھا یا ماتم کے لئے ؟(تعجب کے ساتھ)، اس طرح کوئی تعجب کرے، اور انگلی اٹھائے یا ماتھے پر ہاتھ مارے، تو وہ ہاتھ مارنا تعجب ہوتا ہے یا ماتم کے لئے ؟ بولو!(تعجب کے لئے) یہ تعجب ہے غم تو نہیں۔ تو شیعہ ذاکر کہتے ہیں ہم نے یہاں سے لیا ہے پیٹنا۔

تو میں کہا کرتا ہوں کہ بھائی اختلاف سے بچو۔ تمہارے ہاں بھی جب بچوں کی بشارت ہو تو پیٹا کرو تو ہم اعتراض نہیں کریں گے، لیکن حتی الوسع کام وہی کرو جو پہلے سے ملے، لیکن کسی کی وفات پر پیٹنا، فرمایا نبی پاک ﷺ نے من ضرب الخدود جس نے چہرے پر ہاتھ مارے غم میں، وشق الجیوب اور کپڑے پھاڑے غم میں، ودعا بدعوی الجاھلیۃ اور ہائے ہائے کیا، فلیس منا حضور فرما گئے وہ ہم میں سے نہیں، تو ہم بھی کہتے ہیں کہ جو یہ کریں وہ ہم میں سے ؟(سامعین: نہیں) ہم یہ تو اس وقت نہیں کہتے کہ وہ اپنی مردم شماری علیحدہ کرائیں کاغذات میں انکا نام علیحدہ ہو، ان باتوں میں ہم پڑتے نہیں لیکن حضور ﷺ نے فرمایا:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الخُدُودَ، وَشَقَّ الجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الجَاهِلِيَّةِ»

(صحیح بخاری جلد ۲، ص ۸۲ باب لیس منا من ضرب الخدود)

اور حضرت حسینؓ بھی جب میدان کربلا میں شہید ہونے کے لئے نکلے، تو انہوں نے اپنی بہن کو نصیحت کی، جو انکی کتابوں میں مذکور ہے، اپنی بہن کو کہا اے خواہر گرامی، اے میری عزت والی بہن، میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ جب میں اگلے جہاں چلا جاؤں، تو اپنے منہ کو پیٹنا نہیں، اور کپڑوں کو پھاڑنا نہیں، بلکہ اللہ تعالی کے فیصلوں پر رضامندی کا اظہار کرنا ہے (جلاء العیون ص 327)، اور بہن میں تجھے وہی بات کہتا ہوں، جو میرے نانا نے اپنے آخری سفر میں وفات سے پہلے حضرت فاطمہؓ کو کہی تھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جب یہ وصیت حضور ﷺ نے کی جو حضرت حسینؓ اپنی بہن کو کر رہے ہیں تو تاریخ نے ان سب کو محفوظ کر لیا ہے، تو اہل بیت کے اور حضرت علی المرتضیٰؓ کے جان پہچان میں وہی طریقے

تھے جن کو آج کل اہل سنت کے طریقے کہتے ہیں، اور ہمارا دعوی ہے کہ صحابہؓ اور اہل بیتؓ سب ایک ہی عقیدے کے تھے، اور سب اہل سنت والجماعت تھے، ان میں سے کوئی بھی اہل سنت سے باہر نہیں ہو گا، اور ہم یقین رکھتے ہیں، کہ جب امام مہدی آئیں گے، وہ بھی اہل سنت والجماعت کے عقیدے پر ہوں گے، وہ جوڑنے والے ہوں گے، توڑنے والے نہیں ہوں گے۔ اس وقت جوڑنے والے کون ہیں؟ جو صحابہ اور اہل بیت دونوں کو اکھٹا مانتے ہیں وہ جوڑنے والے ہیں، اور جو کہیں کہ نہیں ایک کو مانیں گے دوسرے کو نہیں، آپ اتنا تو سمجھتے ہیں کہ توڑنے والے وہ ہوئے یا ہم؟[1]

---

(1) اہل سنت کے نزدیک صحابہ و اہل بیت رضی اللہ عنہم دونوں کی تعظیم ضروریات مذہب حقہ میں سے ہے اور یہ دونوں اہل سنت کے لیے ایمان کی دو آنکھیں سمجھی جاتی ہیں۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حب اہل بیت وحب صحابہ ایمان کے دو پر ہیں

اہل بیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے حق میں چشم و چراغ ہیں، ہمارے نزدیک اعتقاد اصحاب اور حب اہل بیت دونوں کے دونوں ایمان کے لئے بمنزلہ دو پر کے ہیں، دونوں ہی سے کام چلے ہے، جیسے ایک پر سے طائر بلند پرواز نصف پرواز تو کیا ایک بالشت بھی نہیں اڑ سکتا، ایسے ہی ایمان بھی بے ان دو پروں کے سہارے کے موجب فوز مقصود (جس کی طرف "اولئك هم الفائزون" یا "فاز فوزا عظیما" وغیرہ میں اشارہ ہے) نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا ایمان ایسا ہی ایمان ہے جس کا آیت "لا ینفع نفسا ایمانها" میں بیان ہے۔ ہاں اگر ہم قدم بقدم حضرات شیعہ ہوتے تو جیسے انہوں نے موافق مثل مشہور غیروں کی بت شگنی کے لیے اپنی ناک کاٹ لی، سنیوں کی ضد میں اصحاب کرام کو برا کہہ کر اپنے ایمان کا زیان کیا، ہم بھی شیعوں کی ضد میں نعوذ باللہ اهل بیت رسول صلی وسلم کو برا کہہ کر مثل خوارج و نواصب اپنے ایمان کو خراب کرتے لیکن ہم کو تو پابندی عقل و نقل سے نہ چاری ہے شیعہ تو نہیں کہ مثل شتر بے مہار پراگندہ رفتار جائیں۔

حب اہل بیت وحب صحابہ ایمان کی دو آنکھیں ہیں:

راہ کی بات تو یہ ہے کہ ہم کو دونوں فریق بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں، کس کو چھوڑیں جس کو

سوال:

فقہ جعفریہ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے کسی میں یہ ہے کہ ہر سال کے بعد عزاداری کے جلوس نکالے جائیں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی یاد میں؟

جواب:

بھائی ہمیں یہ مسئلہ کہیں نہیں ملا کہ ہر سال اس کے لئے جلوس نکالے جائیں۔[1]

پھوڑیں اپنا ہی نقصان ہے بلکہ جیسے کوئی حسین متناسب الاعضاء ہو کہ اس کی آنکھ ناک سب کی سب مناسب اور متناسب ہوں اور پھر اسکی ایک آنکھ بیٹھ جائے تو دوسری آنکھ کی زیب بھی جاتی رہے گی اور اس پر اگر بیٹھی ہوئی آنکھ کے حصہ کی فراخی بھی دوسری ہی آنکھ میں آجائے اور اس میں بجائے سپیدی بھی سیاہی چھا جائے ش بجائے حسن ایسا قبیح المنظر ہو جائے کہ دلدادگان قدیمی اور عاشقان صمیمی بھی اس کی صورت پڑھنے لگیں خاص کر دوسری آنکھ جو باقی رہی ہے بسبب اس کے کہ اپنے اندازہ سے زیادہ فراخ اور کشادہ اور سپیدی کی جا بھی سیاہی ہی ہو گئی ہے، ایسی بری اور بدشکل ہو جائے گی کہ کچھ نہ پوچھو بلکہ اگر چشم باقی ماندہ کو شعور اور اختیار ہو تو اپنی حالت اصلی پر آجائے اور دوسری آنکھ کو بھی بدستور قائم کر دکھلائے کیونکہ اپنا حسن بھی اصلی کیفیت اور دوسری آنکھ کی معیت میں ہے۔

شیعوں نے اپنے ایمان کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی:

سو بعینہ یہی قصہ حضرات شیعہ کے ایمان کے ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اعتقاد صحابہ اور اہل بیت جو بمقتضائے شہادات کلام اللہ اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے لئے بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں۔ چنانچہ رسالہ ہذا کے ملاحظہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہ رہے گا ان دونوں آنکھوں میں سے شیعوں نے ایک آنکھ کو پھوڑ دیا اور اس کے حصے کی فراخی اور کشادگی بھی بلکہ اس سے بھی زیادہ دوسری آنکھ کو دے کر اس کو خراب کر دیا۔ یعنی اعتقاد صحابہ کو جو بمنزلہ چشم ایمان ہے اپنے ہاتھوں کھو کر دوسری آنکھ یعنی اہل بیت کو اس قدر بڑھایا کہ صحابہ کے حصے کی محبت بھی انہی کے لیے صرف کر دی پھر جیسے کہ آنکھ میں سفیدی کی جا بھی سیاہی آجائے ان حضرات بزرگوار فرقہ مسمی بشیعہ نے بھی ایسا ہی کیا۔

(ہدیۃ الشیعہ: 236۔ ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

(1) ان مذکورہ سوالات کی طرح ایک سوال تعزیہ نکالنے کے متعلق بھی سامنے آتا ہے۔ اس سوال اور

اسکے جواب کو ہم مولانا عبد الستار نو تسوی رحمہ اللہ کے رسالہ "حقیقت ماتم" سے یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

سوال: کیا تعلیمات قرآنیہ اور ارشادات نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال و افعال ائمہ کرام علیہم السلام میں تعزیہ سازی کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور یہ کچھ نیکی اور ثواب کا کام بھی ہے؟

جواب: قرآن مجید اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال و افعال ائمہ اہل بیت میں اس کا ذرہ بھر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور یہ بالکل بے اصل اور بے بنیاد رسم ہے۔ کیونکہ دین تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کامل و مکمل ہو چکا تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ:3)

جناب نبی علیہ السلام اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ائمہ اہل بیت عظام کے صدیوں بعد یہ رسم امیر تیمور کے زمانہ میں ایجاد کی گئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کئی سو معصوم انبیاء علیہم السلام اللہ تعالی کے دین کے لیے شہید ہو چکے تھے۔ مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مظلوم و معصوم شہید انبیاء علیہم السلام کے لئے کوئی تعزیہ اور ماتم و نوحہ کا طریقہ جاری نہ فرمایا۔ پھر آپ صلی وسلم کی مقدس زندگی میں بڑے بڑے جلیل القدر مہاجر و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کفار کے مقابلہ میں بدر، احد، احزاب، خیبر وغیرہ میں دین اسلام کی خاطر بھوکے پیاسے مظلومانہ شہید ہوئے۔ حتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اسد اللہ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اللہ تعالی کی راہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہوئے۔ مگر ان حضرات کی عالیشان شہادت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی رضی اللہ عنہ انہوں نے کبھی کوئی تعزیہ اور ماتم وغیرہ کا طریقہ جاری نہ کیا۔ اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے سب سے بڑی مصیبت و صدمہ کی بات یعنی حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد تعزیہ، نوحے، ماتم کا کوئی طریقہ جاری نہ کیا۔ اسی طرح حضرات حسنین کریمین نے سیدنا علی المرتضی کی شہادت کے بعد تعزیہ اور ماتم و نوحے کی رسم کو جاری نہ کیا اور حضرت امام زین العابدین اور حضرت محمد باقر اور حضرت جعفر صادق اور حضرت موسی کاظم اور حضرت علی رضا اور حضرت محمد تقی اور حضرت علی نقی اور حضرت حسن عسکری رحمہم اللہ اجمعین نے نہ کبھی تعزیہ بنایا اور نہ کبھی کسی کو بنانے کا حکم فرمایا۔ قرآن شریف اور حدیث پاک اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام پر ایمان و عقیدت رکھنے والوں کے لئے فرض ہے کہ وہ انکے ارشادات کی پیروی کر کے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوں اسی میں حقیقی

پاکستان یا انڈیا کی بات ہے کہ ایک صاحب تھے، وہ اہل سنت بھائیوں کو کہتے ہیں کہ ہم جب پیٹتے ہیں تو ہاتھ ہمارے ہوتے ہیں، چھاتیاں بھی ہماریں ہوتی ہیں، اور سر بھی ہمارے ہوتے ہیں تو جو ہم غلط یا صحیح کرتے ہیں تو تم لوگ کیوں ناراض ہوتے ہو؟، عقیدہ ہمارا، زبانیں ہماریں، چہرے ہمارے، اور چھاتیاں ہماریں، تو ہم غلط کرتے ہیں یا صحیح، تم ناراض کیوں ہوتے ہو؟ تو ہمارے ایک بزرگ حضرت مولانا سید نورالحسن شاہ بخاریؒ ملتان کے تھے اور پیچھے ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے تھے، تو انہوں نے ایک بہت اچھا جواب دیا، انہوں نے کہا کہ حضور! پھر فرمائیں، آپ نے کیا کہا؟ پھر انہوں نے دہرایا کہ آپ نے یہی کہا کہ ہاتھ ہمارے، چہرے ہمارے، چھاتیاں ہماریں تو اس پر ناراض کیوں ہوتے ہو؟ تو شاہ صاحب رحمۃ اللہ نے اس صاحب کو عجیب جواب دیا، آپ نے کہا پھر یہ بھی کہو کہ

- ہاتھ ہمارے،
- چہرے ہمارے
- چھاتیاں ہماریں

اور محلے بھی ہمارے۔ جب محلے بھی تمہارے اپنے ہوں جہاں یہ جلوس نکلا کریں پھر تو ہو جائے گا امن، اور اگر یہ کہو کہ چہرے ہمارے، چھاتیاں ہماریں، ہاتھ ہمارے، اور محلے تمہارے، تو پھر یہاں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے، تو اگر محلے دار کہتے ہیں، کہ نہیں آپ یہ اظہار ہمارے سامنے نہ کریں، تو جب آپ پیٹتے ہیں، تو ہمیں گمان ہوتا ہے، کہ شاید یہ ہمیں ہی کوٹ رہے ہیں، سمجھ اپنی اپنی ہے خیال اپنا اپنا ہے، تو شاہ صاحب نے عجیب جواب دیا کہ جب کہتے ہیں ہمارے ہمارے تو پھر یہ بھی کہو کہ پھر علاقے بھی ہمارے، اور محلے بھی ہمارے، دوسروں کے محلوں میں جا کر کہنا، کہ نہیں عقیدہ تو ہمارا ہے، عمل بھی ہمارا ہے،

کامیابی اور نجات ہے اور یہی جنت کا راستہ ہے۔ اور اس کے علاوہ ایک جدید راستہ اور رسم و رواج دین میں جاری کرنا خدا اور رسول اور آئمہ علیہم السلام سے اپنے آپ کو زیادہ علیم حکیم اور زیادہ معاملہ فہم سمجھنا ہے گویا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ دین ہمارے لئے اس نیکی کو نہ سمجھ سکے اور ہم نے خود سوچ لی ہے۔ سبحن ربك رب العزة عما يصفون۔ (حقیقت ماتم: 201)

رسم بھی ہماری ہے۔۔۔پر ٹھڑا تمہارا ہے، تمہارے دروازوں پر آکر ہم یہ کریں گے، تو پھر تو زیادتی ہے۔

یہاں سوچنے کی ضرورت ہے کہ جب کتابوں میں کوئی طریقہ ہو جیسا کہ اب نماز ہے، اس کا طریقہ تو کتابوں میں ہے اگر یہ جلوس نکالنا بھی کوئی دینی کام ہوتا، تو اسکا طریقہ بھی کتابوں میں لکھا ہوتا۔

تو میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ میں نے بات کو شروع سے اٹھا کر یہاں تک پہنچایا، آپکو یہ تو معلوم ہو گیا کہ حضور ﷺ کے بعد آپ کی سیاسی جانشینی کیسے چلی؟ اس کے بعد پھر کیسے چلی، پھر اس کے بعد کیسے چلی۔ اب ہم اس پر آئے کہ امیر معاویہؓ کا دور حکومت تقریبا بیس سال رہا، جس میں وہ پوری سلطنت اسلامی کے امیر تھے، امیر المؤمنین تھے۔ انکی جب وفات قریب ہوئی اس کے بعد پھر یہ زمانہ شروع ہوتا ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔

اللہ تعالی نے توفیق عطا فرمائی تو پھر ان شا اللہ اگلی مجلس میں بات کو آگے چلائیں گے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ



حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

حضرت حسین صحابی ہیں اور بلاشبہ صحابی ہیں صاحب روایت معانی ہیں اور اہل بیت صحابی ہیں تو بلاشبہ وہ تمام آثار ولوازم صحابیت اور تمام حقوق ان کے لئے ماننے پڑیں گے جو کتاب و سنت نے مقام صحابیت کے لئے ثابت کئے ہیں اور ہمیں تاریخی طور پر نہیں بلکہ بطور عقیدہ کے اس پر ایمان لانا پڑے گا کہ سیدنا حسین بوجہ صحابی ہونے کے متقن عدول پاک باطن صاف ظاہر محبت جاہ ومال سے بری ہوس اقتدار سے بالاتر اور تمام ان رذائل نفس سے پاک تھے جو ان مقدسین سے بنص کتاب و سنت دھو دیئے گئے پھر حضرت حسین نہ صرف صحابی رسول ہیں بلکہ قرابت نبوی کی خصوصیت سے بھی مالامال ہیں جو اہل بیت کا مخصوص حصہ تھا اور اس کی بناء پر ان کی قلبی تطہیر اور رجس و نجس باطن سے پاکی اور بھی زیادہ مؤکد ہو جاتی ہے... اور قلبی تطہیر کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ قلب دنیاوی رذائل حب جاہ ومال اور ہوس اقتدار و ریاست سے بری ہو جائے اور آدمی عبد الدینار وعبد الدراہم نہ رہے اس لئے حضرت حسین کے صحابی ہونے کے علاوہ اہل بیت میں سے ہونے کی وجہ سے بھی بلاشبہ ان کا ان رذائل سے قلب پاک اور بری مانا جانا بطور عقیدہ کے ضروری ہے۔

(شہید کربلا، ص:۷۸)

چوتھی رات (مجلس 4)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِہٖ (پ:5، النساء: 58)
صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

اللہ تبارک وتعالیٰ جل جلالہ وعم نوالہ نے، جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت پر، آپ کی تشریف آوری پر، عرب میں ایک ایسا انقلاب قائم کیا کہ پوری دنیا ہل گئی، صحرائے عرب میں جہاں جنگل کے طور پر لوگ زندگی گزارتے تھے، اور کوئی باقاعدہ نظام حکومت پہلے عرب میں تھا ہی نہیں، باقی ملکوں میں تو سلطنتیں تھیں، حکومتیں تھیں جیسا کہ مصر میں تھی، شام میں تھی، یمن میں تھی، ہر جگہ کوئی نہ کوئی نظام تھا۔ ایران کی حکومت بھی صدیوں سے چلی آرہی تھی، لیکن عرب میں کوئی حکومت نہیں تھی۔ بالکل صحرا تھا، لوگ جنگل جیسی زندگی بسر کرتے تھے، اللہ تعالی نے چاہااور فاران کی چوٹیوں سے آفتاب رسالت محمدی ﷺ طلوع ہو گیا، اور آپکی تشریف آوری سے آپ کی بعثت سے، چونکہ پوری دنیانے روشن ہونا تھا، اس لئے اللہ تعالی نے اس کے لئے زمین بھی وہ چنی، جہاں پہلے کوئی بادشاہ ہوا ہی نہ ہو۔ یہاں پہلا بادشاہ یہی ہے، اور پہلا بھی وہی ہے جو آخر تک ہوا، تو یہ اتنا بڑاانقلاب ہے۔ جو حضور ﷺ کے ذریعے عرب میں آیا۔

پچھلی مجلس میں جو بیان ہو رہا تھا اس کے آخر میں یہ بات ہوئی کہ حضور ﷺ عرب میں اس طرح چمکے کہ چند گنتی کے سالوں میں پورے عرب میں انقلاب آگیا، اس پیغمبر کے

ذریعہ بہت بڑا انقلاب آیا۔

جب حضور ﷺ کا سفر آخرت قریب تھا، تو پوری دنیا سوچ رہی تھی، کہ اب اس پیغمبر کا کام آگے چلانے والا کون ہو گا؟ دستور زمانہ ہے، اور قبائل میں یہ رسم چلی آرہی تھی، کہ باپ کے چھوڑے ہوئے کام بیٹے مکمل کرتے ہیں۔

ایک سوال

عرب میں جو جنگیں ہوتی تھیں تو جنگیں لڑنے والے، طول وطویل جنگوں سے جب گزرتے تو ان کی وفات کے بعد ان جنگوں کے وارث ان کی اولاد بنتے، جب وہ مرتے تو ان کی اولاد بنتے، پھر وہ میدان میں لڑتے اور تڑپتے، سو ایک عجیب میدان تھا۔ لیکن اس پیغمبر انقلاب کے "انقلاب" کے بعد اور جب آپ کا سفر آخرت قریب تھا، سوچنے والے اس سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، کہ آپؐ کے بعد آپؐ کا جانشین کون ہو گا جو اس کام کو سنبھالے!!

یہودی اپنے طور پر خوش تھے کہ ان کا بیٹا تو کوئی نہیں جو آگے کام سنبھالے گا، رسم زمانہ یہی چلی آرہی تھی کہ بیٹے باپ کا کام سنبھالتے ہیں، تو یہود مطمئن تھے کہ کوئی نہیں سنبھالے گا، لیکن جس ذات نے حضور ﷺ کے ذریعہ ایک ایسا انقلاب عرب میں قائم کر دیا، اس ذات نے اسے سنبھالنے کا انتظام بھی کیا کیونکہ یہ نظام الٰہی تھا۔

جواب

تاہم سوال تھا کہ اب پیغمبر کی جانشینی کیسے چلے گی؟ جواب: یہ اب اولاد میں نہیں آپ کی امت میں چلے گی اور آپ کی امت اتنی بڑی ہو گی کہ اب قیامت تک اور کوئی نئی امت نہ بنے گی کیونکہ اب نہ کوئی پیغمبر پیدا ہو گا نہ کوئی نئی امت بنے گی، اس لیے اب قیامت تک یہی امت رہے گی۔

جانشین کا انتخاب

گزشتہ کل مضمون اس پر ختم ہوا تھا کہ حضور ﷺ کی جانشینی کا نام "خلافت" ہے۔

تو خلافت کے بارے میں اب تک عام لوگوں کے ذہن میں یہی بات چلی آرہی تھی، اور یہی چلی آرہی ہے، کہ آپ کا جانشین کون ہو؟ ایک طبقہ اب تک محرم کی مجلسوں میں بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ حضورؐ کی جانشینی آپ کے اپنے گھر والوں (اہل بیت) میں چاہیے تھی۔ انہوں نے

- اپنی تاریخ کی
- اپنی فکر کی
- اپنی سوچ کی
- اور اپنے بیانات کی

بناء ہی اس پر رکھی ہے کہ پیغمبر انقلاب، جس نے اتنا بڑا انقلاب قائم کیا، اب ان کی جانشینی ان کے اپنے خاندان میں ہی ہو، یہ ان کا خیال ہے، ہم اس وقت کسی پر جرح نہیں کرتے، لیکن اپنے ساتھیوں کو تاریخ کی طرف توجہ دلاتے ہیں، کہ اسوقت سے یہ بات ان لوگوں میں چلی آرہی ہے، کہ جانشینی اپنے گھر میں چاہیے تھی، اب آپ حضرات خود سوچیں کہ قرآن پاک کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کی جانشینی آپکی امت سنبھالے گی، اس کے دلائل قرآن کریم میں کہاں کہاں پھیلے ہیں کہ حضور کی جانشینی، حضور کی ذمہ داری، حضور کا کام آپکی امت سنبھالے گی، یہ قرآن پاک سے سبق ملتا ہے، اور اللہ تعالی نے توفیق عطا فرمائی تو میں بائیسویں پارے سورہ الاحزاب سے اس چیز کو پیش کروں گا۔

انتخاب جانشینی میں دو نظریئے

بہر حال یہ دو نظریے پائے جاتے ہیں، کہ پوری دنیا میں انقلاب لانے والا ایسا پیغمبر پھر جس کے بعد کسی نئے پیغمبر نے نہیں آنا، جو دنیا کو چین سکھ مہیا کرنے میں، رحمۃ للعالمین کہلایا۔ اللہ تعالی نے ختم نبوت کا جس پر تاج رکھا، اس کا جانشین، آیا گھر میں سے ہو گا (فیملی میں سے؟) یا امت میں سے؟ سوال سادہ سا ہے لیکن بڑا گہرا سوال ہے، کہ جانشین کن میں سے ہو؟ اپنی فیملی میں سے یا امت میں سے؟

دنیا میں یہ چیز معلوم ہے، کہ کسی شخص کو جاننے پہچاننے والے اس کے ساتھی ہوتے

ہیں، جو اسکے ساتھ ہوں یا اسکے بچے ہوتے ہیں؟ آپ کی اپنی کارکردگی سے زیادہ آشنا کون ہے؟ جو آپکے دائیں بائیں آگے پیچھے کے ساتھی ہیں۔ اور جو اپنے بچے ہوتے ہیں وہ تو Next Generation ہیں اور اپنے ماں باپ وہ پہلی جنریشن ہیں۔ تو نہ پہلی جنریشن اتنی آشنا ہوتی ہے اور نہ اگلی جنریشن اتنی آشنا ہوتی ہے۔ جاننے والے آگے پیچھے دائیں بائیں ساتھی ہوتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے دنیا میں جو انقلاب قائم کیا اس میں آپ کے ساتھی کون سمجھے جائیں گے؟

- جو بدر میں
- جو احد میں
- جو احزاب میں
- جو خیبر میں

جو ہر مقام پر آپ کے ساتھ چلنے والے تھے۔

کسی کے متعلق معلومات لینی ہو تو اس کے ساتھیوں سے لو

آیا حضور ﷺ کا کام، آپ کا چھوڑا ہوا کام، حضور کا نظام، اس کو چلانے کے لئے جانشین کہاں سے چاہیے؟ ساتھیوں میں سے یا اولاد میں سے؟(سامعین: ساتھیوں میں سے) آپ کی بصیرت، آپ کی فکر، آپ کی سوچ کیا فیصلہ کرتی ہے؟ بھائی خود سوچیں۔

دستور زمانہ

ایک بات یہاں یورپ میں عام کہی جارہی ہے، کیا محاورہ ہے یہاں؟ کہ:

Man is known by the society he keeps

آدمی اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے، انسان اپنے ساتھیوں سے جو اپنے ساتھ چلے ہوں یا جن کے ساتھ واسطہ پڑا ہو، اور صرف یہ یورپ کی آواز ہی نہیں کہ

Man is known by the society he keeps

عربوں میں بھی یہی مقولہ چلا آرہا ہے کہ:

عَنِ الْمَرءِ لَاتَسْئَلْ وَاَبْصِرْ قَرِیْنَهٗ
فَاِنَّ الْقَرِیْنَ بِالْمُقَارِنِ یَقْتَدِیْ"

عرب کہتے ہیں عَنِ الْمَرءِ لَاتَسْئَلْ کسی آدمی کے بارے میں نہ پوچھو کہ وہ کیسا ہے، یہ دیکھو کہ اس کے ساتھی کیسے ہیں۔[1]

پچھلے زمانے میں دستور تھا، کہ جنہوں نے لڑکی کے لئے کوئی رشتہ تلاش کرنا ہوتا تو وہ مختلف جگہ سے معلوم کرنے کی کوشش کرتے کہ اس لڑکے کا اٹھنا بیٹھنا کن کے ساتھ ہے، اس کے ساتھی کیسے ہیں، تو بیٹی کی شادی کرنی ہو تو لڑکے کو پہچاننے کے لئے لڑکے پر زیادہ محنت نہیں ہوتی، اس کے ساتھیوں کو دیکھا جاتا ہے، ایسا ہوتا ہے کہ نہیں؟

کسی جگہ پوچھا گیا کہ لڑکے کے ساتھیوں کو دیکھتے ہیں یا اس کو دیکھتے ہیں، تو اسکا جواب بڑا عجیب دیا، بہت طبیعت خراب ہوئی، کہنے لگے یہاں دیکھتے ہی نہیں اور ماں باپ کو نوبت ہی نہیں آتی، بلکہ بچے خود ہی فیصلے کر لیتے ہیں، وہ زمانہ گیا جس تاریخ پر ہم ناز کرتے ہیں، جن پر انسانیت ناز کرتی ہے، وہ زمانہ گیا۔ خیر یہ تو رواج زمانہ ہے، اس کو چھوڑو۔

لیکن میں اصولی طور پر کہتا ہوں، کہ لڑکے کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، بلکہ ان کے دوست اور ساتھیوں سے پوچھتے تھے، کہ اس کا کیسے اور کن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے، پھر فیصلہ کرتے تھے۔ ایک عرب کہتا ہے، عَنِ الْمَرءِ لَاتَسْئَلْ کسی انسان کے بارے میں جاننا ہو تو اس کے بارے میں نہ پوچھو "وَاَبْصِرْ قَرِیْنَهٗ" اس کے دوستوں کو دیکھو، فَاِنَّ الْقَرِیْنَ بِالْمُقَارِنِ یَقْتَدِیْ ساتھی ساتھیوں کے ساتھ چلتے ہیں، پرندے اپنے ہم جنس میں اڑتے ہیں اور وہیں سے پہچانے جاتے ہیں۔

۞ کبوتروں کی پرواز اپنے ساتھیوں میں

۞ طوطوں کی پرواز اپنے ساتھیوں میں

تم نے پرندوں کو دیکھا کہ وہ اڑتے ہیں، تو اپنے پیرائے میں۔ جنگلوں میں جانور

---

(1) اسی طرح ایک روایت بھی ہے: المرء علی دِینِ خلیلِهِ فلینظُرْ أحَدُ کم مَن یخالِلُ
(رواہ أبو داود، ترمذي، احمد)

پھرتے ہیں، تو اپنے پیرائے میں۔ انسان پہچانے جاتے ہیں تو اپنے دوستوں میں۔ محمد مصطفیٰ ﷺ بھی پہچانے جائیں گے تو صحابہ میں پہچانے جائیں گے۔ سو جس پیغمبر نے ساری دنیا میں انقلاب کھڑا کیا اس کا جانشین کون ہو؟ وہ ان میں سے ہو جن لوگوں میں اس نے زندگی گزاری، جن میں رہے، اٹھے بیٹھے۔ تاہم عقل سوال کرتی ہے، تاریخ پوچھتی ہے، کہ ایک طبقہ یہ کہتا ہے، کہ پیغمبر کا جانشین فیملی میں سے ہو۔

مگر حدیث رسول ﷺ کہتی ہے اور تجربہ بھی یہ کہتا ہے کہ حضور کے جانشین آپ کے خاندان میں سے ہوں۔ حضور ﷺ خاندانِ قریش میں سے تھے اور حضور نے یہ بھی ارشاد فرمایا: اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ [1] سو چاہیے کہ آپ کے جانشین قریش میں سے ہوں۔ اس لیے چاروں خلفاء راشدین قریش میں سے تھے اور آپ کے ساتھیوں میں سے تھے، جنھوں نے آپ کے ساتھ مل کر کام کیا، تو جب سوال کیا گیا کہ جی ساتھیوں میں سے ہو یا فیملی میں سے؟ کہ پیغمبر کا جس کے ساتھ Blood relation پر

- خون کا رشتہ ہے
- خاندانی رشتہ ہے
- انسانی بصیرت کا فیصلہ

ان میں سے ہو یا جن کے ساتھ آپ رہے اٹھے بیٹھے سارے کام کیئے؟ انسانی بصیرت پوچھتی ہے، اور آپ بھی سوچیں، کیا آپ کا ذہن اندر سے کوئی جواب نہیں دے رہا؟ گو بول میں رہا ہوں، لیکن آپ کا ذہن بھی اندر سے جواب دے رہا ہے، کہ کیا جواب ہونا چاہیے "ہے" یا نہیں؟ (سامعین: ہے) میں آپ سے پوچھتا نہیں، لیکن میں آپ کی باطنی آواز کو اور اندر کی صداء کو آواز دیتا ہوں، ذرا غور کرو اُن میں سے چاہیے یا اِن (ساتھیوں) میں سے؟ مجھ سے جب ایسا سوال کیا گیا تمثیل کے طور پر کہہ رہا ہوں تو میں نے نہ جواب دیا اِدھر، اور نہ جواب دیا اُدھر، وہ کہیں جی آپ بتائیں کہ فیملی میں سے ہو یا دوستوں میں سے؟

(1) اس حدیث کی شرح اور صحیح تفہیم کے لیے حضرت علامہ صاحب کی کتاب "دوازدہ احادیث" میں حدیث نمبر 4، اور کتاب "عبقات" جلد اول کی مراجعت فرمائیں۔

پیغمبر ﷺ کا جانشین کون ہو؟

میں مثال آپ کے سامنے لارہا ہوں، سوال کیا گیا کہ جانشین پیغمبر کا کن میں ہونا چاہیے؟ فیملی میں یا ساتھیوں میں؟ جب مجھ پر سوال ہوا، تو میں نے کہا اس کا جواب میں نہیں دیتا، نہ اِن کی بات ہے نہ اُن کی، بعض اوقات فیملی میں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں، جو قابلیت میں جانشین بن سکیں، اور ساتھیوں میں بھی ہر طرح کے لوگ ہیں۔ حضور ﷺ کے ساتھیوں میں جہاں اور بڑے بڑے لوگ تھے وہاں حضرت بلال حبشیؓ بھی تھے، جو عرب کے تھے ہی نہیں، حضرت صہیب رومیؓ بھی تھے جو عرب کے ہے ہی نہیں، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی تھے جو عرب کے ہے ہی نہیں، تو ساتھی ہونا بھی تو کافی نہیں ہوتا، جب سوال کیا گیا کہ خلافت میں پیغمبر کا جانشین کہاں سے ہونا چاہیے، فیملی سے یا دوستوں سے، تو میں نے کہا اس کا جواب مجھے آتا ہی نہیں، جب جواب نہیں آتا تو بجائے کہ میں دوں یا آپ کو کہوں کہ آپ جواب دیں، میں خود قرآن سے کیوں نہ پوچھوں؟ قرآن کیا کہتا ہے؟ بھائی جب مجھے جواب نہیں آتا، تو میں اپنے قیاس کے ساتھ اٹکل پچو کیوں بیان کروں، حالات کا احتمال ہے اِدھر بھی، اور اُدھر بھی، بات اِدھر بھی جاسکتی اُدھر بھی، تو میں نے کہا کہ اس کا جواب

- قیاس سے دینا
- عقل سے دینا
- اپنے خیالات کو اڑانا

خیالات (فلسفہ) کی پرواز کو چھوڑیئے قرآن سے فیصلہ لیں۔

خیالات کی پرواز بڑی اونچی ہے لیکن ہر ایک کے خیالات اپنے اپنے ہوتے ہیں، ضروری نہیں، کہ ایک خیال پر سارے متفق ہو جائیں۔ تو ہم قرآن سے کیوں نہ پوچھیں؟

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ (پ:5 النساء:58)

ترجمہ: بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو، اور جب فیصلہ کرنے لگولوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے، اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو۔

(ترجمہ شیخ الہند)

اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ تم نہ اِدھر دیکھو نہ اُدھر دیکھو۔ تم دیکھو کہ جو اس کا اہل ہو۔ سیاسی طور پر ملک سنبھالنے کے لیے پیشوا اسے چنا جاتا ہے جو اسے چلانے کی اہلیت اور قابلیت رکھتا ہو اور جس میں سیادت کا، سیاست کا، نظام چلانے کا سلیقہ ہو۔ اور جو اس کا سلیقہ نہیں رکھتا، وہ

- کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو اسے پیشوا نہیں بناتے
- وہ کتنا تہجد پڑھنے والا کیوں نہ ہو
- کتنا ہی روزہ دار کیوں نہ ہو

ہم عقیدت میں اس کی بزرگی کو سلام کریں گے، لیکن اسکو اس سیاسی ذمہ داری پر نہیں لائیں گے، ذمہ داری پر وہ ہی آئے جو اس کا اہل ہو، اب بتائیے کہ یہ کہنا کہ جی وہ اولاد میں سے ہو یا وہ ساتھیوں میں سے تو قرآن کا اصول یہ ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ" اللہ تعالی تمہیں حکم دیتا ہے، اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا کہ یہ امانتیں ہیں اس کو اہل کے سپرد کرو، کیا انسانوں پر حکم لگانا، انسانوں کا نظام چلانا، انسانوں پر سیاست کرنا، امیر و غریب دونوں کو اپنا حق دینے کے لئے کوئی اہلیت، قابلیت، کوئی رعب، و قار، کوئی شخصیت وغیرہ کی شرط ہونی چاہیے؟ یا یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ رشتہ دار ہے یا نہیں؟ اہل بیت میں سے ہے کہ نہیں؟ دوستوں میں سے ہے کہ نہیں؟

پیغمبر انقلاب کی جانشینی کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے

تو اس میں

- قابلیت دیکھنی ہے
- صلاحیت دیکھنی ہے

اس میں قیادت کی شان ہے کہ نہیں؟ تو (میرا آپ سے سوال ہے)

سوال: آپ بتائیے کہ اتنا بڑا انقلاب، جو پیغمبر انقلاب نے عرب میں کر کے دکھایا، ان کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کے لئے، بزرگی دیکھنی ہے صرف؟(سامعین: نہیں)

سوال: رشتہ داری دیکھنی ہے؟(سامعین: نہیں)

سوال: Blood Relation دیکھنا ہے؟(سامعین: نہیں)

اللہ تعالی کا قانون کہتا ہے، قرآن کہتا ہے، اس کے لئے اہلیت دیکھیں گے کہ اہلیت کن میں ہے! میرا آج کا وہ موضوع نہیں کہ میں اہلیت بتاؤں لیکن کسی انگریز کے جملہ پر نظر پڑی تھی کہ مسلمانوں میں ایک عمر اور ہوتا تو دنیا میں کہیں کفر کا نام ونشان نہ رہتا، تو حضرت عمر کو ہم صرف ان کی بزرگی پر عقیدت کا سلام نہیں کرتے بلکہ ان کی اہلیت پر بھی دنیا ان کو سلام کرتی ہے۔

اب پاکستان کے ایک صوبہ میں یکم محرم کو حضرت عمرؓ کی یاد میں سرکاری طور پر اسی سال (2013) میں پہلی دفعہ چھٹی منظور ہوئی ہے، کہ اگر دس محرم کو حضرت حسینؓ کی یاد میں سرکاری طور پر چھٹی ہوتی ہے تو یکم محرم کو حضرت عمرؓ کی یاد میں بھی ہونی چاہیے، اللہ تعالی ان کو استقامت عطا فرمائے۔(آمین)

تو میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر کوئی پوچھے، کہ اس عظیم پیغمبر خاتم النبیین، رحمۃ اللعالمین ﷺ جن کو ساری دنیا کے لئے بھیجا گیا، مشرق و مغرب شمال و جنوب کے لئے، اس کی جانشینی کے لئے

- رشتہ داری دیکھی جائے گی
- ہم مجلسی دیکھی جائے گی
- یا اہلیت؟

میں خود سے جواب نہیں دیتا بلکہ قرآن کہتا ہے کہ اہلیت دیکھو!

پیغمبر امت ﷺ کی اپنی نظر کا فیصلہ

اب ذرا غور کریں، ہمارے نبی پاک ﷺ

- اللہ کے محبوب بھی ہیں

- امت کے پیشوا بھی ہیں،
- اپنی امت کے امام بھی ہیں،
- اور امام الانبیا بھی ہیں،
- پہلے سارے پیغمبروں کے بھی امام ہیں،

حضور اکرم ﷺ کی یہ شان ہے یہ تو سب مانتے ہیں، اور پتہ ہے لیکن حضور کی اپنی نظر کا فیصلہ کیا تھا؟ حضور کے پاس حضرت علی المرتضیٰ "آپ کے کزن ہیں اور ان کے اپنے داماد بھی ہیں" وہ موجود ہیں، اور حضور اکرم ﷺ کے پاس بڑے بڑے صحابہ ہیں، بنو امیہ میں عثمان غنیؓ جیسے ہیں، سارے صحابہ موجود ہیں، لیکن سب صحابہ کی موجودگی کے باوجود، نبوت کی نظر پڑی کس پر؟ نبوت کی نظر پڑی، عمر پر، وہ اسوقت دائرہ کفر میں تھے، اللہ سے دعاء کی، یا اللہ اسلام کو عزت دے اس کے ساتھ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ)، اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر کے پاس

- کیا کوئی کمی تھی؟
- کیا حضرت طلحہ و زبیر نہیں تھے؟
- کیا حضرت سعد بن وقاص نہیں تھے؟
- کیا حضرت عبد الرحمن بن عوف نہیں تھے؟
- کیا حضرت علی نہیں تھے؟

حضور ﷺ امام السیاست بھی تھے

سارے تھے لیکن حضور ﷺ کی نظر کدھر جا رہی ہے؟ کہ یا اللہ عمرو بن ہشام یا عمر بن خطاب ان دونوں میں سے ایک دے دے،[1] اللہ کی حکمت یہی تھی کہ حضور کی زبان پر یہی آیا، وگرنہ اگر حضور کی زبان پہ آجاتا کہ دونوں ہی دے دے تو دونوں ہی آجاتے، لیکن آپ نے کہا کہ ان دونوں میں سے ایک۔

(1) ترمذی، باب فی مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

رسول اللہ ﷺ کی سیاسی نظر و بصیرت

اب اس میں بتائیں کہ صرف بزرگی دیکھنی ہو تو حضرت بلالؓ میں بزرگی کم تھی؟ حضرت بلالؓ جو کعبہ پر چڑھ کر، اور پہلے مسجد میں بلندی پر چڑھ کر اذان دیتا تھا، کعبہ پر خدا کی توفیق سے صدا دینی اس کے نام کی، کیا ایسے بندے کی بزرگی میں کوئی شک تھا؟ لیکن حضرت بلال کو چننے کی بجائے پیغمبر کی نظر ادہر کیوں پہنچی؟ اس لئے کہ حضور ﷺ خود بھی سیاست کو سمجھتے تھے، اور ملکی تقاضوں کو سمجھتے تھے، رعیت کے حقوق کو سمجھتے تھے، نظر پڑی تو کہاں "یا اللہ ایسا دے جو ان کو چلائے" حضور کو یقین تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ میرا بھی سفر آخرت ہو گا، لیکن اس امت کو چلانے کے لئے "اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ" اے اللہ اسلام کو عزت دے تو نظر کدہر پڑی؟

معلوم ہوا کہ حضور کی نظر بھی یہی چاہتی تھی کہ اہل آئے اور جو اس کا اہل ہو اور اللہ نے قرآن میں کیا کہا؟ "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا" کہ امانتیں اہل کے سپرد کرو، یہ قوم کی قیادت، ریاست و سیادت یہ ایک امانت ہے، تو امانت کن کے سپرد کرو "اِلٰٓی اَھْلِھَا" "واذاحکمتم بین الناس" اور لوگوں میں سے جب چناؤ کرنا ہو تو پھر انصاف کرو، اس میں رشتہ داریوں کو اور تعلقات کو نہ دیکھو اللہ نے کہا۔

مراد مصطفی ﷺ

حضور ﷺ نے جب خدا سے عمرؓ کو مانگا، تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں حضرت عمر کو کس طرح دیا؟ کہ حضرت عمرؓ کے دل میں یہ ارادہ ہوا کہ میں حضور پر حملہ کروں، وہ اسی خیال میں گھر سے حملہ کے ارادہ سے نکلتے ہیں، لیکن وہ وقت آگیا تھا۔ کسی نے کہا کہ تو انکی دشمنی میں کیا کرے گا؟ پہلے جا کر پتہ لے، تیری تو اپنی بہن مسلمان ہو چکی ہے۔ بہن کے گھر غصے میں گئے کہ ذرا اسکی خبر لیں، لیکن وہ قرآن پڑھ رہی تھی، بس قرآن کی صدا اس طرح بہن کے منہ سے نکلی کہ عمر کے اندر اتر گئی، اور جو حملے کے لئے جارہا تھا، خود وہ شکار ہو کر رہ گیا۔

سو اور جتنے صحابہ بھی آئے حضور کے ارادت مند تھے، عقیدے کے ساتھ وہ مرید ہو کر آئے، لیکن اب مراد مصطفی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم آ رہا تھا، تو اب آپ یہ بتائیں کہ حضور کی اپنی بصیرت کیا کہتی تھی؟ کہ خلافت اہل کے پاس جائے یا Blood Relation پر؟ یا جو میرے ساتھ اٹھے بیٹھے اس پر آئے؟ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کی نظر یہی تھی کہ "اہل کے پاس جائے" اور یہی قرآن کا حکم ہے۔

اب تھوڑی سی اس بات کی طرف توجہ کریں۔ Society میں یہ ایک عام دستور ہے، کہ کچھ لوگ جو نمایاں ہوتے ہیں، جن کو لوگ کہتے ہیں چوہدری صاحب، کوئی چوہدری قسم کے لوگ، کوئی نمبر دار قسم کے لوگ، سربلند لوگ جو نمایاں ہوتے ہیں، ہر سوسائٹی میں ہوتے ہیں یا نہیں؟ تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم عرب میں پیدا ہوئے تو عرب میں کون لوگ تھے کہ جن کی سیادت اور چدراہٹ، نمبر داری کہ بڑا ہونا اور ان کا رعب و دبدبہ اور یہ کہ انسانی قلوب ان کے آگے جھکے چلیں جائیں، وہ کون تھے؟ آپ نے اسلامی تاریخیں پڑھی ہوں گی، علما سے سنی بھی ہوں گی، بارہا آپ نے اپنے مطالعہ کی حد تک اپنے علم کی حد تک جانا ہو گا، ذرا سوچیں کہ عرب کی سوسائٹی میں مکہ اور مدینہ میں وہ کون لوگ تھے جن کا سوسائٹی پر ایک وقار قائم تھا اور دنیا ان کی عزت کرتی تھی؟ آپ اس کا جواب دیں گے؟ ذرا غور کرو میں جواب نہیں مانگ رہا، نہ امتحان مقصود ہے صرف توجہ دلانا مقصود ہے، اس کے ضمن میں میں نے یہ نقشہ کھینچا کہ عرب میں کون لوگ تھے جن کا کہ عام سوسائٹی میں وقار تھا، رعب تھا اور لوگ ان سے دبتے تھے، سوال سب کی سمجھ میں آگیا؟ اب میں جواب عرض کرتا ہوں۔

تمام انبیاء حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کی اولاد میں سے

عرب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی، کہ اس میں حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کا بنایا ہوا کعبہ تھا۔ عرب میں اور ساری چیزیں ہونگی، کھجوروں کے باغ بھی ہونگے، چشمے بھی ہونگے میں اس کی تفصیل نہیں کرتا، لیکن پورے عرب میں سب سے نمایاں کیا چیز تھی؟ (سامعین: وہ کعبہ تھا) اور اسے ابراہیم علیہم السلام نے بنایا تھا، کہ سارے پیغمبر جو ابراہیم علیہم السلام کے

بعد آئے، وہ ان کی اولاد میں سے آئے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

یہاں ایک ضمناً بات عرض کرتا چلوں کہ قادیانی کہتے ہیں کہ ایک مغل ہے جو انکی اولاد ہونے کے بغیر انڈیا قادیان میں آگیا، اس وقت ختم نبوت میرا موضوع نہیں کہ میں انکی غلطی کی نشاندہی کروں۔ (1)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد جتنے پیغمبر بھی آئے وہ ان کی اولاد میں سے ہیں، اور جو ان کی اولاد میں سے نہیں وہ کہے کہ میں پیغمبر ہوں تو ہم کہتے ہیں "نہیں" کیوں کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔

تو خیر! جواب میں یہ دیتا ہوں کہ عرب میں سب سے زیادہ عزت والی جگہ کعبہ ہے اور کعبہ کے جو متولی تھے وہ یہ ایک خاندان تھا جس کو خاندان قریش کہتے تھے، اللہ تعالی نے قرآن پاک میں کسی قوم کے طور پر کسی کا ذکر نہیں کیا سوائے قریش کے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍۙ ۝١ اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ ۝٢ فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِۙ ۝٣ الَّذِىۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ۝٤

ترجمہ: اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو، مانوس رکھنا انکو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے تو چاہیے کہ بندگی کریں اس گھر کے رب کی، جس نے انکو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں۔ (ترجمہ شیخ الہند)

---

(1) مرزا غلام احمد قادیانی کا تعلق مغل قوم سے تھا لیکن اس کے باوجود وہ خود کو کبھی فارسی الاصل، کبھی اسرائیلی النسل، کبھی چینی اور کبھی فاطمی بتاتا رہا۔ مرزا کے اس تبدیلی خاندان کے گورکھ دھندا اور اس کے ان مختلف دعاوی کے تفصیلی مطالعہ کے لیے کتاب "رئیس قادیان۔ جلد اول۔ باب:3" از مولانا رفیق دلاوری رحمہ اللہ ملاحظہ فرمائیں۔ اور اس جھوٹے مدعی نبوت کے کردار اور اس کی پیش کی گئی پیشگوئیوں کو جاننے کے لیے کتاب "مرزا غلام احمد قادیانی اپنی عادات، پیش گوئیوں اور کردار کے آئینہ میں" از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم مطالعہ فرمائیں۔

قریش کی وجہ تعظیم

یہ قریش کی عزت کیوں تھی؟ اس لئے کہ یہ کعبہ کے متولی تھے، اور عرب کے لوگ جہاں ڈاکو بھی تھے... چور بھی تھے... وہ بھی کہتے تھے کہ تجارت کے لئے جب قافلے چلتے ہیں، اور مال لے کر اِدہر سے ادھر جاتے ہیں، کاروبار کے لئے پورے عرب میں پھیلتے ہیں، لیکن جب یہ قریش اپنے تجارتی سفروں میں جاتے تھے تو ڈاکو بھی کہتے تھے "ان کو ہاتھ نہیں لگانا یہ کعبہ کے متولی ہیں" جس کعبہ کی نسبت سے ان کو اتنی نسبت ملی کہ ان کے تجارتی قافلے بھی چلتے تھے، اور ان پر کوئی حملہ نہ کرتا تھا۔ یمن سردیوں میں... شام گرمیوں میں.... مشرق و مغرب کے درمیان یا ایک جگہ سے دوسری جگہ، ان کے قافلے چلتے تھے۔ یہ دو سفر تھے فرمایا اِيْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ایک سفر موسم سرما میں ہوتا تھا، ایک موسم گرما میں ہوتا تھا۔ جب ان کے تجارتی قافلے چلتے تو ڈاکو بھی رستہ چھوڑ دیتے، کہ ان کو کچھ نہیں کہنا کیونکہ کعبہ کے متولی آرہے ہیں، تو ان کا رعب یعنی کعبہ کے تولیوں کا رعب اور قریش کا رعب پورے عرب میں پہلے سے ہی تھا یا نہیں؟ حضور کی پیدائش سے پہلے کا ہی ان کا رعب تھا، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں قرآن کریم میں کہ "لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ① اِيْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ" اب جب ان قریش کو خدا نے، اتنی عزت دی کہ ڈاکو بھی ان پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتے تھے، جب کعبہ کو بسانے والا خاتم النبیین آیا، تو چاہیے تھا کہ یہ لوگ اس نبی آخر الزماں ﷺ کے خادم ہوتے "فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ" اور جو رب ہے بیت اللہ کا اس کے تابع ہوتے اور شرک نہ کرتے، لیکن انہیں میں پھر ابو لہب اٹھا، انہیں میں ابو جہل اٹھا۔

آخری پیغمبر ﷺ کی بعثت

توجہ فرمائیں کہ جب اللہ تعالی نے قریش کو یہ مقام دے رکھا تھا، کہ وہ کعبہ کے متولی ہیں، اسی لئے دنیا کی عزت ان کو ملی ہوئی ہے، تو اللہ نے یہ بھی چاہا کہ اپنا آخری پیغمبر انہیں میں بھیجے، کیوں؟ اس لئے کہ اس پیغمبر نے دنیا کو صرف قرآن ہی نہیں دینا یا صرف سچائی

ہی نہیں دینی بلکہ خدا کی زمین پر خدا کے نظام کو بھی نافذ کرنا ہے، اور قائم کرنا ہے۔

سو حکمرانی یہاں وہی کر سکیں گے جو کعبہ کے متولیوں میں سے ہوں، عبد المطلب یا عبد مناف کے خاندان قریش سے ہوں تو حضور ﷺ پر اللہ تعالی نے وحی بھی اتاری، اور قرآن بھی اتارا، اللہ تعالی کا بڑا فضل و کرم رہا، اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو بڑی شان دی لیکن اس خطہ میں اللہ تعالی نے ان کو اس خاندان میں سے چنا جس خاندان کا دبدبہ پورے عرب میں تھا اور وہ خاندان قریش تھا اور وہ کعبہ کے متولی کہلاتے تھے۔

قیادت کا خاندان قریش میں ہونے کی وجہ

تو حضور اکرم ﷺ کو پتہ تھا کہ ان کا ایک رعب ہے، دبدبہ ہے، تو آپ ﷺ نے یہ جانتے ہوئے ایک مشورہ دیا اپنے صحابہ کو، فرمایا!

اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ (مسند امام احمد ج2)

کہ میرے بعد تم نے جو لیڈر چننے ہوں وہ قریش سے ہوں۔ کیوں؟ ان کا رعب ہے اور ان کا رعب عرب قوم مان جائیگی۔ اور اگر بلال حبشیؓ کو، صہیب رومیؓ کو، سلمان فارسیؓ کو آگے کرو گے، وہ کتنے ہی نیک لوگ ہیں ان کو آگے کرو گے، عرب قوم جو قبائل پر مشتمل ہے، جن کی تاریخ قبائل کی ہے، وہ انہیں نہیں مانیں گے۔ تو سرداری انہیں کو دینی چاہیے جو کعبہ کی نسبت سے ممتاز ہوں۔

سو حضور ﷺ کون تھے؟ جو کعبہ کی نسبت سے ممتاز تھے؟... قریش میں سے تھے۔

- نبوت تو تھی، رسالت بھی تھی
- قرآن بھی حضور ﷺ پر اتر چکا تھا۔
- وحی خداوندی بھی تھی

لیکن کعبہ کی جو نسبت تھی وہ خطہ عرب میں نمایاں تھی، کہ یہ کون ہیں؟ "بنو ہاشم میں سے "تو نبی پاک ﷺ نے بھی کعبہ کو اتنی سیادت دی۔

حضور کا فرمان کہ امام قریش میں سے چننا

تو حضور ﷺ کا اپنا مزاج جو تھا، وہ یہ تھا کہ جو کعبہ کی عزت ہے، یہ قائم رہے، تو

آپ نے سفر آخرت پہ جاتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ "اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ" کہ اپنے لیڈر یہاں سے بنانا تو سارا عرب مان لے گا، اور کسی اور کو بنایا تو شاید کچھ نیک لوگ تو مان لیں، لیکن عرب عوام نہیں مانیں گے، عرب کی فطرت کو حضور جانتے تھے، قبائل کے مزاج کو حضور پہچانتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا! کہ قریش میں سے چننا، تو اتنی بات یاد رکھنا کہ امام قریش میں سے ہوں تو یہ حضور کی بات ہے جو میں خود سے نہیں کر رہا۔ اس لیے

- حضرت ابو بکرؓ قریش میں سے تھے،
- حضرت عمرؓ قریش میں سے تھے،
- حضرت عثمانؓ قریش میں سے تھے
- حضرت علیؓ قریش میں سے تھے

بنو ہاشم اور بنو امیہ دونوں قریش میں سے تھے

پہلے چاروں خلفاء جن کو خلفائے راشدین کہتے ہیں۔ یہ سارے قریش میں سے تھے، اور حضور ﷺ پہلے کہہ گئے تھے اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ کیوں؟ "ان میں رعب و دبدبہ ہے" قریش میں دو خاندان تھے، ایک بنو ہاشم بڑا خاندان اور ایک بنو امیہ، اور دونوں عبد مناف کی اولاد میں سے تھے، عبد مناف کون تھے؟ "حضرت عبد المطلب کے دادا" حضور ﷺ کے دادا کا نام عبد المطلب، اور انکے دادا کا نام عبد مناف تھا۔ تو عرب کے دونوں بڑے خاندان، بنو امیہ اور بنو ہاشم عبد مناف کی اولاد تھے، اب حضور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے، اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْشٍ [1] اب میں اس بات کو ایک طرف رکھ کر ذرا تصویر کا دوسرا رخ بھی

(1) اس حدیث پر حضرت علامہ صاحب مدظلہ العالی ایک مقام پر نہایت نفیس ارشاد فرماتے ہیں جو قارئین کے لیے یہاں ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے:

"یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے طبقاتی برتری کا احساس ختم کر کے انسانیت کو فروغ بخشا تھا اور اللہ رب العزت کی بھی آپ کو یہی ہدایت تھی کہ آپ کی نظریں ان غریبوں سے (جن میں آپ کی سوسائٹی تھی) اٹھنے نہ پائیں مبادا آپ دنیا کی رونق کو پسند کرنے لگیں۔ نہیں۔ ۔۔۔ آپ انہی غریبوں کے ہو کر رہیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں آپ کی اس سوسائٹی

آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

سے انسانیت کو جلا ملے گی۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (پارہ:15، الکہف:28)

ترجمہ: اور تو روکے رکھ اپنے آپ کو ان کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح و شام طالب ہیں اس کی ذات کے اور نہ اٹھیں تیری آنکھیں ان سے دنیا کی رونق کی تلاش میں اور نہ کہنا مان اس کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل رکھا ہے اور وہ پیچھے ہو گیا اپنی خواہش کے اور اس کا کام حد سے نکلا ہوا ہے۔

بایں ہمہ حضور اکرم ﷺ کی نظر عرب نفسیات پر بھی تھی فتح مکہ کے بعد لوگ فوج در فوج داخل دائرہ اسلام ہوئے اور وہ اس نئے ماحول میں آئے ہی تھے کہ حضور اکرم ﷺ کو سفر آخرت پیش آگیا آپ کی نظر عالی قدر نے دیکھا کہ قریش کی عظمت عربوں میں آپ کی تشریف آوری سے بھی پہلے اس درجہ مسلم ہے کہ ان کے تجارتی قافلے سرما و گرما میں رہزنوں کی لوٹ مار سے محفوظ تھے تو آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی آئندہ سیاسی قیادت قریش میں ہی رہے جب تک یہ اس کشتی کو کھینچ سکیں۔ آپ کا قریش کو آگے کرنا اپنے لیے نہ تھا قریش کی اس عظمت کی وجہ سے تھا جو انہیں پہلے سے عربوں میں حاصل تھی اگر آپ قریش کو اپنے لیے آگے کرتے تو بنو ہاشم کی قیادت کا اعلان کرتے **الائمۃ من قریش** نہ فرماتے سو آپ کا یہ فیصلہ عربوں کو ایک وحدت میں جوڑنے کے لیے تھا عربوں میں سے کسی کے طبقاتی تفوق کے لیے نہ تھا۔ اپنے خطبہ وداع میں آپ کہہ چکے تھے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اللہ کے دین کے سوا کسی بات میں برتری نہیں ہے۔ خلفائے راشدین باوجود یہ کہ قریش میں سے تھے انھوں نے انسانی حقوق اور عدل و انصاف کے نفاذ میں حضور اکرم ﷺ کی طرح کسی طبقاتی برتری کو رہ نہ دی، کمزور ان کے نزدیک قوی تھا اور قوی کمزور۔ یہاں تک کہ ہر انسان کا حق محفوظ رہے۔

(آثار الحدیث، جلد:1، ص:17)

اس حدیث کی تفصیلی شرح اور صحیح تفہیم کے لیے کتاب "دوازدہ احادیث، میں حدیث نمبر:4، بنام: حدیث دوازدہ امیر" اور کتاب "عبقات: جلد اول" از علامہ ڈاکٹر خالد محمود مدظلہ العالی کی مراجعت فرمائیں۔

حضور ﷺ کا ایک خاص صفاتی نام

حضور اکرم ﷺ کے جو اور نام ہیں، وہ تو ماشاء اللہ آپ کو آتے ہیں۔ ہم سب حضور کی امت ہیں، لیکن حضور ﷺ کا ایک نام "مہاجر" بھی ہے کہ آپ مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئے، تو اس لحاظ سے آپ "مہاجر" تھے کہ نہیں؟ اس میں کوئی بے ادبی نہیں، حضور تھے تو "مہاجر"۔ مدینہ کے رہنے والے تو نہیں تھے، آپ مکہ سے آئے تھے، تو جب حضور خود مہاجر تھے تو ان مہاجرین کو اپنے ہاں قبول کنہوں نے کیا؟ "انصار نے"۔

انصار کی شان

جو مدینہ کے انصار تھے انہوں نے مہاجرین کو قبول کیا اور اس عزت سے قبول کیا، کہ ایسی عزت تاریخ میں کبھی بھی کسی میزبان نے اپنے مہمان کو نہیں دی ہو گی، یعنی انصار کی پوری تاریخ بتاتی ہے، کہ دنیا کے تمام ملکوں کو دیکھو، تاریخ اقوام میں انقلاب کو دیکھو، اب تک کسی قوم نے باہر سے آنے والی قوم کو وہ عزت نہیں دی، کہ جو انصار مدینہ نے حضور ﷺ کو دی، اسی لئے انصار کی شان اس میں بے مثال ہے۔ تو اب اس بات کو آپ سمجھیں کہ انصار نے جو عزت "حضور" کو دی وہ بہت بڑی بات ہے اور کوئی مومن مسلمان انصار کے مقام، ان کی شان اور ان کے فضائل و مناقب کا انکار نہیں کرتا۔[1]

---

(1) امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"صحابی اس کو کہتے ہیں جس نے ایمان کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حاصل کی ہو اور ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا ہو۔ مہاجرین صحابہ کرام کو کہتے ہیں جو مکہ کے رہنے والے تھے اور قبل ہجرت ایمان لائے تھے، پھر انہوں نے اللہ اور رسول کے لیے اپنے وطن اور اعزہ و اقارب کو چھوڑ دیا اور مکہ سے ہجرت کی۔ یہ کل ایک سو چودہ مرد و عورت تھے۔ انصار ان صحابہ کرام کو کہتے ہیں جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور انہی کی درخواست پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مہاجرین کو اپنے شہر میں جگہ دی اور آپ کی ہر قسم کی مدد کی۔ سابقین اولین ان مہاجرین کو کہتے ہیں جنہوں نے غزوہ بدر یا تحویل قبلہ سے پہلے ہجرت کی۔ غزوہ بدر رمضان دو ہجری میں

حضور ﷺ کے جانشین کے متعلق انصار کا خیال

تاہم حضور ﷺ کی جب وفات ہوگئی، تو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ یہ پیغمبر تو خدا کا انتخاب تھے، لیکن اب بنانا ہے "جانشین مصطفی ﷺ" کہ حضور کا جانشین کون ہو؟ تو یہ اب ایک انسانی انتخاب ہے تو ایک اپنی سوچ بھی اس میں لگے گی۔ تو ہم کیوں نہ اس کے لئے اٹھیں؟ حضور ﷺ مہاجر تھے، آپ خدا کا انتخاب ہیں اور ہم نے بالکل ایسے ہی مانا مگر اب، جب آپ ﷺ خود سفر آخرت پر تشریف لے گئے تو ان کا "جانشین" جو چنناہے وہ انصار میں سے کیوں نہ چنا جائے!؟ بھائی یہ خیال اگر ان کو آیا تو "عقل" میں آسکتا ہے کہ نہیں؟ لیکن یہ ایک تکوینی حکمت تھی، کہ ان کے دلوں میں یہ خیال آیا۔

کہ نبی تو مہاجرین میں سے تھے اور جانشین اور خلیفہ انصار میں سے، تو انصار کا بڑا آدمی کون تھا؟ جس کو اوس اور خزرج دونوں مانیں۔ تو وہ تھے "حضرت سعد بن عبادہ"۔ یہ انصار کے بڑے تھے۔ حضور ﷺ کی جب وفات ہوگئی اور ابھی حضور کو دفن نہیں کیا گیا تھا۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک میٹنگ بلائی۔ یوں سمجھیں کہ جیسے کسی ملک کا بادشاہ سفر آخرت پر چلا جائے تو ایک کہرام مچ جاتا ہے، سارے لوگ کہتے ہیں کہ اب کیا ہوگا!!! اب کیا ہوگا!؟ اور اصول یہ ہے کہ بادشاہ کو دفن تب کیا جاتا ہے جب تاج کسی اور کے سر پہ رکھ دیا جائے، پہلے بادشاہ پر وفات آئے تو تاج کہاں ہوتا ہے؟ تاج ہوتا ہے اس کے سرہانے، میت کے سرہانے تاج پڑا رہتا ہے، جب تک وہ تاج کسی زندہ انسان کے سر پر نہ آجائے پہلے بادشاہ کو دفن نہیں کرتے، اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے، کیوں؟ کوئی سلطنت بے تاج نہ رہنی چاہیے، بادشاہ تو آتے رہیں گے، کارواں آتے رہے ہیں، جاتے رہیں گے،

ہوا اور تحویل قبلہ شعبان دو ہجری میں اور بقول بعض رجب دو ہجری میں ہوئی۔

(آیات خلافت و امامت:156)

سو صحابہ کرام میں مہاجرین کے بعد انصار بلند مقام و مرتبہ کی حامل شخصیات ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں کئی آیات میں مہاجرین کے فضائل و مناقب کے ساتھ انصار کا ذکر بھی بخوبی ملتا ہے اور احادیث کی کتابوں میں بھی انصار کے مناقب و فضائل پر مستقل باب باندھے گئے ہیں۔

حکومت کرنے والوں کے قافلے کئی آئے اور کئی گئے۔

تاہم حضور ﷺ کہاں ہیں؟ ''مسجد نبوی میں''۔ کیونکہ امہات المؤمنین کے حجرے مسجد کے ساتھ ساتھ تھے، حضور ﷺ کا بدن مبارک وہیں تھا، سب صحابہ مہاجر ہوں یا انصار ان کے دل غمگین تھے کہ ہمارے استاذ کہاں گئے، ہم حضور سے محروم ہوگئے، وہاں یہ ایک کہرام مچا تھا۔ رواج زمانہ کے مطابق یا قبائل کے مزاج کے مطابق بندہ کن کا گیا؟ مہاجرین کا۔ کیونکہ جتنے لوگ مکہ سے آئے تھے انہیں حضور ﷺ اپنا ہم وطن سمجھتے تھے اور وہ سارے مہاجرین مسجد نبوی میں تشریف فرماتھے اور حضور ﷺ کا جسد مبارک حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں تھا۔ حضرت عائشہؓ بھی غمگین بیٹھیں تھیں، حضرت فاطمہؓ بھی غمگین بیٹھیں تھیں، اور یہ سارے مہاجر تھے

 حضرت عائشہؓ بھی مہاجروں میں

 اور حضرت فاطمہؓ بھی مہاجروں میں

 حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ بھی مہاجروں میں

 اور حضرت عثمانؓ و علیؓ بھی مہاجروں میں

اجتماعی رونے کا وہاں کوئی منظر نہ تھا:

سب کے دل غمگین تھے، لیکن انہوں نے کوئی پروگرام رونے کا نہیں بنایا، کہ حاضرین ''ہم کل اتنے بجے روئیں گے'' کسی وفات پر یہ رواج نہیں چاہیے کہ رونے کا وقت مقرر کر کے کہا جائے، کہ کل ہم اتنے بجے روئیں گے، رونا اجتماعی طور پر یہ اسلام میں کہیں نہیں ہے، اسلام کے اخلاقی نظام میں ہے کہ جب کسی پر ایسا وقت آجائے، تو صابرین بنیں، یہ نہیں کہ ماتمی مجلسیں قائم کریں، تو صحابہ جو مسجد میں تھے، انہوں نے مسجد میں کوئی واویلا یا آہ وزاری نہیں کی۔ اور نہ انہوں نے اپنی چھاتیاں کوٹیں، جس طرح دس محرم کو پیٹتے ہیں۔[1]

(1) اجتماعی رونے، ماتم کرنے اور پھر جلوس نکالنے کی شرعی حیثیت جاننے کے لیے اور ایسا عمل کرنے

سقیفہ بنی ساعدہ اور غدیر خم

انصار مدینہ کے رہنے والے تھے اور وہ پورے مدینہ میں پھیلے ہوئے تھے، مہاجرین سارے مسجد نبوی میں جمع ہیں، اور حضور ﷺ بھی وہیں ہیں۔ حضرت سعد بن عبادہؓ کی حویلی بہت بڑی تھی جس کو سقیفہ بنی ساعدہ کہتے ہیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں سارے انصار جمع ہوئے، اور کہا کہ ہم حضور ﷺ کا جانشین چنیں، تو انہوں نے جانشین چننا تھا تو کس کو چنتے؟ ان کے سردار تو سعد بن عبادہؓ تھے، اور انہوں نے ہی Meeting بلائی تھی۔ انصار سینکڑوں کی تعداد میں جمع تھے، اور درمیان میں وہ ایک غمگین صورت اور حالت میں چادر لئے بیٹھے تھے۔ انصار کہہ رہے تھے کہ مہاجروں کو ہم نے قبول کیا، پیغمبر "مہاجر" تھے، ہم نے قبول کیا، اللہ کا انتخاب ہم نے قبول کیا، اسلام قبول کیا۔ اب امیر انصار میں سے چنا جائے، تو اگر انصار میں سے چنا جائے، تو بھی عقل کے مطابق ہے، کوئی ایسی بات نہیں۔ ان کی اس تجویز میں یہ حقیقت بھی لپٹی تھی کہ غدیر خم پر حضرت علی ہرگز خلیفہ نامزد نہ کیے گئے تھے ایسا ہوتا تو انصار کبھی بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں یہ اجتماع نہ کرتے۔

خلافت کے امیدوار

یہاں ذرا غور کریں کہ پھر خلافت کے امیدوار کتنے ہو گئے؟ حضور نے اپنی نظر پسند تو ڈالی تھی، حضرت ابو بکرؓ پر، کہ مصلی امامت پر ان کو کھڑا کیا، تو پتہ چل گیا، کہ حضور کی نظر انتخاب ان پر ہے لیکن انصار کی نظر انتخاب کس پر تھی؟ "حضرت سعد بن عبادہؓ" پر، اب

والے گروہ کے دلائل کا جائزہ لینے کیلئے حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی کتابِ لاجواب "تجلیاتِ آفتاب" جلد دوم (باب: جزع و فزع درویشاں باقرار جرم خویشاں، سالانہ ماتمی جلوس اور انکی ظاہری ہائے ہائے، صدمہ پہنچنے پر غم اور سوگ کی فطری اجازت)، حضرت مولانا عبد الستار تونسوی رحمہ اللہ کا مختصر رسالہ "حقیقت ماتم" حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "بشارت الدارین بالصبر علی شهادت الحسین رضی اللہ عنہ" حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ کا مضمون "ماتم کا مسئلہ اسلام کی نظروں میں، فوائد نافعہ، جلد دوم" اور حضرت مولانا محمد اقبال رنگونی صاحب مدظلہ العالی کی کتاب "ماتم نہ کیجئے" کا مطالعہ فرمائیں۔

مقابلہ ان دونوں میں ہو سکتا تھا کہ ان میں سے ہو، یا ان میں سے ہو۔ میں ان ساتھیوں سے، دوستوں سے پوچھا کرتا ہوں، کہ جو کہتے ہیں کہ حضور کے بعد ان کا جانشین ابو بکرؓ ہو یا علیؓ؟ تو میں نے کہا علیؓ تو اس میدان میں نکلے ہی نہ تھے، نہ انہوں نے کبھی اپنی زبان سے کہا تھا کہ مجھے حضور ﷺ نے 18 ذوالحجہ کو غدیر خم پر اپنا ولی عہد بنایا تھا۔

- نہ انہوں نے کچھ کہا
- نہ کہیں اپنا نام پیش کیا
- نہ ان کے ساتھ کوئی آدمی اٹھے

حضرت علی مرتضیٰ خلافت کے امیدوار نہ تھے:

سو اس میں خواہ مخواہ حضرت علیؓ کو حضرت ابو بکرؓ کے مقابلے میں لانا ایک بڑی غلطی ہے۔ اگر مقابلے میں نام کسی کا لیا جا سکتا ہے، تو "حضرت سعد بن عبادہؓ" کا نام لیا جا سکتا ہے کہ انصار ان کی قیادت میں اٹھنا چاہتے تھے، اور جو مہاجرین تھے ان کے لئے ابو بکر کی امامت حضور کا ارشاد تھا، تو اگر خلافت میں اختلاف ہوتا، تو کن کن میں ہوتا؟ "حضرت ابو بکرؓ" میں اور "حضرت سعد بن عبادہؓ" میں۔ اور موضوع یہ ہوتا کہ مہاجرین میں سے ہو یا انصار میں سے ہو، تب تو عقل مانتی ہے۔ مگر اب یہ لوگ کیوں یہ بات اڑاتے ہیں کہ جی خلافت علیؓ کو ملنی چاہیے تھی؟ سو وہ تو نہ امیدوار، نہ کوئی میٹنگ بلائی اور نہ دعوی کیا، بلکہ وہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ کے ہاں صابرین میں سے تھے، خواہ مخواہ ان کا نام لے کر قوم میں ایک نئی فکر پیدا کر دی کہ خلیفہ وہ ہونا چاہیے یا یہ!!! آپ نے خلافت پر جتنے بھی اختلاف سنیں، کن کے درمیاں سنیں، انہیں میں کہ جی خلیفہ ابو بکرؓ ہوں یا علیؓ ہوں! تو بھائی علیؓ تو اس میدان میں آئے ہی نہیں، خواہ مخواہ ان کے ذمہ یہ بات لگائی گئی، میں تاریخ کے طالبعلموں سے پوچھتا ہوں اور کہا کرتا ہوں کہ تاریخ کی کتابیں دیکھو اور ہر زبان میں دیکھو کسی تاریخ میں علیؓ کا نام بطور امیدوار کے اور علیؓ کی کوئی کوشش کہ مجھے لوگ خلیفہ مانیں "نہیں ہے"۔

حضرت فاطمہؓ اور مقدمہ باغ فدک

بھائی حکومت یا خلافت کی سیٹ کوئی جلدی چھوڑتا ہے؟ (سامعین: نہیں)۔ مجھے ایک بات یاد آئی کہ کسی نے کہا کہ جی حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس ایک مقدمہ دائر کیا، کہ فدک کی زمین جو ہے وہ مجھے ملے، وہ میرے والد کی وراثت تھی، آپ نے بھی سنا ہوگا قصہ کہ حضرت فاطمہؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے مطالبہ کیا۔ تو ذرا غور کرو اگر حضور ﷺ کے جانشین "حضرت علیؓ" ہوتے تو حضرت فاطمہؓ اپنے خاوند کے لئے "خلافت" کا دعوی کرتیں یا فدک کا!؟ فدک تو ایک زمین تھی، اور یہ چھوٹا مسئلہ ہے جبکہ خلافت پوری سلطنت تھی، تو اب جن کی سلطنت چھینی گئی ہو، وہ کبھی زمین کے ٹکڑے پر مقدمہ کریں گے؟ بھائی دیکھئے! جن سے سیٹ چھن جائے، جن سے حکومت چھن جائے، خلافت چھن جائے، وہ بڑی چیز کا دعوی چھوڑ کر زمین کا دعوی کرے گا؟ عقل انسانی کیا کہتی ہے؟

بتا اے عقلِ انسانی کوئی حل اس معمہ کا
نظر کچھ اور کہتی ہے خبر کچھ اور کہتی ہے

بھائی سوچو! انہوں نے حق مانگا تو کس سے مانگا؟ حضرت ابو بکرؓ سے۔ معلوم ہوا انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی حکومت مانی تو ان سے مانگا نا؟ بھائی اگر کوئی حکومت ہو تو اس کے پاس تو جایا جاتا ہے کہ میرا حق مجھے ملے تو اگر حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا "حضرت ابو بکرؓ" کے پاس گئیں کہ یہ زمین مجھے دو، تو معلوم ہوا کہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ مان کر ہی یہ سوال کیا تھا۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہی نہیں کہ انہوں نے سوال کیا تھا۔[1] وہ شخصیت جو خاتون جنت ہو

(1) حضرت علامہ صاحب مدظلہ العالی مسئلہ فدک کے متعلق ایک سائل کے استفسار پر مختصر اور جامع جواب ارشاد فرماتے ہیں، اسے یہاں ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے:

سوال: کیا حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا باغ فدک مانگنے کے لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئیں؟ نیز مطلع کریں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے حین حیات

باغ فدک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا ہوا تھا یا نہیں؟ حضرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور بھی بیٹیاں تھیں تو صرف انہوں نے کیوں حق وراثت مانگا؟

سائل: محمد ممتاز الرحمن صدیقی، از جامع مسجد سرگودھا

جواب: حضرت سید فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا باغ فدک کے لیے تشریف لے جانا کوئی یقینی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بعض روایات میں آپ کا جانا ''جاءت'' کے لفظ سے مذکور ہے۔ لیکن ''بخاری'' کی بعض دوسری روایات میں لفظ ''أرسلت'' بھی موجود ہے کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے کسی دوسرے شخص کو اپنا پیغام دے کر بھیجا تھا۔ بعض راویوں نے اس بھیجنے کو مجازاً جانے سے تعبیر کر دیا ہے۔ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کا خود جانا ایک امر مشتبہ ہے جس کا دعویٰ یقینی طور پر نہیں کیا جا سکتا، نہ یہ حضرت سیدہ کے شان کے مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ثانیاً: یہ امر صحیح نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں باغ فدک حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو ہبہ کر دیا تھا، ہبہ کی تمام روایات اسناداً صحیح نہیں اور بیشتر وضاع و کذاب قسم کے راویوں پر مشتمل ہیں۔ بلکہ ''سنن ابو داؤد'' میں ہے کہ حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا نے ارضِ فدک کا سوال خود آنحضرت کی زندگی میں کیا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی کیا تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ (دیکھیے ''سنن ابو داؤد'' 2/415) پس جب کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تمام عملی زندگی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہاج پر قائم تھی تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف باغ فدک حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کو دے دیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خود ارشاد فرماتے ہیں:

إني والله لا أغير شيئاً من صدقات النبي صلى الله عليه وسلم التي كانت عليها في عهد النبي صلى الله عليه وسلم لأعملن فيها بما فعل فيها رسول الله صلى الله عليه وسلم فتشهد علي ثم قال أنا قد عرفنا يا أبا بكر فضيلتك

(بخاری، ج:1۔ ص:566)

ترجمہ: خدا کی قسم یہ چیزیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھیں میں ان میں کچھ بھی تبدیلی نہ کروں گا اور ان امور میں میرا عمل اسی طریق پر ہو گا جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق عمل تھا۔ اس پر حضرت علی مرتضیٰ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کی تصدیق فرمائی اور کہا کہ اے ابو بکر! ہم نے آپ کی فضیلت شان کو پہچان لیا ہے۔

وہ خود اس کے لئے اٹھتیں، یا اپنے خاوند کو کہتیں تم اٹھو؟ خاتون وہی ہے جو اپنے اہم کاموں کے لئے اپنے خاوند کو کہے، کہ "تم جاؤ" اب حضرت فاطمہؓ نے اگر مطالبہ کرنا ہوتا تو وہ خود کرتیں یا حضرت علیؓ کو بھیجتیں؟ اب یہ پراپیگنڈا کہ بی بی فاطمہؓ فدک لینے گئیں ان کو فدک نہ دیا گیا اور لوگ اتنا بھی نہیں سوچتے، کہ خاوند کے صحیح سلامت ہوتے ہوئے کبھی خاتون عدالت میں جاسکتی ہے؟ وہ فاطمہؓ جس کی چادر کو کبھی چشم فلک نے بھی نہیں دیکھا وہ اسکے لئے؟ انہوں نے اہل بیت کی شان اتنی گرادی کہ دنیا کی ان چیزوں کے لئے فاطمہؓ کی عزت کو بھی یہ لوگ بھول گئے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کی میٹنگ

میں یہ واقعہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر خلافت میں کوئی اختلاف ہوتا، تو ان دو میں حضرت ابو بکر یا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما میں ہوتا؟ حیران ہوں کہ حضرت علیؓ کو اس اختلاف میں کیسے داخل کر دیا گیا؟ تو میں اپنے ساتھیوں کو کہہ رہا ہوں، کہ جب حضرت سعد بن عبادہؓ کی

آنحضرت ﷺ کی دوسری بیٹیاں خود آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی فوت ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان کے حقِ وراثت یا طلبِ وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر حضور ﷺ کی دوسری بیٹیاں زندہ ہوتیں تو آپ انہیں دعوتِ مباہلہ کے وقت ساتھ کیوں نہ لے جاتے۔ یہ دعوتِ مباہلہ کا واقعہ حضور ﷺ کے اواخرِ حیات میں پیش آیا اور اس وقت حضور ﷺ کی کوئی بیٹی حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے سوا زندہ نہ تھی۔

اس مسئلے کی مکمل تفصیل کے لیے امام پاکستان حضرت مولانا سید احمد شاہ صاحب چوکیروی کی کتاب تحقیق فدک اپنے موضوع پر لاجواب ہے، آپ اس کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ کتاب ان شاء اللہ جامع و مانع ہو گی اور تحقیق کے اعتبار سے بما لا مزید علیہ کا مصداق ۔ واللہ اعلم بالصوب، کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ۔ [عبقات، ج:1، ص:189]

فدک کے موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے "آیات بینات" از نواب محسن الملک سید مہدی علی مرحوم، "تحقیق فدک" از مولانا سید احمد شاہ چوکیروی رحمہ اللہ، " ازالۃ الشک عن مسئلۃ فدک" از مولانا عبد الستار تونسوی رحمہ اللہ، "رحما بینہم، حصہ صدیقی"، از مولانا محمد نافع رحمہ اللہ "دوازدہ احادیث، حدیث نمبر: 7، "از علامہ ڈاکٹر خالد محمود مد ظلہ العالی کی مراجعت فرمائیں۔

میٹنگ ہو رہی تھی کہ ہم میں سے کون خلیفہ ہو تو "حضرت نعمان بن بشیرؓ" ایک صحابی ہیں وہ وہاں کہیں پاس سے گزرے، جہاں سقیفہ بنی ساعدہ کی میٹنگ ہو رہی تھی اور وہ انصار میں سے نہیں تھے، انہوں نے پوچھا کہ یہ لوگ اتنے جمع ہو رہے ہیں کیا بات ہے؟ کہا کہ حضور کی خلافت کے بارے میں کہ "پہلا خلیفہ کون ہو؟" اس لئے کہ نبی مہاجروں میں سے اور اب خلیفہ ہو جائے انصار میں سے تو حضرت نعمان بن بشیر نے جب یہ بات سنی تو وہ فوراً مسجد نبوی میں گئے، اور جو صحابہ بیٹھے تھے ان سے کہنے لگے! او تم یہاں غم میں بیٹھے ہوئے ہو ادھر دیکھو کیا ہو رہا ہے، حضور کی اگر امت ٹوٹ گئی کہ "انصار اپنا خلیفہ چن لیں" تو امت میں اختلاف ہو جائے گا، تو حضور دنیا میں جو محنت کر کے یہ امت ایک بنا کر گئے، تو کیا اس طرح اس مشن کو ضائع کر دو گے؟ تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو اور وہاں دیکھو کیا ہو رہا ہے؟ اگر اس دن حضرت نعمان بن بشیر اطلاع نہ دیتے اور انصار حضرت سعد بن عبادہؓ کو چن ہی لیتے اور مسجد والے کہتے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امامت پر کھڑا کیا تھا۔ تو کیا اب تک مسلمان سنبھل سکتے؟ (نہ) اللہ تعالی جزائے خیر دے حضرت نعمان بن بشیرؓ کو کہ انہوں نے جب جا کر کہا۔ تو پھر بڑے اور معروف لوگوں میں سے تین آدمی اٹھے۔ اور وہ کون کون؟

- حضرت ابو بکرؓ
- حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ
- اور حضرت عمرؓ

یہ تینوں چل کر آئے، انہوں نے باقی مہاجرین کو نہیں کہا کہ آؤ بھائی ہم چلیں، کہ کہیں اُدھر وہ انصار کوئی اور فیصلہ نہ کر دیں۔ "آؤ ہمارے ساتھ" یہ نہیں کہا، کیوں؟ اس وقت جانشین کو الرٹ (Alert) کرنے کے لئے ہلڑ بازی نہیں ہوتی تھی۔ آج کا دور ہوتا تو کہتے آؤ سارے چلیں، تم بھی آجاؤ، تم بھی آجاؤ۔ سب آجاؤ۔ ایسا نہیں تھا بلکہ صرف تین آدمی اٹھے، ایسا کیوں؟ اس لئے کہ ان کو پتہ تھا کہ "انصار بھی صحابہ ہیں" اور صحابہ وہ ہیں جن پر اعتراض کی انگلی نہیں اٹھتی سو ہم کیوں ہلڑ بازی کریں، سب کو لیکر جائیں اور کسی کی

بے ادبی ہو جائے۔

انصار و مہاجرین تمام اصحاب میں کسی پر انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی

جس طرح مہاجرین کی عزت ہے اسی طرح انصار کی بھی عزت ہے، اصحاب رسول رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے بارے میں قاعدہ یہ ہے "اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی" (ترمذی کتاب المناقب) صحابہ کے بارے میں ڈرو، کسی کے بارے میں انگلی نہیں اٹھانی۔ تو صرف تین اٹھے، اور سقیفہ بنی ساعدہ آئے، جب انصار نے دیکھا کہ یہ آئے ہیں، تو پھر یہ جو تین آگئے، ان میں سب سے زیادہ غم میں ڈوبا ہوا کون تھا؟ (حضرت ابو بکر صدیقؓ) کیوں؟ "اس لئے کہ غار میں یہی دو تو تھے" اور حضور ﷺ کی جب وفات ہو گئی تو دونوں میں ایک ہی رہ گیا نا؟ تو جتنے اسوقت زخمی دل کے ساتھ ابو بکرؓ پہنچے اتنا ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو قوی اور دلیر کر دیا، آپ نے آتے ہی کھڑے ہو کر کہا، کہ حضرات آپ یہاں کس لئے جمع ہیں؟ انہوں نے کہا! ہم اس لئے جمع ہیں، کہ ہم چاہتے ہیں کہ جانشین رسول ﷺ انصار میں سے ہو، تو حضرت ابو بکرؓ نے کہا! کہ میں تمہیں یاد دلاتا ہوں کہ کیا نبی پاک ﷺ نے نہیں فرمایا تھا کہ "الائمۃ من قریش" کہ تم اپنا چوہدری یا بڑا امام، پیشوا وہ چنو جو قریش میں سے ہو، وہ اس لئے کہ اس میں یہ حکمت تھی، کہ قریش کا رعب سارے عرب میں تھا، اور یہاں تک کہ ڈاکو بھی اور انتہائی طور پر ظالم لوگ بھی کعبہ کے والیوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔

صحابہ سارے کے سارے عادل ہیں

تو حضور ﷺ کا منشا یہ تھا کہ سربراہ ایسا ہو کہ جس کے خلاف کسی کو اٹھنے کی جرات نہ ہو، تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کہا کہ حضور کا فرمان ہے کہ **الائمۃ من قریش**، کیا تمہیں یاد نہیں! تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کن کو کہا؟ "انصار کو" اور تھے وہ بھی صحابی، اور صحابہ تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے، ہر ایک صحابی لائق احترام ہے، جب ابو بکر صدیقؓ نے یہ حدیث پڑھی، تو سب نے کہا کہ "ہاں" تو پورے مجمع میں، ایک ابو بکر کی آواز کی گونج تھی اور ایک

رعب تھا۔ اور لوگوں کو یہ بھی پتہ تھا کہ "ثانی اثنین" غار والوں میں سے اب ایک ہی رہ گیا ہے اور وہ آ گیا ہے، لہٰذا انصار کے دلوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جھکا دیا اور وہ مان گئے کہ الائمۃ من قریش بالکل ٹھیک ہے، اور وہ اب سارے چپ ہو گئے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں صدیق اکبرؓ کا فاروق اعظمؓ کے متعلق تجویز دینا

تاہم جب حضرت ابو بکرؓ نے اعلان فرمایا الائمۃ من قریش، اور پھر کہا میں مسلمانوں کی فلاح کے لئے اور بہبود کے لئے ایک ایسے آدمی کو پیش کرتا ہوں، ایسی شخصیت کو پیش کرتا ہوں، کہ جس کے کمالات کو اور قربانیوں کو اور بصیرت کو سب مانتے ہیں اور مکہ کے بڑے ہیں، تو میں آپ کے سامنے نام پیش کرتا ہوں "عمرؓ" کا۔ میں اس کو خلافت کے لائق سمجھتا ہوں، اس کو اللہ نے صلاحیتیں دیں ہیں۔ مسلمان مکہ میں چھپے چھپے رہتے تھے اور دار ارقم میں ان کا اجتماع ہوتا تھا، لیکن جب یہ مسلمان ہوا تو اس نے پہلا اعلان کیا کہ اب میرے اسلام لانے کے بعد ہم نماز پڑھیں گے تو کعبہ میں پڑھیں گے، کھل کر پڑھیں گے تاکہ سب دیکھیں، تو میرے خیال میں اس کو چن لو۔ اب بھی حضرت سعد بن عبادہؓ نہیں بولے اور چپ رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے سوال

جب انہوں نے حضرت عمرؓ کا نام پیش کیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی دی گئی تجویز کو ایک منٹ میں توڑ دیا اور حضرت ابو بکر کو کہا (جس کا مفہوم یہ تھا) کہ آپ کے ارشاد پر ہم انکار نہیں کرتے، مگر آپ ایک بات کا جواب دیں کہ اللہ نے اپنے قرآن میں جن دو کو کہا کہ "ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ" تو ثانی اثنین آپ ہیں یا میں ہوں؟ آپ اس کا جواب دیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ جو جواب دینے میں بڑے دلیر تھے خاموش ہو گئے، کیونکہ یہ حضرت عمرؓ کی قوت استدلال تھی کہ کہا ہم انکار نہیں کرتے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ کے تابع ہیں، لیکن یہ بتائیں کہ قرآن نے جب کہا "دو" تو دوسرے آپ ہیں یا میں ہوں؟ حضرت ابو بکر صدیق کی نظریں جھک گئیں، یہ پہلا موقع ہے کہ وہ

لاجواب ہوئے۔ یعنی حضرت ابو بکر صدیق نہ اس سے پہلے کبھی لاجواب ہوئے اور نہ بعد میں۔ بس ایک ہی سوال تھا کہ وہ ثانی اثنین آپ ہیں یا میں ہوں۔

فاروق اعظمؓ کا صدیقؓ کے متعلق سقیفہ بنی ساعدہ میں اعلان خلافت

یہ کہہ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پورے جذبے کے ساتھ اٹھے اور کہا حضور ہاتھ بڑھائیں اور میں پہلے آپکی بیعت کرتا ہوں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کہاں ہوئی؟ (سامعین: انصار میں) اگر کسی سازش کے تحت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا ہوتا اور علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے رکھا گیا ہوتا، یا اہل بیت کو پیچھے رکھا گیا ہوتا تو بیعتِ ابو بکرؓ کی کہاں ہوتی؟ (سامعین: مہاجرین میں) لیکن ابو بکرؓ کو خلیفہ کنہوں نے چنا؟ جو خلافت کے لئے ایک اپنے فیصلہ کے لئے بیٹھے تھے۔

حضرت ابو بکر کو خلیفہ سب نے متفقہ طور پر چنا

تو میں پوچھا کرتا ہوں کہ حضرت ابو بکرؓ کو خلیفہ کنہوں نے چنا "جو ان کے مخالفین تھے" حقیقت میں تو مخالف یا خلاف نہیں تھے، وہ بھی صحابی تھے۔ مگر میں اجمالی طور پر کہتا ہوں کہ وہ خلیفہ چننے کے لیے اکٹھے تو ہوئے تھے لیکن کیا انہوں نے چنا؟ جب انہوں نے چنا تو دو گواہ کافی ہوتے ہیں تو مہاجرین میں ابو بکرؓ کی خلافت کے دو گواہ کون ہوئے؟ پہلے حضرت عمرؓ اور دوسرے حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ۔ تو اللہ رب العزت نے ان تینوں کو مسجد نبوی سے چلایا کہ ان میں کوئی خلیفہ ہو تو دو گواہ تو ہوں، وگرنہ دو بھی تو آسکتے تھے، یا چار بھی آسکتے تھے، لیکن اللہ رب العزت کی حکمت کہ تین ہی آئے۔ اب جو لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ جی علی کی خلافت تھی، علی کا حق تھا، وہ چھینا گیا تو میں کہتا ہوں کہ جب حضرت ابو بکر نے کہا تھا الائمۃ من قریش کہ خلفاء قریش میں سے ہوں گے، اگر حضرت علی المرتضیٰؓ کو کہیں بھی خلیفہ بنایا گیا ہوتا۔ یا تجویز کیا ہوتا تو حضرت سعد بن عبادہؓ اٹھ کر کہہ دیتے کہ اچھا!! اگر قریش میں سے ہوں گے پھر "علیؓ" ہوں گے "تم" نہیں ہو گے، کیوں کہ غصہ تو ان کو آسکتا تھا نا؟ کہ میں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں Meeting بلائی اور شوریٰ کی

صف بچھائی تو اگر میں نہیں بن رہا اور مکہ والوں سے ہی بنانا ہے تو "حضرت علیؓ" کو بنائیں! تو یہ موقع تھا کہ حضرت سعد بن عبادہؓ حضرت علیؓ کا نام لیتے، لیکن انہوں نے نام نہیں لیا، معلوم ہوا کہ اسوقت تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ تصور تک نہ تھا کہ حضرت علیؓ بھی خلافت کے امید وار ہیں۔ سو بڑی حیرت ہے کہ یہ کب سے لوگوں نے بات بنالی کہ جی مقابلہ علیؓ اور ابو بکرؓ میں تھا، حتی کہ ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ جیسے لوگ بھی انہی دو لفظوں میں گھرے ہوئے ہیں ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مصرعہ سناتا ہوں جرح نہیں کرتا۔ ع

اے گرفتار ابو بکر و علی ہوشیار باش

کہ اے لوگو! جو ابو بکرؓ و علیؓ کے جھگڑوں میں بیٹھے ہو، آپس میں سر پھٹوا رہے ہو، آپس میں جھگڑتے ہو، مسلمان دو ٹکڑے ہو گئے، کچھ ابو بکرؓ کے حامی، کچھ علی رضی اللہ عنہ کے حامی،۔ ع: اے گرفتار ابو بکر و علی ہوشیار باش۔ تو ڈاکٹر اقبالؒ جیسا بصیرت والا آدمی بھی اس چکر کو دیکھ رہا ہے کہ لوگ ابو بکرؓ و علیؓ کے نام سے اختلاف میں گھرے ہوئے ہیں۔

میں عرض کروں کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں، عقل نہیں مانتی کہ یہ اختلاف اگر بنتا ہے تو ابو بکرؓ اور سعد بن عبادہؓ کے درمیان بنتا ہے، یہ خواہ مخواہ ایک بات اتنی بے انصافی کی ہے، اور لوگ تاریخ کے اوراق سے گزر تو جاتے ہیں پر غور نہیں کرتے۔ کیا آپ نے بھی اب تک خلافت کے بارے میں یہی اختلاف سن رکھا ہے کہ اختلاف ابو بکر و علی کے مابین تھا؟ یا کبھی تیسرا بھی سنا ہے (سامعین: کبھی تیسرا نہیں سنا)

خلیفہ وقت کے انتقال کے بعد متمدن دنیا کا اصول

تاہم آج جو لوگ کہتے ہیں اور صحابہ کرام کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ دیکھا!! کہ "نبی کو ابھی دفن بھی نہیں کیا گیا" اور ان کو خلافت کی فکر پڑی ہوئی تھی حالانکہ دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں بڑی بڑی سلطنتوں اور بادشاہیوں میں یہ ہے کہ جب بادشاہ یا ملکہ فوت ہو جائے تو تاج میت کے سرہانے رہتا ہے۔ اور جب تک یہ کسی کے سر پر نہ رکھ دیا جائے پہلے کو دفن نہیں کرتے، یہ دنیا میں ایک مسلم طریقہ کار ہے۔ لیکن پراپیگنڈا کرنے کے لئے مجھے یاد ہے ہم نے بھی ابتدائی دور میں ان لوگوں کی محرم کی مجالس میں اور

دیگر مجلسوں میں اس قسم کے شعر سنے تھے اب ایک شعر یاد آرہا ہے۔ ع
مومنین کرام!

لاشہ نبی کا تھا بے گور کفن پڑا
وہاں ہو رہا تھا تخت خلافت کا فیصلہ
ایسی خلافتوں کا بتاؤ اصول کیا

توجب وہ کہتا کہ ”ایسی خلافتوں کا بتاؤ اصول کیا“ تو سارے لوگ کہتے ہیں ”ہائے ہائے ہائے“[1] تاہم میں نے آپ کے سامنے یہ بات رکھی کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جو سب

(1) شیعہ ایک یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ حضرات شیخین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین اور جنازے میں شریک نہ ہوئے، بلکہ یہ لوگ تو سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے فیصلے ہی کرتے رہ گئے۔! جواباً گزارش ہے کہ یہ ایک بے بنیاد الزام ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ذرا غور کریں کہ جو صحابہ کرام ہر آن اپنا تن من دھن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں وہ حضرات آپ کے جنازہ میں بھی شریک نہ ہوں، کوئی بھی عقل سلیم اسے ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ چنانچہ حضرت علامہ صاحب اطال اللہ حیاتہ ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

سوال: بعض شیعہ علماء سے سنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال پر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر فیصلہ خلافت کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ چلے گئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی عدم موجودگی میں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کر دیا تھا، اور یہ حضرات جنازہ نبوی میں شامل نہ ہو سکے تھے۔

جواب: شیعہ علماء اس کے لیے جو راوی پیش کرتے ہیں وہ عروہ بن زبیر ہیں، ان کی پیدائش اس وقت ہوئی جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت شروع ہو چکا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ للذہبی: 1/95) سو یہ صاحب انتقال نبوی اور جنازہ نبوی میں ہر گز موجود نہ تھے، ان کی اس وقت کی روایت کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً ان مسائل میں جو عقائد کی سرحدوں کو چھوتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت سنداً منقطع ہے اور دیگر معروف روایات کے بھی خلاف ہے جس میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا جنازہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہونا بلکہ سب مہاجرین و انصار کا جنازہ پڑھنا صراحت سے مذکور ہے۔ (دیکھیے شمائل ترمذی: 29، السنن

سے زیادہ زخمی دل تھے لیکن اس دن اللہ نے ان کے دل کو ایسی قوت عطا فرمائی کہ انہوں نے پوری قوم کو سنبھال لیا۔

حضرت ابو بکرؓ کی بیعت پہلے کس نے کی؟

سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار نے سب سے پہلے بیعت کی، اور جب جاکر مہاجرین میں اعلان کیا کہ "ابو بکر خلیفہ" چن لئے گئے ہیں تو اس کے لئے کتنے گواہ چاہیے تھے؟ "دو" ان دونوں نے گواہی دی کہ "ہاں" کہ انکو خلیفہ چنا گیا ہے، پھر مہاجرین نے بیعت کی، پہلی بیعت کنہوں نے کی؟ "انصار نے"۔ اور دوسری بیعت کنہوں نے کی؟ "مہاجرین نے"۔ اور حضرت ابو بکر صدیق بالاتفاق خلیفہ ٹھہرے۔ پھر وہ خلافت حضرت عمرؓ کی طرف کس طرح پہنچی یہ میں نے پچھلی مجلس میں بیان کیا تھا۔ پھر حضرت عثمانؓ پر، پھر حضرت علیؓ پر، پھر خلافت راشدہ کے بعد کی خلافت کے متعلق پچھلی مجلس میں بیان کر رہا تھا کہ امیر معاویہ تک نوبت کس طرح پہنچی۔

اب حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت کو آپ سب کہیں کہ ہمارے "سر آنکھوں پر" ہے، ان کے سہارے پھر امت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی۔ حضور ﷺ کے وصال کے دن سب سے زیادہ ثابت قدمی حضرت ابو بکر میں تھی کیونکہ حضرت عمر تو اپنا ہوش کھو بیٹھے تھے اور بے خودی میں یہاں تک کہہ دیا کہ جس نے کہا کہ حضور ﷺ فوت ہو گئے ہیں

الکبریٰ:3/395،4/30، سنن ابن ماجہ:118، البدایہ والنہایہ:5/565۔ اس کی تائید شیعہ مرویات میں بھی ہے۔ دیکھیے کتاب سلیم بن قیس:7، مطبوع نجف اشرف، کتاب الاحتجاج للطبرسی:45، حیات القلوب:2/866 لکھنؤ) سو اس کا حکم شاذ ہوا، پھر یہ بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں دفن ہوں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پتہ تک نہ ہو، اور یہ سب کام بلا خلیفہ ہی سر انجام پا رہے ہوں، کچھ سوچئے اتنا بڑا اور اہم کام کیا کسی نظام کے بغیر ہی عمل میں آ گیا؟ (عبقات، ج:1، ص:139)

اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے "جنازۃ الرسول ﷺ" از حضرت مولانا عبد الستار تونسوی رحمہ اللہ اور "فوائد نافعہ، فصل اول، جنازہ نبویؐ میں شیخین کی عدم شمولیت" از حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ کی مراجعت فرمائیں۔

میں اس کو مار دوں گا،(1) اب یہ بات عقل سمجھتی ہے؟ لیکن اسوقت حضرت عمر کو حضرت ابو بکر صدیق نے سہارا دیا، حالانکہ عقل کہتی ہے کہ سب سے زیادہ زخمی دل تو وہ تھے۔

مصلیٰ امامت کے متعلق حضرت علیؓ کا ارشاد

لیکن جب حضرت علی نے فیصلہ سنایا تو علی المرتضی کا فیصلہ کیا تھا؟ حضرت علی المرتضی کہتے ہیں:

قدم رسول الله ﷺ ابابکر فصلی بالناس وانی لشاهد غیر غائب وانی لصحیح غیر مریض ولو شاء ان یقدمنی لقدمنی فرضینا لدنیانا من رضیه الله ورسوله لدیننا

(اسد الغابہ ج3 ص328۔ کنز العمال ج12 ص230)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی وفات پر یہاں موجود تھا اور حضور ﷺ کی وفات سے پہلے بھی وہاں ہی تھا، میں تندرست تھا بیمار نہ تھا، حاضر تھا غائب نہیں تھا، چنانچہ اگر حضور ﷺ مجھے آگے کرنا چاہتے تو مجھے کوئی روکنے والا نہیں تھا لیکن حضور ﷺ نے یہ نہیں کہا۔

حضرت علی کا فرمان: ابو بکر رضی اللہ عنہ دین و دنیا کا امام

حضور ﷺ نے مصلی امامت کے لیے حضرت ابو بکر کو چنا

- نماز کیا ہے؟ "ہمارا دین"
- اور ملک کیا ہے؟ "ہماری دنیا"
- سلطنت کیا ہے؟ "دنیا"
- حکومت کیا ہے؟ "دنیا"

(1) وصال نبوی ﷺ کے موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس حالت پر مطالعہ کے لیے اسی کتاب کی پہلی رات کی نشست اول میں سرخی "وصال نبوی ﷺ کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حالت" کے ذیل میں دیئے گئے حاشیہ کی مراجعت فرمائیں۔

 اور نماز کیا ہے؟ "ہمارا دین"

تو علی کا اعلان سنو؟ "ہم نے اپنی دنیا کے لئے اس کو چنا جسکو اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ نے ہمارے دین کے لئے چنا تھا" خاتم النبیین ﷺ نے جس کو دین کے لئے چنا ہم مل کر شوریٰ میں اس کو اپنی دنیا کے لئے چنا اور وہ خلیفہ کون ہے "ابو بکر" تو ابو بکر کی خلافت اتنی بے داغ ہے اور علی نے جو اس کی وضاحت کر دی وہ قربت نظر بھی ہے اور قربت فکر بھی، اس سے کوئی دوسری رائے بھی نہیں ہو سکتی۔

منکرین خلافتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ایک سوال

اب جو حضرت ابو بکر کی خلافت کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں "کہ نہیں جی یہ تو حضرت علی کا حق تھا" تو ان سے سادہ سوال کریں کہ بھائی چلو حق انہی کا کہو لیکن جب حضرت ابو بکر کو خلیفہ بنایا گیا تو بعد میں کوئی نماز کا وقت آیا کہ نہیں؟ بعد میں نمازیں ہوتی رہیں یا نہ؟ جیسا کہ حضور ﷺ نے بھی وفات سے پہلے جب حضرت ابو بکر صدیق کو امام مقرر کیا کہ آپ نماز پڑھائیں تو پہلے بھی امام کے طور وہ نماز پڑھاتے رہے اور حضور ﷺ کے وصال مبارک کے بعد بھی حضرت ابو بکر نمازیں پڑھاتے رہے اور بطور خلیفہ کے امامت کرتے رہے تو اب ذرا غور کریں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے حضرت علی بھی کھڑے ہوئے تھے کہ نہیں؟ شیعہ کبھی بھی اس کا جواب نہ دے سکیں گے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جماعت میں شامل ہوئے تھے کہ نہیں؟ کیونکہ جب ان سے یہ سوال کیا جاتا ہے تو بس ان کی آنکھیں نیچی ہوتی ہیں، کوئی کہے کہ بولو تو سہی، تو آگے سے کہتے ہیں جی ہمارا تو رونے کا وقت ہے محرم کا موقع آئے گا تو ہم روئیں گے۔

ایک قوم ہے جن کا ظاہر و باطن ایک ہے

بھائی اللہ کے بندو! رونے سے کام چلتا ہے تو روتے رہو، اور یہ پچھلے کئی سو سال سے جو رو رہے ہیں تو رو کر تم نے کیا لیا ہے؟ میں ان کو برا نہیں کہہ رہا، میں تو کہہ رہا ہوں کہ یہ ایک ایسی قوم ہے جن کا ظاہر و باطن ایک ہے، نہیں سمجھے!؟ باطن کی میں بات نہیں کرتا،

ظاہر کیا ہے؟ کالے کپڑے ہیں۔ آپ حضرات سے یہ کہتا ہوں اس بات کو ذرا سمجھ لیں کہ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ پیچھے نماز پڑھتے تھے کہ نہیں؟ جب اس کے جواب کے لیے انہیں بہت ہی مجبور کیا گیا تو ایک کہنے لگا کہ پڑھتے تو تھے لیکن اوپر اوپر سے۔۔۔ اندر سے ان کی نیت نہیں ہوتی تھی کہ میں ان کے پیچھے نماز کی نیت کروں۔

اختلاف سے بچنا چاہیے

تو میری عادت ہے میں اختلاف نہیں کرتا بلکہ اختلاف سے بچتا ہوں۔ تاہم میں نے کہا یہ بڑی اچھی بات ہے کہ جب وہ اوپر اوپر سے پڑھتے تھے تو تم بھی ہمارے پیچھے اوپر اوپر سے نماز پڑھا کرو، اوپر اوپر سے ہی سہی تم اپنی مسجدیں علیحدہ نہ بناؤ، اور نہ مسجدوں کو چھوڑ کر امام بارگاہوں میں جاؤ، اگر وہ اوپر اوپر سے پڑھتے تھے تو تم بھی اوپر اوپر سے پڑھ لو، مگر اس پر انہوں نے سمجھوتہ نہیں کیا!! حالانکہ کیا یہ انصاف نہیں تھا؟ (سامعین: بالکل انصاف تھا)۔

ہمارے عقیدے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ دل سے انکے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ اور ہم بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیروی میں دل سے امام کے پیچھے پڑھتے ہیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ دل سے نہیں پڑھتے تھے ہم ان کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں کہ تم آؤ پڑھو تو سہی، چلو اندر سے نہ پڑھنا اوپر اوپر سے پڑھو تو ہم نے تو ان کے ساتھ عدم تعاون نہیں کیا، جس طرح بھی آئیں، آئیں تو سہی۔

حضرت علیؓ خلیفہ اول کے پیچھے نمازیں دل سے پڑھتے رہے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیؓ ابو بکر صدیقؓ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے اور اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ کھڑے کہاں ہوتے تھے؟ اور پہلی نماز میں وہ کھڑے کہاں ہوئے؟ تو جواب ہے کہ "حضرت خالد بن ولید کے ساتھ"۔ حضرت خالد بن ولید اور حضرت علی اتفاق سے اس صف میں اکھٹے ہیں۔ اب جو صحابہ کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ جی وہ تو اس لئے پڑھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید کو حضرت علیؓ

پر مسلط کر دیا تھا کہ یہ اگر نہ پڑھے تو مار دو۔ تو بھائی اللہ کے بندو ذرا غور کرو کہ اگر مارنا ہی ہے تو نماز میں ہی مارنا ہے !؟ کوئی اور موقع نہیں ملتا؟ مجھے بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب انسان دیانت چھوڑ دے تو پھر عقل بھی سلب ہو جاتی ہے۔ بھلا یہ کوئی بات ہے کہ مارنے کا وقت وہ نماز میں ہی تھا!!! اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا نام اس لئے کہ وہ بڑے جرنیل تھے، اس لیے ڈرانے کے لئے کہ۔۔ اچھا!!! خالد بن ولید کو مسلط کیا۔۔۔ اتنا ظلم !؟

تو میں یہ بات دیانت داری سے کہتا ہوں، کہ حضرت علی المرتضی حضرت ابو بکر صدیق کے پیچھے نماز پڑھتے رہے اور اس کا اقرار ان لوگوں نے خود اپنے ہاں کیا ہے کہ انہوں نے نمازیں نہیں چھوڑیں، آپ برابر نمازیں پڑھتے رہے۔

بہر حال اب یہاں تک تو ہم پہنچے لیکن وہ جو مسئلہ جہاں کل چھوڑا کہ پھر آگے خلافت کا نظام کیسے چلا !؟ اور امیر معاویہ تک کیسے پہنچا؟ یہ ایک چھوٹی سی بات کہہ کر پھر ختم کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمرانی وجہاں بانی کے لئے اس رعب کو جو بڑے لوگوں میں ہوتا ہے، جیسے کسی گاؤں میں چوہدری ہوں، نمبر دار ہوں، تو جو بڑے لوگوں کا رعب ہوتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رعب کو ملحوظ رکھ کر یہ کہا تھا **الائمة من قريش** اور یہ کوئی عیب نہیں، اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے لئے یہ حق رکھا تھا۔ تو بڑے لوگ جو تھے ان دو میں سے کون تھے؟ (بنو ہاشم اور بنو امیہ)

عرب کے شہر مکہ میں بنو ہاشم اور بنو امیہ دونوں "عبد مناف" کی اولاد تھے لیکن ان میں جو لوگ جہاں بانی میں، حکمرانی میں، سلطنتوں میں آگے جانے والے تھے وہ زیادہ بنو امیہ تھے، اور للّٰہیت میں، اخلاق میں، بزرگی میں، نیکی میں، یہ بنو ہاشم زیادہ تھے اور دونوں ہی "عبد مناف" کی اولاد تھے۔ لیکن بنو ہاشم میں بزرگی اور نیکی غالب تھی اور ان (بنو امیہ) میں حکمرانی غالب تھی۔

بنو ہاشم اور بنو امیہ کی خصوصیات میں جوہری فرق

آپ حضرات انڈیا کے رہنے والے اور پاکستان کے رہنے والے ہیں تو انڈیا میں اسلام کا پرچم لیکر اور اسلام کا جھنڈا لیکر پہلے کون لڑنے آیا تھا؟ "محمد بن قاسم"۔ تو محمد بن قاسم

رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کس نے بھیجا؟ ''اموی حکومت نے''۔ جو بنو امیہ کے حکمران عبد الملک بن مروان نے بھیجا تھا۔ تو انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر جتنا احسان ''بنو امیہ'' کا ہے تاریخ اب بھی ''محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ'' کو سلام کرتی ہے جو بنو امیہ کے خلیفہ عبد الملک کے حکم سے یہاں آیا۔ ''اسپین'' اندلس میں اسلام کے جھنڈے بہت اونچے اڑے اور اسپین کی ایک شان تھی تو اسپین میں کون اسلام لیکر گئے؟ بنو امیہ کے لوگ ''عبد الرحمن ثالث''۔ اس نے اسپین میں مستقل حکومت بڑی شان سے بنائی تو یہ لوگ جہاں بانی میں معروف تھے اور حضرت امیر معاویہ بھی بنو امیہ میں سے تھے۔ سو اس وقت ان لوگوں کے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا، کہ بلال کی نیکی زیادہ ہے فلاں کی نیکی سے۔

تاریخ اسلامی میں بحری فوج کے موجد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

امیر معاویہ اموی تھے۔ آپ کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین، سلطنت اور امت قائم کی، اس کو چلانے کے لئے ہم نے رعب اور قوت کو قائم رکھنا ہے۔ تو امیر معاویہ کا نقطہ نظر میں ایک عجیب وغریب بات تھی۔

تاہم حبشہ کے ملک کی طرف جب بڑھنا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص کو کہا (حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر تھے) انہیں حضرت عثمان نے اپنے وقت میں کہا تھا کہ اب مصر والے تو مسلمان بن چکے، اب تم حبشہ کی طرف بڑھو۔ مختصر یہ کہ اس کے بعد حضرت امیر معاویہ بحری فوج کی جانب متوجہ ہوئے۔

بھائی ہماری افواج کی کتنی قسمیں ہیں؟ ایک ہے نیوی، نیوی کون ہیں؟ Navigation میں۔ جو سمندروں میں لڑیں، ان کو نیوی کہتے ہیں اور جو میدان میں لڑیں ان کو آرمی کہتے ہیں، اور جو ہوا میں لڑیں ان کو ائیر فورس کہتے ہیں۔ تو سلطنتیں کہاں ہیں؟ ''تین دائروں میں یا نیوی کی یا میدان کی یا ہوا کی'' تو ہوائی جہاز تو اس وقت بنے نہیں تھے تو دو ہی میدان تھے ایک میدان بری اور ایک بحری، تو سب سے پہلے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدر و احد میں لڑے، اور پھر خلفائے راشدین بھی میدان میں لڑے مگر یہ سب زمینی جنگیں تھیں۔ حضرت امیر معاویہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کہا ''اب ہم مسلمان بحری بیڑا بنائیں گے، سمندروں میں

جائیں گے" تو خلفائے راشدین کی عزت اپنی جگہ۔ امیر معاویہ خلفائے راشدین میں شمار نہیں لیکن خلفائے راشدین نے حضور ﷺ کی جانشینی کا جو حق ادا کر دیا وہ اپنی جگہ، ہم ان کی سعادت کو سلام کرتے ہیں اور ان کی عقیدت کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن سمندروں کی لڑائیوں کا تصور سب سے پہلے کن کے دل میں پیدا ہوا؟ "معاویہ رضی اللہ عنہ کے" وہ حضرت عثمان کی طرف سے گورنر تھے. انہوں نے حضرت عثمان کو کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم سمندروں میں اتریں.... کیوں؟ ایک پروگرام تھا کہ انہوں نے کس طرح سمندر کو عبور کر کے جنوبی فرانس تک پہنچنا ہے۔ اب افسوس ہوتا ہے کہ لوگ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شوکت کو، عزت کو اور جہاں بانی کی شان کو تو نہیں دیکھتے۔ تو بحری بیڑا سب سے پہلے کنہوں نے تیار کیا؟ "معاویہ نے"۔

حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق لسان نبوت سے بشارت

ایک شخص گستاخی میں کہتا ہے کہ جی معاویہ نے قائم کیا تو ہم کیا کریں؟ میں نے کہا، میں خود تعریف نہیں کر رہا بلکہ پیغمبر ﷺ تعریف کر چکے، حضور ﷺ مدینہ منورہ میں تھے، حضرت ام حرام کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے، دوپہر کا وقت تھا، نیند آگئی، آپ سو گئے، اور جب اٹھے تو چہرے پر "مسکراہٹ" تھی تو حضرت ام حرام نے پوچھا یارسول اللہ! آپ کے چہرے پر یہ مسکراہٹ ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے کہ میری امت کے لوگ جو ہیں وہ سمندر میں کشتیوں میں اس طرح جارہے ہیں کہ یہ دیکھ کر مجھے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بادشاہ جارہے ہوں۔ وہ لوگ سڑکوں یا خشکی میں نہیں جا رہے بلکہ سمندر میں کشتیاں پر سوار ہیں۔ حضور ﷺ نے دیکھا کہ میری امت کے لوگ سمندر میں کشتیوں پر اس طرح جارہے ہیں کہ "**كالملوك**" جس طرح کہ بادشاہ ہوں، یہ ایک بادشاہی وقار ہے، بادشاہی شان ہے۔

اب یہ خواب جو حضور ﷺ نے سنایا اس میں بشارت تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ میری امت کے لوگ اس طرح سمندروں میں جائیں گے اور کشتیاں تیرائیں گے۔ سو پھر

یہ کشتیاں ترائیں کس نے؟"امیر معاویہ نے"۔ حضور ﷺ کو اللہ نے خواب دکھایا۔[1]

تو صحابہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے عملوں کی تصدیق اللہ تعالی اپنے پیغمبر کو خواب میں دکھا کر کرتے رہے، اور جب پیغمبر نے تعریف کی تو ام حرام کہنے لگیں کہ اچھا اس امت کے لوگ جنگوں میں بحری کشتیوں میں اس طرح جائیں گے !!! حضور "ادعو الله" اللہ سے دعا کریں کہ اللہ مجھے بھی ان میں کر دے کہ جو اس خدمت کے لئے جائیں، چہرہ رسالت پر مسکراہٹ آئی تو آپ نے فرمایا"انت منهم "تو ان میں ہو گی تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ امیر معاویہ نے اپنی مرضی سے وہ بحری بیڑا بنایا صرف و صرف اسلام کی سربلندی کے لیے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا خواب اللہ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو دکھایا اور پیغمبر ﷺ نے امت کو یہ خوش خبری سنائی تو ہم کس طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ سے الگ کریں؟ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جو تجویز تھی پیغمبر ﷺ اس کی بشارت دے چکے تو یہ ایک بڑا باریک نکتہ ہے۔

اللہ تعالی توفیق عطا فرمائے تو کل اگلی مجلس میں اس سے آگے چلیں گے۔ اللہ تعالی عافیت اور صحت بھی دے۔ آمین.............وما علينا الا البلاغ المبين



(1) صحیح بخاری، جلد:1، ص:391۔

ذاکر سے خطاب

حیف ہے اے ذاکر افسردہ طبع و نرم خو
تیرے آگے کاروباری شئ ہے مولٰی کا لہو

تاجرانہ مشق ہے تیرا شعار ھاؤ ھو
فیس کی محتاج ہے منبر پہ تیری گفتگو

عالم اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خون اہل بیت میں لقمہ کو تر کرتا ہے تو

حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دناءت کا سبق
کربلا کے ذکر میں دیتا نہیں کیوں درس حق

چشمہ دولت ہے تیرا سیل اشک بے قلق
خون کی چادر سے سونے کی بناتا ہے ورق

خانہ برباد ہے عشرت سرا تیرے لئے
ایک دفینہ ہے زمین کربلا تیرے لئے

(منقول از ماہنامہ النجم لکھنو 11 محرم 1355ھ)

پانچویں رات (مجلس 5)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ اَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ
وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ (پ10۔التوبہ 33)
وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا (پ26۔الفتح 28)
صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

بزرگان محترم، سامعین عزیز! اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبی پاک ﷺ کو جو اور عزتیں دیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ سے ساری دنیا پر غلبہ کا وعدہ کیا گیا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ:

اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ

اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے اپنے پیغمبر کو دین حق کے ساتھ بھیجا، کاہے کے لئے بھیجا؟ ”لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ“ تاکہ سب دینوں پر، سب نظریات پر، وہ غالب آجائے تو دنیا میں

- جو جو نظریات پھیلے ہوئے تھے،
- اور جو جو مذاہب موجود تھے
- اور جو جو ادیان تھے،
- جن جن ممالک میں تھے

مشرق و مغرب میں جہاں کہیں تھے، سب کے لئے ایک چیلنج تھا کہ اب جو پیغمبر آیا ہے تو اس لیے کہ لِیُظْھِرَہٗ، تاکہ سب پر اللہ تعالیٰ اسے غالب کر دکھائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ جو وعدہ ہے پھر یہ کیسے پورا ہوا؟ اس کا بنیادی جواب یہ یاد رکھیں ”کہ امت کے ذریعے“ ہوا

اگر مصر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں فتح ہوا۔۔۔ تو اس کا کریڈٹ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ شام فتح ہوا۔۔۔ تو یہ بھی انہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا کہ میری امت کے قدم دنیا کے ہر کنارے تک پہنچیں گے تو یاد رکھیں اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی عالمی غلبے کا ظہور ہے:

ان اللہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا ومغاربھا وان امتی سیبلغ ملکھا مازوی لی منھا واعطیت الکنزین الاحمر والابیض

(صحیح مسلم جلد 2 ص 390)

ساری دنیا میرے سامنے لپیٹ کر رکھ دی، میں نے اس کے مشرقوں کو بھی دیکھا، مغربوں کو بھی دیکھا، اور میری امت کے قدم ہر جگہ پہنچیں گے، تو آپ حضرات جو برطانیہ میں آ گئے، آپ حضرات جو اس ملک میں آ گئے تو آپ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی پیشین گوئی کے تحت آئے ہیں کہ میری امت کے قدم دنیا کہ ہر کنارے تک پہنچیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خلفائے راشدین کے دور میں

- یمن فتح ہوا
- مصر فتح ہوا
- شام فتح ہوا

بیت المقدس فتح ہوا، حبشہ تک پہنچے، بڑے بڑے متمدن ممالک ایران وغیرہ سب فتح ہو گئے، اور صحابہ کا جھنڈا سب پر لہرا گیا۔ اور برطانیہ و یورپ میں بھی اذانیں اسی نبی کی گونجیں، یہ جگہ خالی تھی اس کو اللہ نے آپ کے ذریعے پُر کر دیا۔ ہم گناہ گار ہیں، ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر پوری طرح عمل پیرا نہیں رہے لیکن ہم نے یہاں جو اذانیں دیں اسی پیغمبر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دیں، یہاں کی مسجدوں میں نام گونجا تو اشھد ان محمدا رسول اللہ کا گونجا، تو ہم اس ملک میں بھی جو ہیں تو ہم حضور کے غلام ہیں۔

خندق کی کھدائی کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی

تو میں توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں، کہ غزوہ خندق میں خندق کھودتے ہوئے ایک

ایسی چٹان آگئی کہ جو بڑے سے بڑے کارکن سے بھی اکھڑتی نہیں تھی۔ آنحضرت ﷺ سے آکر عرض کی کہ حضور یہ چٹان ہے یہ اکھڑتی نہیں ہے تو آنحضرت ﷺ خود تشریف لے گئے اور آپ کے پہلی کدال مارتے ہی چٹان ٹکڑے ہوگئی، اور ساتھ آپ یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے لئے شام کے محلات روشن کئے گئے ہیں۔[1] تو ساتھ مشکل بھی حل ہوگئی چٹان بھی اکھڑ گئی خندق بھی صحیح بن گئی اور ساتھ یہ کہ اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے میرے لئے روشن کر دیا، اب یہ جو اس قسم کی پیشین گویاں ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ "یہ حضور کا ہی ذمہ تھا کہ ان سب پر فتوحات حاصل کرتے؟ "نہ" آپ پیشوا ہیں ایک پوری امت کے، آپ کی قیادت اور سیادت ایک پوری قوم کے ساتھ وابستہ تھی، تو حضور کے صحابہ نے وہ جہاں جہاں بھی بڑھے وہ حضور ﷺ کی ہی کامیابی ہے، اور آپ (یہاں کے مسلمان) جو یہاں آگئے اور امریکہ تک چلے گئے، آسٹریلیا چلے گئے، نئے نئے ملکوں میں چلے گئے جہاں پہلے مسلمان نہیں پہنچے تھے تو وہ صرف امت نہیں پہنچی یوں سمجھیے حضور کے قدم پہنچے ہیں کیونکہ حضور کے نام پر ہی اس امت کا تعارف تھا اس پیغمبر کے نام کی صدا پوری دنیا میں پہنچی۔

جہاں کہیں اللہ نے حضور ﷺ کو پہنچایا وہاں نام بھی حضور کا ہی چلے گا

اب جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو پہنچایا، وہاں نام بھی کس کا چلے گا؟ "حضور کا ہی"۔ لیکن عملی طور پر وہی لوگ آگے آئیں گے جو عملی طور پر آئے ہیں، تو میں یہ بات بیان کر رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے دین میں جو غلبے کی شان تھی وہی آپ کی پہچان تھی۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

(پ:15، الاسراء:81)

ترجمہ: اور کہہ آیا سچ اور نکل بھاگا جھوٹ بیشک جھوٹ ہے نکل بھاگنے والا۔

(ترجمہ شیخ الہند)

تو حضور ﷺ کا دین سب پر غالب آیا کہ نہیں؟ آج بھی عیسائی اپنی عیسائیت میں دم

(1) مسند احمد، راوی حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ۔

توڑ رہے ہیں۔ ہندو اپنے ہندو ازم میں دم توڑ رہے ہیں، اب اگر یہودی سلطنت اسرائیل میں ہے تو صرف اس لئے کہ ان کے پیچھے امریکہ جیسی بڑی بڑی طاقتیں ہیں ورنہ اپنے پاؤں پر تو وہ یہاں نہیں آئے، تو اسلام کا یہ غلبہ، حضور ﷺ کے نام کا غلبہ ہے، حضور ﷺ کے پروگرام کا غلبہ ہے، حضور ﷺ کے مشن کا غلبہ ہے۔

جیسا کہ میں نے گزشتہ مجلس میں یہ عرض کیا تھا اور اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ نبی پاک ﷺ کے جو صحابہ خاص طور پر بنو امیہ میں سے تھے، ان میں ''جہاں بانی اور حکمرانی'' کے آداب غالب تھے جیسا کہ ملکوں کو فتح کرنا وغیرہ۔

تاہم یہ لوگ ''سپین''(اندلس) تک پہنچے ۔ان لوگوں نے اذانیں دیں اور حضور ﷺ کا نام پوری دنیا میں گھوم گیا۔ تو جب ہم اس نقطہ پر بیان کرتے ہیں کہ دنیا میں غلبہ پانا یہ حضور ﷺ کی خلافت کا ایک نشان تھا۔ اور جو لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ دنیا میں غلبہ ہو۔ انہوں نے دین کا تصور جو قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ بس ''اللہ اللہ کرو'' یہ جہاں بانی حکمرانی اور ملکوں پر اسلام کے جھنڈے لہرانا قوموں سے قومیں ٹکرانا وغیرہ یہ منظر غلط ہے۔ تو ذرا غور کریں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین کی مخالفت کیوں کی گئی؟ اس لئے کہ وہ ''فاتحین'' تھے ''پرچم کشا'' تھے انہوں نے دنیا کے ملکوں پر غلبہ حاصل کیا۔

صحابہ کرام میں ترتیب فضیلت

گزشتہ مجلس میں بیان کرتے ہوئے میں یہاں تک پہنچا تھا کہ حضور ﷺ کے صحابہ میں سب سے اونچے درجے کے لوگ، پہلے درجے میں، اول درجے میں، اونچے درجے میں حضرات ''خلفائے راشدین'' ہیں۔ ان سے آگے اگر دیکھا جائے تو سارے صحابہ میں ''دس'' تھے جن کو عشرہ مبشرہ کہتے ہیں ۔ان کے بعد پھر دیکھا جائے تو "اصحاب بدر" ہیں۔ اور پھر ''بیعت رضوان'' والے چودہ سو پاک باز انسان ہیں، جو حضور ﷺ کے ساتھ حدیبیہ تک پہنچے، اور پھر حدیبیہ کے مقام پر حضور اکرم ﷺ نے ان سے بیعت لی اور جب بیعت لی تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور ﷺ کے بارے میں فرمایا کہ ''اے

میرے پیغمبر اس درخت کے نیچے جن لوگوں نے تیری بیعت کی ہے تیری بیعت نہیں میری بیعت کی ہے" ان کے ہاتھوں پر تیرا ہاتھ نہیں میرا ہاتھ ہے "انما یبایعون اللہ[1]" انہوں نے اللہ کی بیعت کی "ید اللہ فوق ایدیھم"

جن کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ آیا انکے ایمان میں شک نہیں کیا جا سکتا

تو جن لوگوں کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ آیا یا نبی پاک ﷺ کا ہاتھ آیا ان کے بارے میں کسی قسم کا یا ان کے ایمان کے بارے میں کسی قسم کا شبہ ہو سکتا ہے؟ ہمارا اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ سارے صحابہ میں، اول درجہ میں، خلفائے راشدین ہیں، ان کے بعد عشرہ مبشرہ ہیں، ان کے بعد اصحاب بدر اور پھر ان کے بعد اصحاب رضوان یعنی درخت کے نیچے بیعت کرنے والے ہیں۔ سو یہ ایک ترتیب ہے اور آگے وہ ساری امت جو کلمہ گو ہے اور حضور ﷺ کا کلمہ پڑھنے والی ہے۔ یہ کلمہ گو حضور ﷺ کے غلام ہیں اس لیے جہاں جہاں بھی ان کے قدم پہنچے وہ حضور ﷺ کا ہی پروگرام لیکر پہنچے۔

مسلمان جب بھی تقسیم ہوئے پھر ایک نہیں ہوئے

گزشتہ کسی مجلس میں، میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ مسلمان جہاں بھی دو ٹکڑے ہو جائیں، پھر کتنی بھی کوششیں ہوں کیا وہ کبھی ایک ہوئے ہیں؟ (سامعین: نہیں) مسلمان جماعتی درجہ میں جہاں بھی دو ٹکڑے ہو جائیں پھر کبھی ایک ہوئے ہیں؟ ہندوستان میں اہل سنت والجماعت کے دو حصے ہو گئے اب تک اتنی کوششیں ہوئیں لیکن پھر ایک ہوئے ہیں؟ یہ پوری تاریخ ہے میں اسے دہراتا نہیں لیکن دو ہو کر کبھی ایک نہیں ہوئے۔ مگر دیکھیں اللہ کی عجیب شان ہے کہ صحابہ کرام وہ طبقہ ہے کہ جو دو ہو کر پھر ایک ہوئے۔

میں نے یہ بات عرض کی تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ کے سفر آخرت پر جانے کے بعد
✪ سارے مسلمان ایک رہے اور قیادت حضرت ابو بکر صدیق کی رہی

(1) پارہ:26، سورہ الفتح:10۔

❂ پھر سارے مسلمان ایک ہیں اور قیادت حضرت عمر کی ہے
❂ پھر سارے مسلمان ایک ہیں اور قیادت حضرت عثمان کی ہے

پھر حضرت عثمان کے بعد حالات ایسے ہو گئے کہ یہود کی مداخلت کے باعث مسلمانوں میں تقسیم ہوئی۔

مسلمانوں میں اختلافات کا آغاز کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں اجمالی طور پر تو میں نے ایک دو باتیں کہیں تھیں لیکن جب تک تفصیل نہ ہو، ہم کربلا تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ کربلا کے واقعہ کو پورا سمجھنے کے لئے پچھلے Back Ground کو سامنے لانا ضروری ہے۔

جب تک صحابہ کا غلبہ رہا کسی کو تفرقہ کی جرات نہ ہوئی

تو آپ حضرات یہ جانیں کہ حضور ﷺ کی جب وفات ہوئی تو مسلمانوں میں اکثریت میں کون تھے؟ (سامعین: صحابہ) جب ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما کی وفات ہوئی تو مسلمانوں میں صحابہ کی اکثریت تھی لیکن اس دوران میں اب جو لوگ فوت ہو رہے ہیں تو کمی کن میں ہو رہی ہے؟ (صحابہ میں) اور جو اُن کی اگلی نسلیں بڑی ہو رہی ہیں اور جو بچے ہیں وہ جوان ہو رہے ہیں، اور وہ نظام کو سنبھال رہے ہیں تو وہ کون ہیں؟ ”غیر صحابہ“۔

جن آنکھوں میں مصطفی ﷺ کا عکس اترا تھا وہ اقلیت میں ہوتے گئے

جب تک صحابہ کا غلبہ رہا کسی کو جرات نہ ہو سکی کہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے آخری حصے میں عالم اسلام میں صحابہ اقلیت میں تھے اور جو اگلی نسلیں آگئیں وہ مسلمان تو تھے لیکن صحابی نہیں تھے۔ تو جو صحابہ کی برکات ہیں، وہ تو ان میں نہیں تھیں۔ ہم تابعین کی عظمت اور مقام کا انکار نہیں کرتے لیکن جو حضور ﷺ کے فیض یافتہ تھے اور جن کی آنکھوں میں آنحضرت ﷺ کی زیارت کا نور اترا تھا یعنی جب ہم کسی کو دیکھتے ہیں تو اس کا عکس آنکھوں میں آتا ہے کہ نہیں؟ آپ کسی کی آنکھوں کو دیکھیں تو اس کا عکس آنکھوں میں اترتا ہے کہ نہیں؟ تو وہ آنکھیں جن پر حضور ﷺ کا جلوہ اترا تھا وہ اقلیت میں آگئیں، اور مسلمانوں میں تابعین اور اگلی نسل کا غلبہ ہو گیا جو غیر صحابی تھے۔

تاہم پھر ملکوں پر ملک فتح ہوتے چلے گئے

- حبشہ فتح ہوا
- ایران فتح ہوا
- بیت المقدس فتح ہوا
- مصر فتح ہوا
- شام فتح ہوا

ملکوں پر ملک فتح ہوتے چلے گئے تو ان فتوحات میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، کیا وہ صحابی تھے؟ ”نہیں“ وہ صحابی نہیں تھے بلکہ وہ تو اس نئے دور کے تھے، تو جس وقت مسلمانوں میں، عالم اسلام میں، صحابہ اقلیت میں چلے گئے تو وہ برکتیں بھی جاتی رہیں۔ جن کی آنکھوں میں فیض مصطفی کے آثار تھے وہ آنکھیں اقلیت میں جا رہی ہیں، جن پر جلوہ محمدی اترتا تھا۔

تاہم اب یہ بات اس طرح چلی کہ جو مسلمانوں کے اندر سے دشمن تھے جیسے یہود ونصاریٰ یا دوسرے غیر مسلم۔۔۔وہ مسلمانوں میں گھس کر تفرقے کی باتیں کرتے۔

پہلا تفرقہ یہیں شروع میں ہی اٹھنے والا تھا مگر ان کی سوچ سے اللہ نے مسلمانوں کو بچایا اور حضرت ابو بکر کو اس اجتماع نے اپنا خلیفہ چن لیا جو اپنا خلیفہ انصار سے چننا چاہتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ اور صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے

حضور اکرم ﷺ کی عمر مبارک کتنی تھی؟ ”63 سال“۔ حضرت ابو بکر صدیق کی کتنی تھی؟ ”63 سال“۔ حضرت عمر کی کتنی ہوئی؟ تقریباً ”63 سال“۔ سو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی مٹی سے پیدا کیے گئے تھے اور ایک روایت کے مطابق آپؐ نے اعلان بھی فرمایا:

ما من مولود الا وفی سرته من تربیته التی ولد منها فاذا ردالی

ارذل عمرہ ردالی تربتہ التی خلق منھا حتی یدفن فیھا وانی وابا بکر وعمر خلقنا من تربۃ واحدۃ وفیھا ندفن (تاریخ بغداد، ج:3، ص:115)

ترجمہ: ہر بچہ کے ناف میں اس مٹی کا حصہ ہوتا ہے جس سے وہ بنایا یہاں تک کہ اس میں وہ دفن ہو جائے اور میں اور ابو بکر اور عمر ایک ہی مٹی سے بنے ہیں اور اسی میں دفن ہوں گے۔

شیعہ کہ مشہور پیشوا ملا مقبول دہلوی نے اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ پر امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

نطفہ جب رحم میں پہنچ جاتا ہے تو خدا تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیج دیتا ہے کہ وہ اس مٹی میں سے جس میں یہ شخص دفن ہونے والا ہے تھوڑی سی لے آئے چنانچہ وہ فرشتہ لاکر اس نطفہ میں ملا دیتا ہے اور اس شخص کا دل ہمیشہ اسی مٹی کی طرف مائل ہوتا رہتا ہے جب تک کہ اس میں دفن نہ ہو جائے۔۔۔(ترجمہ مقبول ص627)

پس اس یقین سے چارہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا خمیر طیب ایک ہی پاک مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔"

(بحوالہ عبقات، جلد اول، ص41)

سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میں، ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ایک ہی مٹی سے پیدا کیے گئے اور ایک ہی مٹی میں جائیں گے اور اسی سے اٹھائے جائیں گے۔ آج مدینہ منورہ میں گنبد خضراء کے نیچے یہ تینوں اکٹھے ہیں کہ نہیں؟ تو حضورؐ تریسٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے تشریف لے گئے، حضرت ابو بکر صدیق 63 سال کی عمر میں گئے، حضرت عمر 63 سال کی عمر میں گئے، اور حضرت عثمان کی عمر 80 سال ہو گئی" تو منافقوں نے مسلمانوں میں گھس کر یہ پراپیگنڈہ شروع کیا کہ بھائی یہ بوڑھے کب جائیں گے؟ نوجوانوں کو موقع ہی نہیں ملتا کہ نوجوانوں کو آگے کیا جائے۔

بھائی اللہ تبارک وتعالی جل شانہ کی اپنی حکمت ہے اب حضرت عثمان اسی (۸۰) سال کی عمر کے ہو گئے، آپ بوڑھے ہو گئے لیکن ان کی رگوں میں جوانوں کا خون تھا۔ جس کی

مثال میں ایک بات کہتا ہوں کہ حضرت عثمان جب اس بڑی عمر میں تھے تو انہوں نے حکم دیا کہ اب ملک حبشہ پر چڑھائی کی جائے اور حبشی لوگ اپنی شکل و صورت میں ایسے ڈراؤنے اور سخت مزاج ہوتے ہیں کہ ان کے سامنے کھڑے ہونے میں کوئی جلدی جرات نہیں کرتا اور پھر حبشی جب ہاتھیوں پر آئیں جس طرح عرب گھوڑوں پر آتے تھے (جس سے انکی شوکت ظاہر ہوتی تھی) اسی طرح حبشی ہاتھیوں پر آتے تھے۔ تو ذرا سوچیں کہ وہ ہوں بھی حبشی، اور ہوں بھی ہاتھیوں پر، تو ان کے آگے کوئی نکلنے کی جرات کرے گا؟ لیکن حبشہ کی طرف جو ان کی چڑھائی تھی وہ کس رستے سے ہونی تھی؟ ”وہ مصر کے رستے سے ہونی تھی“۔ سوڈان میں جو لوگ ہیں وہ بھی ان جیسے دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کی اور حبشہ کی اصل ایک ہو۔

حضرت عثمان بوڑھے بھی جوان تھے

حضرت عثمان غنی کی رگوں میں بڑھاپے میں بھی جوانوں کا خون تھا، انہوں نے کہا اب ہم حبشہ کا رخ کریں اور حضرت عثمان نے ہی پہلے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان ایک ملک ہے، جو بہت بڑا ملک ہے وہاں بھی روانہ ہوں گے اور آپ نے ہندوستان کے حالات معلوم کرنے کے لئے لوگ بھیجے تھے کہ وہاں کے حالات کا پتہ کرو تو ہندوستان کا رخ سب سے پہلے کس نے کیا؟ کس نے اس طرف دھیان کیا؟ ”حضرت عثمان نے ہی“۔ تو میں کہا کرتا ہوں کہ:

برصغیر کے مسلمانوں پر حضرت عثمان غنی کا احسان

- ہندوستان میں
- پاکستان میں
- بنگلہ دیش میں

ان مسلمانوں پر احسان اگر کسی کا ہے تو اولین حضرت عثمانؓ کا ہے کہ سب سے پہلے ان کی نظر ادھر پہنچی اور ان کی نظر بھی اس انتظار میں تھی کہ کب مسلمان یہاں پہنچیں گے

خیر ہم حبشہ کی بات کر رہے تھے۔

فتح حبشہ اور حضرت عثمان غنی

حضرت عثمان نے کہا کہ اب حبشہ کی طرف چلیں تو سب سے بڑے جرنیل مسلمانوں میں اس طرف کون تھے؟ (حضرت عمرو ابن عاص) حضرت عمرو ابن عاص ہیں جن کو فاتح مصر کہتے ہیں، آپ بہت بڑے آدمی تھے تو عمرو ابن عاص جو مصر کے عامل اور گورنر تھے ان کو کہا گیا کہ حبشہ کی جانب چلنا ہے۔ تو حضرت عمرو ابن عاص نے حضرت عثمان سے گزارش کی کہ جناب میرے خیال میں ہم ابھی اس درجہ میں نہیں کہ حبشہ کی طرف رخ کریں، ان کا مقابلہ کرنا اور افریقہ کے ملکوں میں چلے جانا اس کے لئے میری رائے ساتھ نہیں، تو جب کمانڈر ہی کہہ دے کہ نہیں ہم نہیں جاسکتے تو پھر کوئی حکم دیتا ہے؟ تو حضرت عثمان نے کہا کہ بھائی اگر آپ کی ہمت نہیں پڑتی تو آپ مصر میں بطورAdministrator کے رہیں کہ مصر کا نظام قائم رکھیں، آگے بڑھنے کے لئے میں کسی اور جرنیل کو مقرر کروں گا لیکن ہم نے وہاں جانا ضرور ہے، وہیں ہم نے چڑھائی کرنی ہے تو حضرت عثمان نے کہا کہ میں ایک امیر مقرر کرتا ہوں اور انہوں نے اپنے رشتہ داروں میں سے ابن ابی سرح کو مقرر کیا کہ آپ چڑھائی کریں جب ابن ابی سرح نے ادھر چڑھائی کی تو مقابلے میں شاہ حبشہ نے آنا تھا۔[1]

---

(1) حضرت عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دودھ شریک بھائی تھے۔ آپ فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے اور پھر کچھ مدت کے بعد اسلام چھوڑ بیٹھے اور واپس مشرکین مکہ سے جا ملے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں معافی کی درخواست پیش کی اور آپ نے اسے منظور فرمالیا اور یہ دوبارہ مسلمان ہوگئے۔ اس کے بعد حضرت عبد اللہ اسلام پر ثابت قدم اور پختہ مسلمان رہے اور پھر اس حوالے سے آپ سے کبھی کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوئی جو قابل ملامت ہو۔ آپ کا شمار قریش کے شرفاء اور باصلاحیت افراد میں ہوتا تھا، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں انہیں علاقہ "صعید" اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں "مصر" کا حاکم مقرر کیا۔ افریقہ کی فتح آپ کی ان قابل قدر صلاحیتوں کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ اللہ کے

حضرت عثمانؓ کے خلاف یہود کا پروپیگنڈا

تو شاہ حبشہ نے اپنی جگہ اعلان کیا کہ جو شخص مسلمانوں کے سپہ سالار کا سر میرے پاس لائے گا، میں اپنی بیٹی اس کو بطور بیوی کے دوں گا اور ملک کی آدھی دولت بھی دوں گا سو یہ تو اعلان ہوا شاہ حبشہ کا اور جس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کا کمانڈر مقرر کیا تھا ، جو آگے بڑھا، اس نے بھی اعلان کر دیا کہ جو شاہ حبشہ کا سر لائے گا، اسے آج کا سارا مال غنیمت دیا جائے گا۔ اس وقت ان کو یہی خیال آیا۔ اب جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ میں سارا مال غنیمت اس کو دوں گا، تو سامعین ذرا خیال کیجیے کہ یہ انہوں نے جوش میں کہہ دیا نا؟ وگرنہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو قانون بیان کیا ہے وہ تو اس کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوۡلِ

(پ:10، الانفال:41)

ترجمہ: اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

کہ جو مال غنیمت آئے، اس کے اتنے حصے ہوں گے اور سارے لشکر والوں کا بھی اس میں حصہ ہو گا، اللہ اور رسول کا بھی اس میں حصہ ہو گا، اس میں خمس ہو گا۔ تو جو کمانڈر نے اعلان کر دیا وہ کیا کیا؟ بھائی کیا یہ قرآن کے مطابق تھا؟ شاہ حبشہ نے کہا کہ جو مسلمانوں کے کمانڈر کا سر لائے گا اسے بیٹی بھی دوں گا اور آدھی سلطنت بھی دوں گا تو ادھر سے یہ بھی جوش میں آگئے اور کہا کہ جو اس کا سر لائے گا، میں اسے آج کا سارا مال غنیمت دے دوں گا۔ یہ اعلان کرنے والے کمانڈر حضرت عثمان کے رشتہ داروں میں سے تھے۔

اب ذرا ایک طرف ہو کر سوچیں تو یہود فطرت ابن سبا اور اس کے پیرو کاروں نے یہ

حضور یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! میرا خاتمہ بالخیر نماز کی حالت میں فرما۔ اللہ تعالیٰ نے آپکی یہ دعا قبول فرمائی اور آپ ایک دن بحالت نماز خالق حقیقی سے جا ملے۔ (تفصیلی مطالعہ کے لیے، طبقات ابن سعد، الاستیعاب، اسد الغابہ کی مراجعت فرمائیں)

بات کی کہ دیکھو عثمان نے اپنے رشتہ دار کو مال دینے کے لئے سارا مال غنیمت پیش کر دیا!!! حالانکہ قرآن تو یہ کہتا ہے؟۔۔اب بھائی! ایسے موقع پر اس قسم کا کوئی اعتراض کرنا، کیا مناسب ہے؟ (سامعین: نہیں) غور کریں کہ جب شاہ حبشہ نے اعلان کیا تو اِنہوں نے بھی کوئی نا کوئی اعلان تو کرنا ہی تھا!! مگر اب حضرت عثمان کے خلاف یہود کا یہ پراپیگنڈہ عام کرنا کہ جی قرآن نے مال غنیمت کی تقسیم یہ بتائی ہے اور حضرت عثمان نے اپنے رشتہ دار کو سارامال دے دیا تو خیر اس کی بھی تفصیل ہے یہ موقع نہیں۔[1]

یہ ضمنی بات میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ 80 سال کے بوڑھے تھے، جب ان کو یہ فتح نصیب ہوئی۔ کیونکہ آپ ذہن کے اعتبار سے جوان تھے۔ حضرت عثمان غنی ضعیف العمری میں بھی اپنی رگوں میں جوانوں سا

---

(1) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس جنگ میں امداد کے لیے مدینہ سے ایک لشکر بھیجا تھا جس میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ شاہ حبشہ کے اعلان کے بعد حضرت عبداللہ بن ابی سرح اپنے خیمہ میں تھے جس پر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ خیمہ میں کیوں ہیں؟ میدان میں چل کر خود فوج کی کمان کیوں نہیں کرتے۔ اس سوال پر ابن ابی سرح نے شاہ حبشہ کے اعلان کے متعلق بتایا، اس پر ابن زبیر نے کہا کہ آپ بھی اعلان کر دیں کہ جو شخص شاہ افریقہ کا سر لائے گا میں اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دوں گا اور مال غنیمت کا پورا خمس بھی دے دوں گا۔ مختصر یہ کہ ابن ابی سرح نے خود ہی ایک دستے کے ساتھ شاہ افریقہ کے خیمہ پر حملہ کیا اور اس کا سر اتار کر نیزہ پر بلند کیا اور افریقی فوج کو شکست ہوئی۔ اس طرح ابن ابی سرح اعلان کے موافق خمس غنیمت کے مستحق قرار پائے اور ان کے استحقاق کو حضرت عثمان سمیت فوج نے بھی تسلیم کیا۔ مگر ابن سبا اور اس کے ماننے والوں نے اس واقعے کو غلط رنگ دے کر پیش کیا جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابن ابی سرح کو لکھا کہ تم خمس بھیج دو، میں تم کو اپنے پاس سے مناسب انعام دے دوں گا کیونکہ بعض لوگ اس پر چہ مگوئیاں کر رہے ہیں۔ سو اس مختصر وضاحت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء نوازی کے کھوکھلے الزام کی قلعی کھل جاتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اقرباء نوازی کے لگائے گئے اس غلط الزام پر تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کے لیے کتاب "رحماء بینھم، حصہ اقرباء نوازی" از حضرت مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ اور "خلفائے راشدین" از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی مراجعت فرمائیں۔

خون رکھتے تھے، تبھی تو انہوں نے کہا کہ ہم نے حبشہ پہنچنا ہے اور پھر اللہ نے فتح بھی دی۔ شاہ حبشہ وہاں کا پرانا حکمران تھا اور اس کی فوج ہاتھیوں پر لڑتی تھی جس طرح عرب گھوڑوں پر لڑتے ہیں۔ لیکن حضرت عثمان غنی کو اللہ تعالی نے کوئی روحانی قوت دی تھی، جو وہ اس بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ معلوم ہوتا ہے ان کے پیچھے اللہ تعالی کے الہامات کا دخل تھا۔ تاہم اس کی تفصیل میں جانے کا ٹائم نہیں لیکن اس ہستی کے متعلق جنہوں نے 80 سال کی عمر کا ہو کر بھی اپنے کام کی جو رونق دکھائی اور کامیابی دکھائی اور حبشہ پر فتح حاصل کی اس کے بارے میں ان کے خلاف تحریک چلانے والے کہنے لگے کہ ان کو اتارو، اور جوانوں (Young) کو موقع دو، مگر سوچیں کہ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ "جوانوں کو موقع دینا چاہیے "کیا اتنے پختہ اور تجربہ کار حضرات کے ہوتے ہوئے ان لوگوں کی اس بات کی کوئی اہمیت تھی؟ اور بھلا کیا یہ کوئی بات تھی!!!!

تو اصل بات یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی کے دور کے آخر میں مسلمانوں کی اکثریت صحابہ کی نہ رہی تھی اور صحابہ کی تعداد تھوڑی ہوتی جارہی تھی۔ حضرت صدیق اکبر کے دور میں ختم نبوت کے معرکہ میں کچھ صحابہ فوت ہوگئے پھر حضرت عمر کے دور میں فوت ہوئے اور اب 12 سال کے قریب حضرت عثمان کا دور خلافت ہے اور اس میں بھی دس سال گزر چکے جس میں کچھ اور صحابہ بھی فوت ہوگئے تو مسلمانوں میں صحابہ کی جتنی تعداد کم ہوتی گئی برکات بھی کم ہوتی گئیں اور اللہ تعالی کی طرف سے جو عنایات ہیں وہ بھی کم ہوتی گئیں کیونکہ صحابہ پر جو عنایات اتریں ان کی مثال نہیں ملتی۔ صحابہ کرام پر حضور ﷺ کی صحبت کے اثرات سایہ افگن تھے اور جب صحابہ کا دور تھا اس وقت رُحماء بینهم ان کی شان تھی اور حضرت علی و حضرت معاویہ کے دور میں دونوں طرف افواج میں غیر صحابہ کی اکثریت تھی۔[1]

(1) حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (241ھ) حضرت امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ (110ھ) کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اس جنگ میں صحابہ کرام کی تعداد تیس سے بھی کم تھی:

یہود کی سازش اور منافقین کا کردار

اب یہود کا چکر چل گیا انہوں نے کہا کہ عثمان چونکہ بوڑھے ہوگئے ہیں ان کو کسی طرح ختم کرو، توحج کا سیزن (Season) تھا اور سارے بڑے بڑے لوگ صحابہ کرام اور ام المؤمنین یہ سب حج پہ مکہ المکرمہ گئے ہوئے تھے اور امیر المومنین عثمان غنی مدینہ میں تھے۔ لہذا ایسے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہودیوں نے سازش کی کہ ان پر چڑھائی کر کے قتل کرنا ہے۔ میں حضرت عثمان غنی کی شہادت کے ضمن میں سب باتوں کو چھوڑتا ہوں کیونکہ مجھے ان حالات کو لیکر کربلا تک پہنچنا ہے اور بتانا ہے کہ یہ جو واقعہ ہوا اس کا پس منظر کیا رہا تھا۔

عبد اللہ بن سبا کی تاریخ میں آمد

عبد اللہ بن سبا ایک یہودی تھا[1] جس نے ہر صوبے میں سفر کیا۔ یہ کبھی حجاز میں،

ھاجت الفتنة واصحاب رسول اللہ ﷺ عشرات الوف فلم یحضرھا منھم مائة بل لم یبلغوا ثلاثین (منہاج السنة، ج:3:ص:86)

شیخ الاسلام حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (728ھ) اسکی سند کے متعلق فرماتے ہیں:

ھذا الاسناد اصح اسناد علی وجه الارض (ایضاً)۔

(1) عبد اللہ بن سبا کون تھا؟ اسکا تاریخی تعارف کیا ہے؟ اسکے مقاصد کیا تھے؟ ہم ان تمام سوالات کے جوابات استاذنا المکرم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم کے الفاظ میں پیش کیے دیتے ہیں:

”جوں جوں انسانی تمدن ترقی کرتا گیا انسان اپنے نظریات کے حلقے وسیع کرنے کے لئے کبھی زیر زمین بھی گئے اور رازدارانہ مخفی تنظیمات قائم کیں۔ حالات کو نئی ترتیب دینے میں ان خفیہ تنظیمات نے اپنے اپنے عہد میں بہت کام کیا ہے اور پرانی زندگی سے نئی زندگی میں لانے والے یہ آزاد قومی معمار اپنے کاموں سے نہیں اپنے کارناموں سے پہچانے جاتے رہے۔ سوسائٹی کے ظاہر اعمال کے پیچھے یہ مخفی تنظیمات دور تک اثر انداز رہی ہیں۔

سیّدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمانوں کی سیاسی عظمت کا سورج عین

نصف النہار پر تھا کہ ایک یہودی منتقمانہ پروگرام لے کر اسلام کی صفوں میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا نام عبد اللہ رکھا۔ اور اس نے اپنی تحریک کا آغاز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گورنروں کے خلاف پراپیگنڈے سے کیا۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف بھی ہونٹ ہلانے لگے۔ تاہم ان فری میسنز کی کاروائیاں مسلمانوں میں کچھ سیاسی انتشار پیدا کرنے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ تحریک زیرِ زمیں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں مسلمانوں میں ایک نئے مذہب نے جنم لیا اور چوتھی صدی ہجری میں عبد اللہ بن سبا کا پہلا تاریخی تعارف ان الفاظ میں سامنے آیا۔ ابو عمر و الکشی (۳۷۰ھ) لکھتا ہے:

ذکر بعض اهل العلم ان عبدالله بن سبا كان يهودياً فاسلم ووالى عليا۔ ۔ ۔ وكان اول من اشهر بالقول بفرض امامة علی واظهر البرأة من اعدائه وكاشف مخالفيه واكفرهم فمن هٰهنا قال من خالف الشيعة: اصل التشيع والرفض ماخوذ من اليهودية۔ (رجال کشی۔ بحار الانوار، ج:25، ص:287)

ترجمہ: بعض اہل علم نے کہا ہے کہ عبد اللہ بن سبا یہودی تھا وہ اسلام میں داخل ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا دم بھرنے لگا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی منصوص امامت کی بات اُڑائی اور آپ کے دشمنوں سے اظہار لاتعلقی کیا اور آپ کے مخالفین سے پردہ اُٹھایا اور ان کی تکفیر کی۔ اسی جہت سے وہ لوگ جو شیعہ کے خلاف ہوئے کہتے ہیں کہ تشیع اور رفض کی جڑ یہودیوں سے چلی ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو پانچویں صدی میں لے چلیں۔ امام ابو المظفر الاسفرائنی (۴۷۵ھ) کی شہادت لیجئے:

وزعم ابو المظفر الاسفرائنی فی الملل والنحل ان الذين احرقهم علی طائفة من الروافض ادعوا فيه الالٰهية وهم السبائية وكان كبيرهم عبد الله بن سبا يهودياً فاظهر الاسلام وابتدع هذه المقالة

(نقلہ فی فتح الباری جلد ۲۶، ص: ۱۰۰)

ترجمہ: علامہ سفرائنی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ لوگ جنہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آگ میں جلوادیا تھا وہ رافضیوں کا ایک گروہ تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ میں خدائی طاقت کے مدعی تھے وہ سبائی تھے اور ان کا بانی عبد اللہ بن سبا یہودی تھا اس نے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور یہ باتیں

گھڑیں۔

یہ الفاظ کہ کان یھودیاً فاظھر الاسلام بتلاتے ہیں کہ وہ ایک خفیہ پروگرام سے اسلام کی صفوں میں گھسا تھا۔ یہی الفاظ ہم چھٹی صدی میں حافظ ابن عساکر الدمشقی (۵۷۱ھ) سے سنتے ہیں:

کان اصلہ من الیمن وکان یھودیاً فاظھر الاسلام وطاف بلاد المسلمین لیلفتھم من طائفۃ الائمۃ ویدخل بینھم الشر ودخل دمشق لذلک(تاریخ ابن عساکر جلدصفحہ قلمی)

ترجمہ: اس کی اصل یمن سے تھی وہ یہودی تھا بظاہر اسلام لایا اور اس نے تمام صوبوں کا دورکیا تاکہ انہیں آئمہ کے گروہ سے بچلا دے اور ان میں شر داخل کر دے اس کے لئے وہ دمشق آیا۔"

آیئے اب ہم آپ کو ساتویں صدی میں لے چلیں۔ موٴرخ شہیر علامہ ابن اثیر جزری (۶۳۰ھ) اپنی تاریخ الکامل میں لکھتے ہیں:

ان عبداللہ بن سبا کان یھودیاً واسلام ایام عثمان ثم تنقل فی الحجاز ثم بالبصرۃ ثم بالکوفۃ یرید اضلال الناس فلم یقدر منھم علیٰ ذلک فاخرجہ اھل الشام فاتی مصراً فاقام فیھم۔ (کامل ابن اثیر (جلد ۳، صفحہ ۷۷، احوال ۳۵ھ)

ترجمہ: عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام لایا اور حجاز چلا آیا پھر بصرہ اگیا پھر کوفہ آیا وہ مسلمانوں کو اپنی راہ سے گمراہ کرنے کے درپے ہوا اور اس پر قادر نہ ہو سکا اہل شام نے اسے نکالا تو وہ مصر چلا آیا اور ان میں رہا۔

آیئے اب آپ کو اگلی صدی میں لے چلیں۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (728ھ) لکھتے ہیں:

فالرافضۃ تتحل النقل من اھل البیت لما لا وجود لہ واصل من وضع ذلک لھم زنادقۃ مثل رئیسھم الاول عبد اللہ بن سبا الذی ابتدع لھم الرفض۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲۴، صفحہ ۳۶۷)

ترجمہ: سو روافض اہل بیت کے نام سے وہ چیزیں گھڑتے ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا اور جس نے ان کے لئے یہ باتیں گھڑیں وہ زندیق تھا جیسے کہ ان کا پہلا رئیس جس نے ان کے لئے

رفض کو ایک دین بنایا عبد اللہ بن سبا۔

یہ بات یہ مؤرخین نہیں کہہ رہے صدیوں سے یہ بات ان میں عام رہی ہے:

ذکر غیر واحد منهم ان اول من ابتدع الرفض والقول بالنص علیٰ علی وعصمته کان منافقاً زندیقاً اراد فساد دین الاسلام وأراد ان یصنع بالمسلمین ما صنع بولص بالنصاریٰ لکن لم یتأت له ما تأتی لبولص لضعف دین النصاریٰ او عقلهم فان المسیحؑ رفع۔ (منہاج السنۃ جلد ۳، صفحہ ۲۶۱)

ترجمہ: اسے کئی لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ پہلا شخص جس نے رفض گھڑا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے منصوص اور معصوم امامت کی بات بنائی وہ ایک منافق تھا جس نے زندقہ کا طریقہ اختیار کیا وہ دین اسلام کو برباد کرنا چاہتا تھا اور اس نے چاہا مسلمانوں میں وہی کام کرے جو پولوس نے عیسائیوں میں کیا ہے لیکن اسے وہ قوت حاصل نہ ہوئی جو پولوس کو حاصل تھی دین نصاریٰ کی کمزوری اور ان کی بے سمجھی کی وجہ سے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو تو اوپر اٹھالیا گیا (اور ان کی خلافت قائم نہ ہو سکی تھی)۔"

اس صدی کے آخر میں حافظ ابن کثیر الدمشقی (۷۷۴ھ) بھی یہی کہتے ہیں:

أن رجلا یقال له عبد الله بن سبا کان یهودیاً فاظهر الاسلام وصار الی مصر فاوحیٰ الیٰ طائفة من الناس کلاماً اختراعه من عند نفسه

(البدایۃ والنہایۃ جلد ۷، صفحہ ۱۶۷)

ترجمہ: ایک شخص تھا جسے عبد اللہ بن سبا کہا جاتا تھا وہ یہودی تھا اس نے اپنے آپ کو مسلمان کہا اور مصر چلا آیا اور کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے خفیہ طور پر ان سے کچھ باتیں کیں اور وہ باتیں سب اس کا اختراع تھیں۔"

اب آیئے اگلی صدی میں چلیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) بھی کہتے ہیں:

اخبار عبد الله بن سبا شهیرة فی التاریخ ولیست له روایة ولله الحمد وله اتباع یقال لهم السبائیة معتقد والاهیة علی بن ابی طالب وقد احرقهم علی بالنار فی خلافته (لسان المیزان جلد ۳، صفحہ ۲۹۰)

ترجمہ: عبد اللہ بن سبا کی خبریں تاریخ میں عام ہو چکیں اور اس کی کوئی روایت (حدیث وتاریخ) میں نہیں ہے، اس پر خدا کا شکر ہے۔ اس کے پیرو ہوئے انہیں سبائی کہا جاتا ہے۔ وہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی الوہیت کے قائل تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں انہیں آگ میں زندہ جلایا۔"

حافظ ابن حجر اس پر خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ عبد اللہ بن سبا سے کوئی روایت مروی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے کوئی معروف زندگی نہ گزاری بلکہ وہ زیادہ جاسوس لوگوں کے پیرائے میں رہا۔ کبھی ظاہر اور کبھی مخفی اور اس قسم کے لوگ اسی پیرائے میں رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی فرضی شخصیت ہے تاہم اس کی خبریں اس درجہ میں شہرت پا چکیں کہ اب اس کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ اس شخص کو یہ الحادی کردار خبر متواتر کے طور پر چلا اور اس کا ذکر تقریباً تمام بڑے مؤرخین نے کیا ہے۔

معروف شیعہ مؤرخ مرزا محمد تقی نے ناسخ التواریخ لکھ کر اپنے زعم میں اپنی پہلی سب تواریخ پر پانی پھیر دیا۔ تاہم عبد اللہ بن سبا کے تاریخی وجود کا اس نے بھی اقرار کیا ہے۔

عبد اللہ بن سبا نے مسلمانوں میں کن کن عقائد کو فروغ دیا اسے مرزا محمد تقی کی زبان سے سنئے اور سر دھنیے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے:

"گفت ہاں اے مردم مگر نشنیدہ اید کہ نصاریٰ گویند عیسیٰ علیہ السلام بدیں جہاں رجعت کند و باز آید چنانکہ در شریعت ما نیز ایں سخن استواراست چوں عیسیٰ رجعت تواں کرو محمد کہ بے گماں فاضلتر از دست چگونہ رجعت نہ کند وخداوند نیز ور قرآن کریم مے فرماید ان الذی فرض علیک القرآن لرآدّک الیٰ معاد" (ناسخ التواریخ جلد ۳، صفحہ ۲۳۴)

ترجمہ: اس نے کہا اے لوگو! کیا تم نے نہیں سنا کہ عیسائی کہتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام اس دنیا میں پھر لوٹیں گے اور دوبارہ آئیں گے جیسا کہ ہم مسلمانوں میں بھی یہ بات پختہ ہے جب عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آسکتے ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو بلاشبہ حضرت عیسیٰ سے افضل ہیں وہ یہاں دوبارہ کیوں نہ آسکیں گے اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا ہے: وہ خدا جس نے تمہیں قرآن دیا ہے البتہ تجھے پھر لوٹائے گا لوٹنے کی جگہ پر"

اس کا ایک خفیہ کارکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آیا اور برملا سوال کیا تمہارا عقیدہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دوبارہ آنے میں کیا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی ڈٹ کر تردید کی۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، صفحہ ۵۴)

اسلام میں یہ کوئی معمولی زیادتی نہ تھی۔ امام عجلی کوفی (۲۶۱ھ) نے اس کفر واسلام کا فاصلہ

کبھی عراق میں، کبھی مصر میں اور کبھی شام میں جاتا، جتنے مسلمانوں کے صوبے تھے اور جتنے مسلمانوں کے یہ علاقے تھے ہر ایک میں سفر کرتا جاتا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف تو زبان نہیں چل سکتی تھی سوائے ایک بات کے کہ یہ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن جو ان کے آگے عامل تھے اور وہ مختلف صوبوں میں نظام کو چلا رہے تھے ان کے خلاف پراپیگنڈا کرنا کہ اس عامل نے یہ غلط کیا، اِس عامل نے یہ کیا، اُس عامل نے وہ کیا۔ ہر صوبے میں اس

قائم بتلایا ہے اور کہا ہے:

"جو حضرت علی کی رجعت پر ایمان رکھتا ہے وہ کافر ہے۔" (تذکرہ صفحہ ۴۰۴)

عبد اللہ بن سبا کے ایک دوسرے الحادی عقیدے کی ترغیب بھی آپ اس سے سنیں:

"ہمانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم را علی علیہ السلام وصی و خلیفہ برد۔ چنانچہ خود فرمودانت معنی بمنزلۃ ھارون وموسیٰ، ازیں میتواں دانست کہ علی علیہ السلام خلیفہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔"

ترجمہ: یقینا علی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور خلیفہ تھے چنانچہ آپ نے انہیں خود کہا تم میرے لئے اس طرح ہو جیسے ہارون علیہ السلام موسیٰ کے لئے تھے۔۔۔ اس سے یہ جانا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بلا فصل حضرت علی ہیں۔"

معلوم نہیں اس سے یہ کیسے جانا گیا کہ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ہارون تو حضرت موسیٰ کے خلیفہ نہ ہوئے تھے وہ تو حضرت موسیٰ کی زندگی میں ہی فوت ہوئے وہ صرف حضرت موسیٰ کے ان کی زندگی میں خلیفہ رہے اور یہ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگِ تبوک پر جانے کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بار کی نگرانی سب آپ کے سپرد رہی۔

موٴرخین کی یہ متواتر شہادتیں اس یہودی کے تاریخی وجود کا پتہ دے رہی ہیں اس نے جن نظریات کو جنم دیا وہ آج تک اثنا عشری مذہب میں جلی عنوانوں سے تسلیم کئے گئے ہیں اور شیعہ کے اس کے نقش پا پر چلنے کی خبر دے رہے ہیں۔ ہاں یہ شخص چونکہ ایک خفیہ تحریک کارکن تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ کبھی چھپنا اور کبھی ظاہر ہونا اس کی عادت رہی ہو اور اسی غلط فہمی میں کسی نے یہ سمجھ لیا ہو کہ یہ کوئی فرضی شخص ہو گا، یہ بات صحیح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے زندقہ کی سزا دی، اسے آگ میں جلوا دیا اور موت کے گھاٹ اُتارا اور ظاہر ہے کہ سزائے موت کسی فرضی شخصیت پر جاری نہیں کی جا سکتی وہ کوئی حسی وجود ضرور تھا۔

(عبقات، ج:2، ص:144-139)

نے یہ پراپیگنڈہ کیا۔ اگر صوبوں کے بارے میں یہ خیالات پیدا ہوں تو وفاق پر اثر پڑتا ہے کہ نہیں؟ وفاق جو تھا وہ حضرت عثمان کے پاس تھا اور صوبوں کے جو عامل تھے اور گورنر تھے ان کے بارے میں اس قسم کی فضا پیدا کی وہ ایک لمبی داستان ہے۔[1]

حضرت عثمانؓ کی شہادت

لیکن نتیجہ کیا نکلا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ حضرت عثمان غنی کو کس نے شہید کیا؟ کن لوگوں نے یہ ظلم کیا؟ کہو "باغیوں نے"۔ جو بغاوت کے لئے نکلے تھے تو حضرت عثمان غنی کو شہید کنہوں نے کیا؟ باغیوں نے۔ تو باغیوں نے جب ان کو شہید کر دیا، یا کر رہے تھے تو انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اب کیا ہو گا کیونکہ جو مسلمان حج پر گئے ہوئے ہیں جب بڑے بڑے سارے لوگ واپس آجائیں گے تو کیا وہ ہمیں ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟ (نہیں)۔ تو وہ اس سوچ میں بھی ہیں کہ اب کیا کریں!؟ مسئلہ بڑا ٹیڑھا اور Complicated ہو گیا کہ جن کے وہ خلاف تھے ان کو تو شہید کر دیا وہ اپنے گھر میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے اور قرآن کریم پڑھتے ہوئے ان کو شہید کیا گیا اور ان کا خون پہلے گرا ہی قرآن کریم پر ، اور جب ان کی بیوی بچانے کے لئے آگے آئی تو اس نے جو ہاتھ آگے کیا تو اس کا ہاتھ کٹ گیا تو اس امت میں حضرت عثمان کو امام مظلوم کہا جاتا ہے اور وہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہے وہ اتنے ملکوں کا بادشاہ، اتنے ملکوں کا سربراہ، خلافت راشدہ میں سب سے زیادہ دور بھی انہی کا لیکن ان کو گھر بیٹھے اس طرح شہید کر دیا گیا کہ صحابہ کرام اور دیگر مسلمان ہل کر رہ گئے۔ تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ شہید کنہوں نے کیا؟ باغیوں نے۔ تو اب باغیوں کو ساتھ ہی یہ فکر بھی تھی کہ اب کیا کریں؟ ہمیں کوئی نہیں چھوڑے گا کیونکہ جو لوگ حج پر گئے ہوئے

(1) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت، شخصیت، خلافت اور شہادت تک پیش آنے والے واقعات پر تفصیلی مطالعہ کے لیے "امام مظلوم سیرت سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ"، "شہادت عثمان رضی اللہ عنہ" از حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رحمہ اللہ، "رحماء بینہم" از حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ، "خلفائے راشدین" از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی، "سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ" از حضرت مولانا محمد اقبال رنگونی کی مراجعت فرمائیں۔

ہیں وہ واپس تو آئیں گے اور واپس آکر وہ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔

باغیوں کا حضرت علیؓ پر دباؤ

تو انہوں نے کہا کہ اب طریقہ ایک ہی ہے کہ صحابہ میں سے کسی کو پکڑ کر کھڑا کر کے کہو کہ اب ہمارے خلیفہ، اب ہمارے پیشوا اور اب اس پوری امت کے امام آپ ہی ہیں تو انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پکڑا اور حضرت علی المرتضیٰ کو کہا کہ جی اب آپ امت کی قیادت کریں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تو حالات دیکھ گئے تھے اور ان کے بیٹے حضرت امام حسن اس وقت حضرت عثمان کے گھر کا پہرا دے رہے تھے جب ان کو شہید کیا گیا تو اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں خلیفہ نہیں بنتا، بس میں پیچھے ہٹتا ہوں۔ مگر انہوں نے کہا کہ پھر آپ کا بھی وہی انجام ہو گا جو عثمان کا ہوا ہے، حضرت علی کے وہ خطبے نہج البلاغہ میں محفوظ ہیں جس میں آپ بیان کرتے ہیں اپنی کسمپرسی کو کہ جب انہیں خلیفہ بنایا گیا فرماتے ہیں۔

لوگو! وہ وقت مجھے یاد ہے کہ تم میرا ہاتھ کھینچتے تھے بیعت کرنے کے لئے اور میں اپنا ہاتھ واپس کرتا تھا کہ میں تیار نہیں تھا اور جب تم نے مجھے مجبور ہی کر دیا تو پھر میں نے بیعت قبول کر لی۔ [1]

تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جو مسلمان مدینہ میں موجود تھے ان کے نزدیک تو ان لوگوں کے کہنے سے پہلے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بڑی شان تھی اس لیے اگر اب آپ خلیفہ بھی بن جائیں تو "بسر و چشم" اس کو قبول کریں گے۔ تو جو صالحین امت تھے انہوں نے حضرت علی کو اس لئے قبول کیا کہ حضرت علی کی ایک اپنی شان تھی اور ان کا مقام تھا اور ان کے دین و ایمان میں اور ان کی دیانت و امانت میں کوئی شک نہ تھا اور جو باغی تھے انہوں نے اس لئے آگے کیا کہ ان کے سائے میں وہ بچ سکیں گے۔ اب جو فوج تھی اس سے حضرت علی المرتضیٰ نے خلافت کی بیعت لے لی۔ چونکہ مدینہ منورہ Capital تھا لہٰذا وہاں سارے لوگ حضرت علی کے بیعت ہو گئے تو حضرت علی کی فوج میں یا مدینہ کی جو

---

(1) نہج البلاغہ، ج:1، ص:80، خطبہ نمبر:92۔

افواج تھیں ان میں دونوں طرف کے لوگ تھے یا نہیں؟[1]

حضرت عثمان کی شہادت کی خبریں شام پہنچیں

اب یہ خبر پہنچی شام میں کہ جی عثمان کو شہید کر دیا گیا ہے اور حضرت عثمان کی بیوی جس کی انگلیاں کٹی تھیں وہ شام کے گورنر امیر معاویہ کی رشتے میں بہن (کزن) تھی۔ جب حضرت عثمان کی خون آلود قمیص شام پہنچی تو سارے علاقے میں ایک واویلا مچ گیا، امام مظلوم کی یاد میں لوگ قاتلین کے خلاف بھڑک اٹھے۔ اور پھر جب یہ خبر بھی آئی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چن لیا گیا ہے تو حضرت علی کا دامن جو بالکل خون عثمان سے بالکل پاک تھا، اس پر ہی کئی شبہات اٹھنے لگے۔

حضرات حسنین کریمین کی حضرت عثمان کی حفاظت پر تقرری

حضرت علی نے تو اپنے بیٹوں حضرات حسنین کریمین کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے مقرر کیا ہوا تھا لیکن ان کے بارے میں پراپیگنڈہ کیا گیا کہ جی ان کی ایماء پر یہ کچھ ہوا ۔۔ حضرت علی نے اپنی جگہ قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میرے ہاتھ خون عثمان سے پاک ہیں، (میں تو اس (خلیفہ بننے) کے لئے تیار ہی نہ تھا، ان حالات میں مجھے آگے کیا گیا ہے) لیکن جو Blood Relation ہوتا ہے، جو خون کا رشتہ ہوتا ہے وہ ایسے موقع پر جلدی سنبھلتا نہیں تو جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے Blood Relation کے لوگ اموی، شام میں تھے، اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اموی تھے ان لوگوں کو گمان ہو گیا کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کریں، بیشک حضرت علی اونچے ہیں، ان کے سارے فضائل و کمالات اپنی جگہ، لیکن یہ صوبہ یعنی شام کا، وہ حضرت علی کی خلافت تب قبول کرے گا جب وہ قاتلین عثمان کو اپنی گرفت میں لیں گے۔

---

(1) هؤلاء الذين تريان فخرج خلق كثير فقالوا كلنا قتلة عثمان فمن شاء فليرمنا (البدایہ والنہایہ، ج:7، ص:260)

شیعہ مؤرخ دینوری بھی لکھتے ہیں: یہ لوگ تعداد میں تقریباً بیس ہزار تھے جنہوں نے کہا کہ ہم سب عثمان کے قاتل ہیں۔ (دیکھیے، اخبار الطوال:181)

شام کے لوگوں کا حضرت علیؓ سے مطالبہ اور حضرت علی کا جواب

حضرت علی نے ان کو اطلاع دی کہ میری فوج میں جو قاتل ہیں، وہ اس طرح کام کر رہے ہیں کہ

ومن كلام له عليه السلام بعد ما بويع بالخلافة، وقد قال له قوم من الصحابة لو عاقبت قوما ممن أجلب على عثمان؟ فقال عليه السلام: يا إخوتاه إني لست أجهل ما تعلمون، ولكن كيف لي بقوة والقوم المجلبون على حد شوكتهم، يملكوننا ولا نملكهم۔

(خطبة ١٦٨ نهج البلاغة ج ٢ ص ٨٠)

ترجمہ: آپ کی بیعت ہو چکنے کے بعد صحابہ کی ایک جماعت نے آپ سے کہا کہ بہتر ہے کہ آپ ان لوگوں کو جنہوں نے عثمان پر فوج کشی کی تھی، سزا دیں تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ اے بھائیو! جو تم جانتے ہو میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ لیکن میرے پاس (اس کی) قوت و طاقت کہاں ہے جبکہ فوج کشی کرنے والے اپنے انتہائی زوروں پر ہیں وہ اس وقت ہم پر مسلط ہیں ہم ان پر مسلط نہیں۔

(خطبہ 166 نہج البلاغہ جلد دوم ص 444 اردو مترجم)

یملکوننا ولا نملکھم یہ نہج البلاغہ کے الفاظ ہیں کہ یملکوننا کہ وہ لوگ فوجوں پر قابض ہو گئے ہیں، ولا نملکھم ہماری بات نہیں چلتی تو حضرت علی نے اسوقت کہا کہ قاتلوں کو پکڑنے کی بجائے، پہلا مسئلہ ہے

- امن کا
- امن کا
- امن کا

کہ حکومت Establish ہو جائے، حکومت ایک جگہ جمع ہو جائے، اس کی قوت ایک ہو جائے، پھر انہیں پکڑا جاسکتا ہے مگر اب ان موجودہ حالات میں انہیں کیسے پکڑیں؟ تو حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما میں یہ بات مسئلہ اختلاف رہی ہے۔

تو حضرت علی خلیفہ راشد ہیں، اور مقابلے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کیا ہیں؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہونے کا دعوی نہیں کیا جیسا کہ میں نے پچھلی مجلس میں بتایا تھا، کہ حضرت معاویہ نے کہا کہ مجھے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں شام کا گورنر مقرر کیا پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہاں مقرر کیا گیا، اس لیے میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقرر کردہ نمائندہ ہوں اور جیسا کہ اب مجھے مقرر کرنے والا، اور اپنا نمائندہ مقرر کرنے والا، مجھے یہاں بھیجنے والا، اللہ کے ہاں پیارا ہو چکا تو اب میری وفاداری کا تقاضا ہے کہ جب تک عثمان کے خون کا بدلہ نہ لے لیا جائے اور قاتلوں کو نہ پکڑا جائے تب تک میں نئے خلیفہ کو نہیں مانوں گا۔ تو انہوں نے حضرت علی کے مقام، ان کی شان، ان کے درجات کا انکار نہیں کیا، کہا کہ یہ عثمان کے قاتلوں کو پکڑتے کیوں نہیں؟ لہذا میں نہیں مانتا تو یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ خلافت کے لئے اٹھے اور کہا میں خلیفہ ہوں، تو "نہ" واللہ میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ ان کا اس انکار کے پیچھے خلیفہ ہونے کا دعویٰ ہرگز نہ تھا۔

حضرت امیر معاویہ کا حضرت علی کو خط

امیر معاویہ نے حضرت علی کو جو خط لکھے ہیں، وہ میں نے پڑھے ہیں، کہا اے علی!

ولّانی خلیفتان من قبلك

آپ سے پہلے جو دو خلیفہ حضرت عمر اور حضرت عثمان ہوئے ہیں، میں ان دونوں کے دور کا شام کا والی ہوں۔ مجھے یہاں پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقرر کیا ہے، اور پھر ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پورے دور خلافت میں بلا کسی اختلاف کے میں یہاں کا امیر اور والی رہا ہوں۔ سو وَلّانِی مجھے اس علاقے کا والی بنایا ہے خلیفتان (دو خلیفوں) نے، وانا باق علی حالہ تو میں اپنے اسی حال پر رہوں گا جب تک قاتلین عثمان کو نہ پکڑا جائے۔

سامعین آپ ذرا غور کریں کہ کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل خلافت کا دعوی ہے؟ یا نیابت کا؟ حضرت عثمان کی نیابت میں وہ رہے، سو یہ پراپیگنڈا غلط ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل خلافت کا دعوی کیا۔

حضرت علی کی جنگ صفین میں پہل اور اہل سنت کا مؤقف

مؤرخین جانتے ہیں کہ آگے ایک جنگ کا ذکر آتا ہے جو حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین ہوئی، جسے جنگ صفین کہتے ہیں۔ تو جنگ صفین جب واقع ہوئی، اس میں پہل کس کی طرف سے ہوئی؟ جنگ صفین تو ہوئی ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر پہل کس کی طرف سے ہوئی؟

جنگ صفین جو حضرت علی اور معاویہ کے درمیان ہوئی، اس میں پہل حضرت علی نے کی۔ اور میں ایک عرض کرتا ہوں کہ حضرت علیؓ کو حق تھا۔۔۔ کیوں؟ کیونکہ وہ خلیفہ وقت ہیں۔ تو خلیفہ وقت نے اگر ملک کو جوڑنا ہو تو اسے یہ حق ہے۔ اور حضرت علی نے امیر معاویہ کو خط لکھے، قاصد بھیجے کہ آپ میری خلافت مان لیں اور یہ ٹھیک ہے کہ میرے لشکر میں قاتلین عثمان ملے ہوئے ہیں لیکن جنہوں نے

- حضرت ابو بکر کی بیعت کی
- حضرت عمر کی بیعت کی
- حضرت عثمان کی بیعت کی

میری بیعت کرنے والے بھی وہی لوگ (اہل حل و عقد) ہیں، جو اسوقت زندہ ہیں۔ ٹھیک ہے ان میں سے وہ سارے تو نہیں رہے لیکن ان میں سے جو بھی مدینہ میں زندہ ہیں انہوں نے بیعت کی۔ تو حضرت علی کا خط نہج البلاغہ میں ہے، آپ فرماتے ہیں:

انه بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علیٰ ما بایعوهم علیه، فلم یکن للشاهد ان یختار ولا للغائب ان یرد، وانما الشوریٰ للمهاجرین والانصار (نہج البلاغہ جلد سوم، مکتوب 6 صفحہ 643)

حضرت علی نے فرمایا کہ جب عثمان کو شہید کر دیا گیا تو اس وقت جو لوگ زندہ تھے جنہوں نے کبھی ابو بکر کی بیعت کی (کچھ تو زندہ ہوں گے) جو لوگ زندہ تھے، جنہوں نے حضرت عمر کی بیعت کی، پھر وہ لوگ جنہوں نے حضرت عثمان کی بیعت کی اور میری بیعت بھی انہی نے کی ہے تو میری خلافت ان کی خلافت کے ساتھ متصل ہے۔

حضرت علیؓ نے کبھی خلیفہ اول ہونے کا دعوی نہیں کیا

تو حضرت علی نے کبھی دعوی نہیں کیا کہ میں پہلا خلیفہ ہوں بلکہ جب بھی دعوی کیا تو یہ ہی کہ میں چوتھا خلیفہ ہوں اگر ان کا چوتھا خلیفہ ہونے کا دعوی نہ ہوتا تو کیا وہ یہ کہتے کہ بایعنی القوم میری بیعت ان لوگوں نے کی ہے الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی مابایعوھم علیه ان شرطوں کے ساتھ جو ان سے کی تھیں فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان یرد. وانما الشوریٰ للمھاجرین والانصار اب جو بھی حاضر ہو، سلطنت اسلامی میں، اس کو اور کوئی خلیفہ چننے کا حق نہیں، مجھے چن لیا گیا، انہیں لوگوں نے چنا ہے لیکن لم یکن للشاھد ان یختار جو بھی حاضر ہو اس کو حق نہیں ان یختار کہ کسی اور کو منتخب کرے انما الشوری للمھاجرین والانصار شوری کا حق صرف مہاجرین و انصار کو ہے، شوری کے ارکان مہاجرین اور انصار ہیں اور جتنے بھی مدینہ میں اس وقت تھے مہاجرین وانصار ان سب نے میری بیعت کی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد اور خلیفہ برحق ہیں

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشدہ اور خلیفہ برحق ہیں۔ آپ نے شام کے بارے میں ارادہ کیا کہ اگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نہیں مان رہے تو پھر میں وہی کام کرتا ہوں جو اسلام ایسے موقع پر کہتا ہے کہ جو نہ مانے تو خلیفہ کو حق ہے کہ امن قائم کرنے کے لئے اور ملک کو ایک رکھنے کے لئے چڑھائی کرے۔

جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پر تھے

تو حضرت علی نے جو کیا، اسے ہم شکایت کے طور پر نہیں کہتے کہ انہوں نے حملہ کیا!! لیکن واقعات یہی ہیں کہ پہلے فوجیں جو شام کی طرف بڑھی ہیں وہ حضرت علی کی ان کے حکم سے بڑھی ہیں اور ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو حضرت عثمان کے خلاف تھے اور وہ ساتھ شرارت کے طور پر آگے بڑھے کہ لڑائی تو ہو۔ اس طرح جب امیر معاویہ پر اور شام پر چڑھائی کر ہی دی تو معاویہ نے جو آگے مقابلہ کیا وہ بطور Defense کے کیا ہے، بطور

کے نہیں۔ تو حضرت علی کو بطور خلیفہ راشد ایسا کرنے کا حق تھا کہ نہیں؟ ایسے Offence موقع پر حق تھا۔ اور جن پر ہوا ان کو Defense کا حق بھی تھا کہ نہیں؟ (سامعین: انہیں بھی حق تھا) اس طرح جنگ صفین واقع ہوئی۔ [1]

---

(1) اہل سنت کے نزدیک معرکہ صفین کوئی حق و باطل کا میدان نہ تھا بلکہ اجتہادی آراء کا اختلاف تھا۔ اس لیے اسے حق و باطل کا نشان کہنا بالکل غلط ہے۔ چنانچہ معرکہ صفین کے متعلق اہل سنت محقق علماء کا مؤقف حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب اطال اللہ حیاتہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"سوال: حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین جو اختلاف ہوا اور جو جنگیں ہوئیں وہ حق و باطل کا معرکہ تھا یا یہ کوئی امر مشتبہ تھا جس پر دو مختلف رائیں ہو سکتی تھیں اور یہ دو متضاد فکریں تھیں۔ اگر ان میں سے ایک فریق صریح باطل پر تھا تو کیا اسے ان کی اجتہادی خطاء کہنا جائز ہے؟ اور اگر یہ کوئی امر مشتبہ تھا اور واقعی اس پر دو رائیں ہو سکتی ہیں تو کسی ایک کو قطعی طور پر باطل کہنا کیا جائز ہو گا؟ اور اگر یہ ایک اجتہادی معاملہ تھا اور صواب اور خطاء کے درمیان دائر تھا تو اگر ایک مجتہد کسی ایک فریق کو خطاء پر کہے تو یہ بات تو سمجھ میں آجاتی ہے لیکن کیا ہم یہ حق عوام کو بھی دے سکتے ہیں کہ وہ کسی مجتہد کو اجتہادی خطا کا مرتکب قرار دیں۔

اتنی بات تو مجھے معلوم ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد درس حدیث میں بر سر عام امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مؤقف کو خطاء کہتے ہیں اور شافعی علماء امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تخطیئہ کرتے ہیں لیکن جب یہ اجتہادی اختلاف ائمہ کے درمیان دائر نہ ہو تو کیا کسی عامی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ خطاء اجتہادی کے نام پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تنقید کرے؟ بینوا توجروا!

الجواب: سیدنا حضرت علی المرتضیٰ اور سیدنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما میں جو جنگیں ہوئیں تو وہ حق و باطل کا معرکہ نہ تھیں ایک امر ملتبس میں دو مختلف آراء کا ٹکراؤ تھا۔ موضوع اختلاف سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مظلومانہ قتل اور یہ کہ امت اس کی ذمہ داری سے کس طرح عہدہ برآ ہو تھا اور اس میں ان دونوں بزرگوں کا ٹکراؤ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھلا حق و باطل کے معرکے کیسے ہو سکتے ہیں؟ وہ تو سب کے سب عادل ہیں یہ صرف ایک امر مشتبہ اور موضوع ملتبس تھا جس نے دونوں میں ٹکراؤ پیدا کر دیا تھا، امر مشتبہ وہ ہے جس میں حقیقت نمایاں نہ ہو ہر طرف شبہ کو راہ مل سکے اور ملتبس اسے کہتے ہیں جس میں حقیقت پردے میں ہو، واضح نہ

ہو، زیر لباس ہو، یہ التباس ہے۔

معرکہ صفین حضور ﷺ کی نظر میں:

حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنحضرت ﷺ کبھی تو لوگوں سے مخاطب ہوتے اور کبھی اپنے نواسے کی طرف دیکھتے، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ابْنِی هٰذَا سَیِّدٌ، وَلَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ یُصْلِحَ بِهٖ بَیْنَ فِئَتَیْنِ عَظِیْمَتَیْنِ

(صحیح بخاری، کِتَاب الصُّلْح)

ترجمہ: میرا یہ بیٹا سید ہے اور ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کو پھر سے جوڑ دے۔

آنحضرت ﷺ نے دونوں فریق کو عظیمتین کے ایک وزن میں تولہ ہے اور ہر ایک کا نام فئہ عظیمہ رکھا ہے۔ ان میں سے ایک بھی فئہ باغیہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ ظالم اور مظلوم میں فرق ضرور کرتے اور دونوں کو فئتین عظیمتین کے پلڑوں میں برابر نہ رکھتے۔ حضور نے ان دونوں میں سے کسی سے اسلام کی نفی نہیں کی۔ حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کو بھی مسلمان ہی کہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں حضرات مامور من اللہ نہ تھے، ان میں سے کسی کے پاس کوئی آسمانی حق امامت نہ تھا۔

اس حدیث سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضور ﷺ کی نظر اطہر میں یہ اختلاف کوئی ضد اور عناد کا اختلاف نہ تھا، نہ یہ عہد جاہلیت کی ہاشمی اور اموی چنگاریاں تھیں جو پھر چمک اٹھی تھیں بلکہ یہ ایک امر مشتبہ تھا جس پر دونوں طرف کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے اور اس کا مرکزی نقطہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خون تھا کہ اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے اور اسے کیسے ادا کیا جائے اور دونوں بزرگ اپنے مقاصد میں حق پر تھے۔

والکل کانوا فی ھم علی الحق (مقدمہ ابن خلدون، ص:205)

معرکہ صفین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نظر میں:

حضرت امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ (110ھ) سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن بدیل رضی اللہ عنہ نے ایک خواب دیکھا اور اسے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیان کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تیرا یہ سچا خواب ہے تو تم ایک امر ملتبس میں قتل کئے جاؤ گے اور تاریخ گواہ

ہے کہ وہ جنگ صفین میں قتل کیے گئے۔ محدث عبد الرزاق (211ھ) اسے اس طرح روایت کرتے ہیں:

عن ابن سیرین قال رای عبد اللہ بن بدیل رؤیا فقصھا علی ابی بکر فقال ان صدقت رویاك فانك تقتل فی امر ذی لبس فقتل یوم صفین۔

(المصنف، ج:11، ص:214)

ترجمہ: امام ابن سیرین سے روایت ہے کہ عبد اللہ بن بدیل نے ایک خواب دیکھا جو انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بیان کیا آپ نے فرمایا اگر تیرا خواب سچ نکلا تو تم کسی ایسے معاملہ میں قتل کئے جاؤ گے جو امر ملتبس ہو گا اور عبد اللہ بن بدیل معرکہ صفین میں قتل ہوئے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسے زیرک صاحب علم بھی اسے ایک امر ملتبس قرار دیتے ہیں ہیں تو اسے حق و باطل کا معرکہ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ سو چاہیے کہ ان دو بزرگوں کی معرکہ آرائی کو اجتہادی اختلاف کا نام دیا جائے اس سے حق و باطل کا معرکہ کہنا بڑی جسارت اور خلاف حقیقت بات ہو گی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اسے صریح طور پر امر ملتبس قرار دیتے ہیں۔ اب کیا ہے کوئی جو اسے حق و باطل کا معرکہ کہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا موقف:

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے باہمی اختلاف میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہی ہے کہ صحابہ کرام دونوں طرف حق کی طلب میں کھڑے تھے۔ نفس پرستی کسی جانب نہ تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں میں حق کے زیادہ قریب تھے۔ احتیاط بھی اسی میں ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کو حق پر کہا جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اولیٰ الطائفتین بالحق قرار دیا جائے۔

سیدنا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ خوارج کی خوارج کے خلاف جنگیں تھیں وہ اس قبیل کی نہ تھیں وہ مذہبی جنگیں تھیں اور اختلاف عقیدہ پر مبنی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیۃ (صحیح بخاری، ج:2، ص:1025) "یعنی (خوارج) اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے نکل جاتا ہے"۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ انہیں وہ لوگ ماریں گے جو اولیٰ الطائفتین بالحق

ہوں اور امر واقعہ یہ ہے کہ انکا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے مقابلہ کیا تھا۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوارج کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ:

تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها أولى الطائفتين بالحق

(سنن ابی داؤد، ج:2، ص:627)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ارشادِ نبوت کی رو سے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اصولاً دونوں حق پر تھے اور دونوں جماعتیں "فئتين عظيمتين من المسلمين" تھیں دونوں طرف کے لوگ مسلمان تھے، ہاں حق کے زیادہ قریب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اب یہ کہنا کہ حضرت معاویہ حق پر نہ تھے منشاء نبوت کے صریح خلاف ہے۔ ہاں ان دونوں میں سے خوارج سے لڑنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی تھے۔

جو شخص یہ کہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے مقصد کے اعتبار سے حق پر نہ تھے وہ یقیناً اہل سنت والجماعت میں سے نہیں ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو تو اولی الطائفتين بالحق کہہ سکتے ہیں لیکن حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو علی الاطلاق خطاء پر کہنا ارشاد نبوت کے صریح خلاف ہے ایسا کہنے والا اعتقاداً شیعہ ہے، حضرت علامہ ابن خلدون کی پوری عبارت یوں ہے:

فلم يكن معاوية قائما فيها بقصد الباطل. وانما قصد الحق واخطاء والكل كانوا في مقاصدهم على حق (مقدمہ ابن خلدون، ص:205)

حضرت امیر معاویہ کسی امر باطل پر کھڑے نہ تھے۔ آپ حق کا قصد کئے ہوئے تھے اور چوک گئے اور دونوں گروہ اپنے مقاصد میں حق پر ہی تھے۔

شیخ الاسلام علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی (852ھ) نے تهذيب التهذيب میں تشیع بعرف متقدمین کی تعریف یہ کی ہے:

فالتشيع في عرف المتقدمين هو اعتقاد تفضيل على عثمان وان عليا كان مصيبا في حروبه وان مخالفه مخطي مع تقديم الشيخين وتفضيلهما

(تہذیب التہذیب، ج:1، ص:94)

ترجمہ: متقدمین کی اصطلاح میں جو شخص حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پوری

صحابہ کے خلاف منفی پراپیگنڈا نہیں کیا جاسکتا

اسی لئے ہم صحابہ کے بارے میں یہ پراپیگنڈا نہیں کرتے کہ وہ آپس میں لڑتے تھے

فضیلت اور افضلیت کا اقرار کرتے ہوئے یہ دو عقیدہ رکھے وہ شیعہ سمجھا جاتا تھا ① حضرت علی المرتضیٰ حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے افضل تھے ② حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ اپنی جنگوں میں راستی پر تھے اور آپ کے مخالف خطاء پر تھے۔

سو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو علی الاطلاق مخطی کہنے والا متقدمین کی اصطلاح کے مطابق تفضیلی شیعہ شمار ہوتا تھا ہاں اگر یوں کہہ دیا جائے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے فیصلہ میں چوک گئے لیکن قصداً ان کا فیصلہ غلط نہ تھا وہ اپنے مقصد میں حق پر تھے اور حق کا ہی قصد کیے ہوئے تھے تو اس عقیدے سے کوئی مسلمان شیعہ نہیں ہوجاتا۔

رہا مسئلہ تفضیلی شیعوں کا۔ سو حق یہ ہے کہ تفضیلی شیعہ حقیقت میں شیعہ نہیں ہیں اور شیعہ کے سات بنیادی عقائد میں سے وہ ایک کے بھی قائل نہیں ہیں۔

① عقیدہ تحریف قرآن، ② عقیدہ امامت، ③ انکار خلافت خلفاء ثلاثہ، ④ تکفیر جمیع صحابہ باستثنائے چند، ⑤ قذف ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ⑥ تفضیل آئمہ بر انبیاء سابقین، ⑦ عقیدہ رجعت (یعنی اس دنیا میں دوبارہ آنا)۔

یہ شیعہ کے سات بنیادی عقائد ہیں اور تفضیلی شیعہ ان میں سے کسی بات کے مدعی نہیں، ہاں یہ لوگ اہل سنت میں سے بھی نہیں ہیں۔ حضرت امام ابو داؤد السجستانی رحمۃ اللہ علیہ (275ھ) نے اپنی سنن کے کتاب السنہ میں ان تمام لوگوں کو مردود العمل قرار دیا ہے جو حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے احق بالولایۃ جانیں۔ امام ابو داؤد کے ہاں ایسے لوگ (یعنی تفضیلی شیعہ) ہرگز اہل سنت میں سے نہیں ہے۔ حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

من زعم ان علیا رضی اللہ عنہ کان احق بالولایۃ منہما فقد خطا ابابکر و عمر والمہاجرین والانصار وما اراہ یرتفع لہ مع ھذا عمل الی السماء

(سنن ابی داؤد، ج:2، ص:630)

ترجمہ: جو شخص یہ سمجھے کہ حضرت علی، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم دونوں سے خلافت کے زیادہ حقدار تھے اس نے حضرت ابو بکر حضرت عمر اور تمام مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم کو غلطی پر یقین کیا اور میں ایسے شخص کا کوئی عمل آسمان کی طرف اٹھتا ہوا نہیں دیکھتا۔

اس لئے کہ حضرت علی نے جو کیا وہ بطور خلیفہ راشد کے اپنی قوت قائم کرنا، ملک کو ایک کرنا، نظام ایک کرنا، یہ ان کا حق تھا۔ اور امیر معاویہ جو اپنی بات کہہ رہے تھے وہ ان کا بھی اپنی جگہ حق تھا کہ اپنا ڈیفنس کر رہے ہیں اور وہ امام مظلوم حضرت عثمان کی نیابت میں کھڑے تھے کہ میں ان کا آدمی ہوں، سو اس کو اجتہادی اختلاف کہتے ہیں۔

حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کا اختلاف اجتہادی تھا:

تو حضرت علی اور حضرت معاویہ میں جو یہ اختلاف ہوا اس کے پیچھے ان کا اپنا اپنا اجتہاد تھا لیکن خلیفہ راشد اور خلیفہ بر حق، ہم حضرت علی کو ہی مانتے ہیں۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ صفین میں معرکہ ہوا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تو شیر خدا تھے، لڑنا جانتے تھے، حیدر کرار تھے، میدانوں میں اترنا جانتے تھے۔ اور امیر معاویہ کا مزاج ہی لڑنے کا نہیں تھا، وہ سیاست دان تھے، سوچ میں بہت روشن تھے لیکن ان کا مزاج لڑنے کا نہیں تھا۔

حضرت علی کے نزدیک موجودہ قرآن ہی اصلی قرآن تھا

تاہم صفین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ شاید میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس حملے کا مقابلہ نہ کر سکوں، تو انہوں نے ایک تدبیر کی کہ اپنی فوج کو کہا کہ تم بڑے بڑے بانسوں کے اوپر قرآن باندھ کر پیش کر دو کہ ہمارے تمہارے درمیاں جنگ نہیں بلکہ یہ کتاب فیصلہ کرے گی۔ تو ان کے (شام کے) جو فوجی تھے، انہوں نے لمبے لمبے بانسوں کے اوپر قرآن باندھے اور آگے کھڑے کر دیئے۔ اب حضرت علی کی فوج کہتی تھی ہم ان کا مقابلہ کریں گے اور انہیں چھوڑیں گے نہیں، مگر حضرت علی نے کہا کہ قرآن کے آگے میں جنگ جاری نہیں رکھ سکتا۔ حضرت علی کی دلیل تھی کہ قرآن کے آگے چڑھائی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب انہوں نے قرآن پیش کیا ہے تو ہم قرآن کے آگے جھکتے ہیں۔ حضرت علی کی فوج کے جو لوگ تھے ان میں منافقین بھی گھسے ہوئے تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ صلح ہو جائے۔ لیکن حضرت علی اس بات پر ڈٹ گئے کہ اب مزید جنگ نہ ہو

گی، چونکہ انہوں نے اب قرآن پیش کر دیئے ہیں۔ لہذا آپ نے اپنی فوج اور سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ ہتھیار نیچے کر لو۔

تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تو مزاج ہی لڑنے کا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا ہمارے تمہارے درمیاں یہ کتاب فیصلہ کرے گی، لیکن کیا کتاب خود بولتی ہے؟ حضرت علی المرتضی کہتے ہیں انما الكتاب صامت کتاب تو خاموش ہے انما تنطق عنه الرجال اس کتاب کے متعلق جب بولیں گے انسان ہی بولیں گے۔ قرآن کسے کہتے ہیں؟ جب قرآن کی طرف سے کوئی انسان بولے کہ اس کا یہ مطلب ہے۔ کیونکہ کتاب خود تو بولتی نہیں۔ تاہم حضرت علی نے اپنا نمائندہ حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنا نمائندہ مصر کے فاتح حضرت عمرو بن عاص کو مقرر کیا۔ تاکہ یہ دونوں حضرات مل کر جو فیصلہ کر دیں، ہمیں منظور ہے۔[1]

فرقہ خوارج کی بنیاد

اب ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا، بلکہ فرقہ کیا فتنہ پیدا ہو گیا جنہیں خوارج کہتے ہیں۔ خوارج نے کہا، بھائی ہم نے پیروی کرنی ہے صرف قرآن کی، ابو موسی اشعری کی نہیں، تو علی رضی اللہ عنہ نے چونکہ کہا ہے کہ ہم ان کا فیصلہ مانیں گے جو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کریں تو خوارج نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا کہہ کر شرک کیا ہے۔ سو اس وجہ سے خوارج نے حضرت علی پر کفر کا فتوی دے دیا۔ اب دیکھیں فتنے سے فتنہ پیدا ہو رہا ہے۔

ابھی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا اور یہ ایک تیسرا ٹولہ نکل آیا اور یہ زیادہ وہی تھے جو پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں تھے۔ یہ ان سے نکل گئے اور نعرہ لگایا

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (پ:12، یوسف:40)

---

[1] واقعہ تحکیم پر تفصیلی مطالعہ کے لیے **"عادلانہ دفاع"** از حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رضی اللہ عنہ، **"سیرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ"** از حضرت مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ، **"سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ"**، از حضرت مولانا محمد اقبال رنگونی مظاہری مدظلہ العالی کی مراجعت فرمائیں۔

فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کو ہے

یہ حق صرف اللہ کا ہے دو آدمیوں کو نہیں یہ دونوں آدمیوں کا فیصلہ یہ کفر ہے، شرک ہے، وہ ہے، یہ ہے اور ان سے نکلے تو نکلنے والوں کو کیا کہتے ہیں؟ عربی میں اسے کہتے ہیں خارج تو خارج کی جمع ہے خوارج۔ اب فرقہ خوارج پیدا ہوا جو حضرت علی کی فوج سے نکل گئے تھے۔(1)

---

(1) حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

"حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جنگ صفین کے آخر میں حضرت ابو موسی الاشعری رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف سے حکم مانا تھا کہ وہ جو فیصلہ کریں انہیں منظور ہو گا۔ اس پر ان کا اپنا حلقہ ان سے بگڑ گیا۔ انہوں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ دو انسانوں کو حق مان کر کفر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مسلمان صرف خدا کے فیصلے کو واجب التسلیم مانتے ہیں۔ کسی انسانی فیصلے کو نہیں۔ مقام اہواز میں ان لوگوں نے اپنی فوجی قوت کو جمع کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت سے نکل جانے کا اعلان کیا ان الحکم الا اللہ ان کا نعرہ تھا۔ اس عنوان پر یہ لوگ خوارج کہلائے۔ یہ لوگ جگہ جگہ سر اٹھاتے تھے۔ پھر کبھی دب بھی جاتے اور کسی اور طرف جا نکلتے۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رخ شام کی بجائے خارجیوں کی طرف ہو گیا۔ واقعہ تحکیم سے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف ہوئے۔ تاہم صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ان کے ساتھ نہ تھا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے مناظرے کیے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے ساتھ جنگ نہروان لڑی۔ اب مسلمانوں کی سیاسی قوت دو نہیں تین حصوں میں منقسم ہو چکی تھی اور یہ تیسرا حصہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جماعت سے نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جماعت سے الگ ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی سیاسی قوت کمزور ہوئی اور حالات یہاں تک پہنچے کہ آپ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے 40ھ میں صلح کرنی پڑی کہ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقوں پر چڑھائی نہ کرے۔ یہ سال عام الهدنہ کہلاتا ہے۔ اس سے یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کے کچھ قریب آ گئے لیکن خارجی آپ کے برابر دشمن رہے اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ کے قتل کی سازش کی۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہ کہ قلمرو اسلامی کو سیاسی طور پر کمزور کیا بلکہ انہوں نے اپنی تحریک کو ایک مذہبی رنگ بھی دیا۔ مسلمانوں میں اعتقادی محاذ پر یہ پہلا فتنہ تھا۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں کو بوجہ تحکیم کافر کہتے

دراصل یہی خوارج غلط قسم کے لوگ تھے۔ انہوں نے نکل کر یہ کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس لئے مسلمان نہیں کیونکہ انہوں نے اللہ و رسول کے علاوہ ان دو آدمیوں (حضرت ابو موسی اشعری اور حضرت عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہما) کو فیصل مان لیا، جبکہ اللہ اور رسول کے علاوہ اور کسی کو ماننا ہی جائز نہیں۔ تو حضرت علی کہتے تھے کہ ہم نے ان دو کو اس لئے نہیں مانا کہ یہ اپنی مرضی کی کوئی بات کریں گے!!! بلکہ انہیں اس لئے مانا ہے کہ قرآن کی طرف سے یہی بولیں گے۔ کتاب خود کیا ہے؟ انما الکتاب صامت کتاب خود خاموش ہے انما تنطق عنه الرجال اس کی طرف سے جو بولیں گے وہ انسان ہی بولیں گے۔

خوارج سے حضرت ابن عباسؓ کا مناظرہ

پھر حضرت علیؓ نے اپنے کزن حضرت عبداللہ بن عباس کو ان (خوارج) سے مناظرہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور خوارج میں مناظرہ ہوا تو وہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے خوارج سے کہا کہ اللہ قرآن میں کہتا ہے کہ جب خاوند اور بیوی کا آپس میں نبھانہ ہو یا آپس میں ان کا اختلاف ہو جائے تو اس طرح کرو کہ ایک نمائندہ خاوند کے دوستوں یا ساتھیوں میں سے اور ایک خاتون کے خاندان سے ہو اور جب یہ دونوں آپس میں مل جائیں فحکموا من اهله وحکما من اهلها ایک ان (مرد) کی طرف سے اور ایک ان (عورت) کی طرف سے فیصلہ کر دیں تو حضرت عبداللہ بن عباس کہنے لگے جب قرآن نے کہا ہے کہ خاوند اور بیوی میں دونوں کی طرف سے ایک ایک نمائندہ ہو سکتا ہے تو حضرت علی اور حضرت معاویہ نے اپنا ایک ایک نمائندہ

تھے۔ اسلام میں یہ پہلا اعتقادی فتنہ تھا جس نے مسلمانوں میں ایک مذہبی فرقہ کی شکل پائی۔
ان کا اعتقاد ہے کہ انسان گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر ہو جاتا ہے۔

(خلفائے راشدین، ج:2، ص:448)

اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے کتاب "عبقات جلد دوم" از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی مراجعت فرمائیں۔

مقرر کر کے کونسا جرم کیا ہے !؟، کیا آپ (خوارج) مسلمانوں میں جوڑ نہیں چاہتے ؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دلائل بہت مضبوط تھے لیکن خارجی نکل گئے۔

اور اصل معرکہ اب کن میں رہا؟ "حضرت معاویہ اور حضرت علی میں ہی" تو جنگ صفین میں پہل حضرت معاویہ نے کی ہے؟ "نہیں"۔ حضرت علی نے کی ہے لیکن بطور خلیفہ راشد کے، اور ان کو حق تھا، انہوں نے جو کیا بطور خلیفہ کے کیا اور حضرت معاویہ نے جو جنگ لڑی وہ بطور مقابل کے نہیں بلکہ بطور ڈیفنس کے لڑی۔

حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین صلح کی مراسلت

اب میں چند سال آگے چلتا ہوں تو تقریباً 40ھ میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے مابین صلح کے لئے خط و کتابت ہوتی ہے اور ایک معاہدہ طے پاتا ہے کہ جو حضرت علی کے مقبوضات ہیں اس کے ماتحت علاقہ جات حضرت علی کے حکم کے تحت ہوں گے، ملک شام اور اس کے متعلقہ تمام علاقہ جات حضرت امیر معاویہ کے تحت ہوں گے اور کوئی ایک فریق کسی دوسرے فریق کے علاقہ پر چڑھائی نہیں کرے گا۔ اور دونوں اس طرح آپس میں صلح سے رہیں گے۔ اس صلح نامہ کے شواہدین اور گواہوں میں حضرت عبد اللہ بن عباس بھی شامل تھے۔ (البدایہ والنھایہ، تحت سن 40ھ)۔ اور شیعہ حضرات کی حضرت علی المرتضی کے خطبات و مکتوبات پر مشتمل مشہور کتاب نہج البلاغہ میں بھی حضرت معاویہ کا حضرت علی کو ایک ارسال کردہ خط ملتا ہے جس کا مضمون بھی اس سے ملتا جلتا ہے:

كتب معاوية إلى علي يطلب منه أن يترك له الشام ويدعوه للشفقة على العرب الذين أكلتهم الحرب ولم يبق منهم إلا حشاشات أنفس: جمع حشاشة بالضم، بقية الروح ويخوفه باستواء العدد في رحال الفريقين ويفتخر بأنه من أمية

(نہج البلاغہ، ج 3 حاشیہ، خط نمبر 17)

ٹوٹے ہوئے پھر سے ایک ہو گئے

حضرت علی کی خلافت کے آخری چند سالوں میں حضرت علی اور حضرت معاویہ نے

ایک رائے اور تجویز پر عمل کیا کہ جن علاقوں پر ان کی حکومت چل رہی ہے وہ انہی کی حد تک رہے اور ایک دوسرے کے علاقوں میں دخل اندازی نہ کریں گویا کہ یہ آپس میں ایک صلح کی پیش کش تھی۔ آپ (سامعین) کی رائے میں یہ معاہدہ کیسا تھا، کیا خیال ہے؟ یہ تجویز اچھی تھی نا؟ (اس پر کسی ساتھی نے مجمع میں سے سوال کیا کہ اس طرح خلافت کی مرکزیت ختم ہو گئی تو اس پر حضرت علامہ صاحب نے جواب دیا) وہ تو پہلے ہی ختم تھی۔۔۔ کیوں؟ حضرت علی کی خلافت ان علاقوں میں تو تھی لیکن شام میں تو نہیں چل رہی تھی۔ تو وہ (مرکزیت) اس معاہدے سے ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ تو پہلے ہی ختم تھی، نہیں سمجھے آپ؟ یہ جو تجویز ہے کہ آپ ان پر حملہ نہ کریں اور وہ ان پر حملہ نہیں کریں گے اور اس پر کہا جائے کہ یہ ہمارا پہلا قدم ہے آگے (مستقبل میں) ایک ہونے پر۔ پہلا قدم تو یہ ہے کہ ہم لڑیں نہ، بھائی دیکھو لڑنے سے پہلے اگر مذاکرات کر لیے جائیں تو یہ ایک راہ تو ہے نا۔ تاہم حضرت معاویہ نے کہا کہ سر دست ہم اس پر جمع ہو جائیں تو یہ خط کس نے لکھا؟ حضرت امیر معاویہ نے۔ تو جب خط پہنچا تو حضرت علی نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ سو جب انہوں نے منظور کر لیا کہ اب ہم لڑیں گے نہیں تو

- جو ٹوٹے ہوئے لوگ تھے
- جو لڑے ہوئے لوگ تھے
- جو انتظامی امور میں ایک دوسرے کے خلاف چل رہے تھے

وہ کسی درجے میں تو قریب ہو گئے۔ اب اگلا قدم یہ تھا کہ حقیقی طور پر، مکمل طور پر ان میں اتحاد ہو جائے تاکہ سلطنت ایک ہو جائے۔

حضرت علی، معاویہ اور عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم پر خوارج کا قاتلانہ حملہ

مگر یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا آخری سال ہے۔ تاہم جو خارجی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج سے نکلے تھے وہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے دشمن بن چکے تھے لہذا انہوں نے رمضان کی ایک ہی رات میں تین حضرات کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ معاملہ ہی ختم ہو۔ سو وہ تین حضرات کون کون تھے؟ ایک حضرت علی، دوسرے

حضرت معاویہ اور تیسرے حضرت عمرو ابن عاص (حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر تھے اور آپ بڑے آدمی تھا) سو ان تینوں کو قتل کرنے کی سازش کی گئی۔ اب حضرت علی المرتضیٰ پر خارجیوں کے پروگرام کے مطابق اس رات کو حملہ ہوا تو حضرت علی تو شہید ہو گئے، حضرت امیر معاویہ سیاسی سوچ و فکر میں بہت آگے تھے۔ آپ روز ایک جگہ ہی رات کو نہیں ہوتے تھے بلکہ جگہ بدلتے رہتے تھے۔ تو جو ان کے سونے کی جگہ قاتلین کو معلوم تھی انہوں نے وہاں حملہ کیا، مگر وہاں کوئی اور قتل ہو گیا، تو ان میں تو وہ کامیاب نہ ہو سکے، لیکن حضرت علی تو شہید ہو گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی

تاہم حضرت علی کا دامن اس لحاظ سے پاک اور صاف ہے کہ صحابہ میں جو اختلاف یا مسلمانوں میں جو اختلاف ہوا، ان کے خون سے دونوں طرف کے ہاتھ رنگین تھے، حضرت علی خود دھلوا کر اور صلح کروا کے دنیا سے رخصت ہوئے، اس لیے حضرت علی کی شان اور بڑا مقام قیامت کے دن اور فیصلے کے اس دن ظاہر ہو گی۔ تو حضرت علی جب شہید ہو گئے تو حضرت علی کی حکومت کہاں تھی؟ (سامعین: عراق میں) ان کا دارالحکومت Capital کون سا تھا؟ ''کوفہ۔

حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت حسنؓ کی قیادت

حضرت علی جب شہید ہو گئے تو اب کوفہ اور عراق والوں نے کیا، کیا؟ انہوں نے کہا کہ حضرت علی تو شہید ہو گئے ہیں اس لیے اب ہمیں کسی اور کو خلیفہ بنا لینا چاہیے۔ حضرت علی پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو آپ سے پوچھا گیا کہ ہم اب آپ کے بعد کس کو آگے کریں؟ کسی نے تجویز پیش کی کہ کیا ہم آپ کا بیٹے ''حسن'' کو آپ کے بعد خلیفہ بنا سکتے ہیں؟ تو حضرت علی نے فرمایا، نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ اقرار، یہ تمہارا کام ہے۔ یعنی حضرت علی کا ذہن بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کی شوریٰ فیصلہ کرے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بطور پنجم خلیفہ

حضرت علی نے خود اپنے بیٹے حسن کو Nominate نہیں کیا۔ تاہم حضرت علی 21

رمضان المبارک کو دنیا سے رخصت ہوئے اور اسی دن آپکی تجہیز و تکفین ہوئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ تو اب عراق کی سلطنت کے بڑے کون تھے؟ حضرت حسن۔ اور شام میں کون تھے؟ وہی (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) جو حضرت عمر کے دور کے گورنر تھے، پھر حضرت عثمان کے دور کے گورنر تھے۔ پھر حضرت علی کا دور آیا، ان کے بعد امام حسن خلیفہ بنے، اور شام کے (امیر معاویہ) ہیں۔

اب وہ جو معاویہ رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا کہ ہم لڑیں نہیں سو اس سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اگلا Step یہ تھا کہ ہم دونوں ایک ہی ہو جائیں۔ تاہم اب دنیا میں حضرت علی تو نہ رہے لیکن پھر امام حسن نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس بات کی تکمیل کی، جس کی بنیاد حضرت علی المرتضی رکھ کر گئے تھے۔ ہم حضرت علی المرتضی کی شان کا پورا اقرار کرتے ہیں کہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے آپ کے ہاتھ ہر قسم کے اختلاف سے پاک ہو گئے تھے۔ بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن مسند خلافت پر آ گئے۔

حضرت حسن و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما ایک ہو گئے

یہ تاریخ کا ناقابل انکار واقعہ ہے کہ حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان خلافت کے مسئلہ پر Compromis ہو گیا، حسن اور امیر معاویہ دونوں ایک ہو گئے۔ سو جب دو ملک ایک ہو جائیں، اختلاف مٹ جائے، اقتدار ایک ہو جائے، سلطنت ایک ہو جائے، خلافت ایک ہو جائے، تو کیا یہ خوشی کا موقع ہے یا نہیں؟ بالکل خوشی کا موقع ہے، خوشی کی بات ہے۔ تو یہ جو اتنا بڑا مسئلہ حل ہوا تو اس کے لئے کوئی معاہدہ ہوا ہو گا یا نہ؟ بھائی بغیر لکھنے پڑھنے کے اتنا بڑا کام ہو سکتا ہے!؟ تو میں طالب علموں کو اور علماء حضرات کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ ذرا پڑھنے کی کوشش کریں تاریخ نے اس شہادت کو محفوظ کر لیا ہے۔

حضرت حسنؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین طے کی گئیں شرائط

وہ شرطیں کیا تھیں جن پر صلح ہوئی ہے ان (اہل تشیع) کی ایک مشہور کتاب میں وہ معاہدہ

درج ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی دیگر کتب میں وہ معاہدہ پڑھا جا سکتا ہے جو دونوں کے درمیان ہوا ہے۔ شیعہ کتاب میں ہے:

لما رای الحسن من اصحابه الفشل ارسل الی عبداللہ بن عامر بشرائط اشترطها علی معاویة علی ان یسلم له الخلافة وکانت الشرائط الا یاخذ احدا من اهل العراق باحنة وان یومن الاسود والاحمر ویحتمل مایکون من هفواتهم ویجعل له خراج الاهواز مسلما فی کل عام ویحمل الی اخیه الحسین بن علی فی کل عام الفی الف ویفضل بنی هاشم فی العطاء والصلات علی بنی عبد الشمس

(اخبار الطوال، ص:218)

اور ان کی ایک دوسری کتاب میں یہ بھی ہے کہ

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور سیرت الخلفاء (الراشدین) الصالحین کے مطابق سارے امور کی انجام دہی ہوگی (کشف الغمہ، ج:2، ص:45، اللاردبیلی شیعی)

اگر یہ (حضرت معاویہ) حضرت ابو بکر و عمر اور عثمان ان کی سیرت پر چلیں، ان یعمل فیھم اگر یہ لوگوں میں خلفائے راشدین صالحین کے مطابق چلیں تو میں یہ سارا ملک انہی کے سپرد کرتا ہوں تو حضرت حسن نے جو سلطنت امیر معاویہ کے سپرد کی تو وہ کس شرط پر کی؟ کہ پہلے جو خلفاء صالحین ہیں ان کی پیروی کی جائے، تو معلوم ہوا کہ امام حسن ان خلفائے ثلاثہ کو مانتے تھے، ابو بکر کو بھی مانتے تھے، عمر کو بھی مانتے تھے اور عثمان کو بھی مانتے تھے۔ اور ان کی یہ شرط تھی کہ اگر ان کی پیروی کرو تو سلطنت تمہاری۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ حضرت فاطمہ کے لعل دنیا کے بھوکے نہیں تھے، وہ دنیا کی سیادت و ریاست کے بھوکے نہیں تھے، وہ ملک دینا جانتے ہیں، قربانی کرنا جانتے ہیں، تو جو لوگ حضرت حسینؓ پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مقابلے میں آنا چاہتے تھے، سلطنت لینا چاہتے تھے تو یہ بالکل غلط ہے۔ یاد رکھو کہ یہ وہ خاندان ہے جو سلطنت دینا جانتا ہے سلطنت کی طلب ان کے دلوں میں نہیں تھی۔ شہادت کیا ہے؟ اس کی طرف کون بڑھتے ہیں اس

کا جواب یہ ہے۔

شہادت کیا ہے اک ورثہ محمد کے گھرانے کا

حضور ﷺ کے گھرانے اور فاطمہ کی اولاد کا یہ کردار ہے۔ آج کسی سیاستدان کو ایک کرسی بھی مل جائے وہ جلدی کرسی خالی کرتا ہے؟ نہیں۔ تو حضرت حسن کو تو پورے عراق کی بادشاہی حاصل تھی، پورے عراق کی قیادت حاصل تھی اور شام والوں کے پاس اتنی نہیں تھی جتنی کہ حسن کے پاس تھی لیکن وہ پوری Muslim World سلطنت حضرت معاویہ کے سپرد کرتے ہیں۔

حضرت حسنؓ بھی خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو حق بجانب مانتے تھے

اور یہ معاہدہ ہے کہ حسن بن علی اور معاویہ بن ابی سفیان کے درمیاں کہ حسن بن علی اپنا پورا علاقہ اور اپنی پوری سلطنت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کرتا ہے معاویہ کے علی ان **یعمل فیھم** اس شرط پر کے معاویہ اپنی سلطنت چلائیں گے کتاب اللہ کے مطابق، پیغمبر کے طریقے کے مطابق اور

وعلی سیرۃ (ابی بکر و عمر و عثمان) الخلفاء الصالحین

(کشف الغمہ، ج:2، ص:45 اللاردیلی شیعی)

ترجمہ: اور ان خلفاء صالحین (ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ) کی سیرت کے مطابق۔

اس سے ایک تو یہ پتہ چلا کہ حضرت حسنؓ ان تینوں کو کیا سمجھتے تھے؟ چوتھے خلیفہ کو حضرت امیر معاویہؓ مانتے ہی نہیں تھے اس لئے شرطوں میں جو لکھا گیا علی سیرۃ الخلفاء الصالحین تو اس خلفاء صالحین میں پہلے تین ہی تھے تو حضرت حسنؓ کے عقیدے کا بھی پتہ چل گیا۔

سلطنت کے ایک ہو جانے کے بعد حضرت حسنؓ کا مدینہ میں قیام

اب جب سلطنت ایک ہو گئی تو حضرت حسن کہاں رہیں گے؟ نہیں سمجھے؟ میرا سوال ہے اب جب سلطنت ایک ہو گئی تو حسن رہیں گے کہاں؟ حضرت حسن کا اپنا اصل وطن تو

"مدینہ شریف" تھا اور حضرت علیؓ کا بھی وہی تھا لیکن جب حضرت عثمان شہید ہو گئے۔

حضرت علیؓ نے مدینہ کو اپنا دارالخلافہ کیوں نہیں بنایا

اور حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت علی نے اپنا Capital of the Government مدینہ نہیں رکھا بلکہ انہوں نے اسے عراق منتقل کر لیا۔ عراق ایک اسلامی صوبہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا مسکن کوفہ (عراق) منتقل (Shift) کر لیا۔ تو خارجی اور ناصبی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جی

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سلطنت، حضور کا Capital "مدینہ"
- حضرت ابو بکر کا "مدینہ"
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا "مدینہ"
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا "مدینہ"

مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پہلے ہیں جنہوں نے مدینہ کی بجائے ملک کا Capital "عراق" کو بنایا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر کرتے ہیں کہ انہوں نے مرکز بدلا، تو میں خارجیوں کو اس کا جواب دیا کرتا ہوں کہ حضرت علی نے جب سیاسی طور پر معلوم کر لیا کہ ملک میں بغاوت ہوئی ہے اور اب ان حالات میں اگر مسلمانوں میں، آپس میں لڑائیاں ہوں تو میں اگر مدینہ میں ہی رہوں تو پھر اس شہر مدینہ کی آبرو نہیں رہے گی۔ آپ نے مدینہ کی عزت قائم رکھنے کی خاطر مدینہ چھوڑا تاکہ اگر لڑائی ہو تو عراق، شام یا مصر میں ہو، کسی دوسرے علاقے میں ہو، مدینہ منورہ میں نہ ہو۔ (1)

---

(1) حضرت علامہ صاحب مدظلہ العالی اپنی مایہ ناز تالیف "خلفائے راشدین" میں بھی یہ فرماتے ہیں:
"خارجی لوگ اکثر یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ پہلے حکمران ہیں جنہوں نے اسلام کی پہلی مرکزیت چھوڑی اور مدینہ کی بجائے کوفہ کو پسند فرمایا۔ صورت حال یہ نہیں، یہ اس لیے نہ تھا کہ آپ مدینہ منورہ میں رہنا پسند نہ کرتے تھے، ایسا ہوتا تو حضرت حسن رضی اللہ تعالی عنہ نے جب خلافت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیں تو وہ پھر مدینہ منورہ آکر سکونت

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مدینہ کو چھوڑنا اس لئے نہیں تھا کہ وہ مدینہ کی شان نہیں مانتے تھے بلکہ اس لئے تھا کہ اس کی آبرو کو باقی رکھنا ہے۔ اس لیے اس کا بہتر حل یہ ہے کہ میں ادھر (عراق) چلا جاؤں۔ تو حضرت علی کہاں چلے گئے؟ آپ عراق چلے گئے اور ان کے بیٹے حسن بھی ان کے ساتھ کہاں چلے گئے؟ (عراق) اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ ہی کہاں چلے گئے؟ (سامعین: عراق) اب یہ حضرات عراق میں رہے۔ حضرت علی نے ساڑھے چار سال کے قریب حکومت کی اور یہ یہیں رہے۔

حضرت حسن صلح کے بعد کہاں رہے؟

لیکن جب انہوں نے سلطنت دے ہی دی یعنی حضرت حسن نے حضرت امیر معاویہ کو سلطنت دے ہی دی تو اب انہوں نے کہا کہ ہمیں اب عراق میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں، سو ہم اپنے نانا کے شہر میں جائیں گے۔ پھر یہ دونوں بھائی مدینہ میں آگئے اور یہاں مدینہ میں رہائش اختیار کی۔

اب دونوں جماعتوں کے درمیان اتحاد ہو چکا اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما مدینہ منورہ واپس آگئے۔ سو اب ذرا توجہ کریں کہ اس وقت دیگر صحابہ کرام کی طرح حضرات حسنین کریمین کے لیے ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے وظائف کس نے مقرر کئے؟ (اس کا جواب ہے) "حضرت امیر معاویہ نے"۔ تو اگر حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ نے

اختیار نہ کرتے۔ یہاں یہ بات نہ بھولیے کہ آپ کا عقد خلافت مدینہ میں ہی واقع ہے اور وقت انعقاد خلافت آپ کی سلطنت پوری قلمرو اسلامی تھی۔ ایسے مواقع پر حاضرین کا فیصلہ غائبین پر ہی لوٹتا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اختلاف اس کے بعد کا ہے اور شام اس کے بعد ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دائرہ سلطنت سے نکلا ورنہ پہلے آپ اہل شام کی طرف سے بھی خلیفہ تھے۔ حضرت علی رضی اللہ نے ابتدا میں ہی بھانپ لیا تھا کہ حضرت عثمان امت کے وہ امام ہیں جن کے قتل پر مسلمانوں میں وحدت نہ رہے گی اور بہت ممکن ہے انکی آپس میں جنگیں ہوں جو اب تک نہ ہوئی تھیں۔ آپ نے اسی خدشہ سے اپنا دارالحکومت مدینہ سے کوفہ منتقل کر لیا۔ مبادا کہ باہمی اختلافات میں کہیں مدینہ منورہ کی حرمت ریزی ہو یہ حرم رسول ہے اسے اسی عزت و آبرو میں رہنا چاہیے۔" (خلفائے راشدین، ج:2، ص:400)

امیر معاویہ سے وظائف قبول کیے، اپنی حکومت ان کو دی اور ان کی خلافت تسلیم کر لی تو پھر ہم جو حسنؓ اور حسینؓ کے ماننے والے ہیں، کیا ہمارا کوئی حق ہے کہ ہم معاویہؓ کی کوئی مخالفت کریں؟ نہیں۔ کیوں؟ جب ہمارے امام "حسن" اور "حسین" نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو مان لیا، تو پھر ہمارے لیے بھی کسی انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

میں نے ایک بات کہی تھی کہ مسلمان دو ٹکڑے ہو کر پھر کبھی ایک نہیں ہوئے لیکن مسلمان پہلے دور میں، صحابہ اور تابعین کے دور میں ماشاء اللہ اس شان سے نمایاں ہوئے کہ دو سے پھر ایک ہو گئے، غور کریں کیا یہ کوئی معمولی بات ہے؟ میں پوری تاریخ سے ایک نہیں بلکہ کئی مثالیں دے سکتا ہوں کہ مسلمان جہاں دو ٹکڑے ہوئے پھر ایک نہیں ہوئے۔

حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے صلح دب کر نہیں کی

سوال: اس کے ساتھ اب یہ ایک بات بھی سمجھیں، ایک ساتھی جو یہیں کھڑے ہیں۔ انہوں نے سوال کیا تھا کہ امیر معاویہ تو بڑے سیاست دان اور بڑے آدمی تھے مگر ان کے مقابلے میں حضرت حسن بچے (چھوٹی عمر کے) تھے۔ (گو ان کا ملک زیادہ تھا لیکن تھے تو بچے ہی!؟) تو جب بچے اور بڑے میں صلح ہو تو بعض اوقات آپ نے معاشرے میں دیکھا ہو گا کہ چھوٹا بڑے کے رعب و دبدبہ کی وجہ سے اس سے صلح کر لیتا ہے کہ میں اس سے مقابلہ نہ کر سکوں گا۔ مگر کیا ایسی صلح حقیقی صلح ہوتی ہے؟ بھائی غور کریں کہ لوگ طاقتور کے ساتھ بھی مجبوراً صلح کر لیتے ہیں کہ نہیں؟ یا اس طرح سمجھو کہ ہم پاکستان والے اگر باہر کی بڑی طاقتوں سے صلح کے ساتھ چلیں تو اس میں کچھ اپنی مجبوری کا بھی پہلو ہوتا ہے کہ نہیں؟ تو سوال کرنے والوں نے (جو اسی مجلس میں موجود ہیں) سوال کیا تھا کہ آپ اس بات کو بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں کہ حسن اور معاویہ نے صلح کر لی، لیکن یہ ایک بڑے اور چھوٹے کی صلح تھی تو کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ کہیں حضرت حسن کا "احساس" مجبوری میں تو یہ نہیں کہہ رہا تھا کہ شاید میں اتنے بڑے سیاستدان کا مقابلہ نہ کر سکوں؟ سو اگر ایسا ہو تو پھر یہ حقیقی صلح تو نہ ہوئی بلکہ دب کر بھی تو ہو سکتی ہے؟

سامعین آپAgree کرتے ہیں کہ دب کر بھی ہو سکتی ہے؟ جب مجھ سے پوچھا گیا کہ یہ صلح حقیقی نہیں بلکہ اوپر اوپر سے تھی، مجبوری کے طور پر تھی۔

جواب: تو میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ یہ تو آپ کی رائے ہے کہ یہ مجبوری کی صلح تھی، لیکن یہاں ایک عقلی سوال ہے کہ جو صلح دب کر کی جائے کیا اس میں دب کر صلح کرنے والا کوئی شرائط رکھ سکتا ہے؟ ذرا سوچو! کیوں کہ یہاں تو حضرت حسن شرائط رکھ رہے ہیں جنہیں امیر معاویہ نے منظور کیا سو کیا اس صلح کو مجبوری کی صلح کہا جا سکتا ہے؟

دوسرا یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کی رائے میں کیا یہ مجبوری کی صلح ہے یا خوشی کی صلح ہے؟ تم جو یہ کہتے ہو کہ یہ مجبوری کی صلح ہے (کہ بڑے چھوٹے کا کیا مقابلہ) یہ تمہاری رائے ہے۔ مگر میں کہتا ہوں پیغمبر کی رائے کیا ہے؟ یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ جی حضور ﷺ تو اس وقت وہاں تھے ہی نہیں، سو ان کی رائے کیسے ہو سکتی ہے؟ تو میں کہتا ہوں حضور کی رائے مبارکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سند صحیح کے ساتھ موجود ہے جس میں شک والی کوئی بات نہیں۔ تو حضور رائے دے چکے، کیسے؟ کہ ایک دفعہ حضور ﷺ حضرت حسن کو پیار کر رہے تھے، (حضور ﷺ ان کو اپنا بیٹا کہتے تھے) آپ فرماتے ہیں: اِبْنِي هٰذَا سَيِّدٌ میرا یہ بیٹا سید ہے۔

سید ہونا، یہ کسی نسل کا بیان نہیں، یہ ایک شان ہے، شان کے اعتبار سے کہا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے، یہ میرا بیٹا سید، یہ سید ہے:

لعل الله یصلح به فئتین عظیمتین من المسلمین

(صحیح بخاری، جلد: اول، ص: 373)

ایک وقت آئے گا میرے اس بیٹے کے ذریعہ اللہ مسلمانوں کے دو حصوں کو جوڑیں گے۔ حضور ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھر وہ وقت آیا اور واقعی ہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دونوں جماعتوں کو جوڑا۔ اب پیغمبر تو اسکو خوشی کی صلح کہیں، اس عمل کی تعریف کریں، اور اس پر خوش ہوں۔ اور حضرت علی و امیر معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں کی پارٹیوں کو فئتین عظیمتین من المسلمین کہیں۔ پیغمبر کے الفاظ میں تو یہ خوشی کی صلح

ہے۔ مگر تم (سائل) تصور کرتے ہو کہ یہ مجبوری کی صلح تھی تو جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت حسن کی صلح معاویہ سے ایک مجبوری میں تھی، تو یہ غلط کہتے ہیں اور جو پیغمبر ارشاد فرماتے ہیں وہ بالکل صحیح، برحق اور بجا فرماتے ہیں۔

سامعین! ذرا سوچیں! یہ حضرت حسن کی کتنی بڑی قربانی ہے کہ مسلمانوں کو ایک کرنے کے لئے، آپ نے اپنا سارا حق چھوڑ دیا، جس سے حضرت حسن کی بڑی شان ہونے کا پتہ چلتا ہے سو میری حاضرین سے گزارش ہے کہ جو حضرت علی اور حضرت حسن کی شان کا عقیدہ رکھتا ہے ذرا ہاتھ تو کھڑا کرے تاکہ اللہ کے گھر میں گواہی ہو کہ ہم دل وجان سے اہل بیت کی شان کا پورا اقرار کرتے ہیں۔

تاہم حضرت حسن نے جو صلح کی وہ پیغمبر کے فیصلے کے مطابق مجبوری کی تھی یا خوشی کی حقیقی صلح تھی؟ جب حضور نے فرمادیا اور خوشی کا اظہار کر دیا کہ یہ جوڑے گا اور واقعات نے بتایا کہ واقعی ہی انہوں نے جوڑا تو حضرت حسن نے کتنی بڑی قربانی کی؟ بہت بڑی قربانی کی ہے۔ اور حضور ﷺ کے ہاں یہ قبولیت فئتین عظیمتین کے الفاظ میں ہوئی۔ تو پیغمبر کی نظر میں تو یہ قبولیت ان الفاظ میں ہوئی تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کبھی یہ بھی دھیان کرو کہ خدا کی نظر میں کیسے ہوئی!؟

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی قربانی کی عظیم قبولیت

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے محدث گزرے ہیں۔ انہوں نے اس راز سے بھی پردہ کھول دیا کہ پیغمبر ﷺ کی نظر میں تو یہ صلح اس درجہ کی ہے کہ "لعل اللہ یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین"۔ حضرت حسن نے قربانی کی کہ خلافت دے دی اور شرط رکھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلفاء صالحین کی پیروی کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کی نظر میں حضرت حسن کی قربانی کیا ہے؟ یہ راز پوچھنا ہے تو ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھو، ہم جیسے چھوٹے لوگ اس پر کیا رائے دے سکیں گے۔ اس لیے یہ پوچھنا ہے تو کس سے پوچھو؟ "ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ سے"۔

امام مہدی حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے ہوں گے

یہاں ایک بات آپ سے کہتا ہوں کہ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا کا آخر ہو گا، بھائی کیا قیامت پر ایمان ہے کہ نہیں؟(سامعین: جی بالکل ہمارا قیامت پر ایمان ہے)۔ دنیا آخر ہو گی یہ بھی ایمان ہے کہ نہیں؟(سامعین: جی اس پر بھی ایمان ہے) پھر آخری دور میں مسلمانوں کا ''قائد'' جس پر مسلمان پھر اکٹھے ہوں گے وہ کون ہوں گے؟ وہ ''حضرت امام مہدی'' ہیں۔ حضرت امام مہدی کے دور میں تمام مسلمان ان پر اکھٹے ہو جائیں گے۔ اور جس طرح آج زمین ظلم سے لبریز ہے، ہر طرف ظلم ہی ظلم ہو رہے ہیں، مگر حضرت امام مہدی کے دور میں یہ دنیا عدل وانصاف سے جگمگا اٹھے گی۔ اس وقت میرا موضوع حضرت مہدی پر تقریر کرنا نہیں تاہم یہ ایک ضمنی بات آگئی ہے۔ آپ نے یہ بات سنی ہوئی ہے کہ دنیا کے آخر میں امام مہدی آئیں گے۔ سو اس وقت دنیا کے آخر میں، پوری دنیا کے مسلمانوں کے ایک ہی پیشوا کون ہوں گے؟ ''حضرت مہدی''۔ اور ان کی شان کیا ہو گی؟ کہ ان کی نصرت کے لئے اور مدد کے لئے ''حضرت عیسی بن مریم علیہ السلام'' آسمان سے اتریں گے۔ قیامت کے قریب دجال کا فتنہ ظاہر ہو گا اور اس دجال کا خاتمہ حضرت عیسی علیہ السلام کریں گے۔ (1)

تاہم امام مہدی کی سلطنت بڑی وسیع ہو گی، یہاں تک کہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کے دور خلافت میں بھی اتنی وسعت نہ تھی۔ سو آخر میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے پیشوا حضرت امام مہدی ہوں گے۔ کیا آپ جانتے ہیں یہ حضرت امام مہدی کس کی اولاد میں سے ہوں گے؟ جواب ہے کہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے نہیں بلکہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد اور نسل میں سے ہوں گے۔ ابن قیم کہتے ہیں کہ جب انہوں نے اس وقت سلطنت قربان کی تو پھر اللہ نے دنیا میں اسے یہ جزا دی کہ میں دنیا کے آخر میں ساری سلطنت کو تیری نسل

(1) نزول عیسیٰ علیہ السلام اور فتنہ دجال کے موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی مایہ ناز تصنیف "عقیدۃ خیر الامم فی مقامات عیسیٰ بن مریمؑ" کی مراجعت فرمائیں۔

میں آگے جمع کروں گا اور سارے مسلمان ایک ہوں گے۔

ذرا توجہ دیجیے کہ حضرت امام مہدی کے دور کی سلطنت کی وسعت اسلام کے پہلے دور کے خلفاء جتنی ہوگی یا اس سے بھی وسیع ہوگی؟ اور اس وسیع سلطنت کی قیادت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد کرے گی۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے بھی کوئی ہو سکتا تھا لیکن اللہ تعالی نے اس کام کے لیے خاص طور پر چاہا کہ اس کے لیے کوئی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہو۔۔۔ مگر ایسا کیوں؟

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (پ:27: رحمن:60)

جو نیکی کرے پھر نیکی ہی اس کی طرف بدلے میں آتی ہے هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ خدا کی کون کون سی نعمتوں کو تم جھٹلاو گے۔ حضرت حسن کو یہ شان ملی کہ دنیا کے آخر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت کی قیادت آپ کی اولاد میں سے ایک فرد حضرت مہدی کریں گے۔ تو حضرت حسن کی اولاد میں یہ مقدر کس نے کیا؟ اللہ نے۔ اس نکتہ کو بیان کس نے کیا؟ ابن قیم رحمہ اللہ نے۔ اور یہ تاریخی شہادت بھی ہے کہ یہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عظیم قربانی کی جزا ہے۔

تو ذرا سمجھیں کہ کیا حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین صلح کو مجبوری کی صلح کہا جا سکتا ہے؟ نہیں۔ ایسا کیوں؟ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مجبوری کی صلح نہ تھی۔ اس صلح سے مسلمان پھر سے ایک ہو گئے۔ اور اس صلح کے بعد تقریباً ایک سو(100)سال تک امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خاندان بنو امیہ میں خلافت چلی۔ پھر بنو امیہ کے خاتمے پر عباسیوں کے دور خلافت کا آغاز ہوا۔

اموی اور عباسی حکومتیں

جب بنو عباس بر سر اقتدار آئے تو بنو امیہ کے کچھ لوگوں نے بنو عباس کی خلافت کو قبول نہ کیا اور وہ لوگ کسی طرح بھاگ کر (بغداد چھوڑ کر) اسپین(Spain) پہنچ گئے۔ اور پھر اسپین میں مسلمانوں کا خلیفہ عبد الرحمن ہوا، اور اس طرح پیچھے سے چلی آنے والی ایک خلافت دو ہو گئی۔ عباسیوں کی خلافت بغداد میں اور امویوں کی خلافت اسپین میں۔ دونوں

اپنے اپنے علاقوں میں خلافت کرتے رہے مگر دونوں کی آپس میں ماسوا ایک آدھ جنگ کے کوئی لڑائی یا جنگیں نہ ہوئیں۔

عباسیوں نے اپنے حلقے میں علمی کام کیے اور امویوں نے (Spain) اندلس میں، قرطبہ میں اپنی قوت جمائی، وہاں قرطبہ میں بڑی دینی درسگاہ (یونیورسٹی) قائم کی، بہت بڑی مسجد قائم کی، جس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کے لیے پیدل نہیں جاسکتے تھے بلکہ اس کے لیے ٹرین چلتی تھی۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ کتنی بڑی مسجد تھی اور آج بھی اسپین جانے والے حضرات وہاں جا کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جب وہاں پہنچے تو وہاں اب مسجد تو اس طرح نہ تھی مگر اقبال وہاں سجدہ کرتے ہوئے اس مسجد کی یادیں تازہ کرتے ہیں، جن کا تذکرہ ان کی کتابوں اور اشعار میں ملتا ہے۔ ع

کعبہ ارباب فن! سطوتِ دین مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں[1]

تاہم اتنا وقت نہیں کہ میں اس کی پوری وضاحت کر سکوں، لیکن اتنی بات ہے کہ جب تک مسلمانوں نے ملکی فتوحات کو چھوڑا نہیں، سلطنتوں سے منہ موڑا نہیں، تب تک دنیوی شوکت کو اور عروج کو چھوڑا نہیں۔

حضرت حسنؓ کی شہادت اور امیر معاویہؓ سے حضرت حسینؓ کے تعلقات

بہرحال حضرت حسن نے جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی تو تقریباً دس سال بعد حضرت حسن کی وفات ہو گئی۔ آپ کی وفات کے حوالے سے کچھ لوگ ایک پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ جی امیر معاویہ نے معاذ اللہ کسی عورت کے ذریعے سے امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر

(1) حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم جن اشعار کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں، یہ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم کی کتاب "بابِ جبریل" میں بعنوان 'مسجد قرطبہ' (جو بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)، 'دعا' (یہ مسجد قرطبہ میں لکھی گئی)، 'عبد الرحمن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت'، 'ہسپانیہ' اور 'طارق کی دعا' کے تحت کلیات اقبال میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

دلوایا تھا۔

تو سامعین ذرا غور کریں کہ اگر یہ واقعہ ایسا ہو تو آپ کی عقل کیا کہتی ہے؟ اگر یہ ہی واقعہ ہو تو پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی تھے پھر کیا وہ مدینہ میں ہی رہیں گے؟ پھر وہ معاویہ کا ساتھ چھوڑیں گے نہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو وہ انہیں چھوڑ جاتے، کیونکہ صلح دونوں بھائیوں نے کی تھی۔ اگر یہ واقعہ ایسے ہو کہ حضرت حسن کی شہادت میں حضرت امیر معاویہ کا دخل تھا، تو پھر کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی غیرت گوارہ کرے گی کہ وہ وہیں رہ کر امیر معاویہ کے وظائف قبول کریں؟[1]

---

(1) اس پر یہاں حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم سے کیا گیا ایک استفسار اور اسکا جواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: شیعوں نے یہ بات بہت مشہور کر رکھی ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زہر دلا کر شہید کرادیا تھا۔ اہل سنت مؤرخین بھی کیا اس سے متفق ہیں، اس کا تفصیل سے جواب دیں؟

جواب: حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ یہ بات لگانا کہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دلوایا تھا ایک بڑا بہتان ہے اور کذب محض۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی ضرورت کیا پڑی تھی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تاحیات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ زندہ رہے۔ انہوں نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا کیا بگاڑا تھا جو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اگر زندہ رہتے تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو کسی خطرے کا سامنا کرنا پڑتا۔ علم سے نابلد لوگ یہ نہیں سوچتے کہ اس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کیا ضرورت تھی جو وہ اس کا ارتکاب کرتے۔ خلافت حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کو دے چکے تھے، دونوں بھائی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت ہو چکے تھے۔ ان کے وظائف لیتے رہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی تک فدک کی آمدنی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کو ملتی رہی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی دو جماعتوں کو ایک کیا، سلطنت اسلام متحد ہوئی اور پھر تاحیات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان حضرات کے مابین کوئی دل خراش واقعہ پیش نہیں آیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر مدینہ سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اموی نے پڑھائی اور انہیں اس کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے آگے کیا۔ شہادت حسن رضی اللہ عنہ

میں اگر کسی طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ملوث ہوتے تو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے گورنر کو کبھی نماز جنازہ کے لیے آگے نہ کرتے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو آگے کرتے ہوئے فرمایا:

لولا السنة لما قدمتك۔

(اسد الغابة:2/15، مقاتل الطالبین لابی الفرج:2/51)

ترجمہ: اگر سنت طریقہ نہ ہوتا تو میں تجھے کبھی آگے نہ کرتا (سنت یہ ہے کہ حاکمِ وقت امامت کرائے)۔

امام حسین رضی اللہ عنہ اس کے بعد ہر سال امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس جاتے رہے۔ وہ پوری طرح ان کا اکرام کرتے اور انہیں بڑے تحفے اور ہدایا دے کر رخصت کرتے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر زہر خورانی کا الزام کذب محض ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

ولما توفی الحسن كان الحسين يفد إلى معاوية في كل عام فيعظمه ويكرمه۔

(البدایہ والنہایہ:3/150، تاریخ ابن عساکر:4/311)

ترجمہ: جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہر سال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس وفد بن کر جاتے، آپ انہیں (حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو) بہت سے عطیے دیتے اور ان کا بڑا اکرام فرماتے۔

مشہور شیعی مؤرخ احمد بن داؤد الدینوری (282ھ) لکھتا ہے:

لم ير الحسن ولا الحسين طول حياة معاوية منه سوءً في أنفسهما ولا مكروهاً ولا قطع عنهما شيئاً مما كان شرط لهما ولا تغير لهما عن بر۔

(الاخبار الطوال:225)

ترجمہ: حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے پوری زندگی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اپنے حق میں کوئی بدخواہی نہیں دیکھی، نہ ان کا اپنے بارے میں کوئی ناپسندیدہ عمل دیکھا، نہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوئی بات جس پر آپ نے انہیں عہد دیا تھا توڑی اور نہ ان دونوں کے ساتھ آپ نے کسی نیکی میں دریغ کیا۔

پہلے مؤرخین جیسے ابن جریر طبری (310ھ) خطیب بغدادی (463ھ) وغیرہما میں سے کوئی اس واقعہ کو نقل نہیں کرتا۔ حاکم (405ھ) نے زہر دیئے جانے کا واقعہ نقل کیا ہے، مگر

زہر دینے کے مجرمین کی کوئی نشاندہی نہیں کی۔ سب سے پہلے ابن اثیر الجزری (630ھ) نے اس زہر دینے کی نسبت آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث کی طرف کی ہے۔ اور پھر صیغہ تمریض سے کہا ہے کہ کچھ لوگ اسے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس پر ابن اثیر نے کوئی صحیح روایت پیش نہیں کی، نہ اس الزام کی کہیں توثیق کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ (728ھ) لکھتے ہیں:

إن معاوية سم الحسن فهذا مما ذكره بعض الناس ولم يثبت ذلك ببينة شرعية أو إقرار معتبر ولا نقل يجزم به۔ (منہاج السنۃ:2/225)

ترجمہ: امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دیا ہے یہ وہ بات ہے جو بعض لوگوں نے ذکر کی ہے اور یہ بات کسی واضح شرعی دلیل یا اقرار معتبر سے ثابت نہیں۔ اس پر کوئی نقل نہیں ملتی جس پر یقین کیا جاسکے۔

حافظ ابن کثیر (774ھ) تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے ان کے آخری وقت میں پوچھا کہ آپ کو زہر کس نے دیا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نام بتانے سے انکار کیا اور فرمایا کہ اس کو ترک کردیں اس کا فیصلہ اللہ کے ہاں ہو گا۔

(البدایہ والنہایہ:8/43)

علامہ ابن خلدون (808ھ) لکھتے ہیں:

وما ينقل أن معاوية دس إليه السم مع زوجته جعدة بنت أشعث بن قيس فهو من أحاديث الشيعة وحاشا لمعاوية من ذلك.

(تاریخ ابن خلدون:2/1129)

ترجمہ: اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث کے ساتھ مل کر زہر دلایا تھا یہ شیعوں کی باتیں ہیں۔ حاشا وکلا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا ہو۔

یہ سوال کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دشمنی کن سے تھی، یہ ضرور غور طلب ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک بیان سے اس کا کچھ اشارہ ملتا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو نئی شادیوں کا بہت شوق تھا۔ اسی بناء پر آپ کو حسن مطلاق کہا جانے لگا تھا۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ما زال الحسن يتزوج ويطلق حتى حسبت أن يكون عداوة في القبائل۔

(المصنف ابن ابی شیبہ:5/254)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے شروع سے لے کر انکی وفات تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہیں مدینہ میں رہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حضرت معاویہ سے کوئی لڑائی نہیں۔ مگر جب ان کا جانشین یزید ہوا تب حضرت حسین نے عراق کی طرف سفر کیا۔ میں اس پر آج کا موضوع ختم کرتا ہوں۔

دعاء

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اے اللہ! ہمیں اپنے اسلاف کی تاریخ کو سمجھنے کی توفیق عطاء فرما! تاریخ کو سمجھنے اور اس کی سعادت عطاء فرما! ہمیں حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے غلاموں میں ان کے خادموں میں اور ان کے معتقدین میں جگہ عطا فرما آمین

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ اصحابہ



ترجمہ: حضرت حسن رضی اللہ عنہ متواتر شادیاں کرتے رہے اور طلاقیں دیتے رہے یہاں تک کہ مجھے خدشہ گزرا کہ اس اندازِ عمل سے کہیں قبائل میں عداوت کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔
اس پسِ منظر میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ آپ کی کسی بیوی ہی کی سازش ہو گی۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ قرائن سے ملتی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دامن اس الزام سے بالکل پاک ہے۔ محض مخالفین کی اختراع سے کسی مسئلے کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خالد محمود عفا اللہ عنہ (عبقات، ج:1، ص:391-389)

ذکر حسنین رضی اللہ عنہما

دوش نبیؐ کے شہسواروں کی بات کر
کون و مکاں کے راج دلاروں کی بات کر

جن کے لیے ہیں کوثر و تسنیم موجزن
ان تشنہ کام بادہ گُساروں کی بات کر

خلد بریں ہے جن کے تقدس کی سیر گاہ
ان خوں میں غرق غرق نِگاروں کی بات کر

کلیوں پر کیا گزر گئی پھولوں کو کیا ہوا
گلزار فاطمہؓ کی بہاروں کی بات کر

چھٹی رات (مجلس 6)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى خُصُوْصًا عَلٰى سَيِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِيَاءِ وَعَلٰى آلِهِ الْاَتْقِيَاءِ وَاَصْحَابِهِ الْاَصْفِيَاءِ أَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ
اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ (پ5 النساء 58)
صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ

نظام عالم کو چلانے کے لئے قانون فطرت

برادران اسلام بزرگان مکرم اور عزیز نوجوانو! آج کا موضوع فطری نظام الہی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے اس جہاں کا نظام ایسا بنایا ہے، اور کائنات کو اس نہج پر چلایا ہے، کہ ہر لائن کو کامیاب کرنے کے لئے وہ لوگ آگے آتے ہیں جو اس لائن کے اہل ہوں۔ انسان بیمار ہوتے ہیں تو بیماروں کی ذمہ داری ادا کرنے کے لئے میڈیکل کی لائن بنے گی، جس میں ڈاکٹرز (Doctors)، حکماء اور اطباء بیماریوں کے علاج معالجہ کے لیے آگے آئیں گے، جہاں کہیں ملکوں کے نظم و نسق اور نظام چلانے کی کوئی بات آئے گی تو وہاں قانون جاننے والے ماہرین آگے آئیں گے، بچوں کی دینی و دنیوی تعلیم و تربیت کے لیے مدارس اور سکول قائم کیے جائیں گے۔ سو نظام کائنات کس طرح چل رہا ہے؟ کہ ہر لائن کو وہ حضرات چلا رہے ہیں جو اس لائن کے اہل اور ماہر ہیں، نظام عالم میں وہی لوگ آگے آتے ہیں جو اس لائن کے ماہر ہوں، ہر لائن اس کے اہل اور ماہر کے ساتھ چلے تو نظام بالکل صحیح چلتا ہے۔
لہذا یہ بات ذہن نشین رکھیں! کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے نظام اسلام میں سربراہی کے لئے بھی وہی حکمت کارفرما رکھی ہے، کہ اس میں آگے وہ لوگ آنے چاہیئں جو اس کے اہل ہوں اور اہلیت کی بنا پر ہی حکمران چنے جائیں۔

اہلیت کی بنا پر قائد آگے آئے یا خاندانی نسبت سے آئے؟ ذرا سوچیں! اور آپ خود فیصلہ کریں کہ کسی نسل کے اعتبار سے حکمرانی ہو کہ اسی ایک نسل کا حق ہے کہ وہ حکمرانی پر آئیں، حاکم بنیں؟ یا اس کا مدار اہلیت پر ہو؟ آپ کی عقل یہی فیصلہ کرے گی کہ

- قیادت کے لئے
- سیادت کے لئے
- قوم کی سرداری کے لئے

انہی لوگوں کو آگے آنا چاہیے جو حکومت کرنے کے اہل ہوں اور یہی قرآن کی رو سے نظام عالم کو چلانے کا حکم ہے، دیکھیے پ 5 سورۃ النساء 58۔ آج میں نے یہی آیت آپ کے سامنے پڑھی ہے۔ ووٹ بھی قوم کی ایک امانت ہے۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ حکومت کے لئے ووٹ انہی کو دیں، جو اس کے اہل ہوں، جو ملک کا نظام صحیح چلا سکیں اور قوم کی ضرورتیں پوری کر سکیں۔

اب یہ ایک سوال سامنے آتا ہے کہ نبی پاک ﷺ کی جانشینی کا مسئلہ کیا ہے؟ اہل سنت والجماعت کا یہی اعتقاد ہے کہ رسالت اور نبوت خدا کا انتخاب ہے، لیکن انسانوں کی قیادت کے لیے، ملکوں کو چلانے کے لیے، اور نظام کو آگے بڑھانے کے لیے، انہی لوگوں کو آگے لایا جائے جو اس کے اہل ہوں۔ اور اس کا مدار صرف نیکی پر نہیں۔ بلکہ نیکی کے ساتھ ساتھ اس کا مدار حکومت چلانے اور عوام کو ان کی ضروریات پوری کرنے کی اہلیت پر بھی ہے۔

عام لوگ جن کی سیاسی تربیت نہیں ہوتی ان سے جب پوچھا جائے کہ قوم کی قیادت میں کس کو آگے لانا چاہیے؟ تو نادان آدمی یہی کہے گا، کہ "نیک آدمی کو" تو صرف اتنا ہی نہیں، اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ صرف نیک آدمی نہیں بلکہ اسکی نیکی کے ساتھ ساتھ وہ انسان ہو جو ملک چلانے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔ سو یہ فطری اصول ہے جس پر اللہ نے کائنات کا نظام بنایا ہے کہ جو اہل ہوں ان کو آگے کرو۔

اب میں ایک بات پوچھتا ہوں کہ نیک کسے کہتے ہیں؟ اس کی بہت سی Definitions ہو

سکتی ہیں، لیکن ایک سوچی سمجھی بات جس کو Considered Opinion کہتے ہیں، کہ جس پر بہت غور و فکر ہو گیا، وہ یہ کہ نیک وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہ دے۔ اس Definition سے کوئی بھی اختلاف نہیں کرے گا۔ سو نیک کون ہے؟ جو کسی کو دھوکا نہ دے۔ اور عقل مند کون ہے؟ جو دھوکا نہ کھائے۔

دھوکا دینے اور دھوکا کھانے میں فرق

ایک معیار ہے نیک کا، تو نیک کون ہے؟ جو کسی کو دھوکا نہ دے، اور عقل مند کسے کہتے ہیں؟ جو کسی سے دھوکا نہ کھائے۔ جو کسی کی بات میں آجائے، کسی کے چکر میں آجائے، کسی دھوکا باز کی بات میں آجائے، تو وہ نیک کتنا بھی ہو لیکن اس کو کہیں گے کہ وہ نیک تو ہے پر عقل مند نہیں، تو نیک کون ہے؟ جو کسی کو دھوکا نہ دے اور عقل مند کون ہے؟ جو کسی سے دھوکا نہ کھائے۔ کیونکہ روایت میں یہ چیز معیار کے طور پر ملتی ہے کہ مومن کامل وہی ہے جو

من لا یخدع ولا یخدع (1)

(1) حضرت علامہ صاحب مدظلہ العالی اس عنوان پر ایک مقام پر فرماتے ہیں:

"اس سے پتہ چلا کہ کامل مومن کی دیانت یہ ہے کہ کسی کو دھوکا نہ دے اور فراست یہ ہے کہ کسی سے دھوکہ نہ کھائے، دھوکا نہ دے کے مصداق تو آپ کو بے شمار ملیں گے اور سب صحابہ کرام اس وصف سے متصف تھے لیکن دھوکہ نہ کھانے والے لا یخدع کے مصداق آپ کو وہاں بھی بہت کم ملیں گے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو جس طرح کوفیوں نے دھوکا دیا اور ان کو بار بار خطوط لکھ کر بلایا اور پھر وقت آنے پر غداری اور بے وفائی کی یا جس طرح حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو جنگ صفین میں دھوکا دیا گیا یا جس طرح حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما کو شاطروں نے دھوکا دیا اور مجلس مفاہمت و مصالحت کو جنگ جمل کی صورت میں بدل دیا۔ ان واقعات میں ان حضرات کا دھوکے میں آجانا کوئی لکی چھپی بات نہیں۔ (نبہ علیہ القرطبی فی تاریخہ ووافقہ الآلوسی فی تفسیر الاحزاب)

ہم یقین رکھتے ہیں کہ دھوکے میں آجانے کی ان بزرگوں سے کوئی باز پرس نہ ہو گی کیونکہ

اعمال پر مواخذہ نیات کے اعتبار سے ہوتا ہے اور دھوکا کھانے والے کی اپنی نیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، رب العزت کے ہاں تو کسی بزرگ کی کوئی ایسی کمزوری قابل مواخذہ نہیں لیکن خلافت ارضی اور قیام امور عامہ کے لیے جب نظام عدل کا قیام ہوتا ہے تو ایسے امور کا لحاظ بھی بسا اوقات ضروری ہوتا ہے پس جو اکابر کمال ایمان کے ان دو جزوں سے متصف ہوں گے وہ لازماً ان سے فائق اور آگے ہوں گے جنہیں وقت کے غلط کار لوگوں نے بارہا اپنی سازش کا نشانہ بنایا لیکن یاد رہے کہ اس سے انکی بزرگی پر کوئی داغ نہیں آتا۔ ہاں افضلیت امر دیگر ہے۔ اس معیار پر جب ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کا کوئی سہیم و شریک نظر نہیں آتا اور تاریخ نہیں بتلاتی کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی کبھی دھوکا کھایا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ کے بعد صحابہ کی مجموعی رائے بھی حضرت ابو بکر کو کوئی مغالطہ نہ دے سکی اور انجام کار پتہ چلا کہ حق وہی تھا جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے تھے۔ فتنہ انکار ختم نبوت، لشکر اسامہ رضی اللہ عنہ کی روانگی میں تاخیر کا مطالبہ، مانعین زکوۃ کی تحریکات اور ان سب کے مقابلے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اپنی رائے انہیں کسی مغالطے میں نہ کھینچ سکی۔ ایمان کی اولیت، قوت و ثقاہت اور بصیرت و فراست کے ساتھ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عزم و استقامت کو بھی شامل کرلیں تو پھر انکی شان ایمانی ایمان کے ہر پہلو کے اعتبار سے سب سے فائق اور آگے نظر آتی ہے اور ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ان کمالات ایمانی میں کوئی بزرگ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا شریک و سہیم نہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایمان محض رغبت عقلی کا نتیجہ نہ تھا، صدیقیت کا مقام یہ ہے کہ صدیق رغبت طبعی کے ساتھ ایمان قبول کرتا ہے اور یہ اسی کا امتیاز و اختصاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ایمان قبول کرنے میں کسی دلیل کی ضرورت قطعاً محسوس نہ ہوئی۔

(خلفائے راشدین، ج:1، ص:250)

یہاں ہم مزید اس موضوع سے متعلق ایک استفسار اور اسکا جواب نقل کیے دیتے ہیں تاکہ کسی کے ذہن میں کوئی شک و شبہ نہ ابھرے:

سوال: ”دعوت“ کے ”صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نمبر“ کے صفحہ 10 کالم 1 میں آپ نے مندرجہ ذیل روایت لکھی ہے:

المؤمن من لا یخدع ولا یخدع

جو نہ دھوکا دے، نہ دھوکا کھائے، وہ کامل مومن ہے۔ عام لوگ جن کی سیاسی تربیت نہیں ان سے جب پوچھا جائے کہ قیادت اور سیادت کے لئے کن کو آگے لایا جائے؟ تو کہیں گے جو نیک ہو، تو نیک تو وہ ہے جو کسی کو دھوکا نہ دے، لیکن

 اہل وہ ہے

کامل مؤمن وہ ہے جو نہ دھوکا دے اور نہ دھوکا کھائے؟

یہاں چند دوست اس اُلجھن میں پھنس گئے ہیں کہ کیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ (جنہیں کوفیوں نے دھوکا دیا) حضرت علی رضی اللہ عنہ (جنہیں کوفیوں نے دھوکا دیا) حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ (جنہیں دھوکا دے کر جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑا دیا گیا) کیا یہ سب کامل مؤمن نہ تھے۔ (معاذ اللہ)............ اقبال نیر، گورنمنٹ کالج چکوال

جواب: حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ وزبیر رضی اللہ عنہ یہ سب حضرات کامل الایمان اور علم وعمل کے نیر تاباں تھے۔ لیکن ان میں بھی افضل ومفضول کا سلسلہ اسی طرح ہے جس طرح انبیاء کرام میں سلسلہ تفضیل وافضلیت تھا۔ اگر خاتم الانبیاء کو سب انبیاء کرام علیہم السلام سے علماً عملاً اور رتبۃً افضل کہنا باقی انبیاء ومرسلین کے علم وعمل اور مرتبے کی توہین نہیں، تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علماً وعملاً اور رتبۃً افضل کہنا باقی صحابہ رضی اللہ عنہم واہل بیت سے افضل قرار دینا اس میں بھی ان بزرگان کرام اور امہات المؤمنین کی کوئی توہین مضمر نہیں۔ یہ بزرگان کرام سب کے سب کامل الایمان والعمل تھے۔ مگر یہ کاملیت بھی ایک کلی مشکک ہے جس کے کئی مدارج ہیں۔ ان میں جو شان اکملیت خود حضور ختمی مرتبت کو حاصل تھی وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے حاصل نہیں اور جو شرف اکملیت سیدنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حاصل تھا۔ اگر اس میں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے ممتاز نظر آتے ہیں، تو یہ کوئی وجہ الجھن نہیں۔ ہر کسی کا کامل الایمان ہونا اور ہر بزرگ کی بزرگی اپنے اپنے درجہ میں ثابت ہے۔ جو اس میں شک یا تردد کرے اور کسی ایک بزرگ کی توہین کا مرتکب ہو، اہل سنت کے دائرہ حقہ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ع

اسلامِ ما اطاعتِ خلفائے راشدین
ایمانِ ما محبتِ آلِ محمد است

واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ: خالد محمود عفا اللہ عنہ۔ (عبقات، ج:1، ص:98)

- عقل مند وہ ہے
- سمجھ دار وہ ہے

جو دھوکا نہ کھائے۔

ہم جب تاریخ اسلام میں اس معیار پر غور کرتے ہیں، تو ایک بڑی کامل شخصیت سامنے آتی ہے، کہ جس کو اللہ تعالی نے بصیرت وہ دی، کہ کسی سے دھوکا کھائے نہیں، اور تقوی یہ دیا کہ کسی سے دھوکا کرے نہیں۔

فاروق اعظمؓ کے انتخاب میں کمال فراست

توجہ فرمائیں کہ تاریخ اسلام میں وہ نہایت ممتاز شخصیت حضرت عمر کی ہے۔ جو اس معیار پر ہیں کہ، نیکی کا معیار یہ کہ نہ کسی کو دھوکا دیں، اور عقل و بصیرت کا معیار یہ کہ "نہ دھوکا کھائیں"۔ ناقدین کے سامنے حضرت عمر کی سیرت کھول کر رکھی گئی کہ بتایے اس شخص نے دس سال حکمرانی کی اور Society میں بڑا ممتاز اور کامیاب رہا، لیکن یہ بتاؤ کہ اس نے کبھی کسی سے دھوکا کھایا ہو؟ کسی نے کوئی چکر چلایا ہو اور یہ انکی باتوں میں آگیا ہو؟ بعض اوقات بڑے بڑے نیک لوگ بھی دانستہ طور پر باتوں میں آجاتے ہیں، لیکن حضرت عمر اس مقامِ کمال پر تھے کہ پوری سیرت میں اور پوری زندگی میں اور پھر جب خلافت کے منصب پر بھی آئے تو پوری خلافت میں آپ نے کسی سے دھوکا نہیں کھایا، اللہ تعالی نے انہیں یہ کمال بصیرت عطا فرمائی تھی۔

بلکہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب خلافت کا سارا نظام اور ساری مشینری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی، تو اس میں جو پرزا آپ نے جہاں فٹ کیا، مجال ہے کہ اس میں کوئی نقص نکلا ہو اور وہ اس کو نہ سنبھال سکا ہو، یا اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کر سکا ہو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں مختلف ملکوں میں، مختلف صوبوں میں، مختلف علاقوں میں، جس جس آدمی کو، جس جس مقام اور عہدہ پر مقرر کیا، وہ ایسے اس کا اہل ثابت ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو چار چاند لگ گئے، تو وہ عاملین، گورنر اور دیگر حضرات جو اپنے اپنے عہدے کے اہل ثابت ہوئے، وہ کس کا کمال تھا؟ ان عاملوں کا یا مقرر کرنے والے کا؟ یہ صرف عاملوں کا کمال نہیں

بلکہ یہ ان کی سعادت ہے، نیک بختی ہے کہ وہ عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب میں آگئے۔ سو یہ ان عاملوں کی نیک بختی ہے، سعادت ہے لیکن یہ جو نظرِ بصیرت ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ جہاں جہاں جس جس کو فٹ (Fit) کیا، تاریخ اس پر ناز کرتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی یہ سامنے نہیں لا سکتا کہ انہوں نے کبھی کسی سے دھوکا کھایا ہو۔

دھوکا کھانے پر پکڑ نہیں ہو گی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق کوئی یہ سامنے نہیں لا سکتا کہ انہوں نے کبھی کسی سے دھوکا کھایا ہو۔ دھوکا کوئی دے، اور کوئی دھوکا کھا جائے، یہ تو گناہ نہیں، بلکہ گناہ وہ ہے جو انسان نیت سے کرے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص نیت سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس لئے نہیں پکڑے گا کہ تو نے دھوکا کیوں کھایا۔! کئی لوگ ایسے ہیں کہ جب قرض لیں تو اس ارادے سے لیتے ہیں کہ واپس نہیں دینا اور قرض دینے والا کہتا ہے، کہ مجھے پہلے پتہ نہیں تھا۔ اکثر قرض دینے والا اپنے دوست کو کہتا ہے کہ جو تم اب مجھے مقروض کے متعلق بتا رہے اگر مجھے پہلے بتا دیتے تو میں اس کے چکر میں نہ آتا۔ سامعین ہمارے معاشرے میں ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ نہیں؟ لیکن اب وہ جو دھوکا کھا گیا، قرض دے دیا اور پھر یہ واپس بھی نہیں ہوا، تو اس میں اللہ تعالیٰ قرض دینے والے کو نہیں پکڑے گا، کہ تو نے اس کو قرض کیوں دیا تھا۔!؟ کیونکہ غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے۔ لیکن اپنی بصیرت کے مطابق یہ ہے کہ جو دھوکا نہ کھائے وہ اس اونچے کمال پر ہو گا کہ نظام کو چلانے کے لئے ایسے ہی آدمی آگے ہوں تو تاریخ ان کو سلام کرے گی۔

کمال بصیرت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہلے کیوں پیش کیا

میں ایک جگہ یہ بات کر رہا تھا تو کسی نے سوال کیا کہ جی آپ نے تاریخ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ سے بات شروع کی ہے مگر آپ کو تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بات شروع کرنی چاہیے تھی، چونکہ وہ پہلے آئے ہیں۔ مگر آپ نے اس کمال بصیرت

میں حضرت عمر کو پہلے پیش کیا، تو پہلے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام لینا چاہیے تھا۔

جواب: تو ذرا توجہ کیجئے حضرت ابو بکر صدیق کی ہر بات میں جو کامیابی ہے اس کے پیچھے یہ صرف عقل کی بلندی اور بصیرت کا عروج نہیں، بلکہ وہ کوئی اور بات تھی۔ مثلاً خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کا مصداق ہیں، ان کی جو کامیابی تھی اس کی بنیاد کیا ہے؟ اسے اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمادیا کہ

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (پارہ:6، المائدۃ:67)

اے میرے پیغمبر میں تجھے بچاؤں گا لوگوں سے، یعنی لوگ کتنے ہی حیلے بہانے کریں، یا منافق بن کر آئیں لیکن وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اور حَسْبُكَ اللّٰهُ، تجھے خدا کافی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری کامیابی یہ ہے کہ خدا ان کے ساتھ تھا حتی کہ جب کبھی مدینہ کے گرد سرحدوں پر کوئی دھواں اٹھتا، کوئی شور ہوتا، اور یہ اندیشہ ہوتا کہ شاید کوئی قوم حملہ کرنے کے لئے آئی ہے، کچھ لوگ آئے ہیں۔ تو انسان ہونے کے اعتبار سے Society میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ دیکھو تو سہی کون ہے وہاں!؟ یا کون آیا ہے وہاں!؟ تو ان حالات میں بعض اوقات علاقے کا، Society کا چوہدری بھی اکیلا سرحدوں پر جانے میں بڑا اندیشہ محسوس کرتا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ایسا کوئی موقع آتا تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھوڑے پر سوار ہوتے اور اکیلے ہی چکر لگا کر واپس تشریف لے آتے۔

یہاں اس طرف غور کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکیلے ہی کیوں تشریف لے جاتے!؟ کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ خدا نے مجھے کہہ دیا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں، میں تجھے بچاؤں گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدیق اکبر معیت خدا میں ایک ہیں

یہ ''اللہ کا ساتھ ہونا'' ایک دفعہ اللہ کے حکم سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے ہجرت کی رات نکلا، جب دو شخص، دو ہستیاں غار میں تھیں، جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کے الفاظ سے ذکر کیا جب یہ دو غار میں تھے۔ تو حضرت ابو بکر صدیق کو اندیشہ ہوا کہ کہیں دشمن غار میں نہ آجائیں، کوئی دیکھ نہ پائیں کیونکہ دشمن پیچھے پیچھے ان کا

تعاقب کر رہے تھے کہ رات کا مسافر کہاں گیا تو حضرت ابو بکر صدیق کو خیال آیا کہ کوئی آ نہ جائے، آخر آپ بھی انسان تھے، تو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (پارہ:10، توبہ:40)

ترجمہ: تو غم نہ کر (فکر نہ کر) اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں تو جو اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے نبی کو خبر دی تھی کہ حَسْبُكَ اللّٰہُ کہ خدا تیرے ساتھ ہے تو یہاں اس لپیٹ میں حضور ﷺ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے آئے۔ تو حضور ﷺ اور ابو بکر صدیقؓ کی ساری کامیابی اس پر ہے کہ اللہ ان کے ساتھ ہیں، اللہ نے حضور ﷺ کے ساتھ وعدہ کیا اور حضور ﷺ نے پھر غار میں ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: لَا تَحْزَنْ، تو فکر نہ کر، غم نہ کر، اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو پھر ابو بکر صدیق کو بھی وہی یقین ہوا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے حتیٰ کہ جب حضور کی وفات ہوئی اتنے فتنے پیدا ہوئے

- کہیں ختم نبوت کا انکار ہے
- کہیں زکوٰۃ کا انکار ہے

لیکن حضرت ابو بکر صدیق اس جوان مردی سے ہر ایک کے مقابلے میں آ گئے اور ایسی لڑائی لڑی کہ سارے ناکام ہو گئے، ختم نبوت کے محاذ پر بھی کامیابی، زکوٰۃ کے معاملے پر بھی کامیابی، گویا کہ پورے کا پورا نظام سنبھال لیا، تو حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے پورے ارادہ سے اور پختہ عزم سے ہر کام میں آگے بڑھتے رہے، کیوں کہ غار والے واقعہ سے آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ میں خدائی وعدے پر ہوں، پیغمبر کی زبان سے نکلا: اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے حضور ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جتنے بھی محاذوں پر جیتے ہیں تو اس یقین پر کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو تمام صحابہ کرام میں سے حضرت ابو بکر صدیق کا اپنا ایک الگ بلند مقام ہے۔[1]

(1) ثانی اثنین اور افضلیت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تفصیلی مطالعہ کے لیے "خلفائے راشدین" از

افضل الناس بعد الانبیاء حضرت ابو بکر صدیق کا ہی شان امتیاز

حضور ﷺ کے ساتھ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا میں حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ اس لئے آپ مقامِ کمال پر تھے لیکن جہاں تک بصیرت ہے ملک کو چلانے کے لئے، تو ان کے زمانے میں بھی بصیرت حضرت عمر کی آپ کے ساتھ ساتھ کام کر رہی تھی۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خود بھی کمال بصیرت اور فراست میں ممتاز تھے۔

قیادت و سیادت سپرد کرنے میں اصل الاصول

تاہم میں بات یہ کر رہا تھا کہ قیادت اور سیادت کے لئے آپ کے ذہن میں اصول کیا آیا؟ جو اللہ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ (پارہ:5 النساء:58)

اللہ تمہیں حکم دیتے ہیں "اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ" کہ امانتیں سپرد کرو "اِلٰٓی اَھْلِھَا" جو اس کے اہل ہیں وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اور جب تمہیں لوگوں میں فیصلہ کرنا ہو اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ تو پھر انصاف سے کرو، تو قیادت کن کو دینی چاہیے جن میں ان کی اہلیت اور بصیرت ہو تو اہل سنت کے عقیدے کے مطابق خلیفہ کا انتخاب اس بصیرت پر ہو گا اس عقل مندی پر ہو گا اس سمجھ پر ہو گا کہ امت کی کشتی کو ساتھ ساتھ لے کر چل سکے۔

شیر خدا کا فاروق اعظمؓ کے متعلق بصیرت افروز بیان

حضرت علی المرتضی حضرت عمر کو فرمایا کرتے تھے، ان کا یہ خطبہ نہج البلاغہ میں ہے کہ:

ومن کلام له علیه السلام (وقد استشاره عمر بن الخطاب فی الشخوص لقتال الفرس بنفسه) إن هذا الأمر لم یکن نصره ولا

حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب اور "رحماء بینهم" از حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ کی مراجعت فرمائیں۔

خذلانه بكثرة ولا قلة. وهو دين الله الذي أظهره، وجنده الذي أعده وأمده، حتى بلغ ما بلغ وطلع حيث طلع، ونحن على موعود من الله، والله منجز وعده وناصر جنده، ومكان القيم بالأمر مكان النظام من الخرز يجمعه ويضمه، فإن انقطع النظام تفرق وذهب، ثم لم يجتمع بحذافيره أبدا والعرب اليوم وإن كانوا قليلا فهم كثيرون بالاسلام وعزيزون بالاجتماع. فكن قطبا، واستدر الرحى بالعرب، وأصلهم دونك نار الحرب، فإنك إن شخصت من هذه الأرض انتقضت عليك العرب من أطرافها وأقطارها، حتى يكون ما تدع وراءك من العورات أهم إليك مما بين يديك

(نہج البلاغہ، جلد: دوم، خطبہ: 144، صفحہ: 384)

کن قطبا جب چکی چلتی ہے تو چکی کے درمیان میں (وہ چکی جس میں پہلے دنوں میں آٹا پیستے تھے) یہ آپ اپنے تصور میں سوچیں کہ چکی کے درمیان میں ایک کیلی ہوتی ہے جس کے گرد اس کا بالائی پڑ گھومتا ہے تو جو درمیان میں کیلی ہوتی ہے ساری چکی اس کے گرد گھومتی ہے۔

حضرت علی المرتضی کی بصیرت اور سمجھ پر قربان جائیں، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا کہ آپ اس امت کی چکی کی اس درمیان والی کیلی کی مانند ہیں، جس کے گرد سارے گھومتے ہیں تو "کن قطبا" آپ اسی حیثیت میں رہیں تاکہ چکی گھومتی رہے۔ سارے بنی نوع انسان جو حضور کی امت میں آئے اور جنہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اسلام قبول کیا، ان کی ساری ترقیات، انکی ساری وجاہت، ساری سعادت اور ساری کامیابی اس وقت، اس ایک (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کے گرد گھوم رہی ہے، تو حضرت علی المرتضی نے کتنا پیارا لفظ کہا کہ کن قطبا آپ یہ کیلی بن کر رہیں اور یہ چکی چلاتے رہیں۔

صدیق اکبرؓ نے نظام چلایا تو اللہ تعالیٰ کی معیت میں کہ اللہ نے فرمایا تھا کہ ان الله معنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو خدا تعالی کی یہ بات سنادی تھی، تو

- معیت خداوندی
- نصرت خداوندی
- کفایت خداوندی

سے حضرت ابو بکر صدیقؓ جہاں بھی اور جس کام میں گئے، کامیاب رہے، قرآن پاک کو جمع کرنے کے لئے کہا گیا اس میں کامیاب رہے، ختم نبوت کے محاذ کو سنبھالنے کے لئے نکلے اس میں کامیاب رہے، خلافت کا خطبہ دیکر خلافت کے اصول انہوں نے اسوقت جو اپنی تقریر میں بیان کیے اب تک خلافت کے اصول وہی ہیں، جو موتیوں کی طرح چمکتے ہیں تو ابو بکر صدیق جتنا بھی جیتے وہ اللہ تعالی کی معیت ان اللہ معنا پر جیتے لیکن بصیرت پر، سیاست پر، سمجھ پر، اور اس طرح تقوی کی شان کہ من لا یخدع اور عقل کی شان ولا یُخدع پر حضرت عمر نے کام کیا۔

اب اس سے یہ پتہ چلا کہ ہم سے یا آپ سے اگر پوچھا جائے کہ بھائی پیغمبر کا جانشین یا بنی نوع انسان کا حکمران کون ہونا چاہیے؟ تو آپ کیا کہیں گے کہ کسی Blood Relation پر یا کسی نسل پر اس کا فیصلہ ہو یا اہلیت اور عقل و بصیرت پر؟ کیا کہیں گے (سامعین: اہلیت اور عقل و بصیرت پر)

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (پ5، النساء58)

امانتیں سپرد کرو الی اھلھا جو اس کے اہل ہوں۔ تو حکمران اہلیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، صرف Blood Relation پر، برادری پر اور خاندان کی بنیاد پر نہیں۔

اگر آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں تو آپ یہ سوچیں کہ نبی پاک ﷺ کی شان کا تو کوئی انکار نہیں کرتا، اور نہ کوئی کر سکتا ہے۔ اور جو انکار کرے وہ تو مسلمان ہی نہیں۔ لیکن حکومت کے لیے یہ معیار کہ صرف حضور کی اولاد اور خاندان میں سے ہوں اس کو کہتے ہیں کہ Blood Relation پر، تو اس کا داعی کوئی نہیں۔

عالم دنیا میں قیادت کے انتخاب کا اصول

ایران میں اسلام سے قبل ساسانیوں میں یہ روایت چلی آرہی تھی، کہ انتخاب

Blood Relation پر ہو،

- قیصر کے جانشین Blood Relation پر
- کسریٰ کے جانشین Blood Relation پر

سو قبل از اسلام دنیا میں ہر جگہ آواز لگ رہی تھی خاندان، خاندان، خاندان۔ لیکن نبی پاک ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (سورۃ ال عمران، آیت:159)

نظام چلے شوریٰ پر

اے میرے پیغمبر آپ حکومت چلانے میں، نظام چلانے میں شوری پر چلیں۔ یہ نہیں کہا کہ Blood Relation پر چلیں۔ پرانے زمانے میں حکمران اسی رشتے پر، اسی ناطے پر، اسی اعتماد پر چنے جاتے تھے، حضور ﷺ نے قرآن پاک پیش کیا اور انسانیت کو اللہ کا فرمان ''إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا'' سنایا۔

نبی اکرم ﷺ نے مصلیٰ امامت کے لئے کیا اصول رکھا

اب ذرا توجہ فرمائیں کہ حضور ﷺ کہاں پیدا ہوئے؟ مکہ میں۔ اور مکہ کی عزت "کعبہ" کی وجہ سے تھی۔ مکہ میں عبد مناف کی اولاد میں سے دو خاندان بنو ہاشم اور بنو امیہ بڑے سمجھے جاتے تھے۔ حضور ﷺ کا جب آخری وقت آیا تو آپ نے مصلی امامت کے لئے کیا کیا؟ آپ بیماری کی وجہ سے مسجد میں جماعت کرانے کے لئے نہیں جاسکتے تھے تو آپ نے مصلی امامت پر کسی کو منتخب کرنے کے لئے کیا اصول رکھا! کہ میں آگے اس شخص کو کروں، جو نہ بنو امیہ میں سے ہو اور نہ بنو ہاشم میں سے۔ یعنی دو ہی تو قبیلے بڑے تھے، دو ہی خاندان بڑے تھے، مکہ کے دو ہی چوہدری تھے، دونوں کا اپنا اپنا امتیاز تھا، لیکن حضور ﷺ نے اصول کیا اختیار کیا؟ کہ اس کو آگے کریں جو ان دونوں میں سے نہ ہو بلکہ وہ ہو جو دونوں کو ایک ساتھ لیکر چلے۔ تو رسالت کی نظر اور بصیرت یہی تھی کہ ان دو میں سے نہ ہو۔ تو حضرت ابو بکر صدیق نہ بنو ہاشم میں سے ہیں اور نہ بنو امیہ میں سے۔ بلکہ آپ کا تعلق قریش

کے ایک متوسط قبیلہ سے تھا۔

سفر آخرت پہ روانہ ہونے سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کا خلافت کیلئے انتخاب

حضرت ابو بکر نے اپنے سفر آخرت پہ روانہ ہونے سے پہلے، اپنے بعد خلافت کیلئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان دونوں خاندانوں میں سے نہیں تھے، نہ بنو ہاشم میں سے، نہ بنو امیہ میں سے۔ سو مرکز کے گرد اور Center کے گرد، ساری امت کی چکی اور سلطنت اسلامیہ کی چکی ان دو (حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے عہد میں خوب چلی۔ کہ جو نہ بنو امیہ میں سے تھے، نہ بنو ہاشم میں سے تھے۔ اور کسی نے بھی اظہار تعصب نہیں کیا بلکہ ان دونوں کو اپنا امام مانا اور اب تک ہم ان کو اپنا امام بر حق مانتے ہیں۔

جب حضرت عمر شہید ہوئے تو اس کے بعد حضرت عمر نے اپنے آخری ایام زندگی میں، جب ابھی روح نے قفس عنصری سے پرواز نہ کی تھی، تو انہوں نے چھ ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی۔ آپ نے اس کمیٹی میں بنو امیہ کے ایک فرد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رکھا اور بنو ہاشم کے ایک فرد حضرت علی کو بھی رکھا۔ اور کمیٹی کے باقی چار افراد ان کے علاوہ دیگر قبائل سے تھے۔

تو تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمان غنی "بنو امیہ" سے تھے اور چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ "بنو ہاشم" سے تھے۔ سو خلافت راشدہ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان دونوں خاندانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مگر یہ بات بھی یاد رکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بنیادی طور پر خلافت کے قیام میں استحکام و استقلال، سلطنتوں میں وسعت اور اسلام کے قلعے کو مضبوط کر کے دکھانے والے اور اسلام کی اس روشنی کو جو دنیا کے تمام ملکوں میں ہو، یہ کر کے دکھانے والے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو ہر بات میں آگے رکھتے تھے۔

پیغمبر کی جانشینی کے متعلق تصویر کا دوسرا رخ

تاہم میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ جو نظام آیا ہے، اس کا یہ

اصول یاد رکھیں، ہمارا عقیدہ ہے کہ پیغمبر کے جانشین اہلیت پر صلاحیت پر قابلیت پر آگے آئے ہیں اور ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ یہ نہیں بلکہ (پیغمبر کا جانشین) نسل پر آگے آنا چاہیے تھا۔ اور جب ہم انکو دلائل دیتے ہیں تو وہ دلائل کو سمجھتے نہیں، بلکہ رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اب جو رو کر اپنا وقت ٹالیں، کیا ان میں سمجھ ہوتی ہے؟ اب میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں کوئی سمجھدار لوگ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی مجالس میں جو سمجھدار لوگ بیٹھے ہوتے ہیں، وہ جب کچھ سوچنا شروع ہی کرتے ہیں تو ذاکرین کہتے ہیں مؤمنین! گریہ کیجیے، رونا شروع کیجئے! جب روئیں گے تو سمجھ تو جائے گی نا؟ جب رونا پیٹنا شروع کر دیں گے تو پھر سمجھ کچھ نہ آئے گا اور نہ ہی کچھ غور ہو سکے گا۔ تو جب اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں اور یہ اگر سمجھ لیں گے تو یہ سارے سنی ہو جائیں گے، تو کہتے ہیں مومنین! اب گریہ کیجئے، اتنی آہ وزاری ہوتی ہے کہ پھر کسی کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے، تو کئی لوگ کہتے ہے جی یہ ناداں روتے کیوں ہیں؟ ناداں نہیں اس بات میں دانا ہیں، اس وقت روتے رُلاتے ہیں جب اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگ کہیں بات کو سمجھ نہ جائیں۔ الغرض میں نے آپ کے سامنے یہ سمجھ پیش کی ہے کہ اہلیت والوں کو آگے کرو۔ اللہ تعالی سمجھ کی توفیق دے۔ (آمین)

بنو امیہ کا فطری خاصہ اور رجحان

اب آگے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ بنو امیہ جو مکہ کا خاندان ہے ان کی فطرت اس طرح تھی کہ وہ ملکوں کو بڑھانے میں، جنگیں لڑنے میں، قلعے بنانے میں، آگے بڑھنے میں، اپنی سعادت سمجھتے تھے، یعنی جہاں بانی، حکمرانی، سلطنت بڑھانا اور سیادت و قیادت یہ بنو امیہ کا جوہر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جو بات میں نے کل عرض کی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑھاپے میں بھی کہ جب آپ 80 سال کے قریب پہنچ رہے تھے تب آپ نے کہا کہ حبشہ کو فتح کرو، کیوں؟ کیونکہ حضرت عثمانؓ میں جو یہ تقاضا تھا، یہ ایک خاندانی جوہر اور فطری طور پر تھا۔ تو "امیر معاویہ رضی اللہ عنہ" بھی بنو امیہ میں سے تھے، ان کا معیار ہی یہ تھا کہ آگے بڑھیں، آگے بڑھیں۔ اور قوم اسطرح ہو کہ یہ دنیا کی ساری قوموں پر چھا جائے۔ آگے بڑھیں، ذات کے لئے نہیں بلکہ قوموں کی قیادت میں، سو ان کا مزاج ہی یہ تھا۔

حضرت امیر معاویہ ؓ کا پہلا کمال

حضرت معاویہ نے اپنا پہلا کمال کس طرح اور کب ظاہر کیا؟ اس وقت جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم خشکی کے ہر محاذ پر گئے، عرب کے صحراؤں میں گھوڑے دوڑا چکے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیاب بھی فرمایا، جیسا کہ بدر و احد کے معرکے لگے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور میں معرکے لگے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں معرکے لگے، آپ (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ) کے دور میں معرکے لگے اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے گھوڑے جن صحراؤں میں دوڑے ہیں ہم ان گھوڑوں کے ٹاپوں کو بھی سلام کرتے ہیں جو عرب میں چھا گئے۔ سو امیر المومنین ہم زمین پر اپنی کارکردگی بخوبی دکھا چکے ہیں مگر اب میری ایک عرض اور رائے ہے۔ تو امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ آپ (معاویہ رضی اللہ عنہ) کی وہ کیا رائے ہے؟ (میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو گی) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ امیر المومنین اب ہمیں بحری جنگوں کے لئے بھی تیاری کرنی چاہیے۔ یعنی سمندروں میں لڑنا ہے، پانیوں میں اتر کر لڑنا ہے، کشتیوں میں جا کر لڑنا ہے۔ تو جب تک ہم اسکی مشقیں نہ کریں، اس وقت تک قومی تقاضے پورے نہیں ہوتے۔

سمندر کی لڑائیوں کو رکوب البحر کہتے ہیں اور انگریزی میں اسے Navy System کہہ سکتے ہیں۔ تاہم تاریخ اسلام میں سب سے پہلے یہ بات کن کے ذہن میں آئی؟ اور کس نے اس کا سب سے پہلے اظہار کیا؟ (حضرت امیر معاویہ ؓ کے ذہن میں آئی اور آپ نے اس کا اظہار کیا) اور یہ آپ کس کے سامنے عرض کر رہے ہیں؟ حضرت عثمان ؓ سے۔ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اب ہمیں قوم کو اس طرف بھی لگانا چاہیے۔

تو کیا اس بات سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انکار کر سکتے تھے؟ (نہیں)۔ کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بھی تو بنو امیہ میں سے تھے، ان کی رگوں میں بھی سیادت کا اور قومی قیادت کا

خون تھا۔ اس لیے آپ بڑھاپے میں بھی جوان تھے۔ تو اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے کو قبول کر لیا اور ہاں کر دی، لیکن اس سب پر محنت کس نے کی؟ اس پر "محنت کی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے"۔ انہوں نے لوگوں کو اکھٹا کر کے پانی میں اترنے کی مشقیں کیں، کشتیوں کو چلانے کی مشقیں کیں اور انکو سارے آداب سکھائے جب پہلی دفعہ وہ چلے۔

حضرت معاویہؓ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب بعض اوقات لوگ یہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ جی لڑنے کا کیا فائدہ؟ کیا اللہ والے کبھی لڑتے ہیں! بھائی اب جو معاویہ رضی اللہ عنہ بحری طور پر لڑنے کے لئے تیار ہوئے تو ان پر جو اعتراض کرتے ہیں کیا وہ یہ نہیں سوچتے کہ پھر تو اس طرح کا اعتراض اور جگہ پر بھی ہو سکتا ہے، جیسے خشکی پر لڑنے والے بھی تو آگے آئے تھے!؟ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تھے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے گھوڑے صحراؤں میں دوڑے تھے۔ تو ان تمام حضرات کا آنا اور لڑنا اللہ کی رضا کے لئے تھا۔ تو اب سمندروں میں اترنے والے بھی اللہ کی رضا کے لئے ہی اترے تھے۔ بہر حال حضرت معاویہ نے خود بھی ٹریننگ لی اور اس ٹریننگ میں اور لوگ بھی آپ کے ساتھ رہے۔

تاہم میں اس اعتراض (کہ جی اس طرح لڑنا بھی کوئی کمال ہے) کا ایک اور جواب بھی دے دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں۔ اور پیغمبروں کے بارے میں ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔

پیغمبر ہمیشہ دخل شیطانی سے محفوظ رہتا ہے

آپ (عوام) کو جو خواب آتے ہیں وہ ہر طرح کے ہوتے ہیں یا نہیں؟ لیکن پیغمبر کا خواب دخل شیطانی سے محفوظ ہوتا ہے۔ یہاں ایک بات کہنے والی نہیں تھی لیکن اشارۃً کہتا ہوں کیوں کہ معلوم نہیں یہ آواز کہاں کہاں پہنچ رہی ہے اور آگے کہاں کہاں تک پہنچے گی،

تو بعض باتیں عوامی اجتماع میں کہنے کی نہیں ہوتیں لیکن اشارۃً ایک بات کہتا ہوں۔

عام انسانوں کو جب خواب آتا ہے تو کبھی یہ خواب احتلام بھی تو کہلاتا ہے۔ تو جب وہ اِس درجہ کا خواب ہوتا ہے تو اس میں شیطان کا دخل ہوتا ہے۔

لیکن پیغمبر کا جو خواب ہوتا ہے، وہ وحی ہے، وہ بڑا پاک خواب ہوتا ہے۔ اس لئے آپ ہمیشہ کے لئے یاد رکھیں کہ مَا احۡتَلَمَ نَبِيٌّ قَطُّ[1] کسی بھی پیغمبر کو کبھی احتلام نہیں ہوا۔ شان رسالت اور شان نبوت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ کسی پیغمبر کو یہ نہیں ہوا۔ کیوں کہ یہ عمل دخل شیطانی سے ہوتا ہے اور نبی کو دخل شیطانی نہیں ہوتا۔

پھر خوابوں کی کوئی تعبیر بھی ہوتی ہے۔ تو خوابوں کی تعبیر کی امامت بھی اللہ نے پیغمبر کو دی جن کا نام حضرت یوسف علیہ السلام ہے۔ تعبیر میں عقل انسانی کو دخل ہوتا ہے، لیکن خوابوں کی تعبیر میں بھی امام مانا گیا تو یوسف علیہ السلام مانے گئے۔ اور صحابہ اور تابعین کے آگے جن کا چرچا ہوا، وہ ابن سیرین رحمہ اللہ ہیں جن کو اس فن کا امام اور ماہر مانا گیا۔

مرزا غلام احمد اور Bad Dreams

اب جب یہ بات آپ سمجھ گئے کہ پیغمبر کو اس طرح کا خواب نہیں آتا تو پھر مجھے ایک بات کہنے دو، جو اس موضوع کی نہیں، لیکن کہہ ہی دیتا ہوں کہ کسی نے مرزا غلام احمد کے بیٹے سے پوچھا کہ مرزا صاحب کو کبھی Bad Dreams ہوا؟ بیٹے نے کہیں کسی سے سنا ہو گا، تو وہ کہتا ہے کہ ہاں ان کو ہوا۔[2] سو ہم قادیانیوں کو کہتے ہیں کہ یہ بھی تمہارے اور ہمارے درمیان فیصلہ کن بات ہے۔ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی مانتے ہیں کہ ان کے بعد کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہو گا۔ قادیانیوں تم نے جسے نبی بنا رکھا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اسے

---

(1) الطبرانی فی معجم الکبیر، ج:۱۱، ص:۱۸۰۔

(2) مرزا غلام احمد قادیانی کا بیٹا مرزا بشیر احمد ایم اے لکھتا ہے:

(843) ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ خادم میاں حامد علی مرحوم کی روایت ہے کہ ایک سفر میں حضرت صاحب کو احتلام ہوا۔

(سیرت المہدی، حصہ سوم، ص:757، جدید ایڈیشن، مطبوعہ قادیان، جولائی 2008ء)

Bad Dreams ہوتے تھے۔ تو سامعین آپ کو یہ بات عقیدہ ختم نبوت کے حوالے سے سمجھ آگئی ؟ (سامعین: جی سمجھ آگئی)۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو لسان نبوت سے بشارت

تاہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خواب آیا، اس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ یہ رکوب البحر کے متعلق ہے کہ سمندروں میں مسلمان کیسے اتریں گے۔

اس خواب کو روایت کرنے والی حضرت عبادہ بن صامت کی اہلیہ حضرت ام حرام ہیں، جو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں۔ اس پر سب مورخین کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ ان سے محرم ہونے کا تھا۔ شارح بخاری علامہ کرمانی لکھتے ہیں:

انهم اتفقوا علیٰ انها كانت محرمة لرسول الله ﷺ فقال ابن عبد البر كانت احدى خالاته من الرضاعة وقال آخرون كانت خالة لابيه او لجده لان عبد المطلب كانت امه من بني النجار

ترجمہ: اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت ام حرام بنت ملحان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محرم تھیں۔ ابن عبد البر لکھتے ہیں آپ رضاعت کے رشتہ سے حضور اکرم کی خالہ تھیں اور دوسرے کہتے ہیں کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ آپ کے والد یا دادا عبد المطلب کی وجہ سے تھیں۔ عبد المطلب کی والدہ بنی نجار میں سے تھیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے ہاں کبھی آتے تو وہاں ٹھہر جاتے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت خدمت کرتی تھیں حضرت انس بن مالک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے ہاں آنے اور آرام کرنے کا ایک واقعہ روایت کرتے ہیں:

فاطعمته وجعلت تفلي راسه فنام رسول الله ﷺ ثم استيقظ وهو يضحك قالت فقلت ما يضحكك يا رسول الله قال اناس من امتي عرضوا علي غزاة في سبيل الله يركبون ثبج هذا البحر ملوكا على الاسرة او مثل الملوك على الاسرة (صحیح بخاری، ج:1، ص:391)

ترجمہ: آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانا بھی کھلاتیں آپ کا سر مبارک بھی کھجلاتی

تھیں۔ حضور ایک دفعہ ان کے ہاں سوئے تھے کہ اس حالت میں بیدار ہوئے کہ آپ کے چہرہ مبارک پر ظہور مسرت تھا۔ آپ مسکرا رہے تھے حضرت ام حرام نے آپ سے خوشی کا سبب پوچھا آپ نے فرمایا کہ نیند میں مجھے اپنی امت کے کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے دکھائے گئے وہ اس سمندر میں اس طرح جارہے تھے گویا تختوں پر بادشاہ بیٹھے ہوں یا وہ بادشاہوں کی طرح بیٹھے تھے۔

حضور ﷺ دنیا میں تھے، ابھی سفر آخرت پر نہیں گئے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو خواب دکھایا جو ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ ام حرام بنت ملحان جو عبادہ بنت صامت کی بعد میں بیوی بنیں، آپ ملحان کی بیٹی تھیں۔ حضور اکرم ﷺ ان کے ہاں گئے۔ حضور کو بیٹھے بیٹھے کبھی اونگھ بھی آجاتی تو اس کے دوران حضور کو کوئی بلاتا نہیں تھا۔ ایسا کیوں؟ ایسا اس لیے کہ شاید وحی اتر رہی ہو تو حضور اکرم ﷺ ام حرام بنت ملحان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ تو وہاں بیٹھے اونگھ آگئی۔ یا نیند کہہ سکتے ہیں۔ پھر جب آپ بیدار ہوئے تو چہرے پر مسکراہٹ تھی تو ام حرام نے پوچھا حضور آپ کے چہرے پر یہ خوشی کیا ہے؟ فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا کہ میری امت کے لوگ سمندروں میں کشتیوں پر اس طرح جارہے ہیں کہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ جارہے ہیں رائیتھم میں نے ان کو دیکھا "كالملوك على الاسرة" کہ تختوں پر بادشاہ جارہے ہیں، اس میں اشارہ تھا کہ اب میری امت آگے سمندروں میں دوڑے گی اور جو جائیں گے وہ کامیاب ہوں گے تبھی تو کہا نا کہ بادشاہوں کی طرح جارہے ہیں۔ تو بادشاہ اسی کو کہتے ہیں جو کامیاب ہوں۔ میں نے مسلمانوں کو کشتیوں میں اس طرح دیکھا "كالملوك على الاسرة" جس طرح کہ تخت پر بادشاہ جاتے ہیں تو اس کو دیکھ کر حضور کو کوئی فکر اور غم لاحق ہوا یا خوشی ہوئی؟ چہرے کی مسکراہٹ نے بتادیا کہ حضور ﷺ خوش ہیں۔

اب حضور تو بحری جنگوں کے معرکوں سے خوش ہوں اور اعتراض کرنے والے کہیں کہ امیر معاویہ نے تو بس لڑنے کے لئے بحری جنگوں کا آغاز کیا، تو اس پر آپ خود سوچیں کہ کون سی بات بہتر اور درست ہے؟ بھائی حضور ﷺ کو خواب کس نے دکھایا؟ "اللہ نے"۔

سو اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی بحری مشقوں سے، بحری بیڑوں سے، کشتیوں کے چلنے سے، بادشاہوں کی شوکت ظاہر کرنے سے اللہ بھی خوش تھا۔ پیغمبر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ تو جو قوم اپنی شوکت سے بھاگے کہ ہمیں شوکت نہیں حاصل کرنی، بڑائی حاصل نہیں کرنی اور قومی سطح پر دنیا پر نہیں چھانا، تو اس خواب کی رو سے وہ خاتم النبیین کی لائن کے نہیں رہے، کیونکہ حضور نے فرمایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میری امت کے لوگ کشتیوں میں جا رہے ہیں اور اس شان سے جا رہے ہیں جیسے بادشاہ اپنے تختوں پر بیٹھے ہوں، تو امِ حرام نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے کہا ادع اللہ اے اللہ کے پاک پیغمبر! اللہ سے دعا کریں کہ میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں جو بحری جنگوں میں جائیں گے، (گو یہ عورت ہیں اور خدمت کے لئے جائیں گی) حضور آپ دعا کریں کہ مجھے بھی اس جہاد میں جانے کا موقع ملے ادع اللہ، اللہ سے کہیں۔

ام حرام رضی اللہ عنہا کا انبیاء کے متعلق عقیدہ

معلوم ہوا کہ حضرت امِ حرام کا بھی عقیدہ یہ تھا کہ یہ مقام اور یہ فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔[1] اس لیے آپ نے یہ نہیں کہا کہ "مجھے آپ اس میں شامل کریں" نہیں بلکہ ادع اللہ، اللہ سے کہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وقت اللہ تعالی نے امِ حرام کے متعلق بشارت دے دی کہ **وانتِ منھم** کہ تو ساتھ جائے گی، وہاں بیٹھے بیٹھے پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ آ گئی اور پھر آپ اٹھے تو چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اور فرمایا میں نے پھر یہی نقشہ دیکھا ہے تو پھر ام حرام نے کہا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے ان میں کر دیں تو فرمایا نہیں تم ان میں نہیں۔

تاہم جو معرکے بحری بیڑوں کے ذریعہ لگے ہیں، اس میں "سباق الغایات" امام کون؟ اور پوری امت کے لئے عزت کا نشان کون؟ اور اللہ تعالی نے اسکی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی۔ حضرت معاویہ کا جو یہ بحری جنگوں کا کارنامہ ہے، اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

(1) مختار کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس عنوان پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدر رحمہ اللہ کی کتاب "دل کا سرور" کی مراجعت فرمائیں۔

حیات طیبہ میں نہیں دیکھا۔ اور آپ کے بعد دیکھا تو حضرت عثمان نے دیکھا۔ کیوں کہ ان کے دور میں یہ بات ہوئی تو پہلا معرکہ جو ہے اس میں حضرت امیر معاویہ خود بھی کشتیوں میں اترے اور خود قیادت کی اور ایک داغ بیل ڈال گئے اور جب تک دنیا رہے گی اس وقت تک مسلمانوں کی تاریخ میں بحری جنگوں کے آغاز کا سہرا آپ کے سر ہی رہے گا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایسا کر کے بنو امیہ میں سے ہونے کا حق ادا کر دیا۔

دنیا کے عظیم ترین حکمرانوں میں سے

اب ذرا آگے بڑھتے ہیں۔ اس وقت یہ جنگوں کی فتوحات اور بحری بیڑے کہاں کہاں گئے یہ بھی زیر بحث نہیں اور خالد بن ولید کے گھوڑے کس طرح صحراؤں میں دوڑے اور کس طرح بری جنگوں میں مسلمان غالب آئے وہ بھی زیر بحث نہیں۔ میں بات یہ کر رہا تھا ذرا غور کریں کہ امیر معاویہ کے ذہن میں کیا تھا؟ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ ”اب ہم پوری دنیا میں پھیلیں“ تو اگر امیر معاویہ کی وہ تدبیر کامیاب ہو جاتی (وہ تو علم الٰہی میں تھا کہ نہیں ہو گی) تو ان کے پروگرام میں یہ تھا کہ اب مسلمان آگے بڑھ کر فرانس کے جنوب تک پہنچیں گے، پہلے اسپین کی طرف جائیں گے پھر آگے وہاں تک پہنچیں گے تو حضرت امیر معاویہ کی نظر ہی یہ تھی کہ مسلمانوں کو سنبھالا اور پھیلایا جائے۔

سو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے تو حکمران، لیکن وہ حکمرانوں میں حکمران تھے لیکن حضور کی امت کے نگہبان تھے۔ معاویہ کیا تھا؟ مسلمانوں کو ہر پہلو سے آگے بڑھانے والا تھا:

وہ حکمرانوں میں حکمران تھا
حکمراں بھی مگر کہاں تھا
بپھرتی موجوں میں حق پرستوں کی
سادہ کشتی کا باغ بان تھا
بکھرتی موجوں میں ساری امت کا
ہر طرف سے وہ باغباں تھا
وہ حکمران تھا مگر وہ کیسا

حکمرانوں میں حکمران تھا
وہ حکمران بھی مگر کہاں تھا

شامی اور عراقی لوگوں کی نفسیات

اب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سوچ اور منصوبے تو یہ تھے، مگر آپ کی وفات کا وقت قریب آ گیا۔ اب حضرت امیر معاویہ کے ذہن میں یہ تھا کہ اب میں کیا کروں؟! اس میں ایک بات یاد رکھیے کہ امیر معاویہ کا پہلے سے کونسا صوبہ تھا؟ حضرت امیر معاویہ کا اپنا صوبہ شام تھا۔ جس کو آج کل سیریا (Syria) کہتے ہیں۔ حضرت معاویہ کہاں تھے؟ "شام میں"۔ اور جن کے ساتھ ان کا ملک کے انتظامی امور میں اختلاف چلا آ رہا تھا، یعنی چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ کہاں تھے؟ "عراق میں"۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ عراق میں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام میں۔ تو عراق کے لوگوں کی ایک خاصیت مؤرخین نے بھی بیان کی وہ یہ کہ "یہ رائے بڑی جلدی بدلتے ہیں" اپنی بات پر رہتے نہیں۔ عراق کے لوگ جو ہیں ان کا مزاج ایسا ہے کہ رائے بڑی جلدی بدلنا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اصل میں تو عراق کے نہیں تھے، آپ تو مدینہ سے گئے تھے، آپ تو مکہ والے تھے، لیکن عراق کے لوگوں میں یہ کمزوری عام رہی ہے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کون تھے؟ عراقی۔ اور معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کون تھے؟ شامی۔ تو شامی اور عراقی دونوں قوموں کے مزاج کے بارے میں اگر معلوم کرنا ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات ہیں، ان خطبات سے عراقیوں کے مزاج کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ (عراق) کوفہ میں اپنے ساتھیوں اور خدام سے کہتے ہیں۔ اے اہل عراق! (اس کا مطلب یہ تھا) میں تمہارا قائد ہوں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں مگر تم میری پیروی نہیں کرتے، تم میری بات نہیں مانتے۔ اور معاویہ شام میں میرے مقابلے میں ڈٹا ہوا ہے۔ شام کے سارے لوگ اس پر جان دیتے ہیں **واللہ لوددت بدینار ودرھم**۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح درہم و دینار سے معاملہ ہوتا ہے، معاویہ میرے ساتھ طے کر لے کہ "دس دس آدمی میرے لیتا جائے اور ان دس کے بدلے مجھے اپنا ایک

ایک دے دے" ایسا ہو تو پھر میں کامیاب ہو جاؤں یعنی معاویہ اس طرح کرے کہ 100 عراقی لے لے اور مجھے ان کے بدلے اپنے دس آدمی دے دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ دس میرے لیے 100 سے زیادہ فائدہ مند ہوں گے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خطبہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ:

ایها الشاهدة ابدانهم، الغائبة عقولهم المختلفة اهواءهم المبتلیٰ بهم امراوهم صاحبکم یطیع الله وانتم تعصونه وصاحب اهل الشام یعصی الله وهم یطیعونه۔ لوددت والله ان معاویة صار فنی بکم صرف الدینار بالدرهم فاخذ منی عشرة منکم واعطی نی بواحد منهم (نہج البلاغہ جلد اول خطبہ 95، ص 286)

اے وہ لوگو جن کے جسم تو حاضر ہیں اور عقلیں غائب ہیں!

اے عراق کے لوگو! الشاهدة ابدانهم جن کے بدن تو میرے سامنے ہیں لیکن یہ چلتی پھرتی لاشیں ہیں ای الشاهدة ابدانهم اے وہ لوگو جو میرے سامنے تم موجود ہو الغائبة عقولهم لیکن عقلیں تمہاری ہیں ہی نہیں صاحبکم یطیع لله میں اللہ کا فرمانبردار ہوں وانتم تعصونه۔

تاہم جو شام کے لوگ ہیں، وہ Taff Fighters ہیں اور آپ نے بھی دیکھا ہے کہ اس وقت عالمی انقلابات میں باہر کی طاقتوں نے عراق پر کتنی جلدی قبضہ کر لیا، لیکن شام والے پھر بھی کچھ نہ کچھ ڈٹے رہے۔

اب حضرت امیر معاویہ کا آخری وقت قریب آرہا تھا اور آپ کو قوموں کے مزاج کا بھی پتا تھا، تو انکو اندازہ یہ ہوا کہ اگر میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے نیک آدمی کو آگے کروں تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں میں پرورش پائی، گو اِسوقت مدینہ میں وہ رہتے ہیں لیکن اگر ان کو آگے کروں تو ان کے خیر خواہ اور فداکار ان کے والد کے تعلق سے تو اہل عراق ہیں اور اہل عراق تو بڑی جلدی لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں، سو اسلام کے قلعے کو مضبوط کرنا ہے اور اسلام کو ساری دنیا میں کامیاب کرنا ہے تو ہم اگر نیک ہونے کی بنا پر انکو آگے

کریں تو یہ کہیں چکر میں نہ آجائیں تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نظر اس تناظر میں قومی سطح پر تھی۔

اب ذرا توجہ فرمائیں! انہوں نے صحابہ سے مشورہ کیا، جو اس وقت شام میں اور باہر تھے۔ صحابی یا بزرگ لوگ، تجربہ کار حضرات سے مشورہ کیا۔ حضرت امیر معاویہ نے فرمایا! کہ ہمیں ایسے لوگوں کو آگے کرنا ہے کہ بیرونی ملکوں کے چکر میں نہ آئیں، اب جو ملک بیرونی ملکوں کے اشاروں پر چلتے ہیں، کیا وہ کبھی آگے چل سکتے ہیں!؟ آگے بڑھ سکتے ہیں؟ ''وہ چل ہی نہیں سکتے''۔۔۔۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا۔۔۔۔۔ یہ تھا نکتہ سیاست، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا۔

حضرت امیر معاویہؓ کے بعد بحری جنگوں کے ماہر

اب ذرا توجہ کریں، انہوں نے جب مشورہ کیا تو حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا کہ آپ کے ساتھ بحری جنگ کی مشقیں کس کس نے کی ہیں؟ وہ کی تھیں ''یزید نے بھی'' تو امیر معاویہؓ نے یزید کو بھی خاص طور پر ٹریننگ دی تھی کہ بحری جنگوں میں کس طرح قیادت کرنی ہے اور اگر تم نے اس میدان میں آگے بڑھنا ہے تو یہ مشقیں ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کو آگے کر دو، حضرت معاویہؓ نے کہا کہ بات یہ ہے کہ وہ تو میرا بیٹا ہے، تو بیٹے کو آگے کرنے میں مصلحت معلوم نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے لوگوں میں یہ بات مشہور تھی، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد چونکہ ان کا بیٹا ہوا ہے، حضرت علی جب شہید ہو چکے اور ان کا بیٹا امام حسن رضی اللہ عنہ ان کے بعد ہوا تو حضرت علی کے بعد اگر بیٹا ہو سکتا ہے تو آپ بھی بیٹے کو خلیفہ متعین کریں لیکن امیر معاویہ اس طرف آتے نہیں تھے کہ یہ بیٹا ہے، لیکن ان کے ہاں نکتہ نظر یہ تھا کہ بحری جنگوں کی مشقوں میں اس (یزید) نے ٹریننگ کی ہے پوری۔

علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے:

تو پانچ بڑے آدمی جن میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے کہا کہ اس کو بناؤ۔

لیکن ہمارا جو عقیدہ ہے وہ یہ ہے کہ علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے[1] اب امیر معاویہؓ اپنی جگہ کتنے بھی بڑے درجے کے کیوں نہ ہوں اور تجربہ کار ہوں لیکن غیب کا پتہ تو نہیں تھا کہ یہ بعد میں کرے گا کیا!؟ انہوں نے جو یزید کو نامزد کیا وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ انکو شوری نے مشورہ دیا تھا، اور مشورہ کے بعد انہوں نے انکی بات میں ہاں کی، لیکن اسوقت پتہ نہیں تھا کہ اس کا کردار آگے کیا ہو گا، علم غیب خدا کو ہے۔

حضرت معاویہؓ کی وقت وفات یزید کو حضرت حسین کے متعلق وصیت

لیکن غور کریں کہ حضرت معاویہؓ کی جو وصیت ہے وہ مؤرخین نے کتابوں میں محفوظ کرلی ہے اوران کے شیعہ عالم ملاباقر مجلسی کی کتاب جلاء العیون (فارسی، ج2، ص،509)[2] میں بھی حضرت معاویہ کی یزید کو حضرت حسین کے متعلق وصیت ملتی ہے انہوں نے کہا، بیٹا! میں بڑے لوگوں کی اولاد کے بارے میں تجھے ایک بات کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو اولاد ہے وہ سیاسی قیادت میں آئیں گے ہی نہیں کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا گیا تھا کہ آپ کا بیٹا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ علم میں بہت اونچا ہے، علم کا پہاڑ ہے اور بہت نیک بھی ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، بھائی اگر وہ نیک ہے، تجربہ کار ہے، تو ان سے مشورہ لے لیں لیکن اس کو خلیفہ نہیں بنانا، قیادت میں نہیں لانا۔ انہوں نے کہا جی وہ تو بڑا اہل ہے اور قابل ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے خاندان کا یہ ٹھیکہ ہے کیا؟ کہ یہی کام کریں؟ اور لوگوں کو

---

(1) علم غیب خاصہ باری تعالیٰ ہے، اس عقیدہ پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدر رحمہ اللہ کی کتاب "ازالۃ الریب عن عقیدۃ علم الغیب" و "اظہار العیب فی کتاب اثبات علم الغیب" اور حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کا رسالہ "عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے" کی مراجعت فرمائیں۔

(2) واما امام حسین پس مے دانی نسبت و قرابت او بحضرت رسالت واو پارہ تن آنحضرت است واز گوشت وخون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پروردہ است ومن مے دانم کہ البتہ اہل عراق اورابسوی خود خواہند بردویاری اونخواہند کرد اور انتہا خواہند گزاشت اگر براد ظفریابی حقوق حرمت اورا بشناش و منزلت و قرابت اورا باپیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بیاد آور اورا بکردہ ہائے او مواخذہ مکن وروابطے کہ من دریں مدت محکم کردہ ام قطع مکن زنہار کہ بادمکروھے واسپے برسانی۔

بھی کہو کہ وہ بھی کریں، میں اپنے خاندان کی طرف سے اس قربانی میں سب سے آگے رہا ہوں، ٹھیک ہے میں کر گیا، لیکن اب ہم یہ بوجھ نہیں اٹھائیں گے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ لے لیا کرو، شوریٰ میں لے لو لیکن آگے اس کو نہیں کرنا۔ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو کہا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس مقام کے ہیں کہ وہ آگے آئیں گے ہی نہیں۔ ہاں حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو ہیں وہ ممکن ہے آگے آئیں۔

لیکن میں تمہیں ایک بات صرف کہتا ہوں کہ جب تو حالات پر قابو پالے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں تم رشتہ رسالت کو یاد رکھنا۔ کہ وہ بیٹا کن کا ہے اور نواسہ کن کا ہے، "فاطمہ کی گود نے اس کو پالا ہے"۔

سوسامعین! یہ یاد رکھیں کہ غیب کا علم تو اللہ کو ہے۔ اس لئے یزید کے کسی کردار کی وجہ سے ہم امیر معاویہ پر انگلی نہیں اٹھا سکتے، انہوں نے تو اپنا حق ادا کر دیا۔ اور جو انکی نظر تھی، کہ وہ فاتح پرچم کشا تھے، وہ آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

میں نے کل اشارۃً بات کی تھی کہ اندلس میں، اسپین میں مسلمانوں کی شوکت جو قائم ہوئی وہ بنو امیہ کی ہی وجہ سے ہوئی تھی تو حضرت امیر معاویہ کا نکتہ نظر ہی یہ تھا کہ ایسا آدمی آگے کرو کہ جس کو باہر کا کوئی شخص چکر نہ دے سکے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف منفی پراپیگنڈہ

حضرت امیر معاویہ کی ایک بات یاد آ گئی۔ حضرت امیر معاویہ گورنر کہاں کے تھے؟ "شام کے"۔ اور کس دور میں تھے؟ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تھے۔" اب حکومتوں میں کچھ لوگ Report کرنے والے بھی ہوتے ہیں، یعنی اوپر اطلاع دینے والے۔ اور کبھی Reporter غلط خبر گیری اور غلط پراپیگنڈا بھی کر دیتے ہیں نا؟ سو کسی نے حضرت عمر کو شکایت کی کہ حضور! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نظام اور حضرت ابو بکرؓ کا نظام اور آپ کا نظام تو وہی درویشوں کا ہے، آپ نے وہی مدینہ میں اپنی سادگی قائم رکھی ہے کہ صحراء میں جا کر وہی اینٹوں کا سرہانا بنا کر سو جاتے ہیں حالانکہ آپ بادشاہ ہیں، اور نظام چلاتے ہیں اس طرح کہ ساری چکی گھومتی ہے اسی کیلی کے گرد۔

ایک دفعہ قیصر بادشاہ روم کے کوئی آدمی آئے کہ جی دنیا جس کے نام سے ڈرتی ہے دیکھیں تو سہی اس (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کو، تو وہ مدینہ میں آگئے اور حضرت عمر کا پتہ ہی نہ چلا کہ آپ کہاں ہیں۔ تو کسی نے کہا کہ جی ادھر نکلے تھے تو دیکھا کہ ریگستان میں دو تین اینٹیں سرہانے نیچے رکھی ہوئی ہیں اور آپ سو رہے ہیں۔ تو ان آنے والوں نے بڑی حیرت سے کہا کہ یہ عمر ہے؟ جس کے نام سے دنیا کانپتی ہے تو اس کی زبان سے نکلا کہ اے مسلمانوں کے پیشوا! "عدلتَ فنمتَ" کہ تو نے عدل کر دکھایا اور ٹھنڈی نیند سو رہا ہے اور ہمارے بادشاہوں کو اپنے محلات میں، قیصر و کسریٰ کو اپنے محلات میں یہ نیند نصیب نہیں ہوتی، اے امیر المؤمنین عدلتَ فنمتَ تو نے عدل کر دکھایا اور پھر نیند کا بھی یہ مظاہرہ کیا تو حضرت عمر بھی باوجود اتنی عظمت و شوکت کے درویش ہی رہے۔ جب ملک میں قحط پڑا تو انہوں نے کہا کہ میں زیتون کا تیل لگا کر روٹی نہیں کھاتا، جب تک یہ قحط ہے روٹی زیتون والی نہیں کھاؤں گا، جب تک کہ میری رعیت کے لوگ نہ کھا سکیں، تو زیتون لگا کر روٹی نہیں کھائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نظام تو درویشی کا تھا لیکن ایک رپورٹ کرنے والا کہنے لگا اے امیر المؤمنین تمہارا جو گورنر شام میں ہے وہ تو بادشاہوں کی طرح رہتا ہے۔ اس کا انداز تو اس طرح ہے کہ جس طرح بڑا بادشاہ ہو تو حضرت عمر نے جب یہ سنا تو کہا۔ اچھا! تو انہوں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ میں اب جب شام کا دورہ کروں گا تو میں معاویہ سے ضرور پوچھوں گا، کسی نے جو رپورٹ کی تو تحقیق کروں گا۔

حضرت معاویہ کا سیاست و تدبر میں اونچا مقام

حضرت عمر نے یہ بات کہیں صحابہ میں ظاہر بھی کر دی کہ امیر معاویہؓ سے پوچھیں گے۔ تو ایک بڑا آدمی اور سیاست دان جنہوں نے مصر فتح کیا تھا عمرو ابن عاص جو بہت سمجھ دار آدمی تھے تو وہ امیر معاویہؓ کے بارے میں کہنے لگے کہ میں نے تجربہ کیا ہے کہ معاویہؓ ہر بات میں دلیل کی اتنی قوت رکھتے ہیں کہ چھا جاتے ہیں۔ لیکن اب میں دیکھوں گا کہ عمر کے مقابلے میں وہ کس طرح کامیاب ہوتے ہیں، اب انکا واسطہ امیر المؤمنین حضرت عمر سے ہے، سو ان پر جب حضرت عمر اعتراض کریں گے یا سوال کریں گے تو دیکھتے ہیں کہ کس

طرح یہ نکلیں گے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ ''نہیں نکل سکیں گے'' اور پہلا موقع ہے کہ یہ لاجواب ہوں گے تو عمرو بن عاص نے یہ ظاہر کر دیا تو وہ بھی آ گئے سننے اور دیکھنے کے لئے۔ عمرو بن عاص خود بھی بہت بڑے مدبر اور جرنیل تھے اور حضرت معاویہ بھی بہت بڑے سمجھ دار اور سیاست دان تھے۔ ہماری پنجابی زبان میں کہتے ہیں کہ ''پھنس گئے''۔ آگے سوال کرنے والا ہو حضرت عمر جیسا آدمی اور حاضرین میں حضرت عمرو بن عاص جیسے بیٹھے ہوئے ہوں، اب حضرت معاویہ اس بحث سے نکلیں گے کیسے؟ سو حضرت عمرو بن عاص اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں، کہ میرا خیال تھا کہ یہ اس سے کبھی نکل نہیں سکیں گے۔

چنانچہ حضرت عمر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ آپ کے بارے میں یہ رپورٹ پہنچی ہے کہ آپ نے اپنے ہاں دربان رکھا ہوا ہے، جو باہر سے آنے والوں کو اجازت دے تو کوئی اندر آسکتا ہے۔ تو یہ جو آپ نے شاہانہ پیرایہ بنا رکھا ہے تو یہ کیوں؟

حضرت معاویہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ حضور امیر المؤمنین ''میں وہاں رہتا ہوں یعنی شام میں کہ جس کی سرحدوں کے آگے عیسائیوں کی حکومتیں ہیں'' میں انکے بہت قریب ہوں، مدینہ میں تو یہ اتنی دور جا نہیں سکتے، لیکن میں تو بالکل سرحد پر ہوں، تو ان کا نظام جو ہے اس کے مطابق ان کا نظام ایسا ہے کہ کسی وقت بھی ان کے آدمی آکر ہمارے علاقے میں افراتفری پیدا کر سکتے ہیں، انتشار پیدا کر سکتے ہیں سو وہ اسی طرح مرعوب ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کے اپنے بادشاہ ہیں، تو میں نے یہاں دربان اسی لئے رکھا ہے کہ کوئی سازش کر کے آکر ہمارے نظام کو درہم برہم نہ کرے، کیوں کہ میں سرحد پر ہوں، میں اگر ہوتا ''مدینہ'' میں، تو میں بھی اسی طرح کرتا جس طرح آپ حضرات کرتے ہیں۔ میں بھی اسی طرح چلتا۔ لیکن میں ایک سرحد پر ہوں اور اس وجہ سے متعلقین لوگوں پر اپنا قومی وقار قائم رکھنا، ان پر رعب جمائے رکھنا کہ کوئی جلدی اس طرف رخ نہ کرے یا افراتفری پیدا نہ کر دے، اس لیے یہ سب ضروری ہے تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ مسلمانوں کی سرحدیں درویشوں کے پاس ہیں۔ بلکہ ان کو یہ پتہ ہو کہ جو تمہارے آداب ہیں ان کو یہ جانتے ہیں اور تمہارے ارادوں کو بھی پہچانتے ہیں۔ تو میں نے سرحد مضبوط کی ہے کہ جب تک ہم ملکی

سرحدیں مضبوط نہ کریں گے اپنی سلطنت مضبوط نہ کر سکیں گے۔ اس لئے میں نے کہا کہ اب جو بھی اندر آئے، پہلے وہ دربان سے اجازت لے۔ (مطلب یہ تھا) اس لئے نہیں کہ میں بڑا ہوں، یا میں اپنی شوکت چاہتا ہوں یا میں بڑا ہوں، ایسا "نہیں"۔ بلکہ میں سرحدوں کے نظام اور سرحدوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت عمرو بن عاصؓ جو تھے ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ "معاویہ" ایسے اس بات سے نکل آئے کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ہم تو یہی کہتے رہے کہ یہ تو اب پھنس گئے۔

تو بات یہ ہے کہ امیر معاویہ کے ہاں کئی لوگ سیاست و تدبر میں اونچے مقام پر تھے اب انہوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے کہنے پر یزید کو نامزد کر دیا لیکن اسے نصیحت بھی کر دی کہ بڑے لوگوں کی جو اولاد ہے جیسے حضرت عمرو علی رضی اللہ عنہما کی 'سب کے بارے میں انہوں نے تبصرہ کیا تو کہا کہ حضرت حسین تیرے سامنے آئیں تو رشتہ رسالت کو یاد رکھنا۔ مگر اب غلطی یزید سے یہ ہوئی کہ جب حضرت حسین مدینہ سے چل کر عراق آ گئے اور کربلا کے قریب پہنچنے لگے تو اس وقت یزید نے ابن زیاد کو عراق کا گورنر بنا کر بھیجا کہ وہ نظام چلائے۔

یزید کی بہت بڑی غلطی تھی کہ وہ خود حضرت حسین کے پاس نہ آیا

اگر وہ کچھ بھی خیال کرتا کہ جو آنے والا ہے، وہ ہے کون؟ "حضور ﷺ کا نواسہ ہے" جس کے منہ پر حضور اکرم ﷺ نے اپنے لبِ مبارک سے بوسے دیے، فاطمہ کی گود میں پلنے والا ہے۔ اور حضور فرما چکے حسن و حسین "سیدا شباب اھل الجنۃ" اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسی بڑی ہستی کے سامنے سیاسی بات کرنے کے لئے یزید کو خود آنا چاہیے تھا۔ کیا خیال ہے! اگر وہ خود آتا تو حضرت نے کچھ نصیحتیں ہی کرنی تھیں! کچھ عہد لینے تھے، اس کو کوئی سیرت کی تعلیم دینی تھی، کہ تم بزرگوں کی لائن پر چلو۔ اب حضرت حسن نے جب حکومت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو دی تھی تو انہوں نے بھی نصیحت کی تھی۔ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس کو نصیحت کرتے اور اگر وہ مان جاتا تو عالم اسلام میں اتنا بڑا واقعہ پیش نہ آتا۔ لیکن

اس نے ابن زیاد کو بھیجا، خود نہیں گیا، تو جو باپ کی نصیحت تھی، اس پر یزید نے عمل کیا؟ (سامعین: نہیں)

ہم اہل سنت والجماعت (علماء دیوبند) یزید کے ساتھ نہیں

تو ہم لوگ جو یزید کے ساتھ نہیں وہ اس لئے بھی نہیں کہ اس نے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل نہیں کیا، جس کی وجہ سے اس نے وہ کام کیا جس کا تصور کرتے ہوئے بھی ایک مومن کی روح کانپتی ہے۔

تو میں توجہ اس طرف دلا رہا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب مدینہ سے چلے ہیں۔ تو تھوڑی سی بات اتنی یاد رکھیں کہ جب امیر معاویہ نے یہ سارا کام کر لیا تو اس پر ان کی نظر تھی کہ شام کے لوگ جو ہیں کبھی کسی دوسرے ملک کا لقمہ نہیں بنیں گے جس طرح بنگال میں انگریزوں کے آنے کے بعد بنگال میں سراج الدولہ کی حکومت تھی تو میر جعفر نے بیرونی طاقتوں سے مل کر غداری کی تو مل گیا؟ (سامعین: جی ہاں) تو دوسرے ملکوں کیساتھ مل جانا جو ہے یہ ایک بڑا اندیشہ ہوتا ہے، تو شام کے لوگوں کی یہ روایت رہی ہے کہ یہ اپنی بات پر انتہائی سختی سے جمتے ہیں اور باہر کے لوگوں کا اور باہر کی طاقتوں کا یہ جلدی لقمہ نہیں بنتے، یہ ان کی روایت ہے اسی پر حضرت علی بھی کہتے تھے عراق والوں کو کہ شامیوں میں وفاء ہے اور اے اہل عراق تم میں جفا ہے۔

آپ کو کسی اگلی مجلس میں ان شاء اللہ بتائیں گے کہ جب حسین کا قافلہ مدینہ سے چلا تو عراق والوں نے پہلے خود انہیں خط لکھے تھے اور جب یہ یہاں پہنچے تو عراق والوں کی وفائیں جفاؤں میں بدل چکی تھیں، ایسا ہے یا نہیں؟ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ عراق کے لوگ جو تھے ان کی Brain Washing بڑی جلدی ہو جاتی ہے، اب امیر معاویہ جو تھے وہ شام میں تھے تو ان کی نظر ابھی یہ تھی کہ ہم نے بحری جنگیں لڑنی ہیں، یہاں تک کہ ہم نے یورپ میں بھی پہنچنا ہے، اسپین کے بعد فرانس پر ان کی نظریں تھیں تو جو بڑے لوگ ہوتے ہیں ان کی سوچ بھی بڑی ہوتی ہے۔

واقعہ کربلا کو کیسے سمجھیں؟

تو عام لوگوں کو نہ چاہیے کہ واقعہ کربلا میں بات اس طرح شروع کریں کہ یہ واقعہ کربلا کیا ہے؟ کہ یزید کی غلط حرکتیں، اور بس ان کا ذکر کر دیا اور واہ واہ کہہ دیا، دو چار کلمے بول دیئے اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ جی محرم کی مجلسیں پوری ہو گئیں ہیں۔ محرم کی مجالس کو سمجھنے کے لئے اور پس منظر کو جاننے کے لئے بہت دور روایات میں گہرے طور پر جانا پڑے گا۔ اب میں بھی آپ حضرات کے سامنے یہ کہتا ہوں کہ یزید ایسا ہے ایسا ہے، ایسا ہے اور اس کو کچھ برا کہہ لوں بس۔ اور یہ لوگ پھر یہ کہتے ہیں کہ اس کو کس نے مقرر کیا تھا؟ معاویہ رضی اللہ عنہ نے۔ سو محرم کے ذاکروں کی رٹ کہ اسی ھا، ھو میں وہ حضرت معاویہ کو ہی برا بھلا کہتے ہیں۔

تو یہ بات یاد رکھیے کہ حضرت معاویہ کا جانشین جس کی تجویز شوری کے پانچ سات آدمیوں نے پیش کی تھی، ان میں حضرت مغیرہ بن شعبہ بھی تھے۔ تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ یزید بحری جنگوں میں ماہر ہے اور تاریخ نے بتایا بھی کہ امیر معاویہ کے زمانے میں قسطنطنیہ سے جو حملہ ہوا تو وہ بحری جنگ کے نتیجے میں ہوا، اور اسوقت اس بحری جنگ میں کون کون شامل تھے؟ یہ 49 ہجری کی بات ہے تو اس میں کون کون شامل تھے؟ اور اس کو Arrange کرنے والے تو امیر معاویہ تھے اور حکومت بھی ان کی تھی۔

خلافت راشدہ کا دور ختم ہو چکا تھا، امیر معاویہ کی حکومت کا دور تھا، جب یہ معرکہ پیش آیا تو اس معرکہ میں بحری جنگ لڑنے میں کون کون تھے؟ بحری جنگ لڑنے میں "یزید" بھی تھا اور "حضرت حسین رضی اللہ عنہ" بھی تھے اس میں حضرت حسین نے کوئی ایسی بات نہیں کی کہ یزید یہاں کیوں ہے اور نہ اسوقت یزید کا کوئی ایسا کردار ظاہر ہوا تھا۔ حضرت ابو ایوب انصاری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں وہ بھی اس میں تھے اور بیمار ہو گئے تو جب دیکھا اور اندازہ کر لیا کہ اب میری وفات یہیں ہو گی تو کہنے لگے ہم یہاں قسطنطنیہ کو فتح کرنے نکلے ہیں، جہاد کے لیے نکلے ہیں۔ (انہیں بھیجا کس نے تھا؟ "حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے"۔) تو ہم چونکہ اللہ کے رستے میں نکلے ہیں، تو اپنے ساتھیوں کو کہا کہ تم میرے ساتھی

ہو لیکن جب میری جان نکلے تو اسوقت مسلمانوں کی فوجیں جہاں پہنچ چکی ہوں، تو آخری سرحد پر جا کر مجھے دفن کرنا تاکہ میں آخرت میں اللہ کے حضور کہہ سکوں کہ "آقا و مولا تیری خاطر ہم کہاں کہاں گئے تھے" تو میری قبر یہاں نہ ہو بلکہ جس وقت میری جان نکلے اس وقت فوج جس سرحد تک پہنچ چکی ہو وہاں مجھے دفن کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے (علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کو ایک سفر میں) جہاں حضرت ابو ایوبؓ کی قبر ہے وہاں پہنچایا۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس بحری جنگ میں Order تھا امیر معاویہ کا اور جو شریک لوگ تھے ان میں یزید بھی تھا اور "حضرت حسین" بھی تھے "ابو ایوب انصاری" بھی تھے بلکہ "حضرت عبداللہ بن عمر" جو حضرت عمر کے بیٹے ہیں جو بہت بڑے آدمی تھے وہ بھی تھے تو اس وقت ایسا کوئی واقعہ سننے میں نہیں آیا تھا کہ جی یزید ایسا ہے یا ایسا ہے۔ اب اگر اس کا کردار بعد میں ظاہر ہوا تو اسکی وجہ سے کیا ہم سب صحابہ کے بارے میں بدگمانی کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ کیا امیر معاویہ کی شان میں بے ادبی کر سکتے ہیں؟ (سامعین: نہیں) کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان میں کوئی بات کہہ سکتے ہیں (سامعین: نہیں) ہمارا کام اپنے ساتھیوں کے ایمان کو بچانا ہے اور اس کی ہم دعوت دے رہے ہیں۔ کہ اپنے ایمان کو بچاؤ، صحابہ کرام وہ طبقہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود کہہ گئے تھے کہ ان کے خلاف زبان نہ کھولنا

اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم غرضا من بعدی

(ترمذی کتاب المناقب)

میرے بعد میرے صحابہ کو کبھی انتقام کا نشانہ نہ بنانا من احبھم جس نے ان سے پیار کیا وہ ان کے لئے نہیں میری نسبت سے کیا اور جس نے ان سے بغض کیا وہ ان کے لئے نہیں اس نے مجھ سے بغض کیا۔ اس لئے ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ ہماری زبانیں صحابہ کے بارے میں جب کھلیں گی تو ان کی نیکی کے بارے میں کھلیں گیں، اعتراض کی شکل میں نہیں۔ تو صحابہ پر اعتراض کرنا اور ان پر انگلی اٹھانا حرام ہے عقائد کی کتابوں میں یہ جملے ہیں

جس کا حاصل میں اپنی زبان میں کہتا ہوں نکف السنتنا عن ذکر الصحابة الا بخير [1] تو صحابہ وہ طبقہ ہیں کہ ان کے بارے میں جب بھی زبان کھلے تو اچھائی کے ساتھ کھلے۔ یہ نہ کہو کہ اس نے یہ کیا اس نے یہ کیا اس نے یہ کیا۔

یزید کے کردار کے متعلق حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو علم غیب نہیں تھا

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد مقرر کرنے کے بارے میں پکا عقیدہ رکھو کہ علم غیب خاصہ باری تعالی ہے۔ امیر معاویہ کو قطعاً غیب کا علم نہیں تھا کہ وہ یہ جانتے تھے کہ یزید کا کردار بعد میں کیا ہو گا! اور میں یزید کی اس بات پر کہ اس نے "ابن زیاد" کو عراق کا گورنر بنا کر بھیجا اور خود وہاں شام میں ہی بیٹھا رہا، حالانکہ یہ رشتے میں آپس میں کزن تھے۔ حضرت حسین کی ایک نظر پڑتی تو اس پر بڑا انقلاب آجاتا لیکن یہ گیا ہی نہیں اور اسے اس کے والد نے جو نصیحت کی تھی، کیا اس نے اسے مانا؟ (سامعین: نہیں) تو ہم یزید کے کردار پر حضرت معاویہ کی شان میں کوئی بے ادبی نہیں کرتے۔

تاہم حضرت امیر معاویہ شام میں فوت ہو گئے تو اعلان ہو گیا کہ یزید جانشین بنا ہے۔ لیکن اسلامی سلطنت کے صوبے اور بھی تو تھے، مصر پر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مقرر تھے اور حجاز جو کہ مدینہ ہے یہ بھی فاصلے پر تھا، اور عراق کا صوبہ یہ بھی فاصلے پر تھا۔

تو یزید کی خلافت کی یا امارت کی یا حکومت کی جو بیعت تھی وہ ابھی شام میں ہی ہوئی تھی۔ اب جب تک اس کی بیعت مصر میں نہ ہو جائے، حجاز میں نہ ہو، عراق میں نہ ہو، اس وقت تک اس کی حکومت پوری سلطنت اسلامی پر نہ سمجھی جا سکتی تھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد Interim Period

میں اس دور کے لئے ایک لفظ بولتا ہوں جس کی تشریح پھر اگلی مجلس میں ہو گی۔ وہ ہے "عبوری دور"۔ جسے "Interim period" کہا جاتا ہے صحیح طور پر، قانونی طور پر یزید کی حکومت کب قائم ہو گی؟ جب سارے صوبے اپنی اپنی جگہ بیعت کر لیں، سارے

(1) حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ "الفقہ الاکبر" میں ارشاد فرماتے ہیں:
ولا نذكر احدا من اصحاب رسول الله الا بخير (ص:37، طبع لاہور)

صوبے مان لیں۔ تو ابھی یزید کو مصر والوں نے مانا نہیں تھا (پھر انہوں نے ہی پہل کر دی ماننے میں) حجاز والوں نے بھی نہیں مانا، عراق والوں نے نہیں مانا، تو اس دور کو کیا کہتے ہیں؟ عبوری دور۔ سو اس عبوری دور میں صوبوں کو اختلاف کا حق تھا یا نہیں؟ عبوری دور میں اختلاف ہو سکتا ہے یا نہیں؟

نواصب کو جواب: حضرت حسینؑ نے ہجرت عبوری دور میں کی

حضرت حسین نے جو اختلاف کیا، وہ کب کیا؟ عبوری دور میں۔ جو مؤرخ یہ بیان کرتے ہیں کہ Established Government کہ جب گورنمنٹ قائم ہو جائے اور سربراہ مسلمان ہو تو وہ کتنا غلط کیوں نہ چلے کسی کو اس سے لڑنے کا حق نہیں، یہ ہماری قانونِ اسلامی کی کتابوں میں ہے کہ جو مسلمان سربراہ جب تک مسلمان ہے یا جب تک وہ کفر کی بات نہ کرے، تو کتنے بھی غلط کام نہ کر لے، تم اس کے خلاف بغاوت نہیں کر سکتے۔ تو حضرت حسین کو بدنام کرنے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ جی سربراہ مقرر ہو گیا تھا، اور وہ تھا بھی تو مسلمان! کافر تو نہیں تھا! تو اس کے خلاف حضرت حسین نکلے کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نہیں نکلے۔ وہ نکلنا، بغاوت ہوتا ہے جو Established Government کے وقت ہو، اور یہاں تو ابھی یزید کی حکومت اسٹیبلش ہی نہیں ہوئی تھی،

All over The Muslim world had not accepted him in all the Provinces. That time is regarded as an Interim period.

تو عبوری دور میں حضرت حسین کہاں رہتے تھے؟ (مدینہ میں)۔ تو وہاں جو گورنر تھا یزید کی طرف سے اور پہلے وہ گورنر تھا امیر معاویہ کی طرف سے۔ مدینہ میں اس نے اپنے ہاں بڑے آدمیوں کی اولاد کو بلایا۔ جن میں حضرت حسین بھی گئے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہ بھی گئے، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی گئے اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات گئے۔ تو گورنر نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون" امیر المؤمنین حضرت معاویہ وفات پا گئے ہیں۔ جس پر سب نے پڑھا "انا للہ وانا الیہ راجعون" تو اس نے کہا کہ میں اب نئی حکومت کی طرف سے آپ کو دعوت دیتا ہوں، آپ کو کہتا ہوں کہ آپ اس حکومت کا اقرار کریں۔

Give me your oath of allegiance to the center Government.

آپ سب سینٹر گورنمنٹ سے وفداری کا میرے ساتھ اقرار کریں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر بغاوت کا الزام لگانے والوں کی یہ سوچ غلط ہے

اب حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر کہا کہ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دیں. تو حضرت حسین نے انکار کیا؟ "نہیں"۔ کیوں؟ عبوری دور تھا تو عبوری دور میں سوچنے کا حق ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر بغاوت کا الزام لگانے والے اپنی سوچ میں کمزور اور غلط ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ہر گز اسٹیبلش گورنمنٹ کے خلاف خروج نہیں کیا۔ کیونکہ اسٹیبلش گورنمنٹ کا حکمران کیسا بھی ہو، اسلام میں اس کے خلاف نکلنا جائز نہیں اگر وہ مسلمان ہو۔ میں اس کے لئے ایک حدیث پڑھتا ہوں ترجمہ بھی شاید نہ کر سکوں کیوں کہ وقت زیادہ ہو گیا ہے:

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ قَالَ: إِنَّهُ يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ، فَتَعْرِفُونَ وَتُنْكِرُونَ، فَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ بَرِئَ، وَمَنْ أَنْكَرَ فَقَدْ سَلِمَ، وَلَكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، أَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: «لَا، مَا صَلَّوْا»، أَيْ مَنْ كَرِهَ بِقَلْبِهِ وَأَنْكَرَ بِقَلْبِهِ. (صحیح مسلم بَابُ وُجُوبِ الْإِنْكَارِ عَلَى الْأُمَرَاءِ)

اور صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں یہ ہے کہ مسلمانو! تم پر ایسے بھی حکمران آجائیں گے کہ وہ میرے طریقے پر نہ چلیں گے اور نہ میری سنت کی پیروی کریں گے قلوبھم قلوب الشیاطین فی جثمان انس[1] کہ ایسے لوگ بھی حکمران بنیں گے کہ جن کے بدن تو انسانی ہوں گے لیکن دل شیطانی ہوں گے۔ لیکن جب تک ان کا کفر ثابت نہ ہو کہ کافر ہیں اس وقت تک انکے فسق کی وجہ سے تم نے ان کے مقابلے میں نہیں آنا۔

صحابہ نے عرض کی حضرت جو ایسے حکمران آئیں گے کہ ان میں کچھ باتیں اسلام کی ہوں گی اور غلط بھی، کیا ان سے قتال نہ کریں؟ فرمایا لا ما صلوا جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں، نماز اور ایمان پر ہوں، تو برا سے برا بھی ہو تو تم نے بغاوت نہیں کرنی۔ یہ

(1) صحیح مسلم، ج:2، ص127، باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظہور الفتن۔

حضور ﷺ نے تعلیم دی تھی۔

تاہم حضرت حسین نے بغاوت نہیں کی۔ اس کے لئے میں یہاں سے بات شروع کرتا ہوں۔ کہ پیغام آیا شام سے اور گورنر حجاز نے بڑے لوگوں کی جو اولادیں تھیں ان کو طلب کیا اور کہا کہ تم وفاء کا عہد کرو تو حضرت حسین نے کیا کہا؟ کہ "ہمیں غور کرنے کا موقع دو" تو کیا انہوں نے انکار کیا؟(سامعین: نہیں)۔ تو پھر وہ راتوں رات آگے نکلے ہیں اور وہاں انہوں نے انکار نہیں کیا۔ غور و فکر کے لئے وقت مانگا۔

حضرت حسین جنگ کے لئے نہ نکلے تھے

سامعین! ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے مقابلے کے لئے نکلتے تو "خود سوچو" کہ پھر مدینہ کی جو حکومت تھی وہ انہیں نکلنے دیتی؟ پھر وہاں جو گورنر بیٹھا تھا، وہ وہی تھا جو یزید کی طرف سے اسکی بیعت کی دعوت دے رہا تھا۔ تو یہاں غور کریں کہ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مقابلے کے لئے نکلتے تو کیا یہ گورنر انہیں نکلنے دیتا؟؟ کیا خیال ہے؟ تو کیا کربلا یہیں نہ لگ جاتی، جو وہاں لگنی تھی؟! تو یہ بات یاد رکھیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہرگز یہ کہہ کر نہیں نکلے کہ میں مقابلے کے لئے نکل رہا ہوں۔

پھر آگے یہ بات کہ وہ یہاں سے نکلے کیوں تھے؟ تو وہ اس لیے کہ یہ "عبوری دور" تھا جس میں انہوں نے کہا کہ ہم غور کریں گے۔ سو حضرت حسین کا ارادہ تھا کہ وہ عراق جائیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب اپنے دورِ خلافت میں عراق تشریف لائے تھے تو آپ کے ساتھ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی اپنے والد کے ساتھ آئے تھے۔ اس لیے یہاں ان کے دوست احباب تھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ میں ان لوگوں میں پہنچ کر پھر ان سے بھی مشورہ کروں کہ اب ان حالات میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ لہٰذا حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب مدینہ سے نکلے تھے تو وہ مقابلے کے لئے نہیں نکلے تھے۔ اگر آپ مقابلے کے لئے نکلے ہوتے تو مدینہ میں جو گورنر تھا کیا وہ خود وہاں ان کو نہ روک لیتا؟! اور پھر جو بات کربلا میں ہونی تھی وہ یہیں ہو جاتی۔

حسینی قافلہ جب مدینے سے چلا

بہر حال اب یہ حسینی قافلہ چلا۔ ع

ریگِ عراق منتظر کشتِ حجاز، تشنہ کام
خون حسین بازدہ کوفہ و شام خویش را

(شام کی سیاست اور عراق کے حالات پر ذرا غور کرنا ہے) تو یہ حسینی قافلہ چلا ہے، پھر آگے جا کر کربلا میں جو ہوا، سو ہوا۔ تو یہ مضمون تو آگے چلے گا۔

میں نے آپ کو مدینہ کے اس ماحول تک پہنچا دیا جب حسینی قافلہ رات کو وہاں سے چلا تھا، دو باتیں میں نے کہہ دی ہیں کہ انہوں نے گورنر حجاز کے سامنے انکار نہیں کیا، حضرت حسین نے کہا مجھے سوچنے کا موقع دیں، تو اس کا حاصل کیا ہے؟ کہ انہوں نے اسے عبوری دور سمجھا ہے، Established Period نہیں سمجھا۔ گورنمنٹ جب اسٹیبلش ہوتی ہے تو پھر مسلم سربراہ کے خلاف خروج جائز نہیں، جب سارے علاقے مان لیں تو پھر اس پر مزید غور کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

حضور ﷺ اور ابو بکر کی طرح اب دونوں کے نواسے بھی اکٹھے رہے

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جب کہا گیا، تو انہوں نے بھی قبول نہیں کیا۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کون ہیں؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نواسے، اور حضرت حسین کون ہیں؟ "حضور کے نواسے"۔ جس طرح حضور ﷺ اور ابو بکرؓ ہر بات میں اکھٹے رہے [1] اس طرح ان دو حضرات کے "نواسے بھی اس میدان میں انکار پر اکھٹے رہے" حسین رضی اللہ عنہ نواسہ رسول ﷺ اور عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نواسۂ ابو بکرؓ۔

اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہاں سے راتوں رات چلے اور چلتے ہوئے آپ کو خیال آیا کہ میں اپنے چچا کے بیٹے مسلم بن عقیل کو عراق بھیجتا ہوں۔ عقیل کون تھے؟ "ابو طالب کے بیٹے"۔ تو عقیل کا بیٹا مسلم حضرت حسین کا چچا زاد بھائی (کزن) تھا۔ سو آپ نے مسلم بن عقیل کو آگے بھیجا کہ پہلے جا کر عراق کے لوگوں کو یہ خبر کر دے کہ میں آرہا ہوں اور اگر

---

(1) اصحاب ذوق اور ارباب شوق اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری رحمہ اللہ کی مایہ ناز تصنیف "نبیؐ و صدیقؓ" کی مراجعت فرمائیں۔

اعتدال ہو، فساد نہ ہو، کوئی جنگ کا میدان نہ ہو، خون ریزی کا کوئی اندیشہ نہ ہو پھر تو ہم پہنچ کر کوئی فیصلہ کریں گے، کوئی مشورہ کریں گے لیکن اگر حالات خراب ہو گئے تو پھر ہم اور سوچیں گے، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل کو بھیجا تو پھر اس قافلے پر کیا گزری اور اس قافلے کو راستے میں کہاں روک دیا گیا۔ پھر آگے وہ سارا واقعہ ہے۔

اہل بیت کی محبت جزو ایمان ہے

اب تک میں نے آپ کے سامنے جو کچھ بیان کیا، اس میں ایک بات ضرور یاد رکھیں کہ سارے سانحہ محرم میں آپ کے دل حضرت حسینؓ کے ساتھ ہونے چاہیں۔ کیونکہ اہل بیت کی محبت جزو ایمان ہے۔ اور اہل بیت کے بارے میں کوئی بے ادبی کا تصور بھی آئے تو آدمی سنی نہیں رہ سکتا، اہل سنت سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر یاد رکھیں اور اسے کبھی نہ بھولیں۔

اہل بیت کے بارے میں ایک چھوٹی سی مثال دے کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ ایک بہت بڑے بزرگ صحابی گزرے ہیں، جن کا نام حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہے۔ آپ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ میں نے پہلے انکا ذکر کیا تھا کہ یہ بڑے علم کے پہاڑ تھے۔ آپ ایک دفعہ حج کے موقع پر تھے (ابھی ابھی لوگ چونکہ حج سے آئے ہیں تو میں نے سوچا کہ حج کی بات پر ہی آج کی مجلس ختم کرتا ہوں) کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے مسئلہ پوچھا کہ حضرت حج میں جب احرام باندھا ہوا ہو اور سوتے سوتے یا جاگتے ہاتھ میں اگر "جوں" آجائے۔ "جوں" سمجھتے ہیں؟ پنجابی لوگ تو سمجھتے ہیں کہ یہ سر میں، بالوں میں آجاتی ہیں۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے جب مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر احرام کی حالت میں کوئی "جوں" قابو آجائے تو اسکو مارنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ احرام کی حالت میں کسی جاندار کو مارنا جائز نہیں۔ احرام کی حالت میں کوئی جانور بھی ذبح نہیں کر سکتا۔ تو احرام کی حالت بڑی نازک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مسئلہ پوچھا کہ احرام کی حالت میں "جوں" مارنی جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور اس سائل کو کہا کہ تو ہے کون؟ یعنی کہاں سے آیا ہے؟ کیونکہ حج کے موقع پر جب

لوگ ملتے ہیں تو پہلا سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ تو ہے کس ملک کا؟ تو آپ نے پوچھا کہ تو ہے کون؟ اس نے کہا میں "عراق کا ہوں" تو آپ نے کہا "اے اہل عراق! میں حیران ہوں کہ پیغمبر کے نواسے کو مارتے ہوئے تو تمہیں یہ خیال نہ آیا کہ عبداللہ بن عمر سے مسئلہ پوچھوں اور[1] "جوں" کے مارنے کا مسئلہ پوچھنے آگئے ہو؟ "جوں" کا مسئلہ لے آئے ہو اور پیغمبر کے نواسے پر تم نے جو ظلم کیا اس وقت تو تمہیں یہ خیال نہ آیا؟ اس سے پتہ چلا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ گو سیاسی آدمی نہیں تھے مگر ان کا بھی یہ جواب بتا رہا ہے کہ انکے دلوں میں عظمت اور محبت کس کی تھی؟ "حضرت حسین کی"۔ سو جس کے دل میں حضرت حسین کی محبت نہ بس رہی ہو کیا وہ یہ جواب دے سکتا ہے؟

تو ابن عمر رضی اللہ عنہ کا جواب یہ عقیدہ بتاتا ہے کہ اہل بیت کی عظمت، حسین رضی اللہ عنہ کی شان، اور اس خاندان کا مقام بہت اونچا ہے۔ اور ابن عمر کا یہ ان سے اس محبت کا تعلق ہے۔

اب کیا پتا آپ کہیں گے، یہ تو آپ نے اپنی ساری تقریر کا ہی رد کر دیا، کیوں کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ قیادت کن کو دینی چاہیے؟ "اہل کو،" خونی رشتوں کو تو نہیں؟ میں نے کہا تھا نا؟ (سامعین: جی کہا تھا) تو آپ کہیں گے کہ اب آپ اخیر میں اس کے الٹ آگئے کہ اہل بیت کی محبت جو ہے وہ اس رشتے میں ہے، خونی رشتے میں ہے؟ تو آپ نے تو اپنی ساری تقریر کا رد کر دیا؟ سو ایسا نہیں ہے۔ الحمد للہ میں نے اہل بیت کے لئے یہ نہیں مانگا کہ انکو قیادت دو، بلکہ میں نے انکے لئے مانگا ہے کہ انکو محبت دو۔۔۔ محبت،

- جو قیادت ہے وہ راشدین کی ہے
- قیادت حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی ہے

---

(1) حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ، حَدَّثَنَا مَهْدِيٌّ، حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي يَعْقُوبَ، عَنِ ابْنِ أَبِي نُعْمٍ، قَالَ: كُنْتُ شَاهِدًا لِابْنِ عُمَرَ، وَسَأَلَهُ رَجُلٌ عَنْ دَمِ البَعُوضِ، فَقَالَ: مِمَّنْ أَنْتَ؟ فَقَالَ: مِنْ أَهْلِ العِرَاقِ، قَالَ: انْظُرُوا إِلَى هَذَا، يَسْأَلُنِي عَنْ دَمِ البَعُوضِ، وَقَدْ قَتَلُوا ابْنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَسَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا۔

(صحیح بخاری، كِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ رَحْمَةِ الوَلَدِ وَتَقْبِيلِهِ وَمُعَانَقَتِهِ: 5994)

 ملکوں کو آگے بڑھانا معاویہ رضی اللہ عنہ کی شان ہے

ملکوں کو سنبھالنا اور ان کو بڑھانا معاویہ کی شان ہے، ان سب کی اہلیت کا ہم اقرار کرتے ہیں لیکن میں نے جو سوال کیا، وہ یہ ہے کہ میں نے آپ حضرات سے اہل بیت کے متعلق محبت کی اپیل کی ہے۔ کیونکہ جس کے دل میں اہل بیت کی محبت نہیں وہ صحیح ایمان اور عقیدہ پر نہیں۔ تو بھائی محبت تو مانگی جاسکتی ہے خونی رشتوں پر یا نہیں؟ تو اسلئے اصول یاد رکھو اسلام کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ ؏

اسلام ما اطاعت خلفائے راشدین

ایمان ما محبتِ الِ محمد است

ملک کس طرح چلانے ہیں؟ نظام کس طرح چلانا ہے؟ "اسلام ما" کیا ہے؟ وہ اطاعت ہے کہ "خلفائے راشدین" کے جو فیصلے ہیں امت انہی پر چلے گی، ملک اسی پر چلیں گے، سلطنت اسی پر چلے گی جو راشدین کی راہ تھی۔ ؏ اسلام ما اطاعت خلفائے راشدین اور ایمان ما محبت ال محمد است۔ اور ایمان کیا ہے؟ ہم نے بیشتر دفعہ اپنی تقریروں میں، خطبوں میں، آپ کے سامنے یہ وعظ ہی کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو، آپ سنتے ہیں یا نہیں؟ اور اس میں ہم یہ بھی تو کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونی چاہیے:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ۔۔۔ (1)

کوئی اس وقت تک مومن کامل نہیں ہو سکتا، جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے بڑھ کر، سب سے زیادہ محبت نہ ہو۔ تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مانتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں اور آپ کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت کرنے کو مومن ہونا مانتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں۔

ہم اہل سنت راشدین کی اطاعت مانتے ہیں اور اہل بیت کی محبت بھی مانتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ صحیح عقیدے پر رکھے۔ کیا؟ کہ اطاعت ہے راشدین کی، سیاست ہے ان کی جو اس کے اہل ہوں اور محبت ہے اس رشتے کی جو حضورؐ کے رشتے کے قریب ہوں جو اہل بیت کرام ہیں۔ حضور اکرمؐ کا کہیں بال مبارک بھی ملے تو اس کی عزت اور تعظیم چاہیے۔

---

1 صحیح بخاری، ج:1، کتاب الایمان۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی آخری وصیت

حضور اکرم ﷺ کا کہیں بال مبارک بھی ملے تو اس کی عزت اور تعظیم کرنی چاہیے۔ بات ختم کرتا ہوں کہ حضرت معاویہ کا جب آخری وقت آیا تو نصیحت تو کر دی کہ اب ملک کو کس طرح چلانا ہے لیکن اب اپنے کفن دفن کے بارے میں کہا کہ جب مجھے غسل دے کر کفن پہنا چکو، تو ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے ناخن تراشے تھے تو وہ ناخن میں نے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ تو وہ مبارک ناخن میری آنکھوں پر لگا دینا کہ اب معاویہ جو ہے وہ اللہ کے حضور جارہا ہے۔ چالیس سال تک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیاست تھی۔ بیس سال بطور گورنر کے اور بیس سال بطور خلیفہ اموی کے ۔تو آپ نے کہا کہ میری آنکھوں میں یہ حضور ﷺ کے ناخن مبارک رکھ دینا تو ان کی حضور ﷺ سے اتنی عقیدت و محبت رشتہ رسالت کی وجہ سے تھی۔

تو اہل بیت کے لئے ہم آپ سے محبت مانگتے ہیں، عقیدت مانگتے ہیں۔ کتنا عرصہ شاہی مسجد لاہور میں تاریخی امانتوں میں حضور ﷺ کے موئے مبارک رکھے رہے اور لوگ زیارت کے لئے سالہا سال تک وہاں جاتے رہے۔ تو جس چیز کی نسبت حضور ﷺ سے ہو جائے، اس کی عزت ہے یا نہیں؟ بالکل عزت ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ جن بالوں کی نسبت ہو گئی ان کی بھی محبت اور عزت ہے، جن ناخن کی نسبت ہو گئی ان کی بھی محبت اور عزت ہے۔ سو جب انکے ناخن مبارک اور بال مبارک کی اتنی عقیدت ہے تو پھر ان کے صحابہ واہل بیت کی کتنی عزت اور محبت ہو گی؟ کہ جو ان کے ساتھ بحر و بر میں دوڑے، صحراؤں میں بھی دوڑے، پھر سمندروں میں بھی دوڑے، خالد بن ولید صحراؤں میں دوڑے اور معاویہ بحری جنگوں میں دوڑے۔

اماتنا اللہ علی ھذہ العقیدۃ، اللہ جل شانہ اسی عقیدے پر رکھے۔

وما علینا الا البلاغ



ساتویں رات (مجلس 7)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ اَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ
اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ (پ5 النساء 58)
صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

قیادت کے انتخاب میں قانون الٰہی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دین کو جس پر ہم ہیں، جس کا نام دین اسلام ہے، اسے دین فطرت بنایا ہے۔ اور اس دنیا کے معاملات اللہ تعالی نے اس طرح چاہے ہیں، کہ فطرت کے اصولوں کے مطابق ہوں۔ اب آپ نے یا ہم نے یا مسلمانوں نے جب کسی مرحلے میں اپنے سیاسی رہنما کو چننا ہو اور کہا جائے کہ "تم اپنے سیاسی رہنماء" کو چنو، تو آپ ہی خود سوچیں کہ کیا یہ فیصلہ کسی شخص کے صرف نیک ہونے پر کریں گے کہ وہ تہجد خواں ہے، وہ ہر وقت روزے رکھنے والا ہے، یعنی صائم الدہر ہے۔ یا عقلِ انسانی تقاضا کرے گی کہ وہ اس کا اہل بھی ہو کہ کس طرح معاملات کو طے کرنا ہے اور اس انسان میں کیا کیا وصف ہونے چاہیں، تو انسان کو اس میں سبق کیا حاصل ہوا؟، کہ اس کو "عدل کرنے کا سلیقہ ہو" دولت کی صحیح تقسیم کرنا آئے، رعیت کے حقوق ادا کرپائے، تو اس کو کہتے ہیں، یہ اہل ہے۔

اب نبی پاک ﷺ نے اپنی جانشینی کے لئے جو معیار رکھا وہ وہی ہو سکتا ہے جو دین فطرت کے مطابق ہو، تو میں نے آپ کے سامنے یہ بات واضح کی تھی، کہ چاروں خلفائے راشدین جب اپنا اپنا کام کر چکے، اور خلافت راشدہ کی برکتیں، اس کے اثرات اور اس کے ثمرات لوگوں نے آنکھوں دیکھے، اس کے بعد یعنی خلافت راشدہ کے بعد یہ نظام کن کے

ہاتھ میں آیا؟ پچھلی مجلس میں بتایا گیا تھا کہ ”حضرت امیر معاویہ کے ہاتھ میں آیا“۔ تو امیر معاویہ کی ایک اپنی تاریخ ہے، جو میں نے آپ کے سامنے کسی درجہ میں بیان کر دی تھی، تو اب میں اس بات کی طرف جانا چاہتا ہوں، کہ امیر معاویہ کے دور میں امت مسلمہ کے سیاسی Stage کا نیا رخ کیا تھا؟

حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں مسلمانوں کا نیا سیاسی موڑ

نیا رخ یہ تھا کہ مسلمان اب سمندر میں اتریں، اور بحری جنگوں کی تیاری کریں، خالد بن ولید اور سعد بن ابی وقاص جیسے لوگ صحراء عرب میں اپنے گھوڑے دوڑا چکے، اور اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے، اب جو اگلا Level تھا اس کے بارے میں، میں نے عرض کیا تھا، کہ وہ بحری جنگوں کا اہتمام تھا، تو آپ اس بات کو یاد رکھیں، کہ اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں یہ موڑ کہاں سے شروع کیا؟، کہ اب یہ بری معرکوں میں ہی نہ رہیں، بلکہ بحری بیڑے تیار کریں اور سمندروں میں اتریں، تاکہ دنیا کے کناروں تک پہنچ سکیں، تو تاریخ اسلام میں بحری بیڑے کی ابتدا کس نے کی؟، سب سے پہلے یہ خیال آیا حضرت معاویہ کو۔ انہوں نے امیر المؤمنین، امام المتقین، خلیفہ راشد حضرت عثمان سے عرض کیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں، میں نے آپ کو بتایا تھا، کہ بڑھاپے میں بھی ان کی رگوں میں جوانوں کا خون تھا سو آپ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آگے بڑھو۔

پہلا بحری بیڑا اور حضرت امیر معاویہؓ کا سفر

تو امیر معاویہ نے پہلا بحری بیڑا تیار کیا، اور اس میں وہ خود بھی گئے اور جب امیر معاویہ کی اپنی حکومت تھی تو قسطنطنیہ کی طرف بیڑا روانہ کیا، اب جب حضرت امیر معاویہ نے بحری جنگ کا آغاز کیا، تو میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ صرف انکی اپنی طبع نہ تھی، ان کی اپنی طبیعت کا یہ تقاضا نہ تھا، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب جو میں نے کل بیان کیا تھا تو اس خواب سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ کے اقدامات کو اور ان کے آگے بڑھنے کو، ان کی

Advancement کو، حضور ﷺ اپنی اور اسلام کی Advancement سمجھ رہے تھے، ورنہ وہ خواب ام حرام رضی اللہ عنہا والا نہ ہوتا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس خواب کو صحیح بخاری جلد اول صفحہ 504 پر اور صفحہ 410 پر اور اس کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر اسے نقل کیا ہے۔

اس بات پر میں نے اپنی پچھلی مجلس میں بات ختم کی تھی۔ کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد اپنا کوئی جانشین طے کرنا تھا، تو حضرت کی نظر اسی پر تھی، کہ اب وہی آگے آئے جنہوں نے بحری مشقیں کیں ہوں، تاکہ جو پوری طرح ملک کی سرحدوں کو سنبھال سکے۔ تو انہوں نے اسوقت جو صحابہ ان کے قریب تھے، جیسے "مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ" وغیرہ، ان سے انہوں نے مشورہ کیا، انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ بحری جنگوں میں یزید بڑا تربیت یافتہ ہے، اس نے بڑی ٹریننگ لی ہے۔ تو انکے جواب میں امیر معاویہ نے پہلا عذر یہ کیا، کہ بھائی "وہ تو میرا بیٹا ہے" تو ہم اس نظام کو ملوکیت میں بدلنا نہیں چاہتے۔

خلافت کا مفہوم

یہ نظام خلافت کا آرہا ہے، خلافت کا معنی کیا ہے؟، جو حضرات عربی جانتے ہیں وہ بتائیں گے کہ خلافت کا معنی ہے "پیچھے لگنا" خلف کہتے ہیں "بیٹے کو" وہ اسی لیے کہ وہ باپ کے پیچھے آتا ہے، جو جانشینی کا تصور ہے اسی کی پیش نظر یہ بات ذہن میں رکھیے، کہ خلافت کا معنی "پیچھے لگنا" مثلاً "ابو بکر صدیق" جب خلیفہ ہوئے، تو وہ "مطلق العنان خلیفہ" تھے یا حضور ﷺ کی تابعداری میں خلیفہ تھے؟، "حضور کی تابعداری" میں خلیفہ تھے، تو خلیفہ ہے ہی وہ جو تابعدار ہو، اللہ نے جب کہا تھا

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (پ:1، البقرہ:30)

جب تخلیق آدم کا ارادہ فرمایا، تو یہ کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں نائب بنانے والا ہوں، تو نائب کا کیا معنی؟ کہ جو میرے پیچھے چلے، تو جو اللہ کے حکم کے ماتحت ہو، اس کے پیچھے چلے، "ہدایات ربانیہ" کے تحت وہ آگے چلے، اسکو تو کہیں گے کہ اللہ کا نائب ہے، اللہ کا خلیفہ ہے "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" ہم ابو بکر و عمر کو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ

خلیفہ رسول ہیں یعنی ان کے پیچھے چلنے والے ہیں، خلافت کا "معنی پیچھے چلنا" ہی ہے۔[1]

مسئلہ خلافت و امامت

تو اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد "خلافت" قائم ہوئی۔ حضور کی خلافت قائم ہونی چاہیے، اور وہ قائم ہوئی تو خلافت کا کیا معنی رہا؟ "پیچھے لگنا تو خلافت کا معنی ہے پیچھے لگنا، غور کیجئے "خلافت کا معنی ہے پیچھے لگنا" اور امامت کا معنی "آگے ہونا" ابھی آپ نے نماز پڑھی تو جو امام ہے وہ آگے ہے یا پیچھے ہے؟ "آگے" تو خلافت کا معنی "پیچھے ہونا" اور امامت کا معنی "آگے"۔ اہل سنت والجماعت کا بنیادی عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ کے بعد "خلافت" ہے، لیکن جو ناقدین صحابہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ خلافت نہیں "امامت" ہے۔ اور اس طرح یہ بارہ اماموں کی امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں، کہ حضور ﷺ کے بعد امامت ہے۔[2]

تاہم حضور ﷺ کے بعد پیچھے لگنا یہ کن کا عقیدہ ہے؟، اہل سنت وجماعت کا۔ اور "آگے لگنا" یہ ہمارا عقیدہ نہیں۔ تو آپ یہ بات ذہن میں رکھیں، کہ حضور ﷺ کے بعد خلافت ہے یا امامت ہے؟ (سامعین: خلافت) بھائی میری بات نہ مانو لیکن قرآن کی تو مانو، قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (پ:18، النور:55)[3]

---

(1) خلافت کے موضوع پر ہم مجلس 3 میں اہل سنت کا مؤقف پیش کر آئے ہیں۔

(2) امامت کے موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کی کتاب "شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم" اور "تجلیات آفتاب" جلد اول، از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی مراجعت فرمائیں۔

(3) آیت استخلاف پر تفصیلی مطالعہ کے لیے امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ کی مایہ ناز کتاب "تفسیر آیات خلافت و امامت" حضرت مولانا قاضی کرم الدین دبیر رحمہ اللہ کا علمی شاہکار "آفتاب ہدایت" اور استاذنا المکرم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی کتابِ لاجواب "تجلیاتِ آفتاب" جلد اول کی مراجعت فرمائیں۔

ترجمہ: وعدہ کر لیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں انہوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کر دے گا انکو ملک میں (ترجمہ شیخ الہند)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اس پیغمبر کے بعد خلافت ہو گی، تو نبی کے بعد خلافت ہو گی، یہ ہے ایک عقیدہ۔ اور ان کے بعد امامت ہو گی، یہ ہے دوسرا عقیدہ۔ حضرت ابو بکرؓ ہوں یا حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ ہوں یا حضرت علیؓ، یہ سب حضور ﷺ کے ماتحت تھے۔ اور یہ سب حضور ﷺ کے خلیفہ ہوئے۔ حضور ﷺ خود اپنی امت کے بھی امام ہیں اور تمام پہلے نبیوں کے بھی امام ہیں۔ سو یہ بات سمجھ میں آگئی؟ (سامعین: جی بالکل سمجھ آگئی)۔

تمام خلفائے راشدین حضور ﷺ کے ماتحت تھے

آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ خلافت کا یا امامت کا؟ (سامعین: خلافت کا) کہ بڑے سے بڑے بھی ہوں، اور حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے کون بڑا ہو گا۔ وہ بھی ماتحت ہیں مطلق العنان نہیں۔ باقی حضرت عثمان و علی کے بارے میں بھی ہم یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ بھی ماتحت ہیں۔ اور حضور ﷺ کے اسی طرح تابع ہیں جس طرح حضرت ابو بکر و عمر تھے، اور حضرت علی کا تو یہ مقام ہے کہ جب وہ خلیفہ بنے اسوقت بھی آپ نے اپنے آپ کو "چوتھا خلیفہ" کہا ہے، نہ کہ آپ نے کہیں اپنے اول خلیفہ ہونے کا اعلان کیا۔ سو یہ غلط بات ہے جو لوگ کہتے ہیں، کہ جی حضرت علی جب خلیفہ ہوئے، تو وہ خلیفہ بلا فصل ہوئے۔ بھائی جس کے بارے میں تم کہتے ہو وہ خود تو اپنے بارے میں خلیفہ "بلا فصل" کہتے نہیں۔

خلیفہ بلا فصل کون؟

بلا فصل کا معنی ہے کہ جس میں فاصلہ کوئی نہ ہو۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان کتنے خلیفوں کا فاصلہ تھا؟ "تین کا"۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان کتنے خلیفوں کا فاصلہ ہے؟ "دو کا"۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں اور حضور ﷺ میں کتنے خلیفوں کا فاصلہ ہے؟ "ایک کا"۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ میں کوئی فاصلہ نہیں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بلا فصل خلیفہ ہوئے ہیں۔

تو بات یہ ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ کی حکومت اور خلافت تقریباً "ساڑھے چار سال رہی" تو ساڑھے چار سال ان کا اپنا دعوی، ان کا اپنا مؤقف، اپنے بارے میں کیا تھا؟، کہ "میں چوتھا خلیفہ ہوں"۔ اور تاریخ سے ایسی کوئی قوی شہادت نہیں ملتی، کہ انہوں نے اپنے آپ کو کہیں پہلا خلیفہ کہا ہو۔[1]

---

(1) مزید یہاں ہم اس موضوع کی مناسبت سے حضرت علامہ صاحب کی ایک اور تحریر بھی نقل کیے دیتے ہیں:

رسالت کے بعد بغاوت یا خلافت

قرآن کریم کا اعلان

اللہ تعالیٰ عہد رسالت کے مسلمانوں کو حضور اکرم ﷺ کا جانشین بنائے گا۔

(دیکھیے، پارہ: 18، سورۃ النور: 55)

اہل سنت والجماعت کا اعتقاد ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے بعد خلافت بلا فصل قائم ہوئی۔ رسالت اور خلافت کے درمیان کوئی دور بغاوت نہیں آیا۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد چاروں خلیفہ بلا فصل ایک دوسرے کے جانشین ہوئے اور حضور اکرم ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک خلافت مسلسل پہنچی۔ حضرت علی حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے بعد بلا فصل خلافت پر آئے۔

شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ عہد رسالت کے بعد 24 سال تک بغاوت رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت 24 سال کے فصل سے قائم ہوئی۔ اہل سنت کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پہلی تین خلافتوں سے مسلسل اور بلا فصل تھی۔ شیعہ اعتقاد یہ ہے:

عہد رسالت	عہد بغاوت	عہد خلافت
23 سال	24 سال	اور 6 سال

اب آپ خود فیصلہ کریں کہ قرآن کریم میں رسالت کے بعد بغاوت کی خبر دی گئی ہے یا خلافت کا وعدہ کیا گیا ہے؟ اگر قرآن کریم میں خلافت موعود ہے تو پھر حق پر اہل سنت ہیں اور حضور اکرم ﷺ سے بلا فصل خلافت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی ہے۔

فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ

(پارہ: 7، سورۃ الانعام: 81)

(معیار صحابیت: 303)

نظام تراویح اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسے جاری رکھنا

درمیاں میں ایک واقعہ یاد آگیا۔ اسے ذرا سمجھنے کی کوشش کریں، کہ تراویح کا نظام کیا ہے؟، تراویح کا موجودہ نظام یہ ہے کہ یہ "پورا مہینہ جماعت" کے ساتھ پڑھی جائے، یعنی پورا مہینہ انتیس کا ہو یا تیس کا، ان میں سے جو بھی ہو۔

نمازِ تراویح جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھی جائے، یہ نظام کب سے قائم ہوا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پورا مہینہ تراویح کی جماعت مسجد میں نہیں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین رات نماز تراویح پڑہائی اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا کہ اتنی پابندی سے جو ہم پڑھ رہے ہیں، تو کہیں یہ نماز فرض ہی نہ ہو جائے (لوگوں کے لئے تو آج چار، چھ پڑھنی ہی مشکل ہو گئی ہیں)۔ "اب تک تراویح فرض نہیں"۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اس کی نماز کروانی چھوڑ دی، تاکہ میرے اشتیاق میں، رمضان کی شوق عبادت میں جب مسلمان آئیں اور مسجد بھر جائے، تو اللہ کو بھی یہ ادا اتنی پسند آجائے گی، کہ کہیں اس کے فرض ہونے کا حکم ہی نہ آجائے، تو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت چمکی، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اب گھر سے نہیں نکلے، آپ گھر میں ہی پڑہتے رہے۔ کچھ صحابہ گھروں میں پڑھتے رہے اور کچھ مسجد میں اپنے اپنے طور پہ پڑھتے رہے۔ لیکن یہ جو پورا مہینہ شوکت ہے، آپ بتائیں جو تاریخ سے واقف ہیں کہ یہ پورا مہینہ مسجد میں ایک ہی جماعت کے ساتھ پڑھنا، پورا رمضان جماعت کا ہونا، یہ مسجد کی آب و تاب، یہ چمک و رونق کب ہوئی؟ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں"۔ حضرت عمر کی عظمت کو، ان کی شان کو ہم عقیدت کا سلام کرتے ہیں، ان کے دم سے یہ ہوا۔ تو جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر جرح کرتے ہیں، اور تراویح کے بارے میں بھی کہتے ہیں، کہ انہوں نے تراویح کیوں جاری کی، تو اگر کوئی پوچھے کہ انہوں نے تراویح کیوں جاری کی جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سارا مہینہ، تراویح جماعت سے نہیں پڑھی گئی، تو آپ اس کا جواب "نہ دیں"۔ بعض اوقات ہر سوال پر جواب نہیں دیا جاتا بلکہ سوال پر سوال کیا جاتا ہے۔

میں طالبعلموں کو کہا کرتا ہوں، کہ جب کوئی تم سے سوال کرے، کہ حضرت عمر نے

سارا مہینہ تراویح جماعت کے ساتھ مسجد میں کیوں جاری کی؟، یہ سوال کیا جائے، تو اس سے الٹا سوال کرو، کہ ہمارا سوال یہ ہے کہ حضرت علی جب خلیفہ راشد ہوئے، توانہوں نے سارا مہینہ پڑھی جانے والی نمازِ تراویح کیوں بند نہ کی؟، وہ پوچھیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاری کیوں کی؟، تو ہم کہتے ہیں کہ تم بتاؤ کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، اور وہ خلیفہ راشد تھے، یہ تینوں خلفاء ثلاثہ تو جنت کی ٹھنڈی نیند سو رہے تھے، اسوقت پورے عالم اسلام میں، اور پورے سطح خلافت میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اونچا کوئی نہیں تھا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عمل کو بند کیوں نہ کیا؟ اس بات کے پیچھے نہ پڑو کہ اِنہوں نے جاری کیوں کیں؟! سوال یہ ہے کہ انہوں نے بند کیوں نہ کیں!! ہر سوال کا جواب نہیں دیا جاتا، بلکہ پتا ہے اسے پنجابی میں کیا کہتے ہیں؟، جو لوگ پنجابی ہیں وہ اس بات کو سمجھتے ہیں دوسرے نہ سمجھ سکیں گے، انو کہندے نے نہلے تے دہلا، کوئی نیلے وچ گل کرے تے دیلا مارو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیوں جاری کی؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیوں بند نہ کیں؟

اذانِ جمعہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا فہم قرآن

ایک بات کہتا ہوں کہ پہلے جمعہ کی اذان کس طرح ہوتی تھی؟ جمعہ کی اذان اسی طرح ہوتی تھی جس طرح مسجدوں میں اور اذانیں ہوتی ہیں، مسجد کے اوپر بلندی میں اور باہر، جمعہ کی اذان اس طرح ہوتی تھی کہ جمعہ کی جب آذان ہو جائے تو اب آؤ نماز کی طرف:

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ (پ28 الجمعہ:9)

جب جمعہ کے دن اذان ہو جائے تو اس کے بعد کاروبار کرنا جائز نہیں رہتا۔ شروع کے دور میں کاروبار کو چھوڑنا آسان تھا، کوئی بڑی بڑی فیکٹریاں نہیں تھیں، لیکن آج جو فیکٹریاں دن رات چلتی ہیں، اور فیکٹریوں کے مالکوں کو احساس ہوتا ہے کہ ایک گھنٹے میں اتنا نقصان ہو گا، اتنے گھنٹوں میں اتنے پاؤنڈ جاتے ہیں، مالک ساتھ ساتھ شمار کر رہے ہوتے ہیں۔ تو آج کل جمعہ کی خاطر ان چلتی فیکٹریوں کو کوئی آسانی سے چھوڑنے کیلئے تیار ہو گا جو پاؤنڈ اگلتی ہیں؟!

حضرت عثمان غنی نے اپنے دور میں دیکھا کہ اب مسلمان بڑی تعداد میں ہو گئے ہیں،

تو انہوں نے کہا کہ جو اذان باہر ہوتی ہے "جمعہ کی" اس کو اندر لے آؤ، اور جس وقت امام ممبر پر خطبہ پڑھنے کے لئے آجائے تو اسوقت جمعہ کی اذان دی جائے تاکہ خطبہ کے فوراً بعد جماعت ہو، تو اس طرح جلدی ہو گی تو جلدی لوگ آجائیں گے، تاکہ لوگ اذان کے بعد حرام سے بچ سکیں، اذان کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ (پ28، الجمعہ:9)

ترجمہ: جب اذان ہو نماز کی جمعہ کے دن تو دوڑو اللہ کی یاد کو اور چھوڑ دو خرید و فروخت (ترجمہ شیخ الہند)

"فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ" اللہ کی عبادت کی طرف اور فرمایا "وَذَرُوا الْبَیْعَ" (کاروبار چھوڑ دو) تو اللہ کہے قرآن میں "وَذَرُوا الْبَیْعَ" تو پھر دکانیں جاری رہیں گی؟ نہیں، بلکہ دکانیں بند ہونی چاہیں۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا ذہن کہاں پہنچا، کہ اب امت کی کثرت ہو گئی ہے، کاروبار کی ضرورت ہے، لوگوں کے کاروبار کو بند کرنے کے وہ حق میں نہیں، تو انہوں نے یہ کہا، کہ پھر اذان پہلے ہو ہی نہ، بلکہ اسوقت ہو جب امام ممبر پر آجائے۔ یہاں اس پر سوال ابھرتا تھا "کہ لوگوں کو معلوم کس طرح ہو" کہ یہاں جمعہ کی نماز ہوتی ہے، وہ تو جمعہ کی اذان سے پہلے کوئی اعلان ہو؟ تو فرمایا (صحابہ کے مشورے سے) کہ وہ "ایک اور اذان دے دو" تو جمعہ کی اذانیں اب تک کتنی ہو رہی ہیں؟ "دو ہی" اب یہ کب سے شروع ہوئی ہیں؟ حضرت عثمان کے دور سے۔ حضرت عثمان نے سارے صحابہ کے ساتھ مل کر یہ کیا، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کو شکل دی کہ سارا مہینہ پڑھی جائے اور اس پر سب صحابہ کا اتفاق ہوا اور کسی ایک نے بھی ان سے اختلاف نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جمعہ کی اذانیں "دو" ہوں، تو جو اصل اذان ہے وہ باہر سے اندر لائی گئی، اور باہر کی صدا اس لئے لائی گئی تاکہ لوگوں کو پتہ ہو، کہ اس مسجد میں اذان ہوتی ہے، نماز ہوتی ہے، جمعہ ہوتا ہے، کیوں؟

اس لئے کہ جمعہ ہوتا ہے شہروں میں، دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا۔ نمازِ جمعہ بڑی

مسجدوں میں ہوتا ہے، کیوں کہ جمعہ کی شان ہے "جمعیت" کہ سب اکھٹے ہوں، یعنی جمع ہوں۔ دوسری نمازیں جماعت کے ساتھ چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی ہوسکتی ہیں، پر جمعہ کی شان یہ ہے کہ یہ ایک شان کے ساتھ بڑی جگہ پر ہو۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کتنی اذانیں کر دیں؟ "دو"۔ اور اس پر بھی کسی ایک صحابی کا اختلاف منقول نہیں۔

حضرت علی نے اپنے دور میں تراویح بند کیوں نہ کیں؟

مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ انڈیا میں انگریزوں کے آنے سے پہلے بھی مغلوں کی حکومت تھی۔ اس میں ایک بادشاہ کا نام آپ نے سنا ہوگا "جہانگیر"۔ تو جہانگیر کی ملکہ محترمہ نورجہاں ایران سے آئی ہوئی تھی۔ اس نے جہانگیر کو کہا کہ ہندوستان میں بڑے بڑے علماء ہیں، تو ہمارے عقیدہ کا بھی کوئی عالم ایران سے منگوالو (تو اس زمانے میں بھی یہی تھا کہ بیوی کی بات کو رد کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا) تو جہانگیر نے کہا ٹھیک ہے تو ایک شیعہ عالم "قاضی نوراللہ شوستری" ہندوستان میں آیا، یہ شیعوں کا بڑا مولوی تھا۔ اسے انڈیا میں بلایا گیا۔ اس کی قبر بھی آگرہ میں ہے۔ تو اسنے یہاں آکر ایک کتاب لکھی اور ممکن ہے ایران میں لکھی ہو۔ کتاب کا نام "مجالس المومنین" ہے۔ تو مجالس المومنین میں اس نے اس سوال کو نقل کیا، کہ لوگ پوچھتے ہیں، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تراویح (جو پورا مہینہ پھیلی ہوئی ہے) اور جمعہ کی دو اذانیں (یہ دو اعمال) بند کیوں نہیں کیے؟ تو ایران میں تو یہ صدا لگتی تھی، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ اول ہیں، لیکن تاریخ بتاتی تھی کہ نہیں وہ "چوتھے" ہیں، خلافت پر اتفاق ہے، صرف یہ کہ وہ چوتھے ہیں یا پہلے ہیں، تو قاضی نوراللہ شوستری نے جو اس کا جواب دیا، کہ تم یہ پوچھتے ہو کہ حضرت علی جو ہیں وہ اگر اپنے اختیار سے خلیفہ علی الاطلاق تھے، خلیفہ اول تھے، تو انہوں نے بند کیوں نہ کیے؟، تو قاضی نوراللہ شوستری نے اس کے جواب میں جو لکھا ہے، وہ بڑے سنہری الفاظ سے لکھنے کے لائق ہے، اور تاریخ نے یہ شہادت محفوظ کر لی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت علی کے دور میں بھی حال یہ تھا، کہ حضرت ابوبکر و عمر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے:

"حضرت امیر در ایام خلافت خود دید کہ اکثر مردم حسن سیرت ابوبکر و عمر را

معتقد اند وایشاں رابر حق مے دانند قدرت بر آں نداشت کہ کارے کند کہ دلالت بر فساد خلافت ایشاں داشتہ باشد۔۔۔ اکثر اھل آں زمان رااعتقاد بود کہ امامت حضرت امیر مبنی بر امامت ایشاں است وفساد امامت ایشاں رادلیل فساد امامت او مے دانند" (مجالس المومنین جلد 1 ص 54)

ترجمہ: حضرت علی نے اپنے دور خلافت میں دیکھا کہ لوگ بڑی کثرت سے حضرت ابو بکر و عمر کے حسن سیرت کے معتقد ہیں اور انہیں خلفائے حق مانتے ہیں سو آپ اس پر قادر نہ تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جس سے پتہ چلے کہ ان کی خلافت حق نہ تھی۔۔ اس زمانے کے اکثر لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت علی کی خلافت انہی کی خلافت پر مبنی ہے اور اگر ابو بکر و عمر کی خلافت کو غلط سمجھا جائے تو اس سے حضرت علی کی خلافت بھی غلط سمجھی جائے گی۔

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما گو دنیا سے جا چکے، اور آخرت میں اپنے خیمے لگا چکے، لیکن لوگوں کے دلوں پر ابھی تک ان کا قبضہ ہے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ باوجود خلیفہ ہونے کے، استطاعت نہ رکھتے تھے، کہ کوئی ایسا کام کریں کہ جس سے پتہ چلے کہ یہ علی الاطلاق خلیفہ اول نہیں۔ اسی لئے حضرت علی نے ساری عمر وہی پالیسی اختیار کی جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے چلی آرہی تھی، اس لیے اگر حضرت علی کوئی ایسی بات کرتے جو حضرت ابو بکر وعمر کے خلاف ہو، سارے سمجھتے کہ اگر انکی خلافت صحیح نہیں، تو پھر ان کی بھی صحیح نہیں۔ تو حضرت علی کا اپنا اعتقاد تھا، کہ جو لوگ پہلے سے جو کچھ مانتے چلے آرہے ہیں، میں اگر ان کے خلاف کوئی بات کروں گا، تو لوگ میری خلافت بھی نہیں مانیں گے۔ مجالس المومنین اب بھی ایران اور ہندوستان سے چھپی ہوئی ملتی ہے ۔اور میرے (حضرت علامہ صاحب کے) پاس بھی موجود ہے، اس میں یہ ارشاد ہے کہ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے دیکھا، کہ:

اکثر اہل آں زمان رااعتقاد بود کہ امامت حضرت امیر مبنی بر امامت ایشاں است وفساد امامت ایشاں رادلیل فساد امامت او مے دانند

(مجالس المومنین جلد 1 ص 54)

کہ اس وقت کے اکثر لوگوں کا یہی اعتقاد تھا، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پہلی تین خلافتوں پر مبنی ہے۔ تو پھر حضرت علی مرتضی کے بارے میں صحیح عقیدہ کیا ہے؟ کہ وہ چوتھے ہیں یا پہلے؟ "وہ چوتھے خلیفہ ہیں" تو حضرت علی اپنے دور حکومت میں بھی انہیں پہلوں کے ساتھ رہے، اور کوئی نئی بات نہ ہوئی،[1] اور جب حضرت علی شہید ہوئے، تو قوم

(1) ہو سکتا ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک روایت ملتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیرت شیخین کی پابندی کی بات کی تو آپ نے انکار کر دیا۔ اس سوال کے جواب کے لیے اور اس روایت کی حیثیت جاننے کے لیے حضرت علامہ صاحب کی ایک تحریر نقل کی جاتی ہے:

جواباً گزارش ہے کہ یہ روایت غلط ہے اور شیعہ کی ایجاد ہے۔ اس میں ابو مخنف ایک راوی ہے جو مذہباً شیعہ تھا اور کچھ اور غیر معروف نام ہیں جو ان لوگوں نے ایسی روایات کے لئے گھڑ رکھے ہیں۔ جیسے سالم بن جنادہ، سلیمان بن عبد العزیز بن ابی ثابت، اور نہیں کہا جا سکتا یہ کون لوگ تھے اور کیسے رواۃ تھے سو اس قسم کی روایات کو وزن دے کر تاریخ کے ان یقینی واقعات کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا جن میں حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دل سے اپنا بزرگ اور پیشوا مانا ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

عن رجال لا یعرفون ان علیا قال لعبد الرحمن بن عوف الی غیر ذلك من الاخبار المخالفة لما ثبت فی الصحاح فهی مردودة علی قائلیها و ناقلیها

(البدایہ)

ترجمہ: ان لوگوں سے جن کا پتہ ہی نہیں مروی ہے کہ حضرت علی نے حضرت عبد الرحمن بن عوف کو کہا ہم سے دھوکا کیا گیا ہے۔۔۔ اس قسم کی اور روایات بھی ہیں جو ان روایات سے جو صحیح ہیں ٹکرا رہی ہیں سو انہیں ان کے قائلین اور ناقلین پر ہی لوٹا یا جائے گا، قبول نہ کیا جائے گا۔

اگر کوئی ایسی روایات ہوں بھی تو دوسرے شواہد کی روشنی میں اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ نے ایسی بات بطور انکساری کہی ہو گی کہ کہاں میں اور کہاں حضرت ابو بکر و عمر کی عزیمتیں، میں تو ان کی سیرت پر نہ چل سکوں گا۔ ایسے موقع پر اگر کہیں کوئی اقرار بھی کرے تو متواضع لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ہاں اپنی ہمت کے مطابق ہم کوشش ضرور کریں

گے۔ طبری کی ایک روایت میں یہ پیرایہ بیان بھی ملتا ہے حضرت عبد الرحمن بن عوف نے آپ کو کہا:

علیك عهد الله و میثاقه لتعلمن بكتاب الله و سنته رسوله و سیرة الخلیفتین من بعده۔

ترجمہ: آپ پر خدا کا عہد اور اقرار ہے کہ کتاب اللہ اس کے رسول بر حق کے جو دو جانشین ہوئے ان کی سیرت پر چلیں گے۔

اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ارجو ان افعل و اعمل بمبلغ علمی و طاقتی (طبری، ج:5، ص:37)

ترجمہ: میں امید کرتا ہوں کہ کر سکوں گا اور اپنے علم اور عزیمت کی حد تک اس پر عمل کر سکوں گا۔

کیا یہ روایت اس بات کی تائید نہیں کرتی کہ اگر کہیں آپ سے انکار بھی منقول ہو تو وہ محض ایک انکساری اور تواضع کی وجہ سے ہو گا اور اس تشریح سے ان روایات کے ساتھ تطبیق بھی ہو جاتی ہے جن میں آپ کا اقرار پیروی موجود ہے۔

پھر اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت علی جب خلیفہ بنے تو انہوں نے اس وقت ان تمام شرطوں کا اقرار کیا تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد خلافت کے وقت ان سے لی گئی تھیں اگر وہ ذہنی طور پر سیرت شیخین سے جدا ہوتے تو اس اگلے وقت میں وہ اس کا اقرار کیوں کرتے، شریف رضی نقل کرتا ہے کہ آپ نے اپنی خلافت کے اثبات میں ایک یہ بات بھی کہی تھی:

بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوهم علیه (نہج البلاغہ)

ترجمہ: میری بیعت ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کی بیعت کی تھی اور انہی شرطوں پر انہوں نے میری بیعت کی ہے جو شرطیں انکی بیعت کے وقت ان سے لی گئی تھیں۔

جب آپ کی خلافت ان تمام شرطوں سے وجود میں آئی جو حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کی خلافتوں کے وقت لی گئیں تو پھر آپ سیرت شیخین کی اصولی رہنمائی سے کس

طرح اپنے آپ کو نکال سکتے تھے۔

پھر حضرت حسن نے جب زمام خلافت حضرت امیر معاویہ کے ہاتھ میں دی تو کیا انہوں نے اس سے یہ اقرار نہ لیا کہ وہ اپنی حکومت کتاب و سنت اور خلفائے راشدین کے طریق پر چلائیں گے (دیکھیے، حبیب سیر، ج:2، ص:14، کشف الغمہ)

کیا یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت حسن اس شرط کو عقد خلافت میں لا رہے ہوں جس سے ان کے والد مرحوم کے عقد خلافت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہیں اس سے انکار بھی کیا ہو تو وہ محض انکساری اور تواضع کے طور پر ہو گا کہ ان حضرات کی سیرتیں اور عزتیں اور کہاں میں۔

سو جن لوگوں نے انکار کو انکساری اور تواضع سے ہٹا کر اس کی بناء ذہنی مخالفت اور قلبی عداوت پر رکھی ہے وہ تحقیق کے میدان کے لوگ نہیں ان کے دلوں میں ایک آگ ہے جو مختلف پیرایوں میں ایسی موضوع روایات کے سہارے بھڑکتی رہتی ہے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

یتوھم کثیر من الرافضه و اغبیاء القصاص الذی لا تمیز عندھم بین صحیح الاخبار و ضعیفها و مستقیمها و سقیمها (البدایہ)

ترجمہ: (اس قسم کی باتیں) ان رافضیوں اور غبی قصہ خوانوں کا وہم ہے جو صحیح و ضعیف خبروں میں تمیز نہیں رکھتے اور ثابت اور کمزور باتوں میں فرق نہیں کر سکتے۔

پھر اس احتمال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا قدم ولایت میں بہت راسخ تھا، اصل تصوف کے تین سلسلے قادری، چشتی اور سہروردی انہی سے جاری بتلائے جاتے ہیں سو یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ آپ اہل کشف میں سے بھی ہوں گے گو یہ ضروری نہیں کہ وقت کے تمام سیاسی حقائق آپ پر مکشوف ہوئے ہوں سو اگر یہ تکوینی راز آپ پر کھل گیا ہو کہ آپ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی طرح مدینہ منورہ میں نہیں کوفہ میں رہیں گے یا ساری قلمرو اسلامی کو آپ متحد نہ رکھ سکیں گے اور اس انکشاف پر آپ نے کہہ دیا ہو کہ سیرت شیخین پر عمل کیسے کر سکوں گا کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اور یہ بات عملاً بھی صحیح ہے کہ آپ مدینہ کو اپنا دارالحکومت نہ رکھ سکے تھے جو خلفائے ثلاثہ کا دارالحکومت تھا۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ آپ حضرت عمر کے فضائل بیان کرتے ہوئے یہ بات صراحت سے کہتے تھے کہ آپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر چلے ہیں سو یہ بات اگر خود ان کے ہاں عیب ہوتی تو وہ اسے فضائل عمر رضی اللہ عنہ میں کیوں ذکر کرتے، ایک دن آپ منبر پر تشریف لائے اور فرمایا:

قبض رسول الله صلی الله علیه وسلم واستخلف ابوبکر فعمل بعمله و سار بسیرته حتیٰ قبضه الله علی ذلك ثم استخلف عمر فعمل بعملهما و سار بسیرتهما حتی قبضه الله علی ذلك

(مسند احمد، ج:1، ص:128، مجمع الزوائد، ج:5، ص:176)

ترجمہ: آنحضرت کی وفات ہوئی اور حضرت ابو بکر خلیفہ بنائے گئے تو آپ حضور کے ہی عمل پر چلے اور آپ کی سیرت پر عمل پیرا ہوئے یہاں تک کہ اللہ تعالی نے آپ کو وفات دی پھر حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو آپ بھی اپنے ان دوستوں پیشرووں کی سیرت پر چلتے رہے یہاں تک کہ آپ کو اللہ تعالی نے اسی عمل پر وفات دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کس طرح سیرت عمر پر چلے:

شریک حضرت زبیر سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

کان علی یشبه بعمر یعنی فی السیرة

(کتاب الخراج لیحیی بن آدم (203ھ) ص:24)

سب حضرات جانتے ہیں کہ کوفہ چھاؤنی حضرت عمر نہیں ہی قائم کی تھی اور یہیں حضرت علی اپنے عہد خلافت میں تشریف لے آئے تھے، آپ نے کوفہ آکر ان تمام باتوں کو بحال رکھا جو حضرت عمر کی قائم کردہ تھیں، کیا یہ صریح طور پر حضرت عمر کی سیرت کی پابندی نہیں؟ اور پھر اس کی حد بندی کوفہ تک نہ تھی آپ نے اسے ایک اصول کے طور پر قبول فرمایا۔۔۔۔۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ بڑی شدت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی پالیسیوں کو اپنائے ہوئے تھے۔ اپنی سیرت و کردار میں آپ کی یہی کوشش ہوتی کہ جہاں تک ہو سکے کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ سیرت شیخین کی بھی پابندی کرتے رہیں اور اب یہ کوئی نظریاتی بات نہ رہی تھی جس میں اقرار و انکار کے احتمالات موجود ہوں، یہ بات اب واقعات میں جلوہ گر تھی کہ آپ عملاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا پیشرو اور پیشوا سمجھتے تھے۔

نے ان کا جانشین حضرت حسن کو چنا، یعنی عراق میں، کس کو؟ حضرت حسن کو۔

حضرت حسن کا امیر معاویہ سے اتحاد

حضرت حسن نے مسلمانوں کو پھر سے ایک کرنے کے لئے، امیر معاویہ کے ساتھ عہد کیا، اور اپنی حکومت جو ان کے پاس تھی، وہ بھی ان کو دے دی، یعنی امیر معاویہ کو دے دی، اور شرط یہ لگائی کہ:

"یہ معاہدہ جو حسن بن علی بن ابی طالب اور معاویہ بن ابی سفیان کے ساتھ ہو رہا ہے (اس طرح ہے) کہ وہ اپنی خلافت اپنی مملکت اپنی حکومت، اپنی سلطنت سپرد کرے امیر معاویہ کے، بشرطیکہ امیر معاویہ عہد کرے، کہ میں خلفائے صالحین کی سیرت پر چلوں گا (کشف الغمہ جلد 2، ص 45)

تو حضرت حسن نے جو کہا کہ "خلفائے صالحین کی سیرت" تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کیا اعلان کر دیا؟ انہوں نے بھی راشدین کے بارے میں، پہلے خلیفوں کو ماننے کیلئے وہی روایت اختیار کی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اختیار کی تھی، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کس کے پیچھے؟ حضرت علی کے پیچھے۔ حضرت علی نے جب اپنے آپ کو چوتھا سمجھا، تو حضرت حسن کا کیا عقیدہ ہو گا؟، وہ بھی یہی کہ "حضرت علی چوتھے ہیں"۔ اور جب حضرت حسن نے حکومت حضرت امیر معاویہ کو دے دی، تو امیر معاویہ "بیس سال" حکمران رہے۔ حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما جو پہلے عراق میں رہتے تھے، کیوں کہ ان کے والد محترم حضرت علی کا اپنا دورِ خلافت یہاں ہی گزرا تھا۔ سو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب حکومت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو دے دی، تو اب ان دونوں بھائیوں نے عراق کی رہائش ترک کر دی، اور یہ دونوں بزرگ پھر اپنے نانا کے شہر مدینہ میں آگئے، چونکہ جو سکون اور راحت "مدینہ" میں تھی وہ

اور یہ بات درست نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ نے حضرت عبد الرحمن بن عوف کے سامنے سیرت شیخین کی پابندی قبول کرنے سے انکار کیا تھا، یہ بات شیعہ راویوں کی روایت ہے جو صحیح نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ آپ کی بیعت انہی شرطوں پر کی گئی تھی جو شرطیں آپ کے پیشرووں سے لی گئی تھیں۔ (خلفائے راشدین، ج:1، ص:363-359)

کہیں اور نہ تھی۔ تو ان دونوں کا یہاں آنا وہ کس لیے تھا؟، وہ اسلئے تھا کہ علی الاعلان حسی طور پر یہ چیز آشکار ہو جائے، کہ معاویہ کو حکومت جو ہم نے دی ہے وہ دل سے دی ہے، اطمینان سے دی ہے، سکون سے دی ہے، کسی مجبوری کے تحت نہیں دی، اور پھر جو لوگ میرے والد کو عراق میں تنگ کرنے والے تھے، ان سے جان چھڑا کر ہم یہاں آگئے ہیں۔ اب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب انکو حکومت دے دی، تو مسلمان پھر ایک ہو گئے۔

حضرت حسن کی شہادت

اب جب مسلمان پھر سے ایک ہو گئے تو یہ بات منافقین کے لئے برداشت کرنی بڑی مشکل تھی۔ تاہم حضرت حسن شہید ہو گئے، کسی مفسد نے ان کو زہر دے دیا، تو مفسدین نے یہ بات پھیلائی کہ انکو زہر حضرت امیر معاویہ نے دلوایا ہے۔

بھائی ذرا غور کرو! کہ سیاسی لوگوں کی طلب کیا ہوتی ہے؟ کہ سیاست ہمارے ہاتھ میں آئے، اور جب امام حسن رضی اللہ عنہ نے خود حکومت انکو خود دے دی، تو کوئی زہر دلوانے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟ (سامعین: نہیں) زہر دلوانا ہوتا تو اسوقت دلواتے، جب وہ عراق میں تھے۔ اور اب جب وہ مدینہ میں آگئے اور حکومت کے مذاکرات انہوں نے قبول کر لیے، اور مسلمانوں کا جھنڈا ایک ہو گیا، عالم اسلام ایک ہو گیا، ان میں اتحاد ہو گیا، تو کیا اب زہر دینا تھا؟ بھائی جس کے بارے میں تم بھی کہتے ہو، اور سارے لوگ کہتے ہیں کہ سیاست میں حضرت معاویہ کی سوچ بہت اونچی تھی تو انہیں اتنا پتہ نہ چلا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟! [1]

حضرت حسین کا حضرت حسن کی شہادت کے بعد بھی مدینہ میں قیام رہا

تاہم میں آپ کی توجہ اس طرف دلاتا ہوں۔ ذرا غور سے سنیں! کہ اگر واقعہ یہی بات ہوتی، کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے زہر دلوایا ہے، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اسوقت بھی مدینہ میں رہ سکتے تھے؟ کیا حضرت حسین، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کے احکام کے تحت "قسطنطنیہ" کی جنگ میں جا سکتے تھے؟ حضرت حسن و

(1) اس موضوع پر مجلس 5 میں سرخی "حضرت حسنؓ کی شہادت اور امیر معاویہؓ سے حضرت حسینؓ کے تعلقات" کے ذیل میں دیئے گئے حاشیہ کی مراجعت فرمائیں۔

حسین رضی اللہ عنہما حقیقی بھائی ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اپنی ایک شان اور مقام ہے، جو اپنی جگہ مسلم ہے اور آپ کا ہر عمل بھی آپ کے نام کی طرح حسن تھا۔ تو اگر حضرت امیر معاویہ نے زہر دلوایا تھا، تو کیا اسی وقت حضرت امیر معاویہ کی حکومت کے خلاف اٹھنا حضرت حسین کے لئے ضروری نہیں تھا؟ کیا عقل یہ تقاضا نہیں کرتی؟ جو واقعہ (کربلا) اب پیش آیا کہ یزید کے سامنے آنے پر وہ مدینہ سے چلے کربلا کی طرف پہنچے، تو اگر زہر والا معاملہ ایسے ہی ہوتا کہ اس میں امیر معاویہ کا ہاتھ ہے، اگر اس کہانی اور واقعہ میں کچھ بھی صدق ہوتا، تو کربلا اسی وقت قائم ہو جاتی جب حضرت حسن شہید ہوئے تھے۔

آپ کی عقل کیا کہتی ہے؟ بھائی یہ واقعہ اسی وقت ہو جاتا کہ نہیں؟! لیکن کیا ایسے ہوا؟ (سامعین: نہیں) تو پتہ چلا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو تو اطمینان تھا کہ کوئی ایسی بات نہیں، لیکن یہاں جو لوگ کہتے ہیں کہ جی زہر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دلوایا تھا، تو ہم کہتے ہیں کہ جی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کیوں معلوم نہ ہوا، کہ زہر حضرت معاویہ نے دلوایا ہے؟! اور پھر یہ کہ وہ رہے بھی ساتھ ہی، تو اللہ تعالی کسی کی سمجھ نہ مار دے۔ لوگ بات کو بالکل ہی نہیں سمجھتے۔ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کہاں رہے؟ وہیں مدینہ میں رہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا نقطہ نظر

اب حضرت معاویہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ حکومت پر آگے وہی آئے جو قوم کو آگے لگا سکے، ان کا خیال تھا جو بری جنگوں کے ساتھ ساتھ بحری جنگیں بھی لڑ سکے اور قوم کو لڑا سکے۔ تو اس وقت یزید سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہوا تھا کہ جس کی بنا پر وہ امامت کے لائق نہ ہوتا، اب جو بھی اس کا کردار ظاہر ہوا وہ حضرت امیر معاویہ کی وفات کے بعد ظاہر ہوا، لیکن کئی روایات وضع لکھی گئی ہیں کہ وہ ایسا تھا، یا ایسا تھا۔۔۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے اوپر جو الزام لگنا تھا، وہ یہی تھا کہ کربلا کا واقعہ ہوا۔ تو بھائی کربلا کے واقعہ کی وجہ سے تم اس کو ظالم کہو، لیکن یہ جو حکایتیں اور یہ جو کہانیاں بنائی ہوئی ہیں، ان میں کیا جان ہے۔

ہم اہل سنت والجماعت حسینی ہیں

تو میں نے کل، پچھلی مجلس میں بتادیا تھا کہ ہم اہل سنت حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے بڑے لوگوں کی طرح، اپنے دلی جذبات اور عقیدت کے ساتھ، حضرت حسین کے ساتھ ہیں۔

میں اس کی مثال دیتا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جب ارادہ کیا کہ اب میں یہاں سے عراق جاؤں کیونکہ یزید حکمران بنا ہے اور میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتا، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جب یہ ارادہ کیا کہ میں عراق واپس چلا جاؤں، تو انکو یہ مشورہ دینے کے لئے کہ آپ وہاں نہ جائیں، پانچ عبد اللہ سامنے آئے۔ تو ایک ہی عبد اللہ یعنی اللہ کا بندہ کافی ہوتا ہے تو یہاں پانچ عبد اللہ آئے، کون کون سے؟ مثلاً

- عبد اللہ بن عمر
- عبد اللہ بن جعفر
- عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ
- عبد اللہ بن عباس
- عبد اللہ بن مطیع

تو پانچ عبد اللہ حضرت حسین کے پاس آئے اور کہا کہ آپ عراق نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں نے آپ کے والد محترم اور بھائی کو بہت تنگ کیا، اور انکی بڑی نافرمانی کی۔ اور اب وہ آپ کے دوست بن کر آپ کو دعوت دے رہے ہیں کہ آپ یہاں آجائیں اور اپنی رہائش یہی رکھیں۔ تو آپ (حضرت حسین رضی اللہ عنہ) وہاں نہ جائیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کوفہ کی طرف سفر کا مقصد

اب میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں، لیکن سمجھ داری سے اس کا جواب دینا ہے۔ حضرت حسین پر اللہ کی کروڑوں رحمتیں ہوں۔ آپ جب مدینہ سے نکلے، تو اگر آپ حکومت سے لڑنے کے لئے نکلتے، تو مدینہ میں جو گورنر تھا، جو پہلے امیر معاویہ کے ماتحت تھا، اب وہ یزید کے ماتحت ہے، تو کیا یہ آپ کو وہاں سے نکلنے دیتا؟؟

اس گورنر نے آپ سمیت تمام بڑے بڑے صحابہ کی اولاد کو بلایا تھا، جن میں حضرت

ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے بڑے بڑے لوگوں کی اولادیں شامل تھیں، اس گورنر نے سب کو بلا کر کہا کہ امیر المؤمنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور انہیں انکی شوری نے مشورہ دیا تھا کہ جو بحری جنگیں لڑنے کا جو ماہر ہو گا اسکو آگے کرنا ہے، تو یزید کا انتخاب ہوا تھا۔ لہذا اب آپ سب اس کی بیعت کریں۔

گورنر نے جب یہ تجویز دی، تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں کچھ سوچنے کا موقع دیں۔ تو رات کو ہی یا اگلی رات آپ نے سفر کا ارادہ کیا جس کی بحث میں، میں اس وقت نہیں جاتا۔ تاہم کچھ خطوط بھی آپ کو پہلے سے مل چکے تھے۔

اب خیال کریں، اس سوال کا جواب دینا ہے۔ بھائی کیا حکومت سو رہی تھی ؟ کہ آپ چلنے لگے ہیں اور انہیں پتہ ہی نہیں ؟! گورنر نے جب بڑے لوگوں کو بیعت لینے کے لیے بلایا تھا تو ان بڑے لوگوں میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اور آپ آئے بھی تھے۔ تو اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہاں سے لڑنے کے ارادے سے نکلے ہوں، تو کیا حکومت نکلنے دیتی ؟ کیا خیال ہے ؟ "نہیں نکلنے دیتی"۔ کیونکہ سرحدوں کو مضبوط رکھنے کے لئے فوجیں بھی تھیں، تو اکیلے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کیا کر سکتے تھے ؟ لیکن یہ حسینی قافلہ جب وہاں سے چلا ہے، تو ایک دن میں تو عراق نہیں پہنچا، اس میں راتیں بھی آئی ہوں گی، دن بھی آئے ہوں گے، تو راستے میں کسی مقام پر حکومت کے کسی کارندے نے، پولیس کے کسی دستے نے، آکر ان پر ہاتھ نہ ڈالا۔ اور اگر کوئی کچھ کرتا تو جو کچھ کربلا میں ہوا وہ یہیں نہ واقع ہو جاتا ؟، مدینہ میں نہ سہی لیکن مدینہ کی سرحدوں پر تو واقع ہو جاتا نکلتے ہی۔ آپ اندازہ کریں کہ حکومت کیا اس پر خاموشی رکھ سکتی تھی ؟ جو حکومت نے وہاں کیا، وہ یہاں نہیں ہو سکتا تھا؟ آپ کی عقل اور سمجھ کیا کہتی ہے ؟

بتا اے عقل انسانی کوئی حل اس معمے کا

یہ ایسا ہی مشکل ایک سوال ہے، کہ عقل انسانی اس کا کوئی جواب تجویز نہیں کرتی۔ ع

بتا اے عقل انسانی کوئی حل اس معمے کا
خبر کچھ اور کہتی ہے نظر کچھ اور کہتی ہے

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ لڑنے کے ارادہ سے نہیں نکلے

تاریخ کا طالب علم یہ پڑھتے پڑھتے حیران ہو جاتا ہے۔ تو اب اگر آپ اس پیچید گی سے نکلنا چاہتے ہیں، تو صاف اس بات کو مانیں کہ سیدنا حضرت حسین لڑنے کے ارادہ سے نکلے ہی نہیں۔

دوسری یہ بات ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دل کی آواز نہیں اور نہ یہ دل کی صدا ہے، کہ میں اب اپنی خلافت قائم کروں۔ جب انکو پتہ تھا کہ میرے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ اتنا عرصہ کھڑے رہے، حضرت معاویہ سے لڑتے رہے، جنگ صفین تک نوبت بھی پہنچی، لیکن پھر بھی امیر معاویہ کو اپنے پاؤں سے بدل نہ سکے، پھر امیر معاویہ بیس سال حکومت کر کے اپنے سفر آخرت پر گئے، اور پھر میرے بڑے بھائی نے بھی انکی قیادت قبول کیے رکھی۔

حُجر بن عدی

یہاں ایک بات عرض کرتا ہوں، یاد رکھیں۔ ایک شخص تھا، جس کا نام حجر ابن عدی تھا، اور بعض حُجَر ابن عدی بھی کہتے ہیں۔ اس نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو کہا، (جب انہوں نے امیر معاویہ سے صلح کرلی) کہ حضرت آپ تو بڑے اونچے بزرگ ہیں، علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں، فاطمہ رضی اللہ عنہا کی گود کے پلے ہیں، آپ کی بڑی شان اور مقام ہے، لیکن آپ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کیوں کرلی؟ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میرے بڑے ماننے والے ہیں۔ آپ حکم کریں میں یہاں لشکر جمع کر دوں گا۔ لیکن آپ معاویہ کو چھوڑیں!! حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اکسانے کے لئے کون نکلا؟ "حجر ابن عدی"۔ تو حضرت حسن نے اسے کہا (حضرت حسن بڑے آدمی تھے) کہ میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا، کہ میں نے جو معاویہ کو مانا ہے، اور اب میں اپنے عہد سے پیچھے ہٹوں، میں وعدہ توڑ کر پیچھے آؤں، اس کے لئے میرے پاس کوئی گراؤنڈ نہیں، میں تمہاری بات نہیں مان سکتا۔

پھر حجر بن عدی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، کہ آپ کے بھائی تو نرمی دکھا رہے ہے

ہیں لیکن آپ تو بڑے بہادر ہیں، ہم آپ کے پیچھے کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ حسن کو چھوڑو، آپ آگے بڑھیں، ہم آپ کے پیچھے ہیں، لیکن معاویہ کے اتحاد سے نکلو۔ حضرت حسین نے بھی وہی جواب دیا، کہ بھائی کوئی ایسی بات نہیں ہم نے جن شرطوں کے ساتھ صلح کی تھی، ہماری باتیں مانی گئیں، ہم اب اس صلح سے کس طرح نکلیں۔ (1)

اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ حجر بن عدی باوجود لبادہ زہد وعبادت کے قانون کی نظر میں مفسد تھا۔ دور اول کی شیعیت یہی تھی اور ان کا موضوع سیاست بنو امیہ اور بنو ہاشم کے اختلافات کو بڑھانا اور بنو امیہ سے نفرت پھیلانا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اس نے جنگ قادسیہ میں حصہ لیا تھا اور جنگ صفین میں حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں میں تھا لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ مفسدین میں تھا اور حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی پالیسی کو کھلے بندوں غلط کہتا اس کی ہر کوشش ہوتی کہ جس طرح بھی بن پڑے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی صلح کو سبوتاژ کیا جائے۔ تو مختصر یہ ہے کہ حجر بن عدی کے مفسد ہونے کی وجہ سے اس علاقہ کے والی نے بمع گواہوں کے اسے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا اور حضرت معاویہ نے اسے قتل کروادیا۔

حضرت حسین نے مدینہ سے روانہ ہوتے ہوئے کوئی اعلان نہیں کیا:

تاہم میں جو سوال آپ سے کر رہا ہوں، وہ یہ کہ آپ یہ بتائیں کہ جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ مدینہ سے نکلے، تو وہ اگر حکومت قائم کرنے کے لئے نکلے ہوتے یا اپنی خلافت قائم کرنے کے لئے نکلے ہوتے، کہ میں عراق جا کر اپنی حکومت قائم کروں گا، تو پھر حکومت انہیں نکلنے دیتی؟

نمبر 2: جب کوئی لڑنے کے لئے آئے تو اس کے لئے فطری تقاضا کیا ہے؟ یہ فطرت ہے کہ جب کوئی لڑنے کے لئے نکلے تو پھر وہ آواز دیتا ہے کہ بھائی آؤ میرے ساتھ، ساتھیوں کو نکالتا ہے کہ نہیں؟ (ساتھیوں کو نکالتے ہیں) ایک گشت ہی کرنا ہو تو دوستوں کو

(1) شیعہ کتاب، اخبار الطوال ص 220۔

ساتھ دینا پڑتا ہے، اور ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اعلان

میں سیرتِ نبوت پیش کرتے ہوئے کہتا ہوں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب نکلے تھے تو کس شان سے نکلے، حضرت عیسیٰ جب نکلے تو فرمایا:

مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ۔ (الصف:41)

میں اللہ کی راہ میں نکل رہا ہوں، آؤ میری مدد کرو "مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ" کون ہیں جو میری اللہ کی راہ میں مدد کریں گے۔ یہ آواز کس نے دی؟ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے)۔

قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ۚ وَاشۡہَدۡ بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۵۲﴾

(پ:3، آل عمران:52)

حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے کہا ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ تو حضرت عیسیٰ نے آواز دی تو وہ ساتھ نکلے کہ نہیں؟ اور آواز دینا کس کے ذمہ؟ جو آگے قیادت کرے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ مومنین کو جنگ کے لئے تیار کریں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب آئے، تو اللہ نے فرمایا، اے میرے پیغمبر! حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلَی الۡقِتَالِ، آپ نے جب کافروں سے لڑنا ہے، تو مومنوں کو ساتھ لیکر حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلَی الۡقِتَالِ، مومنین کو آواز دلائیں ترغیب دلائیں کہ آؤ لڑنے کے لئے۔

تو اللہ جل شانہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے کہلوائیں کہ آئیں میری مدد کریں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا کہ آپ لوگوں کو آواز دیں، حَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ عَلَی الۡقِتَالِ، تو سنت یہی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے، کہ جب لڑنے کے لئے نکلو تو ساتھیوں کو آواز دو۔
اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بیٹا اعلان جہاد کرتا تو کیا اس کے لیے کھلی آواز نہ دیتا؟

حضرت مولانا اسمعیل شہید جب وسط ہند سے نکلے اور صوبہ سرحد کے قریب مانسہرہ میں سکھوں سے لڑنے کے لئے پہنچے، تو رستے میں آواز دیتے جاتے۔ اور پھر لوگوں کے

قافلے کے قافلے ساتھ ملتے جاتے۔ تو بالا کوٹ کے مقام پر جو لوگ گئے تو وہ فوجیں پہلے پروردہ نہیں تھیں، بلکہ یہ رستے میں آواز دیتے گئے کہ ہم آرہے ہیں، آرہے ہیں۔

اب ذرا غور کریں کہ اگر اسمعیل کی آواز پر لوگوں کے قافلے رستوں میں چلتے گئے اور ساتھ ملتے گئے، تو اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بیٹا، آپ کا لعل راستے میں آواز دیتا، تو کیا دیہات کی آبادیاں، گردوپیش کی آبادیاں، ان کے ساتھ نہ اٹھتیں! انکے ساتھ نہ آملتیں؟ اور جب وہ عراق پہنچتے، گو اتنی فوجیں نہ ہوتی جتنی حکومت کے پاس ہوتیں لیکن ہزاروں انسان ہوتے کہ نہ؟

آج کے دور کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کتنے سال ہو گئے؟ چودہ صدیاں گزر چکیں۔ تو میں کہتا ہوں آج بھی خدا کا نام لیکر کوئی شخص اعلان کرے کہ ہم نکلتے ہیں، تو اس گئے گزرے دور میں، جس میں کہ بدامنی کی انتہا ہے، آج بھی اگر کوئی اعلان کرے تو ہزاروں لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ دعوت کے کام پر جب لوگ اکھٹے ہوں، تو کتنے کتنے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں، انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے، تو آج بھی اگر خدا کے نام میں اتنی تاثیر ہے، تو اگر فاطمہ کا بیٹا اسوقت آواز دیتا تو اس کے ساتھ کتنا ہجوم ہوتا!! اور ان کے مقابلے میں یزید کی حقیقت ہی کیا تھی، اس کی حقیقت سوائے اس کے کہ بڑے باپ کا بیٹا تھا کچھ بھی نہ تھی۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آواز دیتے تو آپ کا دل کیا کہتا ہے؟

معرکہ سیالکوٹ میں پاکستانی افواج کی قربانیاں

ہماری اس صدی میں کشمیر کے سلسلے میں، پاکستان اور انڈیا کی لڑائی ہو رہی تھی، اور سیالکوٹ کے محاذ پر جو فوجی لڑے وہ میرے خیال میں شاید نماز کے بھی پورے پابند نہ ہوں، لیکن جب معرکہ آیا تو انہوں نے سیالکوٹ کی سرحد پر اپنے بریگیڈیر سے کہا، کہ یہ انڈیا کے ٹینک آرہے ہیں، تو ہم آگے اپنے ٹینکوں کو نہیں لے جاتے۔ بلکہ فوج کا ایک حصہ اپنی جانیں پیش کرتا ہے کہ ٹینکوں کے نیچے ہم کچلے جائیں لیکن ان کا ٹینک ہم روک دیں گے۔ فوج کی تاریخ نے یہ شہادت یاد رکھی ہے، مجھے یاد ہے میں نے اسوقت کسی اخبار میں پڑھا تھا، کہ: ع

سیالکوٹ کے شہدا تمھارے خوں کی قسم
جلائی تم نے دوام حیات کی قندیل
تمھارے جذبہ ایمان نے کردیا ثابت
کہ اس دیار میں باقی ابھی ہیں اسماعیل
تمھارے عزم نے پندار کفر توڑ دیا
بنا کے سامنے ٹینکوں کے چھاتیوں کی فصیل

تمہارے جذبہ ایمان نے کر دیا ثابت، کہ اس دیار میں باقی ابھی ہیں اسمعیل، اسمعیل کا نام لینے والے قربانیوں کی یاد لیکر آتے ہیں، سیالکوٹ کے شہداء، جلائی تم نے حیات دوام کی قندیل، تمہارے جذبہ ایمان نے کر دیا ثابت کہ اس دیار میں باقی ابھی ہیں اسمعیل، تمہارے عزم نے کفر توڑ دیا، بنا کے سامنے ٹینکوں کے چھاتیوں کی فصیل، اگر چودھویں صدی میں یہ جذبہ موجود ہے (تو حضرت حسین کی آواز پر کیا سارا حجاز نہ اٹھ کھڑا ہوتا؟)

میدان جنگ میں بچوں کو ساتھ نہیں لے جایا جاتا۔

مسلمانوں میں اور حضور ﷺ میں پندرہ سو سال کا فاصلہ ہو چکا، حسینی قافلے کے ساتھ کیا وہاں کوئی نہ اٹھتا؟ ان لوگوں کو سمجھ ہی نہیں، کہ جو کہتے ہیں کہ حضرت حسین وہاں لڑنے کے لئے گئے، اگر لڑتے تو واقعہ جو آگے جاکر کربلا میں ہوا وہ یہیں ہو جاتا۔

اب سنیئے، حضور ﷺ کی سنت چلی آرہی ہے، راشدین کی یہ سنت چلی آرہی ہے، صحابہ کی یہ سنت چلی آرہی ہے، کہ جنگ میں نکلو تو خود عورتوں اور بچوں کو ساتھ نہ لے کر نکلو، اب بھی جو فوجی لڑتے ہیں ان کے بچے اور بیویاں پیچھے گاؤں میں ہوتے ہیں۔ جنگ میں نکلو تو خود عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیکر نہ نکلو۔ فوج کے ساتھ کیا کبھی حکومت عورتوں اور بچوں کو جانے دیتی ہے؟ ''نہیں''۔

جب میدان میں جاؤ تو بچوں اور بیویوں کو ساتھ نہیں لے جانا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب جارہے تھے تو انکی بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان کے ساتھ تھیں یا نہیں؟ انکی بیوی ساتھ تھی یا نہیں؟ چھوٹا بچہ علی اصغر ساتھ تھے یا نہیں؟ حسینی قافلہ جب جارہا تھا تو انکے ساتھ باہر

سے کوئی بھاری اکثریت ساتھ تھی؟ جب نہیں تھے تو معلوم ہوا، کہ وہ لڑنے کے لئے جا ہی نہیں رہے تھے۔

عبوری دور

راستے میں انہیں تردد ہوا، کہ جن پانچ عبد اللہ اور دیگر حضرات نے روکا تھا، ان کی بات کی مزید تصدیق کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے کزن مسلم بن عقیل کو آگے بھیج دیا کہ تم جا کر پہلے دیکھو، کہ عراق کا حال کیا ہے۔

دوسری طرف یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اس صوبہ نے یزید کو اس وقت تک قبول کر لیا تھا کہ نہیں؟ کیوں؟ میں نے پچھلی مجلس میں بتایا تھا کہ جس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے ہیں، اس وقت حکومت کی فقہی طور پر اور قانونی طور پر پوزیشن کیا تھی۔ حکومت کی اس وقت کی پوزیشن کو "عبوری دور" کہتے ہیں۔ کہ جب تک سارے صوبوں کی بیعت نہ ہو۔ اس وقت کے صوبوں میں شام تھا، مصر تھا، حجاز تھا، عراق تھا، اور مختلف علاقے تھے۔ ان سب کی بیعت اپنی اپنی جگہ ہونی تھی، تو جب تک بیعت سب کی نہ ہو، اس وقت تک خلافت قائم نہیں ہوتی۔

حضرت ابو بکر صدیق جب سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ چنے گئے۔ تو اب بس یہی نہیں کہ خلیفہ انہوں نے چن لیا ہے "نہیں" پھر آپ مسجد نبوی میں آئے اور وہاں تمام مہاجرین نے آپ کی بیعت کی۔ سو معلوم ہوا ایک ہے بیعت میں Purposel، جب منظوری ہو جائے، تو پرپوزل ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد عملی طور پر بیعت کرنی پڑتی ہے جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی۔

تاہم یزید کی گورنمنٹ اسوقت تک اسٹیبلش نہیں ہوئی تھی۔ Establish گورنمنٹ کے خلاف نکلنا، یہ ایک مسئلہ ہے، اور قانونی طور پر یہ بغاوت ہوتی ہے۔ حکمران چننے میں تو آپ کسی کی مخالفت کریں، لیکن جب گورنمنٹ Established ہو جائے، تو اسٹیبلش ہونے کے بعد اس کو توڑنا یہ جائز نہیں۔

بے نمازی حکمران

حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ تم میں ایسے لوگ ہوں گے کہ کچھ باتیں ان میں اسلام کی ہوں گی، اور کچھ اسلام کی نہیں ہوں گی۔ یہاں تک فرمایا کہ نمازیں بھی وقت پر نہیں پڑھیں گے، تو جب ایسے حکمران ہوں، کہ وہ نمازیں بھی وقت پر نہ پڑھیں، تو اس سے بڑی کوئی برائی ہے؟! کہ ہو حاکم اور نماز بھی نہ پڑھے، کہ "یمیتون الصلوۃ لوقتها[1]" کہ وہ حکمران وقت پر نمازیں نہیں پڑھیں گے، ان کا نام مسلمانوں والا ہوگا اور کچھ باتیں ان میں مسلمانوں والی نہیں ہوں گی۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا، کہ ان باتوں کو جو ناپسند کرے "من کرہ فقد سلم"[2] وہ بچ گیا، جب ایسی باتیں ہوں، اور "من رضی وتابع" جو ایسے حاکموں سے راضی ہو جائے، اور انکی پیروی کرے، آگے عرب اسلوب کے مطابق، جواب نہیں دیا کیوں کہ عربوں کا اسلوب ہے، کہ وہ حالات بتا دیتے ہیں نتیجہ نہیں، وہ سمجھنے والے خود سمجھ لیں۔

Established گورنمنٹ کے خلاف خروج

تو محدثین کہتے ہیں، کہ اسکا نتیجہ یوں ہے کہ "فقد هلك"، کہ: "من رضی وتابع فقد هلك و من کرہ فقد سلم" تو جب حضور ﷺ یہ ارشاد فرما رہے تھے، تو ایک نے پوچھا "افلا نقاتلهم یا رسول الله" کیا ہم ان سے لڑیں نہ؟ (جیسے آج کل لوگ سڑکوں پر آتے ہیں) مقابلے میں نہ آ جائیں، فرمایا "لا" یعنی اسٹیبلش گورنمنٹ کے خلاف نکلنا، اور فساد کرنا اس میں خون ریزی تو ہو گی، لیکن سچائی کا جھنڈا نہیں چمکے گا، تو یوں خون ریزی کرنا، اور دہشت گردی کرنا، اس میں بے گناہوں کا خون کتنا جائے گا، تو حضور ﷺ نے فرمایا لا، پہلے فرمایا: ستکون لکم آئمہ، لیکن پھر فرمایا کہ ان کے خلاف نہ نکلیں۔ اس سے ایک مسئلہ، اسلامی کتابوں میں فقہا نے لکھا ہے، کہ اگر مسلمان حاکم اقتدار پر آ جائے اور گورنمنٹ Establish ہو جائے، تو "ان الامام لا ینزل بالفسق" کتابوں میں لکھا

(1) صحیح مسلم، ج:1، ص:448۔

(2) شعب الایمان، ج:10، ص:11۔

ہے، کہ فسق سے وہ سلطنت سے نہیں نکلتا۔

لیکن جب کفر پر آ جائے، اور وہ اپنا عقیدہ ہی بدل لے کہ میں حضور ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا، تو اسلام سے نکل گیا۔

کیا امام حسین نے مدینہ میں بیعت سے انکار کیا؟

تو کتابوں میں لکھا ہے، کہ خلیفہ "لا ینعزل" کہ وہ فسق کی وجہ سے نکلتا نہیں، اب یزید کچھ بھی ہو، گناہ گار سے گناہ گار، غلط کار سے غلط کار، پر تھا تو مسلمان نا؟ اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جب مدینہ منورہ میں پوچھا گیا، کہ آپ اس کے لئے ہمارے ہاتھ پر بیعت کریں، تو انہوں نے کہا مجھے غور کا موقع دو، انہوں نے انکار نہیں کیا، کیوں؟ عبوری دور تھا۔ لیکن جب وہ جا رہے تھے، تو مختلف صوبوں میں یزید کی بیعت کا اقرار ہو رہا تھا، تو حضرت حسین شرعی طور پر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ Interim Period سے نکل کر ان کی گورنمنٹ Establish Government کے درجہ پہ آئی ہے کہ نہیں۔ تو مؤرخین یہاں یہ بات پیش کرتے ہیں، کہ جب آپ کربلا پہنچے تو حضرت حسینؓ نے تین شرطیں پیش کیں تھیں، اور ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس لئے آئے ہیں۔ تو اسوقت تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی، کہ یہ لڑنے کے لئے آئے ہیں۔ بھلا لڑنے کے لئے کوئی اس طرح آتا ہے؟، بھائی لڑنے کے لئے کوئی اسطرح بیوی کو، بچوں کو، معصوم چھوٹے بچوں کو ساتھ لیکر آتا ہے؟ نہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی حضرت عثمانؓ تھے

کربلا کے شہدا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی عثمان بھی تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی کا نام عثمان بھی تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد، جو نئے نکاح کیے تھے ان میں سے ان کی ایک بیوی میں سے جو بیٹا پیدا ہوا تھا اس کا نام عثمان تھا۔ تو یہ حضرت علی کا بیٹا اور حضرت حسین کا بھائی ہوا۔ سو یہ اس سفر میں حضرت حسین کے ساتھ تھا، اور کربلا کے شہدا میں سر فہرست ہے۔

تاہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہ جو یہاں آکر حالات کا پتہ چلا، اور آپ نے جب کہا کہ میرے تین پرپوزل ہیں، کہ میں عراق کے لوگوں کی دعوت پر یہاں آیا ہوں، کہ یہاں مشورہ کریں، کہ ہم نے نئی حکومت کو ماننا ہے یا نہیں۔ تو یہی جواب حضرت حسین نے وہاں دیا تھا، جب آپ صوبہ حجاز میں تھے جہاں مکہ اور مدینہ ہے، کہ میں سوچوں گا۔

تو حضرت جب آرہے تھے، تو جوں جوں آگے بڑھتے گئے خبریں آتی گئیں، کہ وہ صوبہ بھی مان گیا وہ صوبہ بھی مان گیا، لیکن عراق ابھی رہتا تھا۔ تو انہوں نے مسلم بن عقیل کو آگے بھیجا، کہ تم عراق کی خبر لو، کہ وہ لوگ اپنے خطوط پر قائم ہیں؟ یا نہیں؟

حضرت حسین نقل مکانی کے لئے نکلے تھے

اس وقت آپ ذرا یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ لڑنے کے لئے نکلے ہی نہیں۔ چونکہ پاکستان میں اکثر مجالس محرم میں یہ بات سنی گئی۔ لوگوں نے آکر ہمیں بتایا، کہ جی وہ کہتے ہیں دیکھو! یزید کے مقابلے میں آخر علی کا بیٹا ہی نکلا۔ ابو بکر کا بیٹا نہیں نکلا، عمر کا کوئی بیٹا نہیں نکلا، عثمان کا کوئی بیٹا نہیں نکلا، تو علی کا بیٹا ہی نکلا۔ تو لوگ حیران ہو کر پوچھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جی بات تو ٹھیک ہے، کہ نکلے تو یہی۔

میں کہتا ہوں اللہ کے بندوں! وہ بھی نہیں نکلے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی نہیں نکلے۔ بلکہ وہ نقل مکانی کے لئے آئے تھے، کہ مدینہ میں اب ہم نہیں رہیں گے، کیوں؟ کیونکہ امیر معاویہ چلے گئے، انہی کے ساتھ اتحاد کر کے ہم آئے تھے۔ اب جب وہ فوت ہو گئے ہیں تو ہم بھی ادھر آجاتے ہیں۔ سو حضرت حسین نقل مکانی کے طور پر آرہے تھے۔ فیصلہ انہوں نے یہاں کرنا تھا، مشورہ انہوں نے یہاں کرنا تھا کہ اب ہم کیا کریں۔

جو لڑنے کے لئے نکلے کیا وہ شرطیں پیش کرتا ہے؟

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں شرطیں پیش کیں، کہ تم اگر میرے سفر پر راضی نہیں کہ میں عراق میں آؤں، تو تم مجھے واپس مدینہ جانے دو، میں وہی رہ لوں گا۔ اگر یہ شرط منظور نہیں، تو مجھے اسلامی سلطنت کے باڈر (Border) پر کسی جگہ رہنے دو، تا کہ وہاں کوئی

جہاد کی نوبت آئے، تو میں وہاں اپنا وقت پیش کروں۔ یہ بھی نہیں تو یزید کے پاس مجھے لے چلو میں براہ راست اس سے بات کرتا ہوں۔

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ تین شرطیں پیش کیں، تو ذرا سوچیں جو لڑنے کے لئے نکلے کیا وہ شرطیں پیش کرتا ہے؟ "نہیں"۔ لیکن ان یزیدیوں کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ یہ نہیں بلکہ آپ ہمارے ہاتھ پر یزید کی بیعت کریں۔ تو یزید کے ساتھ بات کرنا آسان تھی، وہ یزید کے پاس جا کر شرطیں لگاتے، کہ اپنی زندگی اسطرح کرو، اس طرح شریعت قائم کرو، تو اگر یزید مان لیتا، تو کیا معلوم صلح ہو جاتی؟ کیا خیال ہے؟

تو حضرت حسین کا یہاں اختلاف کیا تھا؟ میدان کربلا میں یزید کی بیعت سے انکار یا یزیدیوں کی بیعت سے انکار؟...... (یزیدیوں کی بیعت سے انکار)۔ یزیدی کون ہیں؟ جو اس کے کارندے تھے، جیسے شمر، عبید اللہ بن زیاد وغیرہ۔ سو یہ کارندے یزید تھے یا یزیدی؟ (یزیدی)۔ یزیدیوں کے ہاتھ پر بیعت ہو، تو یہ کیا مقام حسین رضی اللہ عنہ تھا؟ (نہیں)۔ اتنا بڑا آدمی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ ہو، علی کا بیٹا ہو، فاطمہ کی گود کا پلا ہو، حسن کا بھائی ہو، تو حضرت حسین بڑے آدمی ہیں، وہ یزید کے ساتھ خود بات کریں۔ جیسے حضرت حسن نے حضرت معاویہ سے خود بات کی تھی۔ تو یزید سے بات کرنے کا حق بھی کس کو تھا؟ حضرت حسین کو۔ لیکن ان لوگوں نے جو یزید کے کارندے تھے، انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاتھ پر بیعت کرو۔ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یزید کی طرف جانے ہی نہ دیا۔ ؏

دیتی رہے گی درس شہادت حسین کی
آزادی حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر تیرا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی تو اطاعت نہ کر قبول

یزید اور "یزیدیوں" میں فرق

تو انکار تھا یزیدیوں کی بیعت کا اور معرکہ تھا یزید سے۔ تو اب ان حالات میں حضرت حسین کس مقام پر تھے؟ مقام شجاعت تو تھا ہی، اب مقام غیرت میں داخل ہو گئے۔

مجاہدین کو میدان میں ایسا موقع بھی ملتا ہے کہ پھر ایک غیرت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ حضرت حسین مقام غیرت پر آ گئے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کے پاس لے چلو میں اس سے بات کروں، تم کون ہوتے ہو روکنے والے۔

تاہم اسوقت آپ اپنے ذہن میں یہی بات رکھیں، کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ لڑنے کے لئے نہیں نکلے تھے۔

حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم کا ایک چارٹ

یہ میں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بہادری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک چارٹ بنایا ہے (حضرت علامہ صاحب نے اپنا ایک بنایا ہوا چارٹ دکھاتے ہوئے فرمایا) کہ اس کے اوپر ایک عنوان ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہ جنگ کے لئے نکلے، نہ آپ نے اس کے لئے اپنے ساتھ کسی کو نکلنے کی آواز دی، اور نہ آپ نے کسی کے لئے اپنے ساتھ جنگ کے لئے جانے کا اظہار کیا، پورے سفر میں۔ کہ ہم جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ تو کیا کوئی بیوی بچوں کو لے کر جنگ کے لئے جاتا ہے؟

حضرت حسین کے ساتھ ظلم ہوا

بہرحال بات یہی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ایک اونچا مقام تھا۔ آپ بڑے باپ کے بیٹے تھے، بڑی ماں کے بیٹے تھے، جو تمام جنت کی عورتوں کی سردار ہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزت کا تقاضا تھا کہ یزید خود ان کے پاس حاضری دیتا، نہ کہ ابن زیاد کو بھیجتا۔ کیا اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہی مقام سمجھا تھا؟! سو یہ اس کی بنیادی غلطی تھی۔

میں یہ کہتا ہوں کہ حضرت حسین کے ساتھ ظلم ہوا، اور یزید کا یہ سب سے بڑا قصور ہے کہ وہ خود کیوں نہیں ان کے پاس آیا۔ کیونکہ ہر Situation کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ تو میں نے تفصیل سے اس کا بیان کر دیا ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تین سفر

اب ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تین اسفار کا مختصر ذکر کرتے ہیں جو ہم نے ایک

چارٹ کی شکل میں پیش کیے ہیں۔ حضرت حسین کے ان تین سفروں میں، دو سفر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور کے ہیں مگر ایک سفر وہ ہے جو خلافت راشدہ کا نہیں بلکہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور کا ہے۔ حضرت امیر معاویہ جب حکمران تھے، اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما دونوں ان کو مان چکے تھے، اور حضرت حسن شہید ہو چکے تھے۔ تو اب حضرت حسین اکیلے تھے۔ اسوقت 49ھ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلامی فوج میں نکلے۔ اس چارٹ میں تین لائنیں ہیں اور ان میں تین سفر ہیں۔ یہ سفر حضرت حسین کے ہیں۔ آپ نے دو سفر حضرت عثمان کے دور میں کیے، اور ایک سفر کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں۔ تو اگر حضرت حسین حضرت عثمان کے دور میں جہاد کے لئے نکلتے ہیں، تو انہوں نے حضرت عثمان کی خلافت قبول کی یا نہیں؟ قبول کی۔ بھائی حضرت عثمان کو امیر المؤمنین مانا یا نہیں؟ اور پھر ایک دفعہ دونوں بھائی اکٹھے حضرت عثمان کے دور میں نکلے۔ لیکن معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ نکلے کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اس وقت شہید ہو چکے تھے۔

نظریات کی بجائے واقعات زیادہ یاد رہتے ہیں

تو اگر آپ واقعات کو پڑھیں، تو واقعات یاد رہتے ہیں لیکن نظریات کبھی بھول بھی جاتے ہیں، کیونکہ نظریات عقلی چیزیں ہیں اور عقل کے لیے سمجھ چاہیے۔ تو میں کہتا ہوں، ساتھیو! آپ ذرا واقعات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

حضرت حسین بن علی کے تین سفر جہاد ہیں، دو کب ہوئے؟ حضرت عثمان کے دور میں اور ایک ہوا حضرت معاویہ کے دور میں۔ تو حضرت حسین جب مدینہ سے جا رہے تھے تو اس وقت جن پانچ عبد اللہ نامی حضرات نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو روکا تھا، ان کے نام بھی ہم نے اس میں دیے ہوئے ہیں کہ وہ کون کون تھے۔

تو مشورہ دینے والے کون ہوتے ہیں؟ جو اپنے ہوں، ہمدرد ہوں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ پانچوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے تب ہی تو مشورہ دے رہے تھے۔ ان پانچوں کے نام یہ ہیں حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن جعفر،

حضرت عبد اللہ بن زبیر، حضرت عبد اللہ بن مطیع رضی اللہ عنہم۔ تو یہ سارے انہیں کے ساتھ ہیں۔ تو اب میں ایک بات کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے یزید کی بیعت کیوں کی؟

بھائی! اتنا لڑنا مشکل نہیں جتنا لڑانا مشکل ہے۔ کیوں؟ اگر کوئی کمانڈر بغیر سوچ کے لڑنے کا حکم دے دے، تو اس میں ہزاروں کا خون ضائع جا سکتا ہے کہ نہیں؟، جو خود لڑے گا تو صرف اپنی جان گئی نا؟، لیکن جو غلط لڑائے گا، اس پر سب کا بوجھ آیا، تو جلدی لڑنے کا حکم کوئی دے سکتا ہے؟ نہیں۔ اب حضرت حسین اسوقت نکلے، جب عبوری دور تھا۔ لیکن جب یزید کی حکومت سارے صوبوں میں اسٹیبلش ہو گئی سوائے مکہ مکرمہ کے، اس وقت انکار کی گنجائش نہ رہی۔ تو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جو تھے، انہوں نے کہا کہ اگر اسوقت ہم یزید کے کسی عمل کی وجہ سے اٹھیں، تو سوائے خون ریزی کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ تو حضرت عبد اللہ بن عمر نے اسوقت بیعت کر لی، اور کہا کہ میں نے جو یہ بیعت کی ہے یہ خون ریزی سے بچانے کے لئے کی۔ تو قوم کو خون ریزی سے بچانے کیلئے، کمانڈر کو ایسے اقدامات کرنے پڑتے ہیں، لیکن حضرت عبد اللہ بن عمر کے الفاظ ہیں، بایعنا ھذا الرجل،[1] ہم نے اس شخص کی بیعت اپنی اصل بیعت کو جو اللہ و رسول سے کی اسے قائم رکھتے ہوئے کی ہے، یعنی اس کی کوئی بات جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف ہو ہم اسے نہیں مانیں گے۔

حضرت حسین کی شہادت پہ جو بھی خوش ہو اس پر لعنت

تو لوگ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کرتے ہیں (اس کا جواب ہم دے چکے) جب حضرت عبد اللہ بن عمر نے بیعت کی، تو آپ نے اس لیے بیعت کی کہ لڑائی کے ساتھ عام خون ریزی نہ ہو۔ لیکن ان کے جذبات، ان کی عقیدت، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ تو جیسا کہ میں نے کہا تھا اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے بارے میں بھی یہ منقول

---

(1) صحیح بخاری، کتاب الفتن، حدیث: 7111۔

ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قتل سے جو شخص بھی راضی ہو، اس پر لعنت ہو۔[1] ہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس مظلومانہ حالت پر دل سے ان کے ساتھ ہیں۔

اور جن لوگوں نے اس وقت یزید کی حکومت کو اس وجہ سے قبول کیا کہ مسلمانوں میں مزید خون ریزی نہ ہو جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے سفر آخرت پر روانہ ہونے سے پہلے ایک مشورہ دیا تھا کہ میرے بعد میرے بیٹے عبد اللہ بن عمر کو خلیفہ تو مقرر نہیں کرنا، لیکن مشورہ اس سے لیتے رہو۔ تو مشورہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا یہی تھا کہ اسوقت ان حالات میں خونریزی جائز نہیں۔

یزید بوجہ مظالم کربلا فاسق تھا

اب کئی لوگ ہم پر یہ سوالات کرتے ہیں کہ جی یزید کو کئی لوگ کافر کہتے ہیں۔ تو میں کہتا ہوں کہ مولانا احمد رضا خاں نے لکھا ہے کہ میں اس کو کافر نہیں کہتا۔[2] اور مولانا گنگوہی نے یہ فرمایا ہے کہ یزید فاسق ہے، اور اس کا فسق واقعہ کربلا کے بعد ظاہر ہوا۔[3]

واقعہ کربلا میں بنیادی چیز

تو دوستو! عزیزو! میں نے جتنی باتیں کیں کیا آپ کو سمجھ آئیں؟ (سامعین: الحمد للہ سمجھ آئی ہیں) حضرت حسین رضی اللہ عنہ وہاں سے جو چلے تھے وہ لڑنے کے لئے نہیں نکلے تھے، یہ ایک بنیادی چیز ہے۔ اس سے یہ پراپیگنڈا ابھی ختم ہو جائے گا کہ دیکھو نکلا تو پھر علی کا بیٹا ہی نا۔! ہم کہتے ہیں وہ بھی حکومت کے لئے نہیں نکلے۔ ہم جب بہت چھوٹے تھے، اور پرائمری سکول میں جاتے تو مجھے یاد ہے، کہ کچھ رائل فیملی کے لوگ ایک رسالہ چھوٹا سا بیچا کرتے تھے۔ اسوقت غالباً وہ رسالہ دو پیسے کا تھا۔ اس کا نام تھا "جنگ نامہ کربلا"۔ سارے لوگ کہتے تھے کہ کربلا میں جنگ ہوئی، پہلی رات وہ نکلا، دوسری رات وہ نکلا، تیسری رات وہ وہ

---

(1) لعن اللہ ابن مرجانۃ (منہاج السنہ، ج:7، ص:558)

(2) فتاویٰ بریلی:275۔ ملفوظات، حصہ اول، ص:114۔

(3) فتاویٰ رشیدیہ، ص:191، ایمان اور کفر کے مسائل۔

نکلے، چوتھی رات وہ نکلے، یہ دس راتیں انہوں نے بنالیں کہ نکلتے ہی رہے راتیں بانٹ کر، اور پھر ایک رات ہوتی ہے جس کو کہتے ہیں کہ مہندی نکلی۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ مہندی کیوں نکلتی ہے؟ کہ جی کربلا میں ایک شادی بھی ہوئی تھی، حضرت امام حسین کے ایک بیٹے قاسم تھے، تو انہیں بہنوں نے اور مستورات نے مہندی تو لگانی تھی نا! خدارا خود سوچو! کہ حالات ایسے ہوں کہ ادھر تو کہو کہ ان کا پانی بند کر دیا گیا۔ تو ایسے حالات میں شادیاں ہو رہی ہیں!!! حالات ایسے ہیں کہ پینے کو پانی نہیں ملتا، تو غسل کو پانی کیا ملے گا؟ تو عقل حیران ہوتی ہے....... کہ یہ کیا باتیں بنائی ہوئی ہیں، کہ ادھر ظلم ہو رہا ہے اور ادھر شادی ہو رہی ہے۔ کہ جی جب معلوم ہو گیا تھا کہ اب زندگی باقی نہیں رہے گی تو جسکی نسبت کی ہوئی تھی تو کہا کہ اس کی شادی تو کر لو۔ یہ باتیں ہماری عام سمجھ سے باہر ہیں اور ایسے نازک حالات میں کوئی ایسی خوشی نہیں کرتا۔

اللہ تبارک وتعالی ہم سب کو اہل سنت والجماعت کے عقیدوں پر قائم رکھے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین



منقبتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ

یقیں کا ہے زیور حسینؓ ابن حیدرؓ | صداقت کا جھومر حسینؓ ابن حیدرؓ
معطر معنبر حسینؓ ابن حیدرؓ | بسا دل کے اندر حسینؓ ابن حیدرؓ
وفاؤں میں اعلیٰ حسینؓ ابن حیدرؓ | عظیم اور بالا حسینؓ ابن حیدرؓ
سخا میں نرالہ حسینؓ ابن حیدرؓ | نبوتؐ کا پالا حسینؓ ابن حیدرؓ
ادائے پیمبرؐ حسینؓ ابن حیدرؓ | حسنؓ کا برادر حسینؓ ابن حیدرؓ
کہو سارے مل کر حسینؓ ابن حیدرؓ | حسینؓ ابن حیدرؓ حسینؓ ابن حیدرؓ
مِرا دین و مسلک حسینؓ ابن حیدرؓ | اور آنکھوں کی ٹھنڈک حسینؓ ابن حیدرؓ
فقاہت میں زیرک حسینؓ ابن حیدرؓ | بہت ہی مبارک حسینؓ ابن حیدرؓ
محبت کا بادل حسینؓ ابن حیدرؓ | اخوت کی مشعل حسینؓ ابن حیدرؓ
زہد میں مکمل حسینؓ ابن حیدرؓ | شجاعت میں اکمل حسین ابنِ حیدرؓ
جو سمجھیں مقامِ حسینؓ ابنِ حیدرؓ | کریں احترامِ حسینِ ابنِ حیدرؓ
کریں احترامِ حسینِ ابنِ حیدرؓ | وہی ہیں غلامِ حسینؓ ابن حیدرؓ
ہے دل میں شجاعِ حسینؓ ابن حیدرؓ | بصد اتباعِ حسینؓ ابن حیدرؓ
کہ یعنی متاعِ حسینؓ ابن حیدرؓ | کروں گا دفاعِ حسینؓ ابن حیدرؓ
ہے صائمؔ کو تابِ حسینؓ ابن حیدرؓ | ہو ذکرِ جنابِ حسینؓ ابن حیدرؓ
نہیں ہے جوابِ حسینؓ ابن حیدرؓ | کروں کیا خطابِ حسینؓ ابن حیدرؓ

صائمؔ

آٹھویں رات (مجلس 8)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ أَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ
وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (پ:2، البقرۃ:155)
صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

حضرات سامعین کرام، بزرگان قوم دوستو اور بھائیو! گزشتہ مجلس میں یہ گزارش کر رہا تھا کہ حضرت حسین مدینہ منورہ رہتے تھے، اور ان کے بڑے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی انکے ساتھ تھے، جب حضرت معاویہ سے یہ صلح کر کے عہد و پیمان کر کے اور ان کی بیعت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لائے اور مسلمان پھر سے ایک ہو گئے، یہاں میں نے یہ عرض کی تھی کہ حضرت حسن تو شہید ہو چکے تھے۔ کسی بدبخت نے انہیں زہر دے دیا تھا۔
حضرت معاویہ کے بعد جب یزید برسر اقتدار آیا تو حضرت حسین نے مدینہ نہ رہنے کا تہیہ کر لیا تو یزید کے گورنر مدینہ نے جب آپ سے یزید کی حکومت تسلیم کرنے کے لئے کہا تو آپ نے اس پر غور کرنے کا وقت مانگا اور راتوں رات وہاں سے چل پڑے تو حضرت حسین جب مدینہ منورہ سے چلے ہیں تو لڑائی کرنے کے لئے نہیں چلے تھے، اور اپنے دلائل میں میں نے یہ بات کہی تھی کہ ”چونکہ یہ بچوں کے ساتھ نکلے ہیں“ ان کی ”بہن“ وہ بھی ساتھ تھی ”بیوی“ بھی ساتھ تھی، چھوٹے بچے بڑے سب ساتھ تھے، تو یہ اطوار اور یہ ڈھب فوج کا نہیں ہوتا جو لڑنے جائے، وہ اس طرح تو نہیں جاتے، تو اس بات کا استدلال کرتے ہوئے کہ یہ لڑنے کے لئے نہیں نکلے تھے چونکہ یہ بچوں کے ساتھ نکلے تھے اور بچوں کے ساتھ کوئی

لڑنے کے لئے نہیں نکلتا ایک دلیل تو یہ پیش کی تھی۔

حضرت حسینؓ کے دور میں دارالحکومت

دوسری بات ذرا آج غور سے سنیں اور توجہ فرمائیں! حکومت کا مرکز، یزید کا دارالحکومت کہاں تھا؟"ملک شام" میں تھا یہ ملک کا تیسرا صوبہ بالکل جدا تھا، یعنی مدینہ منورہ سے دور تھا اور مدینہ منورہ کس صوبے میں تھا؟"حجاز میں" سو مکہ اور مدینہ دونوں اس طرف ہیں (بیان کے دوران اشارہ کرتے ہوئے) عراق دوسری طرف (دوران بیان دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور شام ادھر ہے (دوران بیان تیسری طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو حضرت حسین مدینہ منورہ سے ادھر چلے جدہر عراق ہے، ادھر نہیں چلے جہاں حکومت کا مرکز ہے۔ عام طور پر دیکھا یہی جاتا ہے کہ جب حکومت کے خلاف کوئی احتجاجی جلوس نکلے، حکومت کے خلاف کوئی معرکہ آرائی ہو، تو کدھر رخ کرتے ہیں؟ "دارالحکومت کی طرف" پاکستان میں بڑے پیمانے پر جب کوئی تحریک اٹھتی ہے، یا جب کوئی ریلی نکلتی ہے تو پھر رخ کرتے ہیں "اسلام آباد" کی طرف تو جب حکومت کے بارے میں کوئی بات کہنی ہو، حکومت کو کوئی بات سنانی ہو تو رخ کدھر ہوتا ہے؟ "جہاں حکومت کا مرکز ہو" سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت حسین اگر نکلے یزید کا مقابلہ کرنے تو پھر رخ ان کا کدھر ہونا چاہیے تھا؟ "شام کی طرف"

ع کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں آج غالب غزل سرا نہ ہوا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دارالحکومت کی طرف سفر نہیں کیا

کچھ تو جواب دیں! کہ اگر حسین یزید کے مقابلے میں نکلتے تو شام جاتے یا عراق؟ "شام جاتے"۔ ذرا سوچیے، غور کیجئے! دستور زمانہ اور تاریخ یہی چلی آرہی ہے کہ جب کبھی حکومت کے بارے میں کوئی معرکہ آرائی ہو، اور یا کوئی احتجاج ہو تو رخ مرکز کی طرف ہوتا ہے۔ تو حضرت حسین نے اگر "شام" کی طرف رخ کیا پھر تو کہیں کہ وہ یزید کے مقابلے میں نکلے اور اگر انہوں نے رخ کیا "عراق کا"، تو پھر آپ سوچتے سوچتے تھک جائیں گے کہ

آپ چلے کس لئے تھے؟

یہ ایسا مشکل سوال ہے کہ جب تک پوری دقتِ نظر سے اس پر غور نہ کریں اور سوچتے سوچتے گہرائی میں نہ اتریں، یہ بات سمجھ میں نہیں آئیگی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اگر یزید کے مقابلے کے لئے نکلے تھے تو کدھر جانا چاہیے تھا؟ (شام میں)۔ اور اگر آپ لڑنے کے لئے نکلے تھے تو وہ اپنے ساتھ ایک فوج بنا کر لیجاتے، بچوں کو تو ساتھ نہ لیجاتے! لیکن وہ نہایت سادگی میں صرف اپنے گھر کے لوگوں کو ساتھ لے کر چلے اور چلے عراق کی طرف۔ کیوں؟

اس لئے کہ عراق میں آپ کے والد حکومت کرتے رہے تھے، حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ راشد تھے تو کہاں رہتے تھے؟ "حضرت علی رضی اللہ عنہ مدینہ سے کہاں چلے گئے تھے؟ عراق میں"۔ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی دوستی اور ان کے خیر خواہوں کی آبادی وہاں بھی تھی۔ اس لیے انہوں نے ادھر رخ کیا۔ تو اب نکلے کس لئے تھے؟

اللہ تعالیٰ سمجھنے کی اور سوچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مجھے اب ایک پیچھے کی بات کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے۔ تو میں پہلے وہ بات بیان کرلوں، پھر اس کی روشنی میں اس کا جواب آپ کو مل سکے گا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ چلے کہاں کے لئے تھے۔

خلافت کے متعلق ایک مسئلہ سمجھ لیں

یاد رکھئے خلفائے راشدین کا بھی پہلے سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے "کہ کسی کو بیعت کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا" ہاں اگر کوئی سر اٹھائے اور مقابلہ کرے اس کو تو دبایا جاتا ہے لیکن اگر کوئی مقابلہ میں نہ اٹھے، مخالفت نہ کرے، لیکن بیعت بھی نہ کرے تو اس کے پیچھے کوئی نہیں پڑتا۔ کیونکہ اسلام میں حکومت کے ذمہ یہ تو ہے کہ وہ امن قائم رکھے یعنی اگر کوئی بغاوت کے لئے اٹھتا ہے، مقابلے کے لئے اٹھتا ہے اس کو تو طاقت کے ذریعے دبایا جائے، لیکن اگر کوئی تنہائی میں اپنی زندگی گزار رہا ہے، اور وہ بیعت نہیں کرتا اور کوئی مقابلے میں بھی اس کی تحریک نہیں، لڑنے کی کوئی صورت نہیں، تو اس کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ یہ بات

سمجھ لیں۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کیوں نہ کی

اب میں اس کی ایک مثال دوں۔ میں نے غالباً چوتھی رات (مجلس 4) بیان کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت کہاں وجود میں آئی تھی؟ میں نے کہا تھا ''سقیفہ بنی ساعدہ'' میں جہاں انصار میٹنگ کر رہے تھے۔ آپ کو یاد آگیا ہو گا؟ (سامعین: جی) جہاں انصار میٹنگ کر رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہمارے آقا دو جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو خدا کا انتخاب تھے اور وہ مکہ میں تشریف لائے۔ اور جب آپ مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو ہم نے مکہ سے آنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال بھی کیا، مہاجرین کو جگہ دی کہ مکہ والے اگر آپ کے ساتھ حسن سلوک نہیں کر رہے تو ''مدینہ'' آجائیں۔ لیکن مدینہ کے جو رہنے والے تھے وہ کون تھے؟ (سامعین: انصار) تو انصار کا خیال تھا کہ جانشین رسول انصار میں چنا جائے اور انصار کے بڑے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے اپنے ہاں یہ میٹنگ بلائی تھی۔ وہاں سارے انصار جمع تھے ''اوس و خزرج'' کی تمام شاخیں وہاں موجود تھیں، اور ''حضرت سعد بن عبادہ'' انکے درمیان میں بیٹھے تھے۔

جب حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما وہاں پہنچے تو اب وہاں ان کی وہ بات نہ چل سکی۔ حضرت سعد بھی صحابی تھے اس لیے ''کوئی غیر معقول بات نہیں کر سکتے تھے''۔ لیکن آپ کا کیا خیال ہے کہ ''حضرت سعد بن عبادہ'' نے بطور انسان کے محسوس تو کیا ہو گا ناں کہ یہ کہاں آگئے؟ کہ محسوس نہیں کیا ہو گا؟ (سامعین: کیا ہو گا)۔ کچھ تو محسوس کیا ہو گا کہ یہ کہاں آگئے لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چونکہ وہاں حدیث پیش کی تھی، اور صحابہ حدیث کے بارے میں بھی سب کے سب عادل ہیں، الصحابہ کلھم عدول، وہ حدیث کا انکار نہیں کر سکتے تھے اور اپنی طرف سے کوئی حدیث بنا نہیں سکتے تھے، ان کا تقوی اور ان کا مقام یہ تھا کہ مجال ہے اپنی طرف سے کوئی حدیث یا کسی دوسرے پر غلط بیانی کا الزام لگائیں، کہ اس نے پیغمبر پر یہ بات گھڑی ہے۔ سو صحابہ کرام میں ایسی کوئی فضا نہ تھی۔

''لیکن بطور انسان کے ان کو خیال تو آیا ہو گا'' کہ انصار اس مدینہ کے اصل لوگ ہیں

اور یہ علاقے کے سردار ہیں۔ پیغمبر ﷺ کو تو اس لیے قبول کیا کہ "وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں"، ان کے سامنے کوئی انگلی نہیں اٹھ سکتی، ان کے سامنے ہمارے سر تسلیم خم ہیں۔ لیکن اب اقتدار میں انصار کو موقع ملنا چاہیے، یہ ان کا خیال تھا۔ لیکن حضور ﷺ کی "حدیث" سن کر صحابہ ادب میں جھک گئے۔

اب میں جو اگلی بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب سب "انصار نے" حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور مسجد نبوی میں سارے مہاجرین نے بیعت کی مگر "حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ" نے بیعت نہیں کی، لیکن آپ نے کبھی کوئی مخالفت بھی نہیں کی۔ کیونکہ جب حضرت ابو بکر صدیق نماز پڑھاتے ہیں، تو وہ پیچھے کھڑے ہیں۔ اپنے گھر میں رہتے ہیں تو کسی سرکاری آدمی نے خلافت کے عہدے داروں میں سے ہوں یا جو ان کے کام میں سرکاری حیثیت رکھتا ہو اس کو "حضرت سعد بن عبادہ" کے ساتھ الجھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تو حضرت سعد بن عبادہ کافی عرصہ اس حال میں رہے کہ مدینہ منورہ میں بیعت نہیں کی۔ لیکن کوئی محاذ آرائی بھی نہیں کی، کوئی مخالفت میں جذبات کا اظہار بھی نہیں کیا۔ خاموشی سے اپنی زندگی بسر کرتے رہے اور پھر کچھ عرصہ کے بعد کسی سرحدی علاقے میں جا کر مقیم ہو گئے۔ اس سے پتہ چلا کہ ایک ہے "بیعت کرنا اور ایک ہے مقابلہ کرنا" یہ دو لائنیں ہوئیں کہ جب کوئی سربراہ بنے تو دوسرا یا تو اس کی بیعت کر لے، یا اس سے ٹکرائے۔ لیکن یہاں یہ صورت نہ تھی۔

خاموش رہنے والے کسی کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتے

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے خاموشی اختیار کی لیکن عملی طور پر یہی ثابت کیا کہ میں ساتھ ہوں۔۔ کیوں؟ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ امام نماز ہیں یا جب وہ سرکاری طور پر خطبہ دیتے ہیں تو حضرت سعد بن عبادہؓ بھی حاضر ہوتے ہیں جب تک سرحدی علاقہ میں وہ نہیں گئے تھے۔ لیکن بیعت نہیں کی۔ تو معلوم ہوا کہ صورتیں تین ہیں۔ تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، غور کریں! دو نہیں، تین صورتیں ہیں:

 مان لینا، مقابلہ نہ کرنا

- خاموش رہنا اور بیعت نہ کرنا
- مقابلے کے لئے نکل آنا

توکتنے پہلو میں نے آپ کے سامنے عرض کیے؟ (سامعین: تین)

حضرت علی کے متعلق بخاری کی روایت

ایک روایت اور عرض کرتا ہوں چونکہ امام بخاریؒ نے اسے روایت کیا ہے۔ اس لیے میں بیان کر دیتا ہوں۔ اگرچہ اس روایت کے مقابلے میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت اس کے خلاف ہے۔ لیکن بات سمجھانی مقصود ہے۔ یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں یہ متفق علیہ نہیں ہے یعنی صحیح کتابوں میں موجود ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق نہیں ہے۔

روایت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی ہے جو بخاری شریف میں ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ایک دوسری روایت ابو سعید خدریؓ کی ہے جو صحیح بخاری میں نہیں، لیکن روایت صحیح ہے۔ حدیث کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہم ان دونوں میں تطبیق پیش کرتے ہیں، یعنی Plausible interpretation provide کرتے ہیں۔[1]

میں ذرا ترتیب سے بات کرتا ہوں۔ کوئی یہ نہ کوئی کہے کہ میں جو بات کر رہا ہوں اس کا اقرار کر رہا ہوں کیونکہ اس روایت کے مقابلہ میں، میں نے ہمیشہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ لیکن صرف مسئلہ سمجھانے کے لئے ذکر کر رہا ہوں۔ آپ کہیں گے کہ عجیب بات آپ نے سنائی، وہ بات کیا ہے؟ کہ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں اجتماع ہوا، جب حضرت سعد بن عبادہؓ نے میٹنگ بلائی تھی اور ان کا خیال تھا کہ انصار سے خلیفہ ہو۔ تو وہاں حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ پہنچ گئے اور نبی پاک ﷺ کی حدیث الائمۃ من قریش پیش کی۔ انصار نے مان لی، اور بیعت ہو گئی۔ لیکن حضرت سعد بن عبادہ نے بیعت نہیں کی۔ آپ کن میں سے تھے؟ (سامعین: انصار میں سے)۔ سو یہاں میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ "حضرت علی نے بھی ایک روایت کے مطابق بیعت نہیں کی"۔

---

(1) اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے "خلفائے راشدین" جلد اول از حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی مراجعت فرمائیں۔

وہاں انصار کے اجتماع میں صرف یہ تین مہاجرین تھے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ"، ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی وہاں تھا ہی نہیں۔ تو جب یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ بیعت ہو گئی تو اس وقت حضرت علی تھے کہاں؟ (مسجد میں)[1] تو حضرت علی کو یہ خیال آیا، کہ گو وہ بڑوں کے مقابلے میں چھوٹے تھے، حضرت ابو بکر کے مقابلے میں وہ چھوٹے تھے لیکن ان کو یہ خیال آیا کہ گو میں عمر میں چھوٹا ہوں لیکن اپنی شخصیت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے اور تعارف کے اعتبار سے تو مجھے بھی سقیفہ بنی ساعدہ بلایا جانا چاہیے تھا۔ کہ جب بیعت کرنے لگے تو مجھے کیوں نہیں وہاں بلایا گیا؟ خیال تو آیا نا ان کو؟ تو انہوں نے بیعت نہیں کی۔

حضرت ابو بکر صدیق جب مسجد پہنچے جہاں مہاجرین جمع تھے تو سب نے بیعت کی مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ پھر جب بھی نماز کا وقت آتا، امامت حضرت ابو بکر صدیق کرتے، سب نماز پڑھتے، اور وہاں ان کے پیچھے نماز پڑھنے والوں میں حضرت علی بھی ساتھ کھڑے ہوتے۔ لیکن اپنے طور پر آپ لوگوں کو کہتے رہے کہ "حضرت فاطمہ بیمار ہیں" اس لیے میں اب کسی کام میں بھی حصہ نہیں لے سکوں گا، میں ان کی تیمار داری کروں گا۔ تو حضرت فاطمہ کے آخری دنوں میں ان کی تیمار داری کون کرتے رہے؟ "حضرت علی"۔ تو حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی اہلیہ کو کہا کہ "تم بھی فاطمہ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ" اور ان کی تم بھی عیادت کرتی رہو، خدمت کرتی رہو۔ تو حضرت فاطمہ کی خدمت یا تو حضرت ابو بکر صدیق کی بیوی یعنی خلیفہ وقت کی بیوی "حضرت اسماء بنت عمیس" کرتی رہیں، اور یا "حضرت علی رضی اللہ عنہ" کرتے رہے۔ تو حضرت فاطمہ کا "حضرت اسماء سے" اتنا قریبی رابطہ ہو

(1) رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد خلافت کے باب میں تین گروہ ہو گئے تھے: ① انصار، ② مہاجرین، ③ بنو ہاشم۔ بنو ہاشم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں اکٹھے تھے اور باقی انصار و مہاجرین کے بزرگ حضرات سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع تھے۔ اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی کتاب "الفاروق" کی مراجعت فرمائیں۔ یا یہی مضمون حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی تالیف "خلفائے راشدین" جلد دوم میں مطالعہ فرمائیں۔

گیا کہ آخری دنوں میں جب حضور ﷺ کی جدائی کا غم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تھا تو ان کی تسلی کے لئے آپ سے باتیں حضرت اسماء ہی کرتی رہیں۔

حضرت اسماء سے حضرت فاطمہؓ کی وفات سے قبل گفتگو

مجھے ایک قصہ یاد آیا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے صرف ایک چیز کی فکر ہے کہ جب میری روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی، اس بیماری میں میرا سفر آخرت آجائے تو جب میرا جنازہ جائے گا، تو جنازہ جب چارپائی پر رکھا جاتا ہے تو اوپر چادر بھی ڈالی ہوتی ہے لیکن کچھ باڈی یعنی جسامت تو ظاہر ہو ہی جاتی ہے ناں؟ تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا "سیدۃ نساء اهل الجنه" پیغمبر کی بیٹی ان کو یہ غم کھایا جارہا تھا کہ جب میرا جنازہ جائے گا تو چادر کے نیچے میری باڈی کے لئے بھی پردہ داری نہ ہو، تو حضرت سیدہ حضرت اسماء کو کہنے لگیں کہ میں اس کے بارے میں پریشان ہوں۔ تو حضرت اسماء نے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں، کیونکہ ہم نے حبشہ کے ملک میں دیکھا ہے کہ وہاں چارپائی کے اوپر ایک اسطرح کی چیز ہوتی ہے کہ جیسی ڈولی ہوتی ہے، جیسے ایک پردہ یعنی لکڑی کا ایک ایسا ڈھانچہ کہ جس سے Body کے اوپر ایک پردہ سا آجاتا ہے۔ جسامت اس لکڑی کی جھولی نما ہوتی ہے باڈی کی طرح نہیں ہوتی۔ تو حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں نے وہ دیکھا ہوا ہے اس لیے آپ بے فکر رہیں۔ اس کے لئے ہم ایسا انتظام کریں گے کہ آپ کو غم نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سن کر حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ حضرت اسماء بیان کرتی ہیں کہ اس دنیوی زندگی میں "حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا" کے چہرے پر آخری مسکراہٹ میں نے اِس وقت دیکھی۔ اس کے بعد قبر تک جانے میں کوئی اور ایسا موقع پیش نہیں آیا۔ تاہم "حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ" بھی ان کی خدمت میں رہتے تھے اور ان کا حق بھی تھا۔

حضرت علیؓ نے بیعت کیوں نہ کی؟

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت نہیں کی گو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ چونکہ حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عیادت میں اور تیمار داری میں مصروف تھے۔ اس لئے انہوں نے اور جانب توجہ نہیں کی لیکن نمازیں وہیں مسجد میں ساتھیوں کے ساتھ ادا فرماتے ہیں۔ اور کسی نے اگر کوئی مشورہ کیا تو مشورہ بھی ساتھیوں کو دیتے ہیں، لیکن بیعت نہیں کی۔ جب حضرت فاطمہ الزہراء فوت ہو گئیں پھر وہ خود حضرت ابو بکر صدیق کے پاس آئے اور انہوں نے بیعت کی، اور پھر حضرت علی نے جو تقریر کی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو لے لیا ہے، اور ام المؤمنین حضرت عائشہ اس کی راویہ ہیں تو حضرت علی نے حضرت ابو بکر صدیق کو کہا کہ حضور ہمیں آپ کے کمالات اور اسلام میں جو آپ کا مقام ہے اس سے ہر گز انکار نہیں، میں جو اتنا وقت پیچھے رہا اور بیعت نہیں کی لم ننفس علیک آپ کے مقابلے میں ہمارا کوئی احساس نہیں جاگتا تھا، آپ کے مقابلے میں ہمارا کوئی احساس جاگے یا دل میں ایسی کوئی تڑپ پیدا ہو "بالکل بھی ایسی کوئی بات نہیں"۔ قطعاً آپ کے مقام کے بارے میں ہمارے دل میں کوئی جذبہ رشک ہو یا جذبہ حسد ہو "قطعاً ایسی کوئی بات نہیں"۔ صرف اتنی بات ہے کہ ہم قرابت دارانِ رسول میں سے تھے، اتنا خیال تو ضرور آیا کہ ہمیں "سقیفہ" میں بلایا نہیں گیا۔ مطلب ان کا یہ تھا کہ سقیفہ میں اگر آتے، تو چنتا تو انہوں نے بھی حضرت ابو بکر صدیق کو ہی تھا جیسا کہ ابن عبد البر نے الاستیعاب میں روایت کیا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

فلما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم نظرت فإذا الصلاة علم الإسلام وقوام الدين فرضينا لدنيانا من رضى رسول الله صلى الله عليه وسلم لديننا فبايعنا أبا بكر

(استیعاب ج۳ص۹۷۱، التمہید جلد 22 ص 129)

حضرت علی نے کہا ہم نے اپنی دنیا کے لئے اس کو چنا جسکو اللہ کے پیغمبر نے ہمارے دین کے لئے چنا، یہ حضرت علی نے خود کہا۔

سو پتہ چلا کہ حضرت علی کو اختلاف کوئی نہیں تھا، انہوں نے خود حضرت ابو بکر صدیق کے ہاتھ پر بیعت کی، اور کہا کہ آپ کے مقام کے بارے میں سوال ہی پیدا نہیں

ہو تا کہ کوئی اسکا انکار کر سکے اور ہمارے اندر کوئی جذبہ مقابلے کا ابھرے، پر اتنا احساس ہمارا ضرور جاگتا تھا کہ ہمیں سقیفہ بنی ساعدہ" میں بلایا نہیں گیا۔ نہ بلانے کی اور بھی وجوہات تھیں۔ حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو بھی تو نہیں پتہ تھا کہ وہاں میٹنگ ہو رہی ہے، ان کو بھی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے جاکر اطلاع دی تھی جو انصار میں سے نہیں تھے۔

حضرت نعمان کے کہنے پر یہ تین حضرات یکایک آئے۔ سو ایسے حالات کو کہتے ہیں اچانک ایک ایمر جنسی پیدا ہو جانا۔ تو یہ ایمر جنسی میں آگئے، اگر ایمر جنسی پیدا نہ ہوتی تو حضرت ابو بکر، عمر اور عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم جب مسجد نبوی سے نکلے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر نکلتے لیکن وہ ایمر جنسی میں آئے اور ایمر جنسی کے احکام اور ہوتے ہیں۔

تاہم اس طرف توجہ کیجئے کہ متذکرہ بالا روایت کے مطابق حضرت علی نے چھ ماہ بیعت نہیں کی۔ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایسا "نہیں"، بلکہ حضرت علی المرتضیٰ نے سب کے ساتھ بیعت کی اور یہ جو بیان کیا جاتا ہے کہ چھ مہینے تک چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ اٹھے بیٹھے ہی نہیں مگر نمازیں پیچھے پڑھتے رہے۔ تو اس کا سبب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیماری تھا۔ لیکن جب حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں تو ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور بیعت کی، مگر یہ بیعت دوسری تھی، اس سے پہلے بھی آپ بیعت کر چکے تھے۔ سو اس روایت کے راوی حضرت ابو سعید خدری ہیں اور یہ جو دوسری بیعت ہے اس کی راویہ ہیں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ ہم دونوں روایتوں کو آپس میں جوڑ کر کہتے ہیں۔

دونوں روایتوں میں تطبیق

مجھے ایک واقعہ یاد آیا ایک جگہ غالباً مناظرہ تھا تو مخالفین میں سے کسی نے کہا کہ جی حضرت علی نے چھ ماہ بیعت کیوں نہ کی؟ میرے پاس تشریح کا وقت نہیں تھا۔ جیسا کہ آپ اب بیٹھے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور الحمد اللہ آپ آرام سے بیٹھے ہیں، آپ یہ نہیں کہیں گے کہ ٹائم زیادہ ہو گیا ہے۔ لیکن جب کسی مخالفانہ اجتماع میں ہوں تو یکدم کوئی بات کرے تو جواب دینا پڑتا ہے؟ یکدم انہوں نے کہا کہ جی حضرت علی نے چھ مہینے بیعت نہیں

کی؟ مطلب ان کا یہ تھا کہ اہل سنت کے عقیدے پر ضرب لگائی جائے کہ تمہارے بڑے امام اول کی انہوں نے بیعت نہیں کی تھی، مفہوم تھا کہ کسی کمزوری کی طرف اشارہ کریں۔ تو اس وقت تشریح کا وقت نہیں تھا۔ آپ کو جو میں نے تشریح کی وہ سمجھ آگئی؟ (سامعین: جی آگئی) لیکن اس وقت میں نے کہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھ ماہ کے بعد جو بیعت کی، کیا آپ کو معلوم بھی ہے کیوں کی؟ اس لئے کہ یہ بیعت جبری نہیں تھی بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بتانا چاہتے تھے کہ میں نے بیعت اپنے اختیار سے کی ہے، اور اگر جبری ہوتی تو پہلے دن ہی ہو جاتی۔

آپ بتانا چاہتے تھے کہ اگر جبراً بیعت ہوتی تو پہلے دن ہوتی یا چھ ماہ کے بعد ہوتی؟ جبراً بیعت پہلے دن ہوتی۔ تو جب انہوں نے چھ ماہ بعد کی، تو لوگوں کو دکھانے کے لئے کہ کوئی شخص آئندہ تاریخ میں اسے اس موڑ سے نہ موڑے کہ جبری بیعت ہوئی تھی اور صحابہ نے خلافت پر جبری قبضہ کیا تھا، اگر جبری قبضہ ہوتا تو حضرت علی کی بیعت پہلے دن ہوتی۔

بہر حال اس وقت اللہ تعالیٰ نے نیا جواب سمجھایا کہ وہاں پورے مجمع میں ایک سکون پیدا ہو گیا۔ اور جو اب تک پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق عمر رضی اللہ عنہما زور سے اقتدار پر آئے تھے!؟ تو سامعین بتایئے! اگر زور سے اقتدار پر آتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کب ہوتی؟ (سامعین: پہلے) تو اگر پہلے دن نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ اسلام میں، اس سوسائٹی میں مسلمانوں میں ایک تصور یہ تھا کہ بیعت کوئی کرے ایک بات، یا پھر مقابلے میں آئے دوسری بات، یا پھر خاموشی اختیار کرے تیسری بات، تو یہ تینوں طرح کے Element ہو سکتے ہیں۔[1]

---

(1) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تھی۔ اس پر یہاں حضرت مولانا عبد الستار تونسوی رحمہ اللہ کی ایک تحریر ہدیہ قارئین کی جاتی ہے:

جناب علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور ان کے پیچھے نمازیں

پڑھنا اور باہم مشورے کرنا اور ہر طرح کی عبادات و معاملات میں ان کے ساتھ شریک و شامل رہنا کتب معتبرہ سے ثابت اور تاریخ اسلام کا نہایت زریں باب ہے اور اخوت صحابہ کی اپنی جگہ بہترین مثال ہے۔ اہل سنت کی کتابوں میں تو یہ مضمون بکثرت موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ شیعہ حضرات کی نہایت معتبر روایات میں بھی اس قسم کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔ شیعہ کی معتبر کتاب احتجاج طبرسی مطبوعہ نجف اشرف کے صفحہ 52 پر حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے:

ثم تناول ید ابی بکر فبایعه

پھر علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ان سے بیعت کی۔

اور اسی احتجاج طبرسی کے صفحہ 56 پر موجود ہے:

قال اسامه له بایعته فقال نعم یا اسامة

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا آپ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر چکے ہیں، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں بیعت کر چکا ہوں۔

اور روضہ کافی صفحہ 115،139 اور کشف الغمہ صفحہ 68 اور حق الیقین، جلد اول 148،138 اور شرح نہج البلاغہ درہ نجفیہ صفحہ 88 اور جلاء العیون فارسی صفحہ 88، غزوات حیدری وغیرہ کتب شیعہ میں مختلف طریقوں سے جناب علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہونا ثابت ہے۔

جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جناب علی المرتضی رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پیر و مرشد تو جناب سید الاولین والآخرین جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جناب صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جو بیعت کی تھی یہ بیعت خلافت تھی۔ اور شریف مرتضی علم الہدی شیعہ کے مجتہد اعظم نے اپنی معتبر کتاب الشافعی کے صفحہ 398 پر لکھا ہے:

ثم مد یده فبایعه

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی۔

اگر جناب علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دیانت و صداقت پر پورا پورا اعتماد نہ ہوتا اور ان سے عقیدت و محبت نہ ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے دیندار و دلاور انکے ہاتھ پر کبھی بیعت نہ کرتے، جن کے بیٹے حضرت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیز و اقارب اور ساتھی کٹوا دیئے اور خود بھی جان دیدی مگر فاسق فاجر کے ہاتھ پر بیعت گوارا نہ کی۔ ع

کٹا کر سر شہ کرب و بلا نے یہ بتایا ہے
در باطل پہ جھک سکتی نہیں مومن کی پیشانی

شام سے امیر معاویہؓ کی وفات کی خبر

تاہم اب جب شام سے خبر آگئی کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور یہ بھی خبر آگئی کہ اب جانشین یزید بنا ہے، تو جو مدینہ کا گورنر تھا، اس نے سرکاری حیثیت میں بڑے صحابہ کی اولادوں اور مریدوں کو جمع کیا کہ اب جو نیا حکمران ہے اس کے لئے تم میرے سامنے بیعت کرو، تاکہ حکومت کو میں اطلاع دے سکوں کہ سب نے اس حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔

اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے وہاں کیا کہا تھا؟ میں نے پچھلی کسی مجلس میں بتایا تھا کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں ذرا سوچنے کا موقع دو، ہم ابھی فیصلہ نہیں کرتے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی کہا تھا کہ ہم ابھی فیصلہ نہیں کرتے، ہمیں ذرا سوچنے کا موقع دو۔ تو جو مدینہ کا گورنر تھا، اس نے کہا ٹھیک ہے، "آپ سوچ لیں"، کوئی بات نہیں۔ وہ لوگ نیک تھے ان کے دلوں میں تلخیاں نہیں تھیں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے سوچو۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی خواہش

اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو چلے ہیں، اس سے جو بات مجھے سمجھ آئی ہے وہ یہ کہ حضرت حسین حکومت کے خلاف نہیں نکلے تھے۔ حکومت کے خلاف نکلتے تو شام کی طرف جاتے، اور وہ یزید کی بیعت کرنے کے لئے خوش بھی نہ تھے!! وہ چاہتے تھے کہ مجھے ایسا ماحول مل جائے جہاں میں اکیلا رہ سکوں، بغیر بیعت کیے رہ سکوں۔ سب کے ساتھ نمازوں میں شرکت کروں، مسلمانوں کے ساتھ رہوں۔ جس طرح "حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ" کی پوزیشن تھی، اس پوزیشن میں یہ اپنا وقت گزارنا چاہتے تھے۔

کیونکہ ان کے دوستوں کی، حامیوں کی اور ہمدردوں کی آبادی کا بظاہر اَزیادہ حصہ کہاں تھا؟ عراق میں۔ آپ عراق والوں کے پاس ایسے انداز میں رہنے کے لیے جا رہے تھے کہ آپ

بھلا جس کے بیٹے کی ایمانی استقامت و حمیت کا یہ حال ہو اس کے باپ کی نسبت یہ گمان ہو سکتا ہے کہ وہ شیر خدا ہو کر بخوف جان یا بطمع مال و دنیا کسی غاصب کے ہاتھ پر بیعت ہو۔

(خلفائے راشدین، ج:1، ص:200)

وہاں خوش رہ سکیں اور انہیں کوئی مجبور نہ کر سکے۔ مدینہ منورہ میں ان کا اپنا ہم عمر دوستانہ حلقے کے لوگ کم تھے کیوں کہ یہ باہر عراق رہے تھے۔ حضرت حسین نے جو مدینہ سے عراق نقل مکانی کی تھی تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی زندگی اختیار کرنا چاہتے تھے کہ میں اپنے طور پر خاموشی اختیار کروں۔ امت کے سارے کاموں میں شریک بھی رہوں، لیکن سیاست سے میں کنارہ کش رہوں۔ کیونکہ اگر میں مدینہ منورہ میں رہا تو مجھے یزید کی سیاست میں شامل ہونے کے لیے کہا جائے گا۔ جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نہ چاہتے تھے۔ آپ یزید کی سیاست میں شرکت نہ کرنا چاہتے تھے۔

حکمران کے برسرِ اقتدار آنے پر تین صورتیں

سو جب کوئی نیا حکمران آئے تو تین ہی صورتیں ہیں:

- یا تو اسے مانا جائے
- یا تو اس کے مقابلے میں نکلے
- یا تو خاموشی اختیار کرے

اب جب لوگ اس مسئلہ کربلا پر غور کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جی یزید کی بیعت کرنی چاہیے تھی یا نہیں؟ اور جو کہتے ہیں کہ "نہیں" پھر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مقابلہ کیلیے کیوں نکلے! حالانکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ مقابلہ کے لیے نہیں نکلے تھے۔

پرانے دور میں دیہات میں محرم کے دن آتے تو ایک رسالہ ملتا، مجھے یاد پڑتا ہے وہ چار صفحات پر مشتمل ہوتا اور اس کا نام "جنگ نامہ کربلا" تھا، جس میں باقاعدہ جنگ کا ذکر تھا کہ جس طرح لوگ جنگ کے لئے نکلتے ہیں۔

تو سامعین سوچیں! عورتوں بچوں کے ساتھ کبھی کوئی جنگ کے لئے آیا ہے!! مگر مرثیے پڑھے جاتے ہیں جیسا کہ جنگ نامہ کربلا میں تھا:

وہ اشتیاق جنگ میں تھے لڑکوں کے ولولے
کہ نوجوان کہہ رہے تھے اب ہم لڑیں
وہ اشتیاق جنگ میں تھے لڑکوں کے ولولے

بے تاب تھے کہ دیکھیے تلوار کب چلے
ہر اک چراغِ حق کی لحد کا چراغ تھا
جس پر علی نے کی تھی ریاضت وہ باغ تھا
وہ فاطمہ کی گود کا روشن چراغ تھا

دیہات کے وہ لوگ جو دین کا علم نہیں رکھتے یا تاریخ نہیں جانتے تھے، ان سب میں یہ جنگ نامہ کربلا مشہور تھا۔ عورتیں بھی جب اس سے جنگ کے حالات سنتیں تو بہت روتیں تھیں۔ اور عورتوں کو تو ویسے بھی رونا بہت آتا ہے۔ تو ہم نے انڈیا میں دیکھا ہے، ہندوستان میں اکثر جو مرثیے پڑھتے وہ لکھنؤ کے ہوتے، اور پڑھے جاتے تھے پنجاب کے دیہاتوں میں: "وہ اشتیاق جنگ میں تھے لڑکوں کے ولولے" اشتیاق کا معنی ہوتا ہے شوق ہونا۔ بھائی جنگ لڑی تو جاتی ہے مجبوری میں لیکن "شوق" میں کیا کوئی لڑتا ہے؟ (سامعین: نہیں)[1] لیکن اس شعر کا کیا مطلب ہوا کہ وہ "اشتیاق جنگ میں تھے لڑکوں کے ولولے"

---

(1) اسی موضوع کی مناسبت سے حضرت علامہ صاحب دامت برکاتہم کی مایہ ناز تصنیف "آثار التنزیل" سے ایک سوال اور اسکا جواب نقل کیا جاتا ہے:

"ایک سوال: دین کے جو اعمال خاص حالات میں ہمارے ذمہ آتے ہیں ان حالات کو خود پیدا کرنا تاکہ ان کے متعلقہ احکام پر عمل کیا جاسکے کیا ہمارے ذمہ نہیں؟ اسلام کے وہ احکام جو حکام کے ذمہ ہیں جیسے اجرائے حدود وغیرہ ان پر عمل کرسکنے کے لیے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرنا کیا یہ ہمارے ذمہ ہے؟ اور کیا اس تصور دینی کے ساتھ کوئی غیر مسلم سلطنت مسلمانوں کو اپنے ممالک میں داخل ہونے کی اجازت دے سکے گی؟

جواب: ایسی کوشش ایک انتظامی مسئلہ ہے اور حالات کی مناسبت سے مندوب و مستحسن ہے لیکن فرض نہیں اور نہ یہ دین کی اساسی دعوت ہے حکومت ملی ہو تو اس کے متعلقہ احکام پر عمل کرنا مسلمانوں پر فرض ہے اللہ کے بندوں کی شان قرآن پاک میں یہ بتائی گئی ہے:

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ (پ۱۷، الحج ۱۴)

ترجمہ: اگر ہم ان کو زمین میں قوت دیں تو وہ نمازیں قائم کریں گے اور زکوۃ دیں گے۔ نیکی

"بے تاب تھے کہ دیکھیے تلوار کب چلے" تو یہ ساری باتیں ان لوگوں کی ترتیب دی ہوئی ہیں جن لوگوں کا جذبہ ہی یہ تھا کہ امت کو لڑانا ہے، اور امت کو لڑانے کے لئے پیچھے یہودیوں کی سازش تھی، "ہر اک چراغ حق کی لحد کا چراغ تھا"، "جس پر علی نے کی تھی ریاضت وہ باغ تھا" کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بطور مالی باغ کی پرورش کرتے رہے اور وہ باغ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شکل میں آیا "جس پر علی نے کی تھی ریاضت وہ باغ تھا"

کئی باتیں ذہن میں آتی ہیں، مگر صرف ایک بات کہتا ہوں کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کربلا میں حضرت حسین مقابلے کے لئے نکلے تو حضرت حسین نے پچاس کم دو ہزار آدمی مارے، یہ "جلاء العیون" میں ہے۔ "جلاء العیون" میں ملا باقر مجلسی لکھتا ہے:

"روایت کردہ اند کہ در آنروز بدست معجزہ نمای خود ہزار ونہ صد و پنجاہ نفر از

کا حکم کریں گے اور برائیوں سے روکیں گے۔

لیکن ان تقاضوں پر عمل کرنے کی خاطر اقتدار لینے کی کوشش کرنا اس کی قرآن پاک میں کہیں دعوت نہیں ملتی۔ مال جمع کرنے کی اس لیے کوشش کرنا کہ انسان زکوۃ دے سکے اس کی قرآن میں کہیں ترغیب نہیں دی گئی۔ ہاں مال اگر جمع ہو جائے تو پھر زکوۃ ادا کرنے کی پوری پابندی کرنی ہوگی۔ مال کا جمع کرنا ہرگز فرض نہیں بعض شرطوں کے ساتھ صرف جائز ہے۔ جہاد اسلام کا ایک بڑا مسئلہ ہے اور یہ اسلام کے کوہان کی چوٹی ہے اس کا ترک ذلت کا پیغام اور اس پر عمل زندگی کا نشان ہے لیکن ایسے حالات خود پیدا کرنا کہ اس مسئلے پر عمل کرنے کی نوبت آجائے یہ امت کے ذمے فرض نہیں۔ ہاں حالات خود پیدا ہو جائیں تو پھر اس پر ڈٹ جانا اور اللہ کے نام پر زندگی سے کھیل جانا یہ نہایت ضروری ہے۔ جہاد فرض ہے لیکن اس فرض پر عمل کرنے کے لیے حالات پیدا کرنا یہ فرض نہیں۔ حالات پیدا ہونے پر جو شہادت ملے وہ بے شک مطلوب ہے لیکن شہید ہونے کے حالات خود پیدا کرنے کی قرآن نے کہیں دعوت نہیں دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لاتمنّو لقاء العدو اسبلو الله العائشه فاذا لقیمتو فا اصبروا

(صحیح بخاری، ج۱، ص۴۴۴)

ترجمہ: تم خود دشمن سے لڑنے کی تمنا نہ کرو لیکن اگر لڑنا پڑ جائے تو پھر ثابت قدم رہو۔"

(آثار التنزیل، ج:2، ص:175)

آن اشقیا بر خال ہلاک انداخت براویت مسعودی ہزار وہشت صد نفر را بسوی عذاب سقر فرستاد"[1]

اس روز امام حسین نے ایک ہزار نو سو پچاس کافران شقاوت اساس کو ہلاک کیا[2] کہ حضرت حسین نے ایک ہزار نو سو پچاس آدمی مارے۔ تو میں نے ایک دفعہ ایک سے پوچھا کہ اتنے سارے لوگ دفن کہاں ہوئے؟! کیونکہ دو ہزار افراد دفن تو کہیں ہوئے ہوں گے؟ تو کیا وجہ کہ کربلا کے واقعات تو تاریخ میں آتے ہیں لیکن ان سینکڑوں کی قبروں کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔!! پھر یہ لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جی وہ تو اتنے برے تھے کہ ان کا جنازہ پڑھنے کو بھی کوئی تیار نہیں تھا!!۔ اللہ کے بندو! اگر وہ اتنے برے تھے، تو حکومت کی طرف سے تو لڑ رہے تھے نا؟ (سامعین: جی ہاں) کس کی فوج تھی؟ حکومت کی۔ تو جب حکومت کی طرف سے فوج آئے گی تو اور کوئی نہ بھی ہو کم از کم حکومتی لوگ تو کہیں گے کہ جنازہ پڑھیں؟ او بھائی! ابن زیاد "نہ" پڑھتا، شمر ہی پڑھتا؟ پھر "جواب دیا"، ان کا "جنازہ ہی حرام تھا"۔

اللہ کے بندو! عقل انسانی سوال کرتی ہے کہ انسانی سوسائٹی میں، مسلمانوں میں ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو اگر وہ زمین پر ہی رہے تو کیا ان کی لاشوں کو نوچنے کے لئے آسمان سے گدیں اتریں گی؟ جب جانور مر جائے تو اس کو باہر جنگل میں چھوڑ آتے ہیں تو اسے کھانے کے لئے گدیں اترتی ہیں کہ نہیں؟ (سامعین: اترتی ہیں)۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لاشیں گئی کہاں؟ جب پتا نہیں لگتا کہ وہ کہاں گئیں تو اس طرح کیوں نہیں کہتے کہ اس طرح کے یہ جھوٹے قصے ہیں لڑائی کے، کہ اتنے ہزار مار دیئے۔ ایسے واقعہ نہیں ہوا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ظلماً شہید کیا گیا، وہ مظلوم ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے اسے جنگ بنانے کے لئے کہا کہ نہیں، وہاں ایک ہزار نو سو پچاس قتل کئے تو لڑائی وہاں ہو رہی تھی اور گن یہ رہے تھے!؟

---

(1) جلاء العیون (فارسی)، ج:2، ص:576۔

(2) جلاء العیون، ج:2، ص:251۔

اہل سنت کی مجالس میں ہمیشہ قرآن و سنت کا حوالہ دیا جاتا ہے

چنانچہ ان کی مجلسوں میں جب جائیں تو قرآن و حدیث کی بات نہیں کرتے ”میں بچپن میں ان کی مجلسوں میں گیا ہوں اور انہیں سنا ہے۔ تو انہوں نے باتیں کرنی ہوں تو شروع ہی یہاں سے کرتے ہیں کہ راوی کہتا ہے، راوی کہتا ہے، اور جب اہل سنت والجماعت کی مجلس ہو تو وہ کہتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے، پیغمبر کی زبان، رسالت کا اعلان، صحابہ واہل بیت کا فرمان، اماموں کا فرمان یہ ہے۔ لیکن ان کے ہاں راوی کہتا ہے۔ اور ایک صفحہ پہ کئی کئی جگہ ”راوی کہتا ہے“”راوی کہتا ہے“۔

تو کئی لوگ پوچھتے ہیں کہ ”راوی کیا ہوتا ہے؟

میں نے کہا ”راوی جس طرح چناب ہوتا ہے“

تو میں کسی زمانے تقریروں میں ایک جملہ کہا کرتا تھا کہ برادران کرام ”راوی کے کنارے جھونپڑیاں نہ ڈالو“ راوی جب طغیانی پر آتا ہے تو بڑوں بڑوں کو ڈبو دیتا ہے، اللہ راوی کی طغیانی سے بچائے۔ اُن دنوں راوی میں طغیانی بھی آتی تھی، اب تو ملک تقسیم ہونے کے باعث دریاؤں کے نکلنے کے مواقع انڈیا میں ہیں۔ اب راوی خشک ہے، اب جب کبھی راوی کے کنارے سے گزرنا ہوتا ہے، تو کہتے ہیں۔ ع

اے لب راوی بتا ان رفتگاں کا ماجرا

(وہ پہلے دور میں جو بہاریں تھیں وہ ایک قصہ تھا)

اے لبِ راوی بتا ان رفتگاں کا ماجرا
کل تجھ پہ جن کا راج تھا انجام ان کا کیا ہوا

آج راوی کا پانی خشک اور وہاں سے جب بسیں گزرتیں ہیں، سڑکیں گزرتی ہیں تو اب اس بات کا مزہ نہیں۔ لیکن اُسوقت جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اُسوقت اس میں طغیانی تھی۔ تو میں نے کہا ”راوی کے کنارے جھونپڑی نہ بناؤ، پتہ نہیں کس وقت طغیانی آ جائے“۔

تاہم ان کی بنا کس پر ہے؟ کہ ”راوی کہتا ہے“”راوی کہتا ہے“۔ اب اگر کسی راوی

نے یہ کہا کہ جی حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اتنے لوگ مارے، تو ہم نے نہیں کہا کہ نہیں مارے، ہم نے کہا کہ اگر مارے تو ان کی لاشیں کدھر گئیں؟؟ ہاں جی! کیا یہ بات سوچنے کی ہے یا نہیں؟! میرے سامنے ایک نے جواب دیا کہ وہ ایسے لوگ تھے کہ ان کا جنازہ پڑھنا ہی جائز نہ تھا۔ اس لئے نہ کسی نے جنازہ پڑھا، نہ دفن ہوئے۔ تو میں نے کہا کہ چلو اگر نہیں دفن ہوئے تو کم از کم اتنا ہی کہیں آتا کہ چیلیں اتریں تھیں اور چیلوں نے انہیں کھایا تھا۔

عبوری دور میں امکانی صورتیں تین ہی بنتی ہیں

تو میں بات یہ کر رہا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب مدینہ منورہ میں تھے تو ان کا لڑنے کا قصد نہیں تھا۔ اگر لڑنے کا قصد ہوتا تو آپ یزید کے مقابلے کے لئے نکلتے، آپ ”شام جاتے، عراق نہ جاتے“۔ جب کہ وہ عراق گئے اور اپنے پرانے دوستوں کے پاس گئے تاکہ میرے ہمدرد، میرے ساتھ ہوں گے۔ تو کوئی جبراً مجھ سے بیعت نہیں کرائے گا، میں خاموشی اختیار کروں گا تو میرا مقابلہ کسی سے نہیں ہوگا، یا میں کسی دور کے علاقے میں اپنی زندگی کے دن گزار لوں گا۔ تو کیا جنگ کے لیے جانے والا بیوی کو، بہن کو، بچوں کو، ساتھ لے کر جاتا ہے؟

تو یہ کیسے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ جی آپ لڑنے کے لئے نکلے تھے۔ ہمیں جب لوگ کہتے ہیں کہ جی حضرت حسین کے ساتھ نکلا ہی کوئی نہیں، تو میں کہتا ہوں کہ ”نکلتے تب جب حضرت حسین آواز دیتے“ کہ میں لڑنے کے لیے جا رہا ہوں۔ جب یہ اس لیے نکلے ہی نہیں تو آواز کیا دیتے۔!! بہر صورت میں نے بتایا کہ ایسے موقع پر امکانی صورت عمل کیا ہے؟ تین صورتیں ہیں یا تو بیعت ہو جائیں۔

- یا مقابلہ کا اعلان ہو جائے
- اور یا خاموشی کا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق نیک گمان

تو حضرت حسین کے بارے میں نیک گمان کیا ہے؟ یہ تو پکی بات ہے کہ آپ لڑنے

کے لئے نہیں نکلے اور یہ بھی پکی بات ہے کہ یزید کی زندگی ایسی طرز کی تھی جو پسندیدہ نہیں تھی۔ تو حضرت حسین اس فوج کے ساتھ وفا کا عہد کریں یا بیعت کریں وہ ان کے مقام کے خلاف تھا۔ تو تیسری صورت ایک ہی ہے کہ وہ عراق میں ایسی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے کہ جس میں نہ کوئی فساد ہو اور نہ کوئی آزمائش ہو۔ آپ نے اکثر یہ سنا ہو گا کہ اہل عراق نے بڑے خط لکھے تھے تو انہوں نے کیا خط لکھے تھے؟ خط یہی لکھے تھے کہ "ہم آپ کے پرانے دوست ہیں" آپ کے والد کے پرانے خادم ہیں، اس لیے آپ یہاں آ جائیں۔ ہم آپ کو سر آنکھوں پر اٹھائیں گے۔ تو انہوں نے انکو اپنی طرف سے اچھی سوسائٹی میں آنے کے لئے کہا اور اسی کی پیشکش کی کہ آپ یہاں آئیں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب حجاز سے چلے تو وہ ان کے خطوط کی وجہ سے چلے۔ تو وہ اس ارادے کی وجہ سے چلے کہ میں وہاں جا کر آرام کی زندگی بسر کروں، وہاں مجھے کوئی مجبور نہیں کرے گا۔ اب جنہوں نے بلایا تھا ان کے متعلق معلوم ہوا کہ عراق کے لوگ اپنی وفائیں بڑی جلدی بدلتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تقریریں بھی ان لوگوں کے خلاف ہیں۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات

مجھے موضوع سے ہٹ کر ایک واقعہ یاد آ رہا ہے کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہاں رہتے تھے؟ جہاں حضرت علی المرتضیٰ پہنچے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے دور میں اسی جگہ عراق کے رہنے والے تھے۔ سو آپ جب حج پر آئے تو ایک دفعہ مدینہ منورہ میں آپکی ملاقات حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ہوئی۔ حضرت امام مالک علمِ حدیث کے بہت بڑے امام تھے۔ اور آپ کی بڑی شہرت تھی۔ اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اپنی شہرت بھی بہت تھی۔ تو امام ابو حنیفہ نے امام مالک کو دیکھا ہوا نہیں تھا، انہوں نے کہا چلو جی حضرت امام مالکؒ کی زیارت کریں۔ امام مالکؒ ان سے عمر میں ذرا چھوٹے تھے اور امام ابو حنیفہ بڑے تھے۔ تو انہوں نے کہا "چلو جی امام مالک کے پاس چلیں"۔ سو یہ امام مالک کے پاس پہنچے "سلام کیا" تو امام مالک نے کہا کہ "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ تو امام صاحب نے کہا "مِنَ الْعِرَاقِ" تو امام مالکؒ نے ذرا دل لگی کے پیرائے میں کہا "عراق من اھل النفاق"

کہ عراق کے لوگ وہ ہیں جنہوں نے نفاق کیا، آپ کا اشارہ تھا حضرت حسین والے واقعہ کی طرف کہ عراق والوں نے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ بے وفائی کی تھی:

حسینی قافلہ صحراء کی جن راہوں سے گزرا تھا
وہ راہیں آج تک اس قافلے کو یاد کرتی ہیں

امام مالکؒ نے فرمایا "عراق من اھل النفاق"۔ امام مالکؒ کو ان کوفہ والوں کا عمل یاد آیا۔ امام صاحب نے کہا تھا کہ "میں عراق سے ہوں" تو امام مالک نے کہا "عراق من اھل النفاق"۔ اب امام صاحب چپ ہیں کیوں کہ اگر یہ سامنے آجاتے تو تعارف کروانا پڑتا؟ کہ کون ہوں؟ امام مالک نے بھی امام صاحب کا نام تو سنا ہوا تھا لیکن پتہ نہیں تھا کہ یہ میرے سامنے وہی ہیں۔ تو امام صاحب اتنی بات کر کے اور سن کے کہیں چلے گئے، اور کچھ دیر بعد پھر آئے، اور "کہنے لگے" حضرت میں آپ سے کوئی علم کی سند لینا چاہتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ امام صاحب بڑے تھے، اور امام مالک ان سے چھوٹی عمر کے تھے، یعنی گو آپ چھوٹے ہیں مجھ سے لیکن چونکہ "مدینہ" میں بیٹھے ہیں تو میں آپ سے سند لینا چاہتا ہوں۔

امام صاحب نے کہا کہ سند کے لیے آپ مجھے قرآن کی ایک آیت پڑھا دیں، یا میں پڑھتا ہوں، آپ سن لیں۔ امام مالک نے فرمایا کہ "آپ پڑھیں قرآن کی آیت" تو امام صاحب نے آیت پڑھی تو میں (حضرت علامہ صاحب) وہ آیت پڑھتا ہوں۔ لیکن امام صاحب نے غلط پڑھی۔ جو حافظ ہیں وہ سمجھیں گے کہ میں غلط پڑھ رہا ہوں۔

(تو میں چونکہ قصہ بیان کر رہا ہوں) تو امام صاحبؒ نے سند لینے کے لئے جو آیت پڑہی امام مالکؒ کے پاس تو وہ میں پڑھتا ہوں:

وَمِمَّنۡ حَوۡلَكُمۡ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ وَمِنۡ اَهۡلِ الۡعِرَاقِ

تمہارے ارد گرد منافق پھیلے ہوئے ہیں اے مسلمانو "وَمِمَّنۡ حَوۡلَكُمۡ" تمہارے ارد گرد "منافقون" منافق پھیلے ہوئے ہیں، یہ منافق بھی مسلمانوں میں گھسے ہوئے تھے۔ آگے امام صاحب نے فرمایا "وَمِنۡ اَهۡلِ الۡعِرَاقِ" تو آیت اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ آیت اس طرح ہے:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
وَمِمَّنۡ حَوۡلَکُمۡ مِّنَ الۡاَعۡرَابِ مُنٰفِقُوۡنَ ۛؕ وَمِنۡ اَہۡلِ الۡمَدِیۡنَۃِ ۛ
مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ ۟ لَا تَعۡلَمُہُمۡ ؕ نَحۡنُ نَعۡلَمُہُمۡ (پ10، التوبہ 101)

امام مالک نے فرمایا کہ "جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا"

تو امام صاحب نے جب یہ آیت پڑھی تو امام مالک بڑے ذہین تھے، انہوں نے کہا "وہ میں نے جو کہا تھا نا کہ کہاں سے آئے؟ انہوں نے کہا تھا "من اهل العراق" تو میں نے کہا تھا "من اهل النفاق" تو "عراقیوں پر نفاق" تو آیت انہوں نے وہ پڑھ دی جس میں آیا "منافقون" لیکن امام مالک حیران ہو گئے، امام مالک نے کہا بہت توجہ کر کے کہ آپ ہیں کون؟ انہوں نے کہا "لوگ مجھے ابو حنیفہ" کہتے ہیں۔ تو امام مالک نے کہا "جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا"۔ مطلب یہ تھا کہ یہ آیت پڑھ کر اسوقت جواب نہیں دیا اگر اسوقت جواب دیتے تو قرآن کی جو آیت ہے اس میں مدینہ کا لفظ ہے، اس لیے اس کی بے ادبی کا ڈر تھا کہ انہوں نے عراق کو بچانے کے لیے یہ آیت پڑھی ہے۔

اور جب کہا کہ مجھے علم کی سند دے دیں اس سے معلوم ہوا کہ ان میں کوئی تکبر نہیں، غرور نہیں تھا۔ سو آپ نے آرام سے پڑھا:

وَمِمَّنۡ حَوۡلَکُمۡ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مُنَافِقُوۡنَ وَمِنۡ اَہۡلِ الۡعِرَاقِ مَرَدُوۡا عَلَی النِّفَاقِ

تو پھر امام مالک نے ان کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی اور حیران ہو گئے کہ جیسا سن رکھا تھا انہیں ویسا ہی پایا۔ (امام صاحب کی تعلیمات میں انسان حیران ہو جاتا ہے کبھی اس عنوان پر تقریر ہو تو میں سناؤ کہ کس طرح ان کی "Approach" تھی سوچنے کی)۔

حضرت علی کی اپنے ماتحتوں کے متعلق رائے

تاہم میں عراق والوں کے بارے میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضرت علیؓ نے بھی اپنے وقت میں عراق والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ جیسا کہ ان کے پانچویں صدی ہجری کے

ایک علامہ رضی ہوئے ہیں، انہوں نے حضرت علی کی ایک تقریر نقل کی ہے کہ: اے عراق کے لوگو!

ایها الشاهدة ابدانهم (نہج البلاغہ جلد اول خطبہ 95 صفحہ 286)

تمہارے بدن تو میرے سامنے حاضر ہیں مگر تم چلتی ہوئیں لاشیں ہو "الغائبة عقولهم" تمہاری عقلیں غائب ہیں، میں حیران ہوں کہ تم کبھی بھی میرے ساتھ وفاء نہیں کرتے۔

یہ عہد توڑنے میں، وفا بدلنے میں اول نمبر پر ہیں۔ جب حضرت حسین کو انہوں نے خط لکھے تھے کہ "ہم آپ کے خادم ہیں"، آپ یہاں آئیں اور بالکل آرام سے رہیں، آپ کو بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں، کوئی شخص پکڑ دھکڑ نہیں کر سکے گا، مدینہ میں آپ کے لیے اس قسم کا ماحول نہیں ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ عراق کیوں جارہے تھے؟

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان (کوفہ والوں) کے پاس امن وچین اور خاموش زندگی گزارنے کے لیے جارہے تھے۔ چنانچہ جب ابن زیاد کے حکم پر اس کے کارندوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بیعت کرنے کا کہا تو حضرت حسین نے جو شرطیں پیش کی تھیں، ان میں ایک شرط یہ پیش کی تھی کہ "مجھے یا تو واپس جانے دو، مدینہ ہی"۔ یا مجھے کسی سرحدی علاقے میں خاموش زندگی گزارنے کا موقع دو۔ تو اس میں غور کریں کہ حضرت حسینؓ نے کہہ دیا کہ "میں لڑنے کے لئے نہیں آیا"۔ کیا یہ لائنیں اور یہ سطور نہیں بتارہیں کہ آپ لڑنے کے لئے نہیں آئے؟ سو اس سے پتہ چلا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ارادہ جو تھا وہ اقتدار نہیں تھا، نہ آپ اقتدار کے بھوکے تھے۔

اب حضرت حسنؓ نے جب حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت قبول کی، تو "امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی پتا تھا" کہ "حسن" اکیلے نہیں، بلکہ ان کے پیچھے پورا صوبہ ہے "عراق کا" اور دوسرے علاقے بھی۔ (عراق جہاں حضرت حسن کی حکومت ہے)۔

امام حسین کا کربلا میں داخل ہونے سے قبل خطبہ

تاہم اگر یزید خود آجاتا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قدموں پر تو انہوں نے اقتدار اس سے مانگنا نہیں تھا، یہی کہنا تھا کہ اپنی زندگی کو پاکیزہ بناؤ، تاکہ مسلمانوں کی خدمت ہوسکے۔ تو آپ جب یہ کہتے تو یزید نے انکار کرنا تھا؟ "کیا پتہ حضرت امام حسین کے رعب اور سمجھانے سے بات مان جاتا؟"

دوسری طرف ابن زیاد وغیرہ چاہتے تھے کہ یہ ماحول پیدا نہ ہو، اس لیے اس نے ایک ایک کو پکڑ کے سختی کی۔ اور ان لوگوں کی وفائیں بدل گئیں۔ تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب پہنچیں ہیں عراق میں تو آپ نے آواز دی کہ اے کوفہ کے رہنے والو! نام لیکر کر کہ فلاں فلاں یہ تمہارا خط ہے!! "وہ خطوط حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس تھے "لیکن آگے ہاں کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ تو حضرت حسین کو معلوم ہوگیا کہ ان کی وفائیں جفاؤں میں بدل گئی ہیں۔ میں نے گزشتہ کسی مجلس میں کہا تھا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مسلم بن عقیل کو آگے بھیجا تھا۔ مسلم بن عقیل حضرت حسین کا کزن تھا۔ آپ نے اس کو پہلے بھیج دیا کہ تم جا کر پتہ کرو کہ عراقیوں نے جو مجھے بلایا ہے تو کیا وہ مجھے اپنی آغوشِ محبت میں اور دامنِ وفاء میں لینے کو تیار بھی ہیں کہ نہیں؟

مسلم بن عقیل رحمۃ اللہ علیہ

یہ مسلم کس کے بیٹے تھے؟ "عقیل کے" اور عقیل کون تھا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ یہاں ایک بات ضمنی یاد رکھیں کہ حضرت علی کے والد کا نام کیا تھا؟ "ابو طالب" تو ابو طالب کے چار بیٹے تھے۔ ایک ان کا بیٹا تھا "جعفر"۔ جعفر کے ایک بیٹے کا نام تھا "عبد اللہ"۔ یہ عبد اللہ اس وقت مدینہ منورہ میں تھے جب حسینی قافلہ چل رہا تھا۔ تو جب لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ عراقیوں کی بات پر وہاں نہ جائیں تو ان میں عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ خیر ابو طالب کے بیٹے کا نام ہے "جعفر" اور ایک بیٹے کا نام "علی" تو یہ دونوں شروع میں ہی مسلمان ہوگئے، جعفر بھی مسلمان علی بھی مسلمان۔ اور دو

بیٹے اور تھے ایک کا نام تھا "عقیل"، اور ایک کا نام تھا "طالب"، طالب جس کا نام تھا اس کی وجہ سے ان کے والد "ابو طالب" کہلاتے تھے۔ ابو طالب کا معنی ہے "طالب کا باپ"۔ تو ایک ہے طالب اور ایک ہیں "عقیل"۔ تو طالب مسلمان نہیں ہوا اور عقیل بھی شروع اسلام میں مسلمان نہیں ہوئے بلکہ حضرت عقیل بہت بعد میں مسلمان ہوئے۔[1] ان

---

(1) اس موضوع سے متعلق حضرت علامہ صاحب سے کیا گیا ایک استفسار اور اسکا جواب نقل کیا جاتا ہے:

"سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے کتنے بیٹے تھے؟ ان کی وفات پر ان کے کس کس بیٹے نے وراثت پائی؟ کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنے باپ کی وراثت سے کچھ حصہ ملا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ حضرت ابو طالب اپنی پوری عمر اپنا ایمان چھپاتے رہے اور ظاہری یہی کرتے رہے کہ میں اہل مکہ کے دین پر ہوں۔ اس باب میں اہل سنت کا عقیدہ کیا ہے؟

الجواب: حضرت ابو طالب کے چار بیٹے تھے: 1 طالب، جس کے نام پر آپ کی کنیت ابو طالب تھی۔ 2 عقیل بن ابی طالب 3 حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو غزوہ موتہ میں بطور سالار شہید ہوئے۔ 4 حضرت علی رضی اللہ عنہ چوتھے خلیفہ راشد۔ یہ حضرت جعفر سے 10 سال چھوٹے تھے۔

ان چاروں میں عقیل اور طالب مسلمان نہ ہوئے تھے اور حضرت جعفر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں اسلام میں آئے۔ ان دونوں کو اس لئے املاک ابی طالب سے کچھ حصہ نہ ملا کیونکہ یہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کی املاک پر طالب اور عقیل کو ہی جاتی تھیں جو دائرہ اسلام نہ ہوئے تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ وہ واحد جلیل القدر صحابی ہیں جن کا نام قرآن کریم (پ:23، الاحزاب) میں مذکور ہے، وہ بیان کرتے ہیں:

وكان عقيل ورث ابي طالب هو وطالب ولم يرثه جعفر ولا علی شیاء لا نهما كانا مسلمين وكان عقيل وطالب كافرين (صحیح مسلم، ج:1، ص:436)

ترجمہ: عقیل اور طالب اپنے باپ ابو طالب کے وارث ہوئے اور آپ کی وراثت حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کچھ نہ ملی کیونکہ یہ دونوں اسلام لا چکے تھے سو

عقیل کے بیٹے کا نام ہے "مسلم"۔

تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ کئی لوگ سوال کرتے ہیں کہ "ابو طالب اسلام لائے تھے یا نہیں؟ تو میں ایسے سوال کا جواب ذرا کم دیتا ہوں، تاہم میں نے کہا کہ میں اس سوال کا صرف اتنا جواب دیتا ہوں کہ ابو طالب جب فوت ہوئے تو انکی جو جائیداد تھی یا ان کا جو مکان تھا اس کے وارث کون ہوئے؟ حدیث کی کتابوں میں یہ ذکر آتا ہے اور تاریخ نے بھی اس شہادت کو محفوظ کر لیا۔ کہ ابو طالب کی پوری جائیداد کے وارث ہوئے تھے عقیل اور طالب۔ کیوں؟ اس لئے کہ دوسرے بیٹے "دو جعفر اور علی مسلمان" ہو گئے تھے اور قانون یہ ہے کہ کافر کی وراثت مسلمان نہیں پاتے، قانون شرع کے مطابق جو دائرہ اسلام میں نہیں اسکو بھی مسلمان کی وراثت نہیں مل سکتی "لایرثُ المسلمُ الکافرَ" کافر کے مسلمان وارث نہیں ہوتے اور مسلمان کافر کے وارث نہیں۔ کسی کے بیٹے ہوں پانچ اور ایک قادیانی ہو جائے تو اسکی پوری وراثت چار کو ملے گی پانچویں کو نہیں ملے گی، کیونکہ "غیر مسلم مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا" آپ کے ذہن میں یہ بات آگئی؟ (سامعین: جی)۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ ابو طالب کے کتنے بیٹے تھے؟ چار تو وراثت کن کو ملی؟ دو کو، اور دو کو نہیں ملی۔

فتح مکہ اور فوج ظفر موج جب آئی

ضمنی واقعہ یاد آگیا، وگرنہ میں تو چاہتا تھا کہ آج ہی کربلا پہ پہنچ جائیں اور بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا۔ لیکن واقعہ یاد یوں آیا کہ حضور ﷺ نے جب مکہ فتح کیا! تو مکہ دن کے وقت فتح ہوا۔ سو وقت تو گزر جاتا ہے، وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اب جب شام ہونے لگی تو

وہ ابو طالب کے وارث ہوئے۔

جناب پیر مہر علی شاہ صاحب بھی لکھتے ہیں:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابو طالب کے واسطے یہی چاہتے تھے کہ وہ اسلام لاویں اور ظہور میں ایسا نہ آیا جس سے صاف پایا جاتا ہے کہ جب نبی کو کلی اختیار نہیں تو ولی کو کس طرح ہو (مکتوبات طیبات، ص:127، طباعت اول)۔۔۔ (عبقات، ج:2، ص:378)

حضور ﷺ رہنے کے لیے جائیں کہاں؟ لشکر اسلام تو مکہ میں آیا، وہ اللہ کے گھر میں حاضر ہوئے، حرم شریف میں حاضر ہوئے، کعبہ میں حاضر ہوئے، تو "فوج ظفر موج جب آئی" تو یہ پوری سطوتِ اسلام اور شوکتِ اسلام کا نشان تھا۔ لیکن جب شام ہوئی تو کسی شخص نے آکر حضور ﷺ کو کہا کہ "حضور اب تو شام ہو رہی ہے تو آپ اپنے گھر میں آئیں"۔ تو بے ساختہ حضور ﷺ کے منہ مبارک سے نکلا کہ "عقیل نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے؟ مطلب یہ تھا کہ ابو طالب کی وراثت تو لے گئے "عقیل اور طالب ہی" علی رضی اللہ عنہ کو تو نہیں ملی جو مسلمان ہوئے تھے۔ تو حضور ﷺ کی پارٹی تو حضرت علی تھی، تو آپ نے فرمایا: عقیل نے ہمارے لیے چھوڑا ہی کیا ہے۔ سو اس سے جناب ابو طالب کے ایمان نہ لانے کی توثیق ہوتی ہے، کہ وراثت عقیل اور طالب کو ملی، حضرت علی و جعفر رضی اللہ عنہما کو نہیں ملی۔ تو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے بے ساختہ نکل آیا کہ عقیل نے چھوڑا ہی کیا ہے اس لیے آپ وہاں نہیں گئے۔

تو میں آپ حضرات کی توجہ اس طرف دلا رہا ہوں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پہلے عقیل کے بیٹے مسلم کو بھیجا۔ جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خبر بھیجی کہ جی وہاں تو "دوست کوئی نہیں" یزید کے کارندے وہاں پہنچ چکے ہیں، اور ان سب کی وفا جفا میں بدل چکی ہے۔ تو حضرت حسین یہ سن کر بہت پریشان ہوئے۔ بعض مؤرخین نے یہ نازک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت حسین نے خیال کیا کہ میں پھر واپس چلا جاؤں! جب انکو یہ خیال آیا تو پھر یہاں ایک اصول سامنے آتا ہے کہ حضرت حسین جب مدینہ سے نکلے تو وہ عزت کے ساتھ نکلے تھے کہ میں بیعت نہیں کرتا گو لڑتا بھی نہیں، مقابل میں بھی نہیں آتا لیکن بیعت بھی نہیں کرتا۔ اب راستے سے اگر واپس مدینہ جاتے ہیں، تو مدینہ میں وہ جو پہلے عزت اور مقام تھا وہ رہ سکتا تھا؟ "نہیں"۔ اب اس مقام پر حضرت حسین رضی اللہ عنہ مقام حیرت کے بعد "مقام غیرت" پر پہنچ چکے تھے۔ اللہ والوں پر ایسے اوقات آتے ہیں، کبھی حیرت کے اور پھر کبھی اس سے آگے بڑھتے ہیں غیرت سے۔

سکھوں کا اہل سنت کے متعلق پھیلایا گیا باطل نعرہ

ایک بات اور سامنے آگئی کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ جب بالا کوٹ کے مقام پر سکھوں سے جہاد کر رہے تھے۔ تو ابھی ان کی شہادت شام کو جا کر ہونی تھی کہ عصر کے وقت، جب وہ عصر کی نماز کے لئے آئے ہیں، تو حیرانی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو کہا، یہ مجھے جنت نظر آرہی ہے۔ حالانکہ آپ شام کے وقت شہید ہوئے ہیں، اور اچھے بھلے تھے عصر کے وقت۔ تو انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ مجھے جنت نظر آرہی ہے۔ اسوقت ان کو نہیں پتہ تھا کے شہادت شام کو آرہی ہے، تو کہا کہ "جنت نظر آرہی ہے"۔

بالا کوٹ کے مقام پر کن کا مقابلہ تھا؟ "سکھوں کا اور مولانا اسمعیل شہید کا اور مولانا کے ساتھ سید احمد شہید بھی تھے"۔ تو سکھوں نے بڑا پراپیگنڈا کر رکھا تھا کہ مانسہرہ کے لوگ اور مانسہرہ کے باسی جو ہمارے ساتھ لڑ رہے ہیں یہ وہابی ہیں۔ حالانکہ وہ "اہل سنت والجماعت تھے"۔ لیکن پراپیگنڈا کیا گیا کہ یہ وہابی ہیں۔ کون پراپیگنڈا کر رہا تھا؟ "سکھ" گویا کہ سکھ پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ یہ وہابی ہیں۔ گویا کہ وہاں کے لوگ اتنے ناداں ہیں کہ وہ وہابی کو زیادہ برا سمجھتے ہیں سکھوں کو نہیں۔ سکھ پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ "یہ وہابی" ہیں، لوگو ان سے بچنا، تو سب نے کہا کہ سکھ ٹھیک کہہ رہے ہوں گے۔[1]

تاہم ایک شاعر کہتا ہے:

وہ جسے وہابیہ نے دیا ہے لقب شہید و ذبیح کا
وہ شہید لیلی نجد تھا وہ قتیل تیغ خیار ہے
وہ جسے وہابیہ نے دیا ہے لقب ذبیح و شہید کا
وہ قتیل لیلی نہیں وہ قتیل شیر خیار ہے

تو جو آگے بڑھا تھا قتل کرنے کے لئے وہ خیار سنگھ تھا، سکھ، تو کہا کہ لوگ کہتے ہیں یہ شہید ہے۔ ناں

وہ جسے وہابیہ نے دیا ہے لقب شہید و ذبیح کا

(1) حضرت شاہ اسمعیل شہید رحمہ اللہ کی شخصیت اور تحریک پر مستند معلومات کیلئے حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب مدظلہ العالی کی کتاب "شاہ اسمعیل شہید" کی مراجعت فرمائیں۔

وہ شہید لیلی نجد تھا قتیل تیغ خیار ہے

توسکھوں نے بہت پراپیگنڈا کیا تھا، اور لوگ تو پراپیگنڈا کرنے سے ٹلتے نہیں۔ وہ جیسا کہ پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ایک شہر تھا جس کا نام لائل پور تھا۔ توجب پاکستان بنا تو کوئی Policy تھی کہ جی اس شہر کا نام بدل کر اس کا نام کچھ اور رکھو۔ تو گورنمنٹ کے کسی آدمی نے تجویز پیش کر دی کہ اس کا نام رکھا جائے "فیصل آباد"۔ تو ایک مولوی صاحب تھے، میں ان کا نام نہیں لیتا چونکہ ہم نے تو کربلا کا واقعہ بیان کرنا ہے، تو ایک مولوی صاحب نے نکل کر کہا "فیصل آباد" نام نہ رکھو کیونکہ "شاہ فیصل" جو ہے وہ تو وہابیوں کا بڑا ہے، لہذا اس کے نام پر ہم اپنے شہر کا نام نہیں رکھنے دیں گے۔ تو جب وہ جلسے میں اعلان کر رہے تھے کہ جی "فیصل" وہابی کے نام پر اس شہر کا نام نہیں رکھنے دیں گے اور اس کے لیے ہمیں قربانی دینا پڑی تو دیں گے، لیکن یہ نام نہیں رکھنے دیں گے۔ تو ایک لڑکا کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ "فیصل" تو وہابی ہے لیکن جس کے نام پر "لائل پور" بنا تھا، "لائل" وہ تو "حنفی" تھا۔۔۔ کیا؟ لائل تو تھا نا انگریز؟ اس کے نام پر وہ بنا تھا "لائل پور"۔ مگر وہ لڑکا ان مولوی صاحب کو کہتا ہے، کیا لائل "حنفی" تھا؟ اس پر وہ مولوی صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور ان کا شہر لائل پور اب مستقل طور پر فیصل آباد بن چکا ہے۔

گنڈہ سنگھ وہابی ہو گیا

اب نادان لوگ سمجھتے نہیں۔ جس طرح ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مسجد کے مولوی صاحب تھے۔ ان کو عادت تھی کہ سودا ادھار لینا۔ وہ سودا ایک سکھ دکاندار سے لیتے تھے، جس کا نام "گنڈا سنگھ" تھا۔ تو گنڈا سنگھ کے پاس جب کافی رقم ادھار بن گئی، تو اس نے کہا مولوی صاحب بل زیادہ ہو گیا ہے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے، لہذا مجھے میری رقم دے دیں۔ مولوی صاحب یہ سن کر ناراض ہوئے کہ تم کو کوئی خیال نہیں ہے؟ اس نے کہا جی میری ضرورت ہے، میں مال لاتا ہوں وہاں مجھے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ مولوی صاحب اس بات سے بگڑ گئے اور اسے کہا کہ اچھا جی میں تمہیں دیکھوں گا۔ تو مولوی صاحب نے گاؤں میں اعلان کر دیا کہ بھائی "گنڈا سنگھ" سے سودا نہ لو، کیونکہ گنڈا سنگھ وہابی ہو گیا ہے۔ اور

جب لوگوں کو پتہ چلا کہ اچھا!! گنڈہ سنگھ وہابی ہو گیا ہے تو انہوں نے سودالینا چھوڑ دیا۔ پھر مجبوراً اس سکھ دکاندار نے مولوی صاحب کو کہا کہ مولوی صاحب! آپ کو سارا بل معاف، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، انہوں نے کھانا کھانا ہے، کیوں ظلم کرتے ہو۔ تو مولوی صاحب نے کہا ٹھیک ہے اور پھر یہ اعلان کیا کہ گنڈا سنگھ حنفی ہو گیا ہے تو لوگوں نے پھر سے سودالیناشروع کر دیا۔

بہر حال مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کو عصر کے وقت، آگے کے کچھ مناظر منکشف ہوئے۔ ان کو پتہ چل چکا تھا کہ ان لوگوں نے ہمارے خلاف غلط پراپیگنڈا کیا ہے۔ تو انکو یہ پتہ بھی چل گیا تھا اور وہ اسوقت بھی اپنی جان بچاسکتے تھے لیکن اسوقت شاہ اسمٰعیل شہید اس مقام پر تھے کہ جس مقام کا نام "مقام غیرت ہے" کہ وہ دلجمعی کے ساتھ لڑے، ساری فوجیں ملا کر لڑے اور کامیاب بھی ہوتے رہے لیکن اب تقدیر اللہ کی طرف سے ہے، اور فیصلے تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ آپ اپنی جگہ پورا لڑے لیکن انہوں نے کہا کہ اب اگر بھاگ کر جان بچائیں کہ جی ادھر ادھر ہو جائیں، تو مومن مقام غیرت میں اس بلندی پر ہوتا ہے کہ اس کو پہلے ہی جنت نظر آجاتی ہے۔ سو جنت مولانا اسمٰعیل شہید کی منتظر تھی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا آخری فیصلہ

حضرت حسین کو جب بتایا گیا کہ عراق کے لوگوں نے وفائیں بدل لیں ہیں تو حضرت حسین کے دل میں ایک خیال آیا کہ میں واپس نہ چلا جاؤں! لیکن انکو پھر یہ بھی خیال ہے کہ میں علی رضی اللہ عنہ کا بیٹا ہوں، فاطمہ رضی اللہ عنہا کی گود کا پروردہ ہوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسہ ہوں، اور میں نے اپنی اسلامی احساس کے ساتھ، ایک دین کی شرافت کے ساتھ اگر ارادہ کیا ہے کہ میں یزید کی بیعت نہ کروں اور اب حالات اس طرح کے ہیں کہ میں واپس بھی نہ جاؤں، (جس طرح مولانا اسمٰعیل شہید بالا کوٹ کے مقام پر حیرت سے نکل کر مقام غیرت پر آچکے تھے) تو اب فاطمہ رضی اللہ عنہا کا لعل "مقام غیرت" پر آگیا۔ شہادت کیا ہے؟

شہادت کیا ہے ایک ورثہ محمد کے گھرانے کا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یقین ہو گیا کہ اب مجھے خاموش زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں

ملے گا۔

کیا اسلام میں بیمار کی قربانی قبول نہیں ہوتی؟

یہ موضوع کہ کربلا میں کیا گزری، اگر یہ داستان پوچھنی ہے تو حضرت زینبؓ سے پوچھیئے، جو حضرت حسینؓ کی بہن تھیں، جن کے سامنے یہ نقشہ گزرا۔ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ جی سارے شہید ہو گئے مگر حضرت زین العابدین کیسے بچ گئے؟ حضرت زین العابدین حضرت حسین کے بیٹے ہیں، یہ بھی اپنے والد، اپنی پھوپھی حضرت زینب اور دیگر لوگوں کے ساتھ نکلے ہیں، تو لوگ سوال کرت ہیں کہ جہاں سارے شہید ہوئے وہاں یہ کیسے بچ گئے۔ تو اس کا بیان اگلی مجلس میں آئے گا کہ یہ کیسے بچے؟ لیکن اسکا ایک جواب ملا باقر مجلسی کے پیرو نے دیا کہ "وہ بیمار تھے"۔ تو اس پر میں یہ کہتا ہوں کہ لڑنے اور شہید ہونے میں کبھی تندرست اور بیمار کا فرق ہوتا ہے؟ جس ظالم نے مارنا ہو، کیا وہ کبھی اس لئے مارنے سے رکتا ہے کہ وہ بیمار ہے؟ اور ایک طرف یہ واقعہ، جنگ بنا کر اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ کربلا میں اس طرح معرکہ ہوا کہ تلوار چلانے والے کے لئے تندرست کیا اور بیمار کیا؟ وہ کہتے ہیں نہیں جی یہ اسلام کا مسئلہ ہے کہ "بیمار کی قربانی قبول نہیں ہوتی"، اب دیکھیں ان نادانوں نے مسئلہ کہاں کا کہاں لگا دیا!؟ یہ مسئلہ کہ بیمار کی قربانی نہیں لگتی، یہ مسئلہ ہے بکرے کا کہ بکرا بیمار ہو اس کی قربانی نہیں قبول کی جاتی۔

بہر حال اللہ تبارک و تعالی جل شانہ آپ کے آنے کو قبول فرمائے۔ تو دین کی باتیں بیان کرتے ہوئے ضمنی طور پر جو بات اور واقعات آجاتے ہیں، انہیں اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو ایک ہی موضوع سنتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔ تو میں نے جو ضمنی واقعات ذکر کیے ہیں وہ اس لیے بھی کہ آپ کو اکتاہٹ نہ ہو۔ اللہ تعالی سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

خلاصہ

تو خلاصہ بات کا یہی ہے کہ تاریخ کی Complicated روایتوں کو کہ جس میں راوی یہ کہتا ہے، راوی یہ کہتا ہے، ان پر بغیر تحقیق کیے انہیں مان کر اپنے ایمان کو کمزور نہیں

کرنا۔ ہمارے ایمان کا مدار ہے "قرآن و سنت" پر، "صحابہ اور اہل بیت کے جوڑ پر"۔ تو جو محرم کی مجالس اس طرح بیان کرے کہ جس میں صحابہ اور اہل بیت کے جوڑ کو بیان کیا جائے تو وہ تو ہمارا مسلک ہے۔ لیکن جن مجالس میں ان میں توڑ کرنا اور تفرقہ ڈالنا مقصود ہو تو یہ ہمارا مسلک نہیں اعاذنا اللہُ من ھذا۔ اللہ تعالیٰ اس سے بچائے (اٰمین)

وما علینا الا البلاغ



نویں رات (مجلس 9)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ أَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ
وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ
(پ2، البقرۃ155) صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ

رسول اللہ ﷺ کی برکات اور بعد کا زمانہ

بزرگان محترم، حضرات علماء کرام واجب الاحترام سامعین عزیز! نبی پاک ﷺ پر اللہ تعالی نے دین مکمل کیا، اور پھر آپ سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ نبی پاک ﷺ نے پیچھے جو ماحول چھوڑا، اس میں جب تک صحابہ کرام کا غلبہ رہا، تب تک تقوی و طہارت کی ایک الگ اور اعلی شان اپنی جگہ قائم رہی اور امنِ عام رہا، مسلمانوں کو شوکت ملی، ملکوں پر ملک فتح ہوتے گئے۔ لیکن جوں جوں زمانہ دور ہوتا گیا وہ برکات نہ رہیں کیونکہ مسلمانوں میں اکثریت غیر صحابہ کی ہوگئی۔

اس کے لئے ان حالات کا نقشہ سامنے رکھیں کہ حضرت عثمان غنی بارہ سال خلافت کرنے کے بعد شکار کس کا ہو گئے؟ "بغاوت کا"۔ مدینہ منورہ سے جب بڑے اکابر صحابہ "حج" پر گئے ہوئے تھے تو پیچھے ان (باغی) لوگوں نے بغاوت کر کے حضرت عثمان غنی کو گھر بیٹھے شہید کر دیا۔۔ کس کو شہید کیا؟ اس سلطنت کے "رہنماء" کو، اس سلطنت کے سربراہ کو، خلیفہ کو، اس عظیم سلطنت کے "پیشواء" کو، جو کئی ملکوں پر حاوی تھا۔ تو اب جو لوگ بغاوت کے لئے اٹھے وہ اپنی زبان کے اعتبار سے کیا تھے؟ ذرا سوچو؟

 زبان کے وہ مسلمان تھے

 کلمہ پڑھتے تھے

 نمازیں پڑھتے تھے

تو اتنے بڑے آدمی جو حضور ﷺ کے بعد صرف تیسرے "خلیفہ راشد ہی نہیں"، بلکہ حضور ﷺ کے "داماد" بھی ہیں، اور "دوہرے داماد" ہیں، ان کے بارے میں اتنی بڑی سازش کی گئی! اباغی میدان میں نکالے گئے! پھر باغیوں نے اس ماحول پر قبضہ بھی کر لیا کہ حضرت علی کی بات بھی وہ چلنے نہیں دیتے تھے۔

تو آپ ذرا تصور کریں کہ وہ شخص جو کئی ملکوں پر حاوی ہو اور خلافت کو بارہ سال سے چلا رہا ہو، اس کے خلاف اتنا بڑا ماحول بن گیا۔ ع

پلٹ ہوا جو یک بہ یک گئی
ہے قرار میرے کو دل نہیں
بیاں کروں کیا دلِ داغ میں
ہے فگار سینہ سے غم میرا

حضور ﷺ نے جب امت چھوڑی تو وہ ایک امت تھی

تیسرے خلیفہ راشد کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا۔ پھر حضرت علی جو حضور اکرم ﷺ کے کزن تھے اور داماد بھی تھے اور اپنی نیکی میں وہ معروف بھی تھے۔ تو جنگ صفین کے خاتمے پر خوارج کی طرف سے ان پر سر عام "کفر کا فتوی" لگایا گیا، یعنی صرف اختلاف نہیں کیا گیا بلکہ کفر کا فتوی لگایا گیا۔ اب تک مسلمانوں میں کسی کے خلاف، انتظامی معاملات میں تو اختلاف ہوتا رہا لیکن کسی مسلمان کے خلاف خاص طور پر صحابہ کے خلاف یہ آواز کہیں نہیں اٹھی تھی کہ کسی کو "کافر" کہا جائے۔ لیکن حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ کو خارجیوں نے کافر کہا اور ان لوگوں نے کافر قرار دیا جو خود نمازی تھے۔ ان خارجیوں کو سمجھانے کے لئے حضور ﷺ کے صحابی حضرت عبداللہ بن عباس گئے۔ آپ قرآن پڑھتے رہے اور سمجھاتے رہے لیکن وہ نہیں سمجھے۔ تو سلطنت پوری کی پوری انتشار کا شکار ہو گئی۔ تو اسوقت آپ کے خیال میں سب سے اہم مسئلہ، پوری امت کا مسئلہ کیا تھا؟ سب سے

اہم مسئلہ یہی تھا کہ کسی طرح سلطنت انسانی میں امن قائم کیا جائے اور وہ بھی

- ایک رہنماء پر
- ایک امام وقت پر
- ایک سیاست دان پر
- سب ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

یہی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے جب امت چھوڑی تو یہ ایک امانت مسلمانوں کے سپرد کی۔ تو اسطرح یہ انکا ایک فرض ہے کہ امت کو بچائیں، امت ایک جھنڈے تلے رہے۔

سلطنت ایک رہے کیسے؟

لیکن یہ وجہ کیا ہے؟ کہ اس وقت سے اختلافات ایسے پھوٹے کہ اپنی طرف سے بڑی کوششیں ہوئیں کہ سب ایک ہو جائیں! ہر شخص جب ذی رائے ہو گیا اور ہر شخص رائے دیتا ہے، تو جب کثرت آراء کا معرکہ لگے تو پھر کبھی ایک ہونا کتنا مشکل ہو جاتا ہے!؟ اگر کوئی ایک Issue پیش کر دیا جائے، جس پر لوگ اپنی اپنی رائے دیں تو کسی ایک رائے پر اکھٹا کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ نہیں؟

تو اتنی بڑی سلطنت کے سربراہ کو سارے مان لیں اب وہ فضا نہیں رہی تھی۔ تو سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ امت کو ایک رکھا جائے۔ اب جو پرانے بزرگ صحابہ تھے وہ کم رہ گئے تھے۔ کچھ نئے لوگ نئے ممالک سے آئے، جو مسلمان ہوئے۔ اب ظاہر ہے وہ نئے مسلمان ہونے والے صحابی تو نہیں تھے، اور جو پچھلے تھے صحابہ کرام، وہ فوت ہو رہے ہیں، اور جو بچے تھے، وہ بڑے ہو رہے تھے۔ تو صحابہ کی تعداد مسلمانوں کی سوسائٹی میں دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے حضور ﷺ کا دور نہیں دیکھا تھا اور حضور ﷺ کی توجہ ان پر نہیں پڑی تھی۔ تو اب یہ سلطنت ایک رہے کیسے؟ بچے کیسے؟ تشریحات کتنی بھی کی جائیں اور تقریریں کتنی بھی کی جائیں، تاریخی تعارضات کو کتنا ہی High Light کیا جائے، لیکن سارے ہی ایک رائے پر جمع ہو جائیں یا متفق ہو

جائیں، یہ حالات کے پیشِ نظر ممکن نہیں تھا۔

حضرت امیر معاویہ اور حضرت حسنؓ یہ دو نہایت پاک باز انسان تھے جنہوں نے بکھرے ہوئے معاشرے کو پھر سے اکٹھا کر کے سلطنت اسلامی ایک کر دی۔ سب صوبوں کے پیشوا، سب کے امام، جتنے بھی ممالک تھے سب ایک خلافت کے ماتحت ہو گئے۔

حضرت معاویہ نے بھی اپنے تدبر سے، اپنی حکمت سے، پھر سے مسلمانوں کو جوڑا مگر اس میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو خراج عقیدت پیش کرنا پڑتا ہے جنہوں نے قربانی کر کے اپنی پوری سلطنت حضرت معاویہ کے سپرد کر دی۔ جس سے ہر جگہ امن ہو گیا۔

اس کے بعد وقت گزرتا گیا، نظام چلتا گیا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ مجھے بھی ایک دن سفر آخرت پیش آنا ہے تو میرے بعد کیا ہو؟ اس پر تمام حساس مسلمان جن کا احساس جاگتا تھا وہ بھی اس پر بہت پریشان تھے کہ کیا ہو؟ اس پر مؤرخین نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کی ایک تقریر ضبط کی ہے حضرت مغیرہ بن شعبہ بڑی افسردہ دلی سے کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان کے وقت میں مسلمانوں کے انتشار کو دیکھا اور مسلمانوں کی ایک خلافت میرے سامنے دو ٹکڑے ہوئی، پھر جنگیں ہوئیں مسلمانوں کی تلوار بے نیام ہوئی، آپس میں لڑے، میں نے یہ سارے منظر دیکھے ہیں۔ تو وہ زمانہ جب حضرت عثمان شہیدؓ ہوئے ہیں، اب اُس زمانے سے یہ زمانہ آگے بڑھ چکا ہے، اِس کو بیس، پچیس سال ہو چکے ہیں، پرانا قصہ ہو گیا ہے۔ تو اب آئندہ جو شر پیدا ہو گا وہ پہلے شر سے کم ہو گا یا زیادہ؟ عقل انسانی یہی کہتی ہے کہ "وہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گا"۔ حضرت عثمان کے وقت میں جو کچھ ہوا، وہ نہایت پریشان کن ہے کہ وقت کے بادشاہ کو جو ایک ملک کا نہیں بلکہ کئی ممالک کی خلافت کا تاجدار ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا قریب کا ہے اور سب سے زیادہ دورِ خلافت بھی انہی کا ہوا، ان کا یہ حال ہوا تو جوں جوں وقت آگے جائے گا، کام بڑھے گا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ ڈر نہیں کہ میری امت پھر سے "کافر" ہو جائے گی، یہ ڈر بھی نہیں کہ پھر سے یہ "شرک" کرنے لگے گی، بتوں کو پوجنے لگی گی، لیکن یہ مجھے ڈر ہے کہ آپس کے "انتشار و اختلاف" میں جلدی اترے گی اور یہ ایک بڑا عذاب

الہٰی ہو گا، کسی امت کے لئے، کسی قوم کے لئے، اپنے گھر میں، اپنی مرکزیت میں، اپنے اتفاق میں انتشار ہو جائے تو اس سے بڑا کوئی سانحہ نہیں ہو سکتا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی رائے

تو حضرت مغیرہ بن شعبہ کی یہ ایک تقریر ہے جو انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کی۔ تو امیر معاویہ نے ان سے پوچھا کہ حالات میرے بعد کیا ہونگے؟ اس میں تمہاری رائے کیا ہے؟ مغیرہ بن شعبہؓ نے کہا "یہاں صوبوں سے صوبے ٹکرائیں گے"۔ فرد سے فرد ٹکرائیں وہ تو اختلاف تھوڑا سا حل بھی ہو جاتا ہے لیکن جب صوبوں سے صوبے ٹکرائیں؟ کہ ایک صوبہ کدھر، ایک صوبہ کدھر؟ ایک ملک کدھر، ایک ملک کدھر؟

مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آیا کہ مسلمانوں کے اس انتشار میں یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چھوٹا سا مسئلہ درمیان میں آیا، ایک روایت میں آتا ہے پہلے نبی شہید بھی ہوتے رہے "نبی کے قتل پر اللہ کا غضب اتنا بھڑکتا ہے پھر زمین جو ہے وہ ستر ہزار انسانوں کا خون مانگتی ہے"[1] اس ایک نبی کے خون گرنے سے، اس پر ظلم ہونے سے اللہ تعالی کا غضب اتنا بھڑکتا ہے کہ جب تک "ستر ہزار انسان خون میں رنگین نہ ہو جائیں قتل میں، اللہ تعالی کا غضب ٹھنڈا نہیں ہوتا" اور اگر کوئی پیغمبر کا خلیفہ جانشین اللہ کا مقبول وہ شہید ہو جائے تو پھر زمین "پینتیس ہزار انسانوں کا خون مانگتی ہے" حضرت عثمان غنیؓ امام مظلوم تھے ان کے قتل پر جو خدا کا غضب بھڑکا، اب زمین پر اتنا اللہ تعالی کا غضب آیا کہ سلطنتیں ٹکرا رہی ہیں، صوبے ٹکرا رہے ہیں، حضرت علی پر فتوے کفر کے لگ رہے ہیں، خوارج ایک فرقہ بن رہا ہے۔

تورات وانجیل کے ورثاء کا کردار

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس صورتحال پر خوش کون ہوں گے؟ یہ جو مسلمانوں پر "گئی یک بہ یک جو ہوا پلٹ" ایک جھنڈا نہیں رہا، ایک خلافت نہیں رہی،

---

(1) تاریخ الخلفاء، ص168۔

اندازہ کریں سب سے زیادہ خوش کون ہو گا؟ سب سے زیادہ خوش ہونگے "یہود و نصاری" جو تورات وانجیل کے نمائندے بنتے ہیں۔ ان کو اس بات پر غصہ تھا کہ تورات وانجیل ماننے والوں کے سامنے یہ "قرآن" والی مخلوق کہاں سے آگئ؟ وہ سب سے زیادہ خوش تھے۔ تو اس میں ایک ضمنی بات کہ ان عیسائیوں کی سرحدیں کس سے ملتی تھیں؟ اُس وقت کی سرحدوں کے متعلق کہتا ہوں، عیسائیوں کے علاقوں کی سرحدیں ملتی تھیں ایران سے، ایران کی شمالی اضلاع کی جو سرحدیں تھیں اس کے آگے عیسائیوں کی بستیاں تھیں، اور شام کی سرحدوں پر بھی عیسائیوں کی بستیاں تھیں۔

دوران اختلافات حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ کا دفاع

اب ذرا توجہ کریں، جب حضرت علیؓ میں اور معاویہؓ میں آپس میں اختلافات چل رہے تھے، جنگوں تک نوبت پہنچ رہی تھی۔ تو ایسے وقت میں ایران پر قبضہ کن کا تھا؟ یعنی جن حالات میں انتشار ہے اور ساری سلطنت انتشار کا شکار ہے تو اسوقت ایران پر امیر معاویہ کا قبضہ تھا یا حضرت علی کا؟ "جواب: حضرت علیؓ کا"۔ اور جہاں حضرت علی کا قبضہ تھا، اسکے ساتھ سرحد پہ کن کا قبضہ تھا؟ "عیسائیوں کا"۔ تو عیسائیوں نے بہانہ بنا کر دھمکی دی، کس کو؟ خلیفہ راشد "حضرت علی رضی اللہ عنہ کو"۔ حضرت علی کو انہوں نے یعنی قیصر کے لوگوں نے دھمکی دی، یعنی خلیفہ راشد کو اور کہا کہ "ہم اب حملہ کریں گے" تو اب اگر ایسا ہو تو سیاسی طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے ایران بھی نکل جاتا ہے، اور عیسائی بھی ان سرحدوں پر آجاتے ہیں، تو اگر ایران پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے تو بظاہر اسکی خوشی کس کو ہو گی؟ ظاہری طور پر "امیر معاویہ" کو ہو گی، کیونکہ ان کا حضرت علی کے ساتھ ٹکراؤ تھا۔ حضرت علی کے ساتھ ٹکراؤ تھا، اب حضرت علی کی جتنی سیاسی پوزیشن کمزور ہو، تو قوت کس کو ملے گی؟ حضرت امیر معاویہ کو۔

تاہم جب انہوں نے حضرت علی کو دھمکی دی، تو حضرت علی نے کیا جواب دیا؟ وہ تو اس وقت اپنی پریشانی کا شکار تھے، مگر حضرت امیر معاویہ نے اس سربراہ قیصر کو جو ان سرحدوں کا سربراہ تھا، اس کو امیر معاویہ نے بڑے سخت الفاظ میں پیغام بھیجا، بڑے سخت

لفظ ہیں، جس طرح کوئی کسی کو کہے "اوئے کتے" حضرت معاویہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس گورنر کو کہا کہ تونے اگر علی کی سلطنت پر حملہ کیا تو دوسری طرف سے پہلا سپاہی جو تیرے مقابلے میں آئے گا وہ "معاویہ" ہو گا۔

علیؑ کا پہلا سپاہی معاویہؓ ہو گا

ہم اگر آپس میں لڑ رہے ہیں تو یہ اختلاف ہمارا بھائیوں کی طرح گھر کا ہے۔ لیکن کوئی بھی بیرونی طاقت سلطنت اسلامیہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گی تو "علی" کی طرف سے پہلا سپاہی میں (امیر معاویہ) سامنے آؤں گا۔ چنانچہ حضرت معاویہ کے اس جواب کے بعد پھر انکو جرات نہیں ہوئی۔ تو اس وقت جو درد مند تھے، نبی پاک کے قریبی تھے، ان سے تربیت یافتہ تھے، انکا دل اس انتشار کے باوجود، اور اپنے اختلافات کے باوجود، اس بات پر تڑپتا تھا کہ اسلامی سلطنت جو ہے وہ بچ رہے، یہی سب کی خواہش تھی۔ وگرنہ امیر معاویہ کیا یہ جواب دیتے؟ تاریخ نے حضرت امیر معاویہ کا یہ خط محفوظ کر لیا ہے، بڑے سخت لہجہ میں کہا کہ "تونے اگر آنکھ بھی اٹھائی علی کے سامنے یا تو نبرد آزما ہوا۔ تو علی کا پہلا سپاہی جو تیرے مقابلے میں نکلے گا وہ معاویہ ہو گا"[1] تو یہ چند لوگ رہ گئے تھے جن کو یہ درد تھا کہ کسی طرح اسلامی سلطنت بچ رہے بچ رہے۔

حضرت عثمان غنیؓ کے متعلق صوبوں میں منافقین کی یورش

تاہم حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد کتنا انتشار ہوا؟ اور اب تو (حضرت معاویہ کے دور حکومت سے) اس واقعہ کو بھی کافی عرصہ ہو چکا ہے، حضرت علی کے جانشین حضرت حسن بھی اپنی جگہ عراق میں خلیفہ رہ چکے، پھر امیر معاویہ سارے عالم اسلامی کے بھی بیس سال خلیفہ رہے، سو اب امیر معاویہ کا سفر آخرت ہے، اب مسلمانوں کا کیا حال ہو گا، اس پر ہر آنکھ اشکبار تھی، اور ہر دل دردناک انداز میں رو رہا تھا، کہ اب کیا ہو گا، تو مغیرہ بن شعبہ نے جو کئی عرصہ پہلے رائے دی تھی کہ میں نے پہلے اختلافات دیکھے ہیں، حضرت

(1) البدایہ والنہایہ، ج:8، ص:119۔

عثمان کے گرد جس طرح منافقین نے گھیر اڈالا، اور عبد اللہ بن سبا صوبہ بہ صوبہ سفر کرتا رہا کہ حضرت عثمان کے عامل ایسے ہیں، ان کے کارکن ایسے ہیں، صوبوں کے گورنر ایسے ہیں۔ سلطنت پوری میں اختلافات کا جال پھیلا دیا، میں (مغیرہ بن شعبہ) نے وہ سب حالات دیکھے ہیں۔ پھر امیر معاویہ اور علی کے درمیاں جنگیں بھی دیکھیں، ان کو سلجھانے کے لئے، بڑے بڑے اکابر صحابہ بھی اٹھے، لیکن کامیابی نہیں ہو سکی۔ تو معاویہ دیکھو اب اگر کوئی ایسا شخص کہ جو کسی کے چکر میں آجائے، باتوں میں آجائے، سیاسی پختگی نہ ہو، تو اس کو نہیں بنانا، کیونکہ اب اگر ایسا کچھ ہوا تو بندہ کے ساتھ بندہ نہیں رہے گا" بھائی کے ساتھ بھائی نہیں رہے گا، ساری سلطنت جو حضور ﷺ نے قائم کی تھی، اور جس کے گرد حضرت ابو بکر و عمر نے خروج سے پہرا دیا تھا" وہ سارا باغ ہی اجڑ جائے گا" وہ بہار جو خلفائے راشدین کے دور میں تھی اب اس کی بجائے خزاں ہو گی، اب بڑا ہی خطرناک مرحلہ ہے کہ کریں کیا؟

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی رائے میں حضرت امیر معاویہ کے بعد خلیفہ کون ہو

تو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، کہ شام کے لوگ (جہاں امیر معاویہ ہیں) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے نظام سے اس قدر خوش تھے کہ ان پر جان دیتے تھے، تو انہوں نے کہا کہ میری رائے یہ ہے، کہ اگر شام کا آدمی ہو تو مرکز اتنا مضبوط رہے گا کہ یہ آہستہ آہستہ ساری جگہ، ایک پرچم کے نیچے دکھائی دے گی۔ لیکن اگر کوئی دور کا آدمی باہر سے لیا گیا، تو ممکن ہے کہ اس کے گرد وفاداروں کا اجتماع نہ ہو اور ایسے لوگ آجائیں کہ جس کی جس طرح سنیں اس کے مخالف ہو گئے اور ان کی سنیں پھر اس کے مخالف ہو گئے، تو یہ تقریر کی حضرت مغیرہ بن شعبہ نے حضرت امیر معاویہ کے سامنے۔

تو انہوں نے کہا کہ پھر اس کی تجویز کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ وفاداری تو آپ کی ہے، شام اور پوری سلطنت تو آپ پر اعتماد پورا کرتی ہے، تو آپ اپنے بیٹے یزید کو اگر مقرر کر دیں تو لوگ کہیں گے "کہ معاویہ کا بیٹا ہے"۔ لوگ آپ پر جان دیتے ہیں، تو اس سے وفاق مضبوط رہے گا، یہ ایسا ہے کہ سلطنت ملے گی نہیں۔

اس سے پہلے حضرت امیر معاویہ کے کبھی تصور میں بھی نہیں آیا تھا، کہ میرے بعد

میر ابیٹا حاکم ہو گا۔ حضرت معاویہ کہنے لگے کہ کیالوگ پھر یہ نہ کہیں کہ یہ تو بیٹا ہے!؟اور میں نے تو کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا! مغیرہ یہ بات آپکی ٹھیک ہے لیکن کیا سارے اس کو مان لیں گے ؟ تو حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ "میں نے انقلابات دیکھے ہیں" حضرت عثمان غنی کے بعد کس طرح پوری سلطنت میں زلزلے آئے، اس لئے اب ملک کو بچانا ہے، سلطنت کو بچانا ہے، امت کو بچانا ہے۔ اس لیے اس کے سوااور کوئی راستہ نہیں۔ تو حضرت مغیرہ چونکہ بڑے سیاستدان تھے انہوں نے کہا، کہ اگر کوفے میں فلاں گورنر ہو جائے اور حجاز میں وہ ہو جائے، مصر میں فلاں ہو جائے، اور فلاں یہ ذمہ داریاں قبول کر لے، تو ان شاء اللہ سلطنت بچ رہے گی، مسلمان پھر شکار نہیں ہونگے، اس کو ایک طرف رکھیں بات ذرا سی اور کرتا ہوں۔

ابن زیاد لعین کون تھا؟

حضرت امیر معاویہ کے والد کا کیا نام تھا؟ "ابو سفیان" جو بنو امیہ کے بڑے سردار تھے اور حضور ﷺ کے مقابلے میں "بدر" میں وہی آئے، احد میں بھی وہی آئے، احزاب میں بھی وہی آئے۔ انکا اپنے قبیلے میں ایک بڑا مقام تھا۔ پھر اللہ کا فضل ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ تو ابو سفیان کے "امیر معاویہ تو بیٹے تھے" ہی ان کی اہلیہ سے، لیکن ان کا ایک اور بیٹا بھی تھا، بیٹے تو انکے کئی تھے، لیکن ایک بیٹا تھا، ان کی جو خاندان میں بیوی تھی اس میں سے یہ نہیں تھا۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ جاہلیت کے دور میں، جب ابو سفیان مسلمان نہیں تھے، جب حضور ﷺ نے بھی ابھی اعلان نہیں کیا تھا تو اس زمانے میں، یا کسی تاریک دور میں جو بیٹا پیدا ہوا، اس کا نام زیاد تھا، اسی کا بیٹا ہے عبید اللہ بن زیاد، جو حضرت حسینؓ کے مقابلے میں عراق آیا تھا۔ ابن زیاد جو کہتے ہیں، تو ابن زیاد اسی کا بیٹا تھا۔ تو میں اب کس کی بات کر رہا ہوں ؟ "باپ کی" (مطلب زیاد کی) تو زیاد جو تھا، وہ بیٹا تھا کسی اندازہ کے مطابق ابو سفیان کا۔ زیاد بڑے دماغ والا، اور بڑا سوچ والا اور بڑا اونچے درجے کا سیاستدان تھا۔ لیکن جو اصل بیٹا ہے، وہ تو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت امیر معاویہ زیاد کو اسوقت اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے، وہ کہتا تھا کہ "میں آپ کا بھائی ہوں" خدمت کروں گا جو امر فرمائیں؟ لیکن امیر

معاویہ اپنی خاندانی تفاخر میں، اسکو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔

حضرت علی نے اپنے دور خلافت میں زیاد کو فارس کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت علی کا معتقد تھا اور حضرت علی بھی اس پر اعتماد کیا کرتے تھے۔ پھر حضرت علی کے بعد حضرت امام حسن کا حضرت امیر معاویہ کو خلافت دینے کے بعد حضرت امیر معاویہ نے سمجھا، سوچا کہ ایسے سمجھ دار آدمی کو اگر میں قبول کر لوں، تو میری سلطنت کو فائدہ ہو گا۔ تو امیر معاویہ نے اسے قبول کر لیا، اور بصرہ کا حاکم بنا دیا اس طرح حضرت معاویہ بصرہ کوفہ اور فارس وغیرہ کے علاقے حضرت مغیرہ بن شعبہ اور ابن زیاد کے سپرد کر کے مطمئن ہو گئے اور ان دونوں نے بھی اپنے اپنے علاقوں میں اٹھنے والے فتنوں کا بڑے عجیب انداز میں سدباب کیا۔

"زیاد" حضرت امیر معاویہ کو کہتا تھا کہ آپ نے جو مجھے "فارس و بصرہ" وغیرہ کے علاقوں میں حاکم مقرر کیا ہوا ہے، تو میں پورا نظام چلا سکتا ہوں اگر مجھے مکہ اور مدینہ یعنی حجاز جو ہے اس کا بھی گورنر بنا دو، تو میں سب کا نظام سنبھال لوں گا۔ آپ مجھے جس طرح حکم دیں گے میں اس طرح چلوں گا، یہ کس نے کہا؟ "زیاد نے"۔ اب یہ خبر مشہور ہو گئی، تو جب مدینہ والوں کو اور مکہ والوں کو یہ خبر ملی کہ زیاد یہاں کا گورنر شاید بن جائے، تو اس کے سخت مزاج رویہ کی وجہ سے بڑے لوگ پریشان ہوئے اور اسی پریشانی کی حالت میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت اتنے سخت مزاج شخص، زیاد کو اگر امیر معاویہ یہاں مقرر کر دیں، تو اپنی سختی میں اتنے بدنام آدمی کا، اس علاقے میں جہاں مکہ بھی ہے مدینہ بھی ہے وہ اگر یہاں کا صوبہ دار ہو جائے یا یہاں کا گورنر ہو جائے، تو یہ بہت ہی افسوس ناک سانحہ ہو گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر کی زیاد کے متعلق بد دعاء

حضرت عبد اللہ بن عمر نے کہا، میں کیا کروں؟ انہوں نے کہا، ہم آپکے پاس آئے ہیں، آپ ہمارے روحانی پیشوا ہیں، صرف اس لئے آئیں ہیں کہ آپ اللہ تعالی کے حضور دعا کریں کہ مکہ مدینہ کی آبرو رہے اور یہاں "زیاد" نہ آئے۔ تو حضرت عبد اللہ بن عمر کو

سارے کہنے لگے کہ جی آپ بزرگ ہیں سو دعا کریں۔ اور حضرت عبد اللہ بن عمر کی شخصیت اتنی اونچی تھی کہ اگر وہ ذرا ہاں کرتے تو ساری سلطنت انکو اپنا وقت کا خلیفہ مان لے، لیکن حضرت عمر کہہ گئے تھے کہ اسکو نہیں بنانا، ہاں مشورہ ان سے لے لو، یہ پالیسی طے کرنے میں مدد کر دیں، لیکن انکو خلیفہ نہیں بنانا۔

تو اب جب حضرت عبد اللہ بن عمر سے بڑی التجا سے کہا گیا کہ جی اب زیاد مکہ اور مدینہ کا گورنر اور صوبہ دار نہ بن جائے! تو مؤرخین لکھتے ہیں پھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بہت رو کر ہاتھ اٹھائے دعا کے لئے، اور سارے آنے والے انکے ساتھ "آمین" کہنے والے تھے۔

زیاد کا انجام

حضرت عبد اللہ بن عمر نے اس درد مندی سے دعا کی، کہ چند دنوں میں طاعون کا مرض آیا، جو پہلے ہی کسی علاقے میں پھیلا ہو گا۔ تو زیاد کی ایک انگلی پر طاعون کا حملہ ہوا اور اس ایک انگلی پر ایک دانہ ہوا۔ تو ان دنوں جب یہ مرض آتا تھا، تو اس کا حملہ اسی طرح ہوتا تھا کہ کہیں ایک دانہ ہوتا تھا اور سارا زہر اسی میں جمع ہوتا۔ تو "زیاد بن ابی سفیان" حضرت عبد اللہ بن عمر کی بد دعا کے چند دن بعد ہی مر گیا۔ یہ سمجھ دار بہت تھا اور اس نے حضرت امیر معاویہ کے سامنے ہر طرح کی اپنی خدمات پیش کی ہوئیں تھیں۔

ابھی حضرت امیر معاویہ فوت نہیں ہوئے تھے، یہ میں پہلے کی بات بتا رہا ہوں کہ انکو کہا جا رہا تھا کہ اس (یزید) کو مقرر کر دیں، اور یہ جو "زیاد" تھا اس کو پتہ تھا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے مشورہ دیا ہے، کہ یزید کو آگے کریں تو زیاد نے اپنے ایک ساتھی عبید بن کعب نمیری سے یزید کی ولی عہدی کی رائے اور اس کے کردار پر مشورہ کیا اور پھر اسی عبید بن کعب کو ہی یزید کو سمجھانے کے لیے اس کے پاس بھیجا اور کہا کہ تجھے سلطنت قبول نہیں کرے گی، جب تک تو اپنی زندگی کو نہ بدلے، اور کچھ اور نصیحتیں کیں۔ یزید نے ان کے سامنے اقرار کیا، کہ میں آپکے سامنے انکار نہیں کر سکتا، میں اپنی زندگی بدل لوں گا۔ تو زیاد یزید سے بالکل مطمئن ہو گیا، تو جب زیاد مطمئن ہو گیا۔ پھر زیاد وباء کی وجہ سے یکدم طاعون

کا شکار ہو گیا۔ یہ نہیں پتا تھا کہ عمر کے بیٹے نے بد دعا کی ہے، کسی عام آدمی نے نہیں۔

تو میں توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ اسی ابوسفیان کا ایک بیٹا تھا "عتبہ" اور اس کے بیٹے کا نام تھا "ولید"۔ اور وہ ابوسفیان کا پوتا تھا اور وہ اسوقت جب امیر معاویہ کی وفات ہوئی ہے، تو مدینہ منورہ پر یہ مقرر تھا۔ کون؟ "ابوسفیان کا پوتا ولید بن عتبہ بن ابوسفیان"۔

امیر معاویہؓ کا مغیرہ بن شعبہؓ کی رائے کو قبول کرنا

اب بات سنئے! حضرت امیر معاویہ نے اپنے وقت میں باتیں تو سب کی سن لیں، لیکن آخر میں "حضرت مغیرہ بن شعبہ" کی جو تجویز تھی آپ نے اسے قبول کیا۔ اب ادھر ساتھ یہ بات رکھئے کہ یزید میں اس وقت کوئی شرعی عیب یعنی شرعی بیماری کہ جس طرح کوئی شراب پیئے وہ کوئی نہیں تھی، لیکن اس کا جو مزاج تھا، وہ اس طرح جیسے آزاد آوارہ لڑکے ہوتے ہیں کہ ہر وقت شکار کے لیے جنگلوں میں پھر رہا ہے، Seriously نہ سلطنت کو دیکھتا ہے، نہ سیاست کو دیکھتا ہے، نہ حالات کو دیکھتا ہے، تو اس مزاج کا آدمی جو تھا۔ اس واسطے امت کے صلحاء اور صحابہ اسکو قبول نہیں کرتے تھے، یہ نہیں کہ کوئی شرعی عیب تھا، یہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اتنا آزاد طبع آوارہ جنگلوں میں پھرنے والا اور شکار میں اور پھر یہ بھی کہ میں وقت کے بادشاہ یا وقت کے سربراہ کا بیٹا ہوں، تو اسطرح اسکا مزاج بنا ہوا تھا۔ تو اکابر صحابہ اسوقت جتنے زندہ تھے ان کا مشورہ یہ تھا کہ یہ رائے ٹھیک نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں چل سکتا۔ صرف زیاد تھا، جس نے اسکو کہا کہ زندگی بدلنے کا عہد کر، توبہ کر، یہ کر، وہ کر۔

تو میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جو بھی ہوا ہو، لمبی کہانی ہے، کب تک آدمی بیان کرے، لیکن ایسے موقع پر آپ یہ تو سمجھ رہے ہیں کہ یہ کام کوئی معمولی نہیں تھا کہ "امت ایک ہو کر رہے"۔ تو ولید بن عتبہ بن ابی سفیان نے مدینہ میں میٹنگ بلائی، کہ شام سے خبر آئی ہے کہ امیر معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

یزید اپنے والد کی وفات کے وقت موجود نہ تھا

اور یزید جو ہے وہ اتنا آزاد تھا کہ باپ کے پاس وفات کے وقت بھی نہیں تھا۔ تو کم از

کم یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ اس وقت باپ کے پاس ہوتا۔ اور یہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب اسکو اطلاع ملی کہ آپ کے والد فوت ہو گئے ہیں، تو یہ جنازہ میں بھی نہیں آیا تھا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قریبی ہو اور جنازہ نہ پڑھ سکے، تو پھر وہ قبر پر جنازہ پڑھ لے۔ مسئلہ یہ ہے دفن کرنے کے بعد تین دن تک گمان ہوتا ہے کہ اندر ابھی لاش پھٹی نہیں، اس وقت قبر کو اس طرح سمجھا جائے جس طرح میت سامنے پڑی ہے، اور پھر مسلمانوں کو یہ سمجھ آجائے کہ فلاں شخص بغیر جنازہ کے دفن کر دیا گیا، تو انکو بھی یہ حکم ہے کہ وہ قبر پر نماز پڑھیں۔

اور صحیح مسلم میں ایک روایت آتی ہے کہ

عن أبي هريرة أن امرأة سوداء كانت تقم المسجد (أو شابا) ففقدها رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأل عنها (أو عنه) فقالوا مات قال أفلا كنتم آذنتموني قال فكأنهم صغروا أمرها (أو أمره) فقال دلوني على قبرها فدلوه فصلى عليها ثم قال إن هذه القبور مملوءة ظلمة على أهلها وإن الله عز وجل ينورها لهم بصلاتي عليهم [ش (تقم المسجد) أي تكنسه والقمامة الكناسة والمقمة المكنسة (آذنتموني) أي أعلمتموني] (صحیح مسلم باب الصلاۃ علی القبر)

نبی پاک ﷺ کے دور میں جو عورت مسجد نبوی کی خدمت کرتی تھی وہ کچھ دن نظر نہ آئی، یا اس کی خدمت ظاہر نہ ہوئی تو حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے، تو کہا وہ جو عورت آیا کرتی تھی، مسجد کی صفائی کرتی تھی، وہ کئی دنوں سے دیکھی نہیں۔ تو آپکو صحابہ نے اطلاع دی کہ حضور وہ تو فوت ہو گئی ہے۔ تو آپ نے فرمایا! کہ مجھے تم نے کیوں نہ بتایا؟ تو حضور ﷺ کی نظر شفقت دیکھیں کہ امت پر اتنی نظر شفقت تھی کہ ایک ایک کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ تو حضور ﷺ نے انہیں فرمایا کہ آپ مجھے اس کی قبر پر لے جائیں۔ حضور ﷺ اس عورت کی جو خدمات تھیں اس عورت کی خدمات سے اتنا متاثر تھے کہ فرمایا! کہ دلوني على قبرها او كما قال، کہ مجھے اسکی قبر پر لے چلو، تو حضور

وہاں گئے، اور حضور ﷺ نے بالکل جس طرح میت سامنے ہے، قبر کو سامنے رکھ کر، پھر جنازہ پڑھا۔ اس کا جنازہ ہو چکا تھا، ہمارے حنفی فقہ میں ہے کہ جنازہ دہرایا نہیں جاتا تو حنفیوں کے فقہ کے اس مسئلہ کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے، کہ پھر اس عورت کا جنازہ تو پہلے ہو چکا تھا اور دفن بھی ہو چکی تھی تو حضور ﷺ نے دوبارہ جنازہ کیوں پڑھا؟ ایک خیال تو گزرتا ہے ناں؟ تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان ھذہ القبور مملوۃ ظلمۃ

بیشک یہ جو قبریں ہیں بھریں ہوئیں ہیں اندھیروں سے **وان اللہ ینورھا بصلوتی علیھم او کما قال** ﷺ اور جس کی نماز جنازہ میں پڑھاؤں اس کی قبر نورانی ہو جاتی ہے۔ تو اس عورت نے چونکہ مسجد کی بہت خدمات کیں تھیں، تو اس کی قبر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت حاصل ہو اس کے لئے حضور ﷺ اسکی قبر پر گئے اور آپ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ یہاں دو تین چیزیں پیش نظر رہیں کہ حضور ﷺ کو جو نہیں بتایا گیا کہ وہ عورت فوت ہو گئی ہے، اس پر آپ نے صحابہ پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ تو معلوم ہوا کہ عالم اسباب میں، خبر دینی پڑتی ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ خود بہ خود جانتے ہیں۔ ع

علم غیبی کس نمی داند بجز پروردگار
ہر کہ گوید من بدانم تو از او باور مدار
مصطفی ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے جبرائیل
جبریل ہرگز نہ گفتے تا نہ گفتے پروردگار

جبریل جیسے بھی کوئی بات نہیں بتا سکتے جب تک کہ پیچھے خدا نہ کہے، عالم الغیب خاصہ باری تعالیٰ ہے۔ پھر جب حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتاؤ، تو معلوم ہوا کہ قبر بتانا، یہ بجا تھا جو لوگ کہتے ہیں کہ نہیں جی جانتے تھے، بھائی یہ تو بڑی بے ادبی ہے! کیا وہ ایسے ہی پوچھتے تھے کہ کہاں ہے؟ اس طرح پوچھتے تھے جس طرح کوئی انسان کسی دوسرے سے پوچھتا ہے، لیکن ایسے عقیدے لوگوں نے گھڑ رکھے ہیں، کہ ان لوگوں کا صحیح بات

سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تاہم دوسرا جنازہ کب ہوتا ہے؟ یہ حضور ﷺ کی خصوصیت تھی، جو اور کسی کے پڑھانے پر شامل نہیں۔

یزید نے نمازِ جنازہ قبر پر پڑھی

بہر حال جب یزید آیا تو شرمندہ تھا لوگوں کے سامنے کہ ایک تو باپ کی وفات کے وقت موجود بھی نہیں تھا، اور پھر نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی۔ تو اسنے پھر قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔ جب یہ خبریں مدینہ پہنچیں اور ولید نے میٹنگ بلائی جس میں بڑے بڑے صحابہ کرام کے بیٹے تھے، ان کو بلایا اور کہا، کہ حضرت معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے، اور اب شام میں انکا بیٹا ہے، اسکو لوگوں نے مان لیا ہے، تو آپ بھی مانیں۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے آنے سے انکار کر دیا

تو وہاں جب میٹنگ کے لیے بلایا گیا تو صرف ایک آدمی نے وہاں آنے سے انکار کیا کہ "میں آج نہیں آسکتا" میں سوچوں گا، پھر آؤں گا۔ یہ کس نے کہا، وہ کون تھے؟ "حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ"۔ تو وہاں کا جو گورنر ولید تھا وہ نرم طبیعت کا تھا تو "حضرت عبد اللہ بن زبیر" نے کہا میں آج نہیں آسکتا، مجھے موقع دو۔ اس نے کہا چلو پھر صحیح۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ میٹنگ میں آگئے اور کہا مجھے سوچنے کا موقع دو۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس وقت نہیں آسکتا، مجھے اور موقع دو۔ اور "حضرت حسین" نے بھی کہا مجھے سوچنے کا موقع دو۔ ولید نے کہا ٹھیک ہے۔

اس مجلس کے بعد رات کے وقت لوگوں نے خبریں دیں کہ "حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ" غائب ہیں۔ تو وہ آدھی رات ایسے راستوں سے جو پہچان میں نہیں یا عام عمل میں نہیں آتے، ایسے رستوں سے وہ روانہ ہوئے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں روانہ ہوئے۔ تو "ولید" اور حکومت کے دوسرے آدمی اگلا سارا دن "عبد اللہ بن زبیر" کو تلاش کرتے رہے کہ کدھر گئے، کدھر گئے۔ اور کھوج لگاتے، رستوں کو دیکھتے لیکن پتہ ہی نہ چلا کہ کدھر گئے۔ اس پر

ولید بڑا پریشان کہ وہ جو نکل گئے ہیں، اس سے اب بہت گڑبڑ ہو گی، انکو اسی وقت خطرات نظر آ گئے کہ اب کیا ہو گا تاریخ کا۔

اب حضرت ابن زبیر کے بعد حضرت حسین بھی نکل گئے۔ پہلے تو یہی حیران تھے کہ "عبداللہ بن زبیر" کدھر گئے اور دوسری رات پتہ چلا کہ "حضرت حسین" بھی نکل گئے۔ تو حضرت عبداللہ بن زبیر بھی اپنے "بال بچوں" کو لے کر نکلے اور حضرت حسین بھی اپنے "بال بچوں" کو لے کر نکلے، اور "لڑائی" کے عنوان پر نہیں گئے اور یہ کہ یزید کو ہم نہیں مانیں گے یہ کہہ کر بھی نہیں گئے۔

حضرت حسین اور عبداللہ بن زبیر دونوں ہی مدینہ سے نکلے۔ تو جو حضرت حسین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عراق گئے کہ انہوں نے ادھر سفر کیا، تو یاد رکھو کہ آپ سیدھے عراق نہیں گئے، بلکہ پہلے "مکہ" گئے۔ اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ حرم شریف میں، تقریباً دونوں اکٹھے داخل ہوئے۔ "حضرت عبداللہ بن زبیر" اپنے سفر پر آئے تھے اور اپنے طریقے پر اور اپنی حکمت پر اور اپنی سوچ پر۔ اور حضرت حسین کا قافلہ بھی اپنے بچوں کے ساتھ کھلم کھلا آیا۔ ع

حسینی قافلہ صحرا کی جن راہوں پر گزرا تھا
وہ راہیں آج تک اس قافلے کو یاد کرتی ہیں

اب جب یہ دونوں آ گئے۔ تو اکثر نمازوں کے وقت ملاقاتیں بھی ہوتیں اور یہ سوچتے کہ کیا کریں اور کیا نہیں۔ یہ دونوں بڑے لوگ تھے یعنی حضور ﷺ کے سگے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کت بیٹے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی وہی رشتہ تھا۔ تو علی کا بیٹا اور زبیر کا بیٹا دونوں حرم شریف میں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر زیادہ وقت گزارتے ذکر اذکار، اللہ اللہ میں، عبادت میں نمازوں میں یا دعائیں کرنے میں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی رائے

حضرت عبداللہ بن زبیر کی پوزیشن یا رائے کیا تھی، اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ذرا سوچو! حضرت عبداللہ بن زبیر کی رائے یہ تھی کہ "اب پورے عالم اسلام کا

خلیفہ اور امیر المؤمنین وہ ہونا چاہیے جس کو سارے مان لیں" تو جب تک وہ فضا نہیں پیدا ہوتی، میں بطور مکہ کے حکمران کے یہاں اپنا وقت بسر کروں گا۔ اور میں اعلان کرتا ہوں کہ یزید کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنی، مطلب یہ تھا کہ میں اس سے لڑنے کے لئے دمشق نہیں جاؤں گا، شام نہیں جاؤں لیکن جہاں تک مکہ کی حدود ہے اس میں جس طرح امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے حاکم رہے اور خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چلتی رہی، میں بھی اسی طرح رہوں گا۔

تو حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ میں یہاں مکہ کا حکمران بن کر رہوں، یہاں کا نظام چلاؤں، لوگوں کی ضروریات پوری کروں۔ کیونکہ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں نے یزید کو نہیں ماننا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے دل کی بھی یہی آواز تھی، لیکن حضرت حسین کے بارے میں پہلے یہی بات نکلی کہ یہ بھی آئے ہیں عبادت کی نیت سے کہ وقت مکہ میں گزاریں، مسجد میں گزاریں، حرم شریف میں گزاریں گے، جس طرح بندہ دنیا سے تنگ آکر کہتا ہے آدمی چلو اللہ اللہ کرو۔ تو دونوں حضرت عبد اللہ بن زبیر بھی یہاں مکہ میں اور حضرت حسین بھی یہیں۔

ترجمان القرآن کی مکہ میں آمد

اتنے میں مدینہ منورہ سے دو بڑے بزرگ جو علم میں اپنی جگہ آفتاب و مہتاب تھے، کون؟ "حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ" اور ترجمان القرآن "حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ"۔ یہ دونوں حضرات بھی مکہ آگئے تو اب جو مکہ میں ان کا بیٹھنا، ملنا، اور میٹنگز کرنے سے ایک نئی فضا بنی۔ تو میں نے جو یہ بات کئی مرتبہ بتائی ہے کہ حضرت حسین کو عراق جانے سے جن لوگوں نے روکا، ان میں پانچ عبد اللہ نامی حضرات تھے۔ تو ان حضرات نے حضرت حسین کو روکا کہاں تھا؟ مکہ میں۔ "مدینہ میں نہیں روکا تھا"۔ کیوں؟ حضرت عبد اللہ بن زبیر نکلے اور حضرت حسین وہ بھی رات کے وقت نکلے، تو روکنے والوں نے کہاں روکا؟ "مکہ آکر" تو روکنے کے لیے کون کون آگے آئے؟

 حضرت عبد اللہ بن عمر بھی آگئے

- اور حضرت عبد اللہ بن عباس بھی آ گئے
- اور حضرت عبد اللہ بن جعفر بھی آ گئے
- اور حضرت عبد اللہ بن مطیع بھی آ گئے

حضرت حسینؓ کی عراق جانے کی رائے

ان سب نے روکا، تو "حضرت عبد اللہ بن زبیر" نے تو مان لیا کہ ہم یہیں رہیں گے اور عبادت کرتے کرتے یہیں فوت ہونگے۔ لیکن "حضرت حسین" نے فرمایا میں عراق جاؤں گا۔ میرے پاس ان لوگوں کے دعوتی خطوط ہیں تو حضرت حسین نے جو عراق کا رخ کیا اور "کوفہ" کا رخ کیا۔ تو مکہ سے رخ کیا۔ مدینہ سے جب وہ چلے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مکہ جارہے ہیں، یا عمرہ کرنے جارہے ہیں، یا عبادت کے لئے اور یا انہوں نے رکنا ہی وہی ہے۔ تو حضرت حسین جب مکہ سے روانہ ہوئے تو حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے جو ان کے قریبی ساتھی تھے وہ اس پر رو رہے تھے کہ "آئندہ انجام کیا ہوگا"!! حضرت حسین کو جو انہوں نے سمجھایا وہ الفاظ بھی تاریخ کی بعض کتابوں میں ہیں، حضرت حسین کو کہا کہ عراق والوں نے آپ کے والد کے ساتھ کیا سلوک کیا! آپ کے بھائی حسن کے ساتھ کیا سلوک کیا! آپ ان کی باتوں میں وہاں کیوں جارہے ہیں؟ اللہ اللہ کرنا ہے تو یہیں کریں کیوں کہ کعبہ کے اندر سے کوئی کسی کو پکڑ نہیں سکتا۔

پہلے دور میں کوئی قاتل بھی اگر مکہ کے اندر آجاتا، تو جس کے باپ کا وہ قاتل ہو اس کی بھی جرات نہیں تھی کہ مکہ میں آکر پکڑے، بلکہ وہ باہر منتظر ہوتا۔ سو حضرت حسین کو کہا کہ آپ یہیں رہیں، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب یہ مدینہ سے نکلے تھے تو سیاست کیلئے نہیں نکلے تھے، لڑنے کے لئے نہیں نکلے تھے، خلافت لینے کے لئے نہیں نکلے تھے، حکومت لینے نہیں نکلے تھے، اور اقتدار کے لیے نہیں نکلے تھے۔

حضرت ابن زبیر نے مکہ میں بیعت لینا شروع کی

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جب کہا کہ میں یہی رہتا ہوں تو تاریخ کی کتابوں میں

آتا ہے کہ اب "حضرت عبد اللہ بن زبیر نے" بیعت لینا شروع کی۔ "حضرت حسین" بھی اس وقت وہیں تھے اور انکے ہوتے ہوئے "دو ہزار" کے قریب آدمیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی کہ ہم بھی بیعت کرتے ہیں کہ ہم یزید کے ساتھ بیعت نہیں کریں گے لیکن یہ نہیں کہا کہ "مقابلے میں نکلتے" ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ میں اپنی رائے پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہوں کہ میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا بس جب تک ایسا حکمران جس پر سارا عالم اسلام جمع ہو جائے، ایسا نہیں آتا اس وقت تک میں "مکے میں بطور حاکم" کے رہوں گا۔ تو انہوں نے جو بیعت لی وہ صرف مکہ کے نظام میں حضرت عبد اللہ بن زبیر کی سربراہی میں رہنے کی تھی۔

حضور ﷺ و ابو بکر دونوں کے نواسے یزید کے خلاف

اب اس سے ایک مغالطہ تو دور ہو گیا، جس کا میں نے ذکر کیا تھا کہ جو لوگ پراپیگنڈا کرتے ہیں کہ یزید کے خلاف نکلا تو صرف علی کا بیٹا ہی نا؟ ان کے علاوہ اور کوئی نہیں نکلا؟ اب تو آپ کو پتہ چل گیا نا کہ زبیر کا بیٹا بھی نکلا ہے "حضرت زبیر" اور "حضرت علی" آپس میں ماموں پھوپھی کے بیٹے تھے تو حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو جانتے ہیں؟ کون ہیں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نواسے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ "حضور ﷺ کے نواسے"۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کون ہیں؟ "حضرت ابو بکر صدیق کا نواسہ"، "زبیر کا بیٹا ہے مگر نواسہ ابو بکر کا ہے"۔ تو جس طرح اللہ تعالی نے حضور ﷺ کو اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کئی باتوں میں ایک رکھا، اکٹھا رکھا، انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ یزید کے مقابلہ میں مقابلہ کا معنی یہ نہیں کہ وہ ہٹ جائے اور ہم آتے ہیں "نہ"، بلکہ اس میں کہ ہم نے اس کی بیعت نہیں کرنی، اس میں حضور ﷺ کا نواسہ اور حضرت ابو بکر صدیق کا نواسہ دونوں ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔ اور اتفاق ایسا ہوا کہ حرم شریف میں کعبہ میں بھی وہ دونوں اکھٹے ہو گئے، فرق رہا تو صرف اتنا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر تو مکہ میں ہی رہے اور حضرت حسین وہاں سے عراق کی طرف چلے۔

اب جب حضرت حسین عراق کی طرف چلے تو اسوقت کوفہ کا عامل کون تھا؟ ابن زیاد۔ زیاد جس کا استلحاق معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا کہ میں بھی ابوسفیان کا بیٹا ہوں اور تم بھی ابوسفیان کے بیٹے ہو، اس کا بیٹا جسے ابن زیاد کہتے ہیں، یہ تھا وہاں کا گورنر۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کوفہ نہیں پہنچے ابھی باہر ہی تھے کہ انہیں کربلا کے مقام پر روک لیا گیا۔

حضرت امام حسین تصادم سے ہر قیمت پر امت کو بچانا چاہتے تھے

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے وہاں کربلا کے مقام پر تین تجاویز پیش کیں، کس کے سامنے پیش کیں؟ ذرا سنو! یہ جو عراق کا علاقہ ہے جس جگہ حسین کے قافلے کو روکا گیا اس پورے علاقے کا بڑا یعنی صوبے کا گورنر ابن زیاد تھا تو ابن زیاد نے اپنے کارندے آگے بھیجے تھے ان کارندوں کو کہا تھا کہ حسین کو تم نے روکنا ہے۔ تو حضرت حسینؓ نے جو تین تجویزیں پیش کیں وہ پیش کیں ان کارندوں کے سامنے۔

- پہلی یہ کہ میں یہاں مقابلے کے لئے نہیں آیا مجھے عراق والوں نے یہاں رہنے کی دعوت دی ہے تو میں ان کے بلانے پر آیا ہوں، اگر تم مجھے یہاں روکتے ہو تو میں واپس مدینہ جانے کو تیار ہوں۔
- نمبر دو اگر یہ نہیں تو میں اپنی اسلامی سلطنت کے سرحد پر بالکل درویشانہ طور پر زندگی گزارنے کو تیار ہوں، بالکل کنارہ کش ہو کر اپنا وقت گزاروں گا، اور وہیں کہیں جہاد کی نوبت آگئی کافروں سے تو میں جہاد میں شریک ہو جاؤں گا تو تم مجھے وہاں رہنے دو یا مدینہ جانے دو۔
- تیسری تجویز یہ ہے کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو اور جو تم مجھے زیر حراست کرنا چاہتے ہو تاکہ مجھے قید کرو، تو تم میرے پیچھے ساتھ ساتھ چلنا تاکہ تمہارا یہ اندیشہ ختم ہو جائے کہ میں کہیں بھاگ نہ جاؤں، لیکن مجھے لے چلو میں براہ راست بات کرتا ہوں، اگر میری تجاویز یزید مان لیتا ہے تو پھر دیکھیں گے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی پیش کردہ تجاویز میں سیاسی اور فقہی طور پر کوئی سقم نہ تھا

سامعین ان تجاویز کو مان لیا جاتا ہے تو اس کے بعد کوئی جھگڑا رہ جاتا ہے؟ (سامعین: نہیں) خود سوچیں کہ جتنی ممکنہ صورتیں ہیں سب کو Cover کرتے ہوئے، ملک کو ایک رکھنے کے لئے اور بچانے کے لئے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جو تجاویز ہیں وہ سیاسی طور پر اور فقہی طور پر ان میں کوئی سقم ہے؟ (سامعین: نہیں)۔ ان میں کوئی سقم نہیں۔

آپ نے کہا یا مدینہ ہی رہوں یا ہر قسم کی سیاست سے دور کنارے پر رہوں یا مجھے یزید کے پاس لے چلو میں خود اس سے بات کر لوں گا۔ سید مرتضی نے غالباً کتاب الشافی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ حتی اضع یدی علی ید یزید (ترجمہ: یہاں تک کہ میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں)

اور مشہور شیعہ عالم شیخ مفید اپنی کتاب الارشاد میں لکھتا ہے:

ولما رأى الحسين...... لقتاله أنفذ إلى عمر بن سعد: "إني أريد أن ألقاك" فاجتمعا ليلا فتناجيا طويلا، ثم رجع عمر بن سعد إلى مكانه و كتب إلى عبيد الله بن زياد: أما بعد: فإن الله قد أطفأ النائرة وجمع الكلمة وأصلح أمر الأمة، هذا حسين قد أعطاني أن يرجع إلى المكان الذي أتى منه أو أن يسير إلى ثغر من الثغور فيكون رجلا من المسلمين، له ما لهم وعليه ما عليهم، أو أن يأتي أمير المؤمنين يزيد فيضع يده في يده، فيرى فيما بينه وبينه رأيه

(الارشاد للمفید ج ۲ ص ۸۷)

اب ابن زیاد کے جو کارندے تھے وہ یہ تجویزیں لے کر "ابن زیاد" کے پاس پہنچے جو علاقے کا گورنر تھا۔ اور اس نے کہا کہ حضرت حسین نے یہ تجویزیں پیش کیں ہیں۔

دوسری طرف کربلا میں ابن زیاد کا مقرر کردہ کارندہ عمرو بن سعد حضرت حسین کی یہ تجاویز سن کر بہت خوش ہو گیا اور کہنے لگا اب تو پھر کوئی بھی فتنہ پیدا نہیں ہو گا، ساری سلطنت ایک ہو جائے گی۔ کیوں؟ جیسے حضرت حسن اور حضرت امیر معاویہ براہ راست ایک دوسرے کے سامنے پیش ہوئے تھے اور حضرت حسن نے کہا تھا کہ "ہماری یہ باتیں

مان لیں تو میں سب کچھ آپ کو دے دیتا ہوں" تم ایک رہنما ہو جاؤ اور مسلمانوں کا جھنڈا پھر ایک ہو جائے گا۔ تو اب یہ موقع آگیا ہے کہ جس طرح "حسن و معاویہ" ایک دوسرے کے سامنے آئے اور پھر compromise ہو گیا اب حضرت حسین جو ہیں وہ یزید کے سامنے جائیں تو کیا پتہ compromise ہو جائے تو ابن سعد بڑا خوش ہوا کہ اب کوئی فتنہ نہیں ہو گا ، جھگڑا نہیں ہو گا، ایک بہت بڑا problem حل ہو جائے گا۔

لیکن ابن زیاد کا ایک کارندہ شمر تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر حضرت حسین کا اور یزید کا سمجھوتہ ہو تا ہے تو ہم جیسے کہاں جائیں گے؟ پھر تو "ہمیں کسی نے پوچھنا ہی نہیں" اس نے "ابن زیاد کو مشورہ دیا کہ نہیں ،اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں آئیگا، اسے آگے نہیں جانے دینا۔ حضرت حسین نے بار بار اپنی بات کہی لیکن وہ اسی پر کہ جانے نہیں دینا۔ یہ شمر کون تھا؟

شمر لعین کون تھا؟

حضرت علی المرتضیٰ ؓ نے حضرت فاطمہ ؓ کی وفات کے بعد جن عورتوں سے شادیاں کیں ان میں سے ایک بیوی شمر کی بہن بھی تھی اور اس رشتہ کے اعتبار سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس کو پہچانتے بھی تھے لیکن اسوقت چونکہ وہ ابن زیاد کا نمائندہ تھا تو یہ ڈٹ گئے کہ ان کو ملنے نہیں دینا۔ (1) بات لمبی نہ ہو، پھر کیا گزری؟ میں تھوڑی بات کہہ کر بات ختم

(1) سوال: امام حسین رضی اللہ عنہ کے شمر ذی الجوشن کس سلسلہ سے ماموں ہیں؟ پوری وضاحت کی جائے۔......... سائل: محمد فاروق عثمان علی صدیق از عباسی منزل تلہ گنگ

جواب: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی سوتیلی والدہ ام البنین بنت خرام (حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی چوتھی بیوی تھیں) قبیلہ بنی کلاب میں سے تھیں، ان کا نکاح حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کی تجویز سے ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عقیل رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ:

"برائے من زنی خطبہ کن کہ برادرانش از شجعان عرب باشند"

(عمدۃ الطالب و منتخب التواریخ: 121، ایران۔

یعنی میرے نکاح کے لیے کوئی ایسی عورت تجویز کرو جس کے بھائی عرب کے بڑے

کرتا ہوں۔

یزید اور یزیدی

ذرا غور کریں کہ ایک ہے یزید، یہ کون تھا؟ یہ حکمران تھا اور یہ جو اسکی طرف سے سارے تڑپ رہے تھے؟ اور صحرا میں پھڑک رہے تھے! کبھی حضرت عبداللہ بن زبیر کی مخالفت میں جارہے ہیں کبھی حضرت حسین کی مخالفت میں جارہے ہیں، یہ کون ہیں؟ انکو کہتے ہیں یزیدی۔ ایک ہے یزید بڑا پیشوا، اور ایک ہیں یزیدی۔ تو طاقت اور اختیار ملک چلانے کا کس کو تھا؟"یزید کو" یزیدیوں کو تو نہیں تھا ناں؟(سامعین: نہیں)اب یہ جو یزیدی ہیں خود یزید نہیں، جو یزیدی ہیں وہ جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کہہ رہے ہیں کہ "آپ ہمارے ہاتھ پر یزید کی بیعت کریں۔

حضرت امام حسین کا مقام

تو یہ جو خفت ہے کیا یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقام کے مناسب تھی؟(سامعین: نہیں)۔ یزید بھی نہیں بلکہ یزید کا باپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جو حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کی عزت کرتا تھا، جن کے ہاتھ میں ان دو حضرات نے اپنا ہاتھ دیا تھا۔ اب اس کا بیٹا یزید جو ہے وہ اس پوزیشن کا نہیں، تو جو اس (یزید) کے کارندے ہیں پھر ان کی حیثیت کیا ہے؟؟ وہ تو بالکل بھی کوئی پوزیشن نہیں رکھتے۔

تو میں نے پچھلی مجلس میں کہا تھا کہ اب حضرت حسین رضی اللہ عنہ مقام غیرت میں آ گئے۔ حضرت حسین نے کہا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں

بہادروں میں سے ہوں۔ اس پر حضرت عقیل رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز فرمائی تھی، شمر ملعون انہی میں سے تھا اور بنی کلاب میں سے تھا۔ انہی میں سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ علمدار تھے جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بھائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ شمر اس رشتہ کے تعلق سے اپنے بھانجوں کے لیے ابن زیاد سے امان بھی لکھوالایا تھا۔ جس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ بہر حال اس لحاظ سے یعنی سوتیلی والدہ حضرت ام البنین کے واسطہ سے شمر ذی الجواشن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا رشتہ میں ماموں تھا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔(علامہ خالد محمود، عبقات، ج:1، ص:294)

حضور ﷺ کا نواسہ ہوں، کیا تم نہیں جانتے کہ میں فاطمہ کا بیٹا اور پروردہ ہوں، میں علی کا بیٹا ہوں، میں حسن کا بھائی ہوں جس نے پوری امت کو پھر سے جمع کیا۔

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بڑی دردمندی کے ساتھ تقریر کی۔ آپ نے کہا کہ کیا اب میں ان کے سامنے یعنی شمر اور ابن زیاد کے سامنے بیعت کروں؟ اب حضرت حسین مقام غیرت میں آ گئے۔ سیاست کی گتھی کو سلجھانا وہ تو ہو سکتا ہے، کبھی انسان جھک کر بھی سمجھا دیتا ہے۔ لیکن حضرت حسین کا ایک مقام تھا۔ تو حضرت حسین نے جب یہ کہا اے لوگو! تم میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں مسلمانوں میں، جو حضور ﷺ کے عہد کے ہیں، صحابہ ہیں، جنہوں نے حضور ﷺ کے مبارک دہن سے یہ آواز سنی کہ آپ نے فرمایا تھا میرے بھائی کو اور میرا نام لیکر الحسن و الحسین سیدا شباب اهل الجنه (ترمذی شریف) حسن اور حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں،[1] اب بھی وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے پیغمبر

---

(1) اس روایت کے متعلق حضرت علامہ صاحب مدظلہ العالی ایک اور مقام پر ایک استفسار کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

سوال: حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق یہ حدیث ہے کہ یہ دونوں جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے تو جنت میں انبیاء کرام علیہم بھی ہوں گے۔ حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما بھی ہوں گے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ہوں گے تو کیا امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ان سب کے بھی سردار ہوں گے۔ کیونکہ جنت میں تو سب ہی جوان ہوں گے؟

سائل: ماسٹر محمد ابراہیم ساکن مڈرانجھ تحصیل بھلوال

جواب: حضرت امام حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما جنت میں ان لوگوں کے سردار ہوں گے جو اِس دنیا میں جوان ہونے کی حالت میں فوت ہوئے۔ پس اس سے ان کے انبیاء کرام علیہمؑ یا شیخین کریمین یا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کے بھی سردار ہونے کا گمان لازم نہیں آتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنت میں سب جوان ہی ہوں گے، جنتیوں کا بڑھاپا اعزاز و انعام کی صورت میں جوانی میں بدلا جا چکا ہو گا۔ لیکن اس روایت میں کہ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے، جوانوں سے مراد اس دنیا کے جوان ہیں جو جنت سے سرفراز ہوں گے۔ اس عالم جنت کے جوان مراد نہیں کیونکہ وہاں تو سبھی جوان ہوں گے، پھر تخصیص کا کیا فائدہ۔ (عبقات، ج:1، ص:191)

کی زبان سے یہ سنا۔ کیا میں ان دو میں سے ایک نہیں ہوں؟ تو حضرت حسین نے یہ کوئی تکبر کی بات نہیں کی، وہ "مقام غیرت" پر کہ اس خاندان کے لئے یہ بڑی خفت اور بے ادبی کا مقام تھا، کہ وہ "یزید" بھی نہیں "یزیدیوں" کے ہاتھ پر بیعت کریں، تو یزید کی بیعت شرطیں منوا کر یہ کوئی عیب نہ تھی۔ کیا حضرت حسن نے حضرت معاویہ سے شرطیں نہیں منوائی تھیں؟ اور کیا انہوں نے مانی نہیں تھیں؟ کیا پھر سے عالم اسلام ایک نہیں ہوا؟ تو حضرت حسین بھی جا کر اپنی شرطیں منواتے اسی پر عمرو بن سعد خوش تھا کہ اب تو مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن بد بختی انہیں کے نام لکھی ہوئی تھی۔

ولید کے حضرت حسین کی ہجرت پر تاثرات

تو مجھے ایک واقعہ درمیان میں یاد آیا۔ کہ مدینہ میں حکومت کا کون نمائندہ تھا جس کو یہ کہا گیا تھا کہ ہمیں سوچنے کا موقع دو؟ "ولید"۔ جو مدینہ پر مقرر تھا۔ اس نے سب کو بلایا تھا کہ بیعت کرو، تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آج میں مصروف ہوں، میں آج نہیں آسکتا کل آؤں گا یا پھر آجاؤں گا۔ مگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ پہنچ گئے، لیکن کہا کہ مجھے سوچنے کا موقع دو۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیر کے بارے میں اگلے دن پتہ چلا کہ وہ تو راتو رات غائب ہیں، تو پھر سارا دن ان کی تلاش کرتے رہے کہ "عبداللہ بن زبیر" کہاں ہیں؟ سارا دن انہیں تلاش کرتے رہے۔ اگلے دن پتہ چلا کہ حسین بھی گئے، اب "حضرت حسین" کا تعاقب کر سکتے تھے کہ نہیں؟ حضرت حسین کے پیچھے جا سکتے تھے ناں؟ (سامعین: ہاں)۔ لیکن ولید نے جو الفاظ کہے وہ بھی تاریخ نے محفوظ کر لئے، ولید نے کہا، وہ بڑا سمجھ دار تھا، "اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اب زمین حسین کے خون سے رنگین ہو گی" میں چونکہ یہاں حکومت کا نمائندہ ہوں، میں ان کے پیچھے تلاش میں نہیں جانا چاہتا کہ میرے ہاتھ ان کے خون سے رنگین ہوں، یعنی اس کو بھی خوف آ گیا۔ ان لفظوں کے اندر کیا ہے؟ یہی ہے نا کہ "میں نہ جاؤں" میں نہیں چاہتا کہ میرے ہاتھ ان کے خون سے رنگین ہوں۔ اب یہ بھی حکومت کا نمائندہ ہے جو میٹنگیں کر رہا ہے لیکن اس کی روح بھی اندر سے کانپ رہی ہے کہ حضرت حسین کے خون سے میرے ہاتھ رنگین نہ ہوں۔

اب یہ جو بدبخت ابن زیاد کی نمائندگی میں وہاں کھڑے تھے اور حضرت حسین تجویزیں پیش کر رہے ہیں جن تجاویز میں پورے عالم اسلام کی بھلائی تھی لیکن یہ بدبخت ماننے کو تیار نہیں۔

الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنۃ

تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ حضرت حسین نے جو آخری تقریر کی ہے کہ کیا میں فاطمہ کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا میں رسول کا نواسہ نہیں ہوں؟ کیا تم مجھے جانتے نہیں؟ کیا پیغمبر کی زبان نے جب کہا تھا "الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنۃ" اب بھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کے دہن مبارک سے اور لسان مبارک سے یہ لفظ سنے، تم مجھے کہتے ہو کہ میں تمہارے ہاتھوں پر بیعت کروں، تم مجھے وہاں کیوں نہیں لے جاتے؟ کیوں کہ اختیار اور ملک چلانے کی طاقت تو یزید کی تھی نا؟ اس کو تو منوا سکتے تھے کہ یوں کرو، یا یوں کرو۔ لیکن یہ جو دو لوگ تھے شمر ذی الجوشن اور ابن زیاد، یہ نہیں مانے۔

یہ بات ذرا سمجھو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو اسوقت مقام غیرت میں تھے، تو آپ یزیدی کارندوں کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ حضرت حسین کا اپنا ایک مقام تھا اور اسوقت حضرت حسین مقام غیرت میں آچکے تھے۔ تو مقام غیرت پر آکر کہتے ہیں کہ بھائی تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ کیا تمہیں اس میں شک ہے کہ میں پیغمبر کا نواسہ ہوں؟ جس کا تم کلمہ پڑھتے ہو؟ مطلب یہ تھا کہ اب تک تمہاری مسجدیں میرے نانا کے نام کی اذان سے گونجتی ہیں، اس کے باوجود کہ تم اذانوں میں کہتے ہو "اشھد ان محمدا رسول اللہ" تو جس کا نام تم اس طرح لیتے ہو کیا میں اس کا نواسہ نہیں ہوں، کیا اس وقت کئی صحابی موجود نہیں جو گواہی دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے کہا تھا "الحسن و الحسین سیدا شباب اھل الجنہ"۔ اب آگے سے کوئی بول نہیں رہا لیکن

دیتی رہے گی درس شہادت حسین کی
آزادی حیات کا وہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر تیرا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

توحضرت حسین کی مخالفت اسوقت جب وہ مقام غیرت پہ تھے، اور کربلا سامنے تھی، اور پتہ تھا کہ کیا ہو گا، اسوقت آپ نے انکار کیا لیکن یزیدیوں کے کہنے پر۔ توحضرت حسین جب مقام غیرت میں تھے، تو انہوں نے اسوقت فیصلہ کر لیا کہ جان دینی پڑے گی۔ اب آگے کیا ہوا؟ حضرت حسین کے شہید ہونے کے بعد جب قافلہ اس کنبے کا جو انکے اپنے گھرانے کے لوگ تھے، حضرت حسین کی بیوی، حضرت حسین کی بہن اور بیٹا حضرت زین العابدین۔ اب حکومت کے پہرے میں ان گھر والوں کو کربلا سے جنگی قیدی بنا کر شام میں یزید کے پاس پہنچایا گیا۔ اس قافلہ میں عورتیں ہی تھیں سوائے حضرت زین العابدین کے۔ تو بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ کربلا سے پھر کوفے میں گئے، اور جب کوفہ میں گئے تو وہ عورتیں بچے اپنے مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر ادھر ادھر دیکھ رہے تھے، کہ حضرت حسین کا قافلہ جب کربلا آیا تھا تو "حسین" موجود تھے، عزت کے ساتھ آج کس طرح یہ قافلہ یہاں سے گزر رہا ہے۔ تو ایک ایسی کیفیت تھی کہ ان عورتوں میں اور مردوں میں جو وہاں موجود تھے انہوں نے بے اختیار رونا شروع کیا تو میں توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ وہ رونا تو بے اختیار تھا گو وہ رونا اہل عراق کی بے وفائی پر بھی تھا لیکن جو منظر تھا سامنے۔ ع

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

آخر انسان کا دل تھا، ان لوگوں میں جو عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں پر دیکھ رہے تھے کہ جو قافلہ مدینہ سے چلا تھا آج کتنے ان سے شہید ہو چکے اور اب اس بے بسی میں یہ قافلہ جا رہا ہے تو۔۔۔

دل ہی تو نہ ہے سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

تو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو ان شاء اللہ پھر مزید اگلی مجلس میں بیان ہو گا۔ تاہم ہمارے اہل سنت کے جذبات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مظلومیت میں ان کے ساتھ ہیں۔ حضرت حسین کے ساتھ ظلم کرنے میں عراق کے لوگ اور ابن زیاد سمیت جو اس کے آگے کارندے تھے ان سب کی یہ بدبختی تھی ان کی بدنیتی تھی کہ انہوں نے کسی تجویز کو نہ مانا، نہ آگے جانے دیا اور ظلماً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔

اب ایک گروہ کی چال یہ ہے کہ جب بھی کربلا کے واقعہ میں حضرت حسین کا نام آتا ہے تو وہ یہ کہتے تو ہیں کہ اس میں ابن زیاد، شمر اور عمرو بن سعد کی بد بختی تھی لیکن یہ گروہ چالاً کہتے ہیں کہ ان تینوں کا نام کم لو اور زیادہ یزید کا نام لو، بلکہ کہتے ہیں صرف یزید کا نام لو، یزید کا۔ ان کے ہاں محرم کی مجالس میں امام باڑوں میں، بارگاہوں میں جتنا بھی حساب ہو گا یزید پر ہو گا اور جو "یزیدی" تھے جنہوں نے وہاں یہ سارا دردناک ظلم کیا ان کا ذکر برائے نام ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ امام حسین کو بڑی بے دردی اور ظالمانہ طریقے سے شہید کرنے پر ان تینوں کا نام بجا طور پر ذکر ہونا چاہیے۔

حضرت امام حسین کی شہادت پر خوش ہونے والا لعنتی ہے

میں آپ کو صرف اپنے عقیدے کے بارے میں ایک بات کہوں گا کہ اہل سنت والجماعت حضرت حسین کی اس مظلومیت پر ان کے ساتھ ہیں۔ جن لوگوں نے ان پر ظلم کیا یا حضرت حسین کے قتل سے وہ خوش بھی ہوئے تو حافظ ابن تیمیہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ ان پر خدا کی لعنت ہے۔ کرنے والے تو در کنار جو اس سے خوش بھی ہو اس پر بھی اللہ کی لعنت ہے۔ تو ہمارے دل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہیں لیکن اس واقعہ کو اس انداز سے لایا جائے کہ یزید کا نام صرف اس لیے لیا جائے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر چھینٹیں پڑیں۔ ہم حضرت امیر معاویہ کو "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی اور کاتب وحی" مانتے ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی شخص بات کرے ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ تاہم اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ حضرت امام حسین کے بارے میں ہمارا اپنا کوئی مؤقف نہ ہو! بلکہ ہم کہتے ہیں کہ حضرت حسین مظلوم تھے اور اس واقعہ میں بنیادی قصور ان کا یعنی عراق والوں کا ہے۔ اس کو حضرت زینب نے بھی بیان کیا۔ حضرت زینب حضرت حسین کی بہن اس قافلے میں جا رہی تھیں تو بے اختیار ان کی زبان سے یہ بات نکل گئی۔ وہ بات میں ان شاء اللہ اگلی مجلس میں عرض کروں گا۔............ وما علینا الا البلاغ



دسویں رات (مجلس 10)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی سَیِّدِ الرُّسُلِ
وَخَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَعَلٰی آلِہِ الْاَتْقِیَاءِ وَاَصْحَابِہِ الْاَصْفِیَاءِ أَمَّا بَعْدُ
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ
(پ2: البقرۃ 154)

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: «مَا مِنْ مَكْلُومٍ یُكْلَمُ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ إِلَّا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَكَلْمُهُ یَدْمَى، اللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ، وَالرِّیحُ رِیحُ مِسْكٍ» (صحیح بخاری)

وَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ اَوْ كَمَا قَالَ النَّبِیُّ ﷺ (المعجم الکبیر للطبرانی ج8 ص282)

حضرات علما کرام واجب الاحترام بزرگان قوم سامعین عزیز دوستو اور بھائیو! شہادت کا لفظ آپ کے لئے اجنبی لفظ نہیں، ہر روز آپ سنتے ہیں کہ جی فلاں کورٹ میں شہادت ہوئی یا شہادت دی گئی۔ شہادت کا لفظ (Word) کوئی اوپرا لفظ نہیں۔ اس کا انگریزی میں معنی ہے کہ To Bear Evidence یا To Provide The Evidence کہ کسی حقیقت کی خبر دینا۔ جب کسی حقیقت کی خبر بطور گواہی کے دی جائے تو کہتے ہیں شہادت دی ہے۔ تو آپ نے جو یہ اپنے دینی حلقے میں لفظ سنا ہے کہ فلاں شہید ہوئے تو شہید وہی لفظ ہے بمعنی شہادت گواہی دینے والا، گواہی کس پر؟ گواہی کس پر دی جا رہی ہے؟ جو واقعہ سامنے نہیں یا پردہ غائب میں ہے۔ وہ ماضی کا کوئی واقعہ ہو، یا پردہ میں کوئی حقیقت ہو تو اس کی گواہی دینا۔ عدالتوں میں یہی شہادت اور بطور گواہی دی جاتی ہے۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ جل شانہ نے اپنے آپ کو پردہ غائب میں رکھا، وہ یہاں ان آنکھوں سے نظر نہیں آتا، تو اس کی جو بھی باتیں ہم نے مانیں اور سیکھیں، ویؤمنون

بالغیب، To believe in unseen، کے طور پر مانیں۔

سو جب کوئی چیز پردہ میں ہو تو اس کے لئے گواہی دینے کے دو طریقے ہیں۔ گواہی دینا کسے کہتے ہیں؟ Lips service زبان کے ساتھ گواہی دینا کہ میں یہ بات کہتا ہوں کہ

I bear witness

تو اب خدا کے ہونے کی گواہی آپ نے اپنی زبان کے ساتھ دی، تو یہ آپ کی شہادت ہے کہ اللہ ہے۔

لیکن انسان کی زبان کبھی صحیح چلتی ہے، اور کبھی غلط بھی۔ جب صحیح چلے تو یہ صادقین کی زبان ہے، اور غلط چلے تو یہ جھوٹ ہے۔ جھوٹ بھی زبان سے ادا ہوتا ہے، لیکن اگر مطابق واقع نہ ہو، تو کہتے ہیں یہ جھوٹ ہے۔ تو زبان کی گواہی جھوٹی بھی ہو سکتی ہے، اور سچی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک گواہی ہے جو زبان سے نہیں بلکہ اچھلتے خون سے دی جائے، کیوں؟ انسان جھوٹ بولتا ہے، اپنی ساکھ بنانے کے لئے۔ انسان جھوٹ بولتا ہے اپنے دنیا کے کسی کام کیلئے اور جس کی دنیا ہی باقی نہیں رہنی وہ جھوٹ کیا بولے گا؟ جس کی دنیا ہی باقی نہیں رہے گی، ظاہر ہے وہ جھوٹ تو نہیں بولے گا۔ اس لئے یہ اپنے خون کے قطروں سے اور اچھلتے خون سے گواہی دینا کہ وہ (اللہ) ہے، یہ میدان میں اس طرح کی گواہی ہے کہ جس میں کذب کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن کو اس گواہی کے لائق بنایا، ان کو کہتے ہیں شہداء کرام۔

تاریخ مذاہب اور شہداء

تاریخ مذاہب میں خاص طور پر اہل کتاب میں، یہود و نصاریٰ میں مقربین بارگاہ الٰہی کے دو ہی نام ملتے ہیں۔

 پیغمبر Prophets

یا

 صالحین (Saints) کا نام ملتا ہے

صالحین کو انگریزی میں کہتے ہیں Saints، ہندوؤں میں انہیں سادھو کہتے ہیں۔ تو اہل

کتاب کے مذہب کے دائرے میں مقربین الٰہی کے دو ہی نام ملتے ہیں یا پیغمبروں کے یا صالحین کے۔ اسلام نے ایک جامع مذہب اور دین کا خاکہ دیا، کہ جس میں پیغمبر بھی ہیں، شہداء بھی ہیں اور صالحین بھی ہیں:

(1) أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ (پ27۔الحدید19)

(2) وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ (پ2:البقرۃ154)

توجو شہداء ہیں ان کا نام صرف اسلام میں ملتا ہے پہلی تاریخ مذاہب میں نہیں ملتا۔ ہر پہلے مذہب نے اپنے عقیدے کے مطابق مقربین بارگاہ الٰہی کا جو تعارف کروایا، تو وہ یہی ہیں پیغمبر اور صالحین۔

ہندو مذہب میں صلحاء اور انکی زبان کی اصل

ایک انبیاء ہیں اور ایک صلحا ہیں، یعنی Prophets ہیں اور Saints ہیں۔ Saint سے آپ نے اردو میں ایک لفظ بارہا سنا ہو گا "سَنت" سنت کوئی بزرگ ہو نیک تارک الدنیا تو اس کو کہتے ہیں سینٹ، اور ہندی میں اسے کہتے ہیں سنس۔ سنس، سنت اور سینٹ (Saint) کی اصل ایک ہے۔ اور ہندو عقیدے کے مطابق جو ان لوگوں کی زبان ہے، ان کو کہا سنس، سنسکرت کہتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ویدوں کی زبان سنسکرت ہے، وہ ہے سنس، کرت یعنی سنسوں کے منہ سے نکلی ہوئی بولی یعنی سنسکرت۔ جس طرح آپ نے سنا ہو گا کہ اگر کوئی سکھوں کے قریب رہا ہو یا کسی نے سکھوں کے ماحول کو دیکھا ہو، تو وہ جانتا ہو گا یا اس نے ان کے ہاں یہ الفاظ "گر مکھی" سنے ہوں گے۔ ہم تو انکی زبان کو کہتے ہیں پنجابی، مگر وہ کہتے ہیں گر مکھی۔ تو گر مکھی کیا ہے؟ یعنی گرو کے مکھ یعنی منہ سے نکلی ہوئی بولی۔ مکھ کا معنی Mouth۔ تو مکھ اور Mouth یہ ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ تو جو ان کے ہاں گرو کے منہ سے نکلی ہوئی وہ گر مکھی اور جو سنس کے منہ سے بات نکلی، وہ ہو گئی سنسکرت۔

اسلام میں شہید کا تصور

سو میں کہہ یہ رہا تھا کہ تیسرا طبقہ Martyrs یا شہداء کا ہے۔ تاریخ میں شہیدوں کا

تصور نہ ویدوں میں ہے اور نہ اہل کتاب کے ہاں ہے۔ تو پھر یہ تعارف کروایا کس نے؟ یہ تعارف کروایا اسلام نے کہ تاریخ اسلام میں ایسے لوگ بھی ہیں، جنہوں نے خدا کے ہونے پر اپنے خون سے گواہی دی، اچھلتے خون سے گواہی دی۔

گواہی کی اقسام

اب گواہی دو قسم کی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سچی بھی ہوتی ہے، اور جھوٹی بھی۔ زبان کی گواہی کبھی کسی حیلے کے تحت غلط بھی ہو جاتی ہے، لیکن خون کی گواہی جھوٹی نہیں ہوتی۔ تو اسلام کے دائرے میں خدا پر شہادت دینے والے، اور یہ گواہی دینے والے دو ہی ہیں۔ ع

پہنچتا ہے ہر ایک میکش کے آگے دور جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطف عام اس کا
گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں سچا ایک نام اس کا

شہادتین میں فرق

جب اچھلتے خون سے اس پر گواہی دی جائے، کہ سچا ایک نام اس کا تو ہمارے ہاں اسے کہتے ہیں درجہ شہادت، تو یہ وہی شہادت ہے جس طرح عدالت میں شہادت دی جائے۔ فرق کیا ہے؟ عدالت میں شہادت دی جاتی ہے لفظوں سے۔ اور میدان میں شہادت دی جاتی ہے خون کے قطروں سے۔ جن لوگوں نے خدا کے ہونے پر گواہی دی اللہ تبارک وتعالی جل شانہ نے ان کو انعام دیا۔ اور دنیا والوں کو کہا کہ جو اس راہ سے خدا کے پاس پہنچے ان کو تم مردہ نہ کہو۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ (پ2: البقرة 154)

ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

تو کئی لوگ پوچھتے ہیں، کہ وہ زندہ کیسے ہیں ہم نے تو اپنے ہاتھوں سے ان کو دفن کیا تو

اگر وہ زندہ ہوتے تو زیرِ خاک سلائے جاتے؟ قرآن کہتا ہے تم انکو مردہ نہ کہو اور تجربہ کہتا ہے کہ ان کو دفن کیا گیا ہے۔

بتا اے عقل انسانی کوئی حل اس معمے کا
نظر کچھ اور کہتی ہے خبر کچھ اور کہتی ہے

نظر کیا ہے؟ کہ ان کو دفن کیا گیا، کیا شہیدوں کی قبریں نہیں ہوتیں؟ تو نظریہ کہتی ہے کہ دفن کیا گیا اور خبر کہتی ہے، وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ان کو مردہ نہ کہو، میں اس کی تشریح تو نہیں کرتا ایک بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔

زندہ، مردہ اور شہید میں فرق

کہ زندہ میں اور مردہ میں بنیادی فرق کیا ہے؟ تو اس کا جواب ہے کہ:

إِذَا مَاتَ ابنُ آدم انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ

(صحیح مسلم کتاب الوقف)

جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے تو اس کے فوت ہوتے ہی اس کا اعمال نامہ لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اس نے جو عمل کیے اچھے یا برے، ذرہ خیر کا کیا، یا ذرہ شر کا کیا، جو بھی اس نے عمل کیے اس کی وفات کے ساتھ ہی، ان کے اعمال نامے لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ یہ شہید ہیں جن کے اعمال نامے لپیٹے نہیں جاتے۔ کیوں؟ شہید اپنے خون سے وہ نقوشِ زندگی چھوڑ جاتے ہیں، کہ جب تک دنیا ان پر عمل کرتی رہے، ان کے عملوں کا ثواب ان کے کھاتے میں جاتا ہے۔ ان کے اعمال نامے لپیٹے نہیں جاتے۔ ہم عام طور پر تو یہ دیکھتے ہیں، کہ جب کوئی شخص فوت ہو جائے، اس کا عمل منقطع ہو گیا۔ لیکن شہید دنیا سے تو منتقل ہو گیا، لیکن اس کے اعمال نامے لپیٹے نہیں گئے۔ اس کے عملوں میں جو خیر کا کھاتہ ہے، اس کھاتے میں آمد ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے کہ شہید جو ہے وہ قوم کو ایک زندگی کا پیغام دے کر جاتا ہے، قوم کو ایک راہ دے کر جاتا ہے۔ تو اس راہ میں جتنے بھی چلتے رہیں، اور حق کے ہونے کی گواہی زبان سے دیتے رہیں، تو شہید نے جو خون کے ساتھ گواہی دی ہے، اس کے ساتھ وہ گواہی باقی ہے، اس کا عمل باقی ہے۔

توحیات کسے کہتے ہیں؟ کہ عمل ہو۔ اور جس کا عمل ہی نہ ہو اس کی حیات کیا ہو گی؟ حضور ﷺ نے جب پیغمبروں کے بارے میں فرمایا، کہ الانبیا احیاء تو ساتھ ہی عمل بھی بتایا کہ فی قبورھم یصلون[1] ان کا عمل جاری ہے تو حیات کے معنی معلوم ہو گئے۔

ایمان اور شعور

تو ہم جب کہتے ہیں، کہ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ کہ شہیدوں کو مردہ نہ کہو، تو لوگ کہتے ہیں ہمیں سمجھ نہیں آتی۔ ہم کہتے ہیں تمہیں کیا سمجھ نہیں آتی! خدا نے تو پہلے ہی کہہ دیا کہ ولکن لا تشعرون کہ نہیں تم سمجھتے۔ تو ایمان تو ہے ہی کہ شعور میں نہ بھی آئے تب بھی مانو۔ اور وہ بات ماننی جو شعور میں آئے، وہ بھی کوئی ماننا ہے؟

مثلاً میں عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی یہ کہے کہ میرا ایمان ہے کہ یہ رومال ہے۔ تو اردو کے اعتبار سے یہ جملہ غلط ہو گا۔ کیوں؟ کیونکہ یہ ایمان نہیں، یہ تو مشاہدہ ہے، نظر آرہا ہے۔ تو جو چیز مشاہدے میں ہو اس پر ایمان نہیں ہو پاتا، ایمان پردے کی بات پر ہوتا ہے۔ جس کو نہ نظریں پہنچ سکیں، نہ کان سن سکیں۔ ہم زمین پر گواہی دیتے ہیں کہ اللہ ہے۔ لیکن اسے ہماری نہ آنکھیں دیکھتی ہیں، نہ کان سنتے ہیں۔ تو گواہی ہوتی ہی اس پر کہ جب کوئی چیز سامنے نہ ہو۔ اور جو سامنے ہو اسکو کہتے ہیں مشاہدہ۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان دیتے ہیں لمن یقتل تو قتل تو وارد ہو گیا، جب قتل وارد ہو گیا تو وہ مقتول ہو گئے لیکن پھر کہا کہ لا تشعرون تمہیں سمجھ نہیں ہے وہ زندہ ہیں۔

ایمان بالغیب

اب تم جب کہتے ہو کہ نہیں ہم نے تو خود ان کو قتل ہوتے دیکھا، اور دفن ہوتے دیکھا، تو فرمایا کہ لا تشعرون، ان کی حیات تمہارے شعور سے اوپر کی بات ہے۔ تو مومن ہے ہی وہ جو اللہ اور اسکے رسول کے کہنے پر بلا دیکھے ایمان لائے، ایسا ہو پھر تو ایمان

---

(1) اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب اطال اللہ حیاتہ کی مایہ ناز تصنیف "مقام حیات" کی مراجعت فرمائیں۔

ہے۔ یؤمنون کا لفظ پہلی دفعہ جب سب سے پہلے قرآن میں آیا تو فرمایا یؤمنون بالغیب ایمان لاتے ہیں بن دیکھے۔ (تو ایمان ہے ہی یہ)۔ اب آپ کی آنکھ صاف کہے کہ وہ قتل ہوئے اور دفن ہوئے، لیکن قرآن کی زبان میں عقیدہ رکھو کہ وہ زندہ ہیں۔ اب ہماری تاریخ میں، اسلام کی تاریخ میں، حضور اکرم ﷺ سے جو امت کا قافلہ چلا، وہاں صدیقین بھی چمکے، مجددین بھی آئے، اور شہداء بھی مختلف مقامات پر خدا کے ہونے کی گواہی دیتے اور صدقِ رسالت کی گواہی دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو شہداء تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں، پہلی صدی (صحابہ) میں، دوسری صدی میں، تیسری صدی میں اور اسی طرح ہر صدی میں۔

ایک اور چھوٹی سی بات ذہن میں آئی۔ ایک صحابی جو کسی غزوہ میں زخمی ہوئے تھے۔ ان کا زخم تھا اور جب تھوڑا بہت علاج کیا گیا تو زخم مندمل ہو گیا۔ تو انہوں نے یہ دعا کی کہ یا اللہ اگر میری قسمت میں آئندہ کے لئے جہاد میں جانا نہیں ہے، تو میرے زخم کو کھول دے تاکہ جان نکلے تو اسی حالت میں نکلے کہ میں شہید ہوں۔ تو تاریخ اسلام میں شہداء کی ایک لمبی فہرست ہے۔

تکریم رسالت مآب ﷺ اور مقام شہادت

اس شہداء کی فہرست میں سید الشہداء تو وہ ہی ہیں کہ جن کو لسانِ رسالت ماب ﷺ نے سید کہا۔ وہ کون ہیں؟ (حضرت حمزہؓ)۔ جو احد میں شہید ہوئے۔ بدر کے مقام پہ جتنے بھی شہید ہوئے، وہ بھی شہداء ہیں۔ تو شہداء کی فہرست صحابہ کرام سے شروع ہوتی ہے۔ تو ضمنی طور پہ یہ بات کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے آقا خاتم النبیین ﷺ وہ شہید نہیں ہوئے، کیوں؟ اس لئے کہ خدا نے انہیں یہ کہہ دیا تھا کہ

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (پ6، المائدہ67)

کہ خدا تجھے لوگوں سے بچائے گا۔ اب اگر حضور ﷺ شہید ہوں تو آخر کسی کے مارنے پر ہوں گے نا؟ کہ اسنے آپ کو ظاہری طور پر مارا، ایسا ہو تو خدا کا وہ وعدہ کہاں گیا؟ کہ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ میں تجھے بچالوں گا۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو

شہادت نہیں دی۔ لیکن امت میں شہیدوں کا ایک سلسلہ چلا ہے۔ حضور ﷺ کو شہادت نہیں دی، تاکہ کوئی کہہ نہ سکے کہ میں نے پیغمبر کو گرادیا ظاہری طور پر۔ یہ تکریم رسالت اس درجہ تک اس طرح باقی رہی کہ کوئی کہہ نہ سکے کہ یہ پیغمبر کی شان ہے؟

اور حضرت ابو بکر صدیق اس طرح حضور ﷺ کے ساتھ چلے، جس طرح اصل کے ساتھ سایہ چلتا ہے۔ حضور ﷺ بھی شہید نہیں، صدیق بھی شہید نہیں۔ جب یہ دونوں غار میں تھے تو حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے خدا کے کہنے پر ایک جملہ ادا ہو گیا تھا کہ لاتحزن ان اللہ معنا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ کہا کہ جس طرح میرے ساتھ ہے، تمہارے ساتھ بھی ہے۔ اب وہ بھی شہید نہیں اور یہ بھی شہید نہیں۔

لیکن اللہ تعالی نے ان کو شہادت دی، یعنی شہادت کا مرتبہ دے دیا لیکن اسطرح نہیں دیا کہ کوئی کافر کہہ سکے کہ میں نے گرایا۔ مثلاً نبی پاک ﷺ کو ایک یہودیہ نے زہر والا گوشت دھوکا سے، ارادہ قتل سے کھلا دیا، تو اللہ تبارک وتعالی نے اس کو اثر نہیں دیا، یعنی حضور اکرم ﷺ پر اس زہر کے جو اثرات تھے وہ رک گئے، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں نے پیغمبر کو مار دیا، قصہ ختم کر دیا۔ لیکن سالوں کے بعد جب حضور ﷺ آخری وقت میں بیمار ہوئے، تو آپ نے فرمایا کہ عائشہ میں محسوس کر رہا ہوں، کہ وہ جو یہودیہ نے مجھے زہر دیا تھا، اس زہر کے اثرات اب پھر میرے بدن میں آرہے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالی نے حضور کو جو اور مراتب دیئے

- نبوت دی
- رسالت دی
- کامیابیاں دیں
- عام غلبہ رسالت دیا

تو مقام شہادت جس کی حضور ﷺ دعا سکھلا گئے تھے، کہ اللھم ارزقنا شھادۃً فی سبیلك اے اللہ ہمیں اپنی راہ میں شہادت دے، تو اللہ پاک چاہتے تھے کہ آپکو وہ مقام بھی دیا جائے۔ تو دیا کس طرح؟ کہ آخر میں، وہ جو زہر یہودیہ نے دیا تھا، وہ پھر اثر کے لئے

آگے ہوا۔ تو آخری وقت میں اگر اس زہر نے اثر کیا تو حضور ﷺ مقام شہادت بھی پا گئے۔ لیکن اس طرح مقام شہادت کہ دشمن نہ کہہ سکے کہ میں نے آپ کو گرایا۔ یہ عجیب مقام ہے کہ رسالت کو اللہ نے اس طرح شانِ شہادت سے نوازا۔

شہادت اور صدیق اکبر

آپ نے یہ بارہا سنا ہو گا، کہ غار میں جب حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ تھے۔ وہاں غار میں ایک سانپ نے حضرت ابو بکر صدیق کو کاٹ لیا۔ تو حضور ﷺ نے اپنا لعاب مبارک لگایا، حضرت ابو بکر کو شفا ہو گئی اور زہر نے اثر نہیں کیا۔ تو حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے آخری وقت میں کہا، کہ وہ جو غار میں مجھے سانپ نے کاٹا تھا مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے اثرات آرہے ہیں۔ تاکہ صدیق بھی جب دنیا سے گئے، اسی طرح مقام شہادت کے ساتھ جس طرح خود پیغمبر گئے تھے۔ پیغمبر کی زبان مبارک سے خدا کے کہنے پر اِنَّ اللہَ مَعَنَا نکلا تھا۔ تو اللہ تعالی نے ان دونوں کو ساتھ ساتھ رکھا۔ ان دونوں کے بعد پھر شہیدوں کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے شہید

- حضرت عمرؓ
- پھر حضرت عثمانؓ
- پھر حضرت علیؓ

اور پھر ان کے ساتھ بہت سے لوگ اور بھی جو میدانوں میں آکر شہید ہوتے رہے۔ پھر اس شہادت کا عجیب نمونہ حضرت حسینؓ نے کربلا میں پیش کیا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مدینہ سے روانگی

کل میں نے بتایا تھا اور لوگ بہت کم اس کو بیان کرتے ہیں کہ حضرت حسین مدینہ منورہ سے جب چلے، تو آپ نے رخ عراق کی طرف نہیں کیا۔ پہلے بات سمجھانے کے لئے میں نے کہا تھا کہ انہوں نے شام کی طرف رخ نہیں کیا، وہ بات سمجھانی تھی۔ اب میں عملی دنیا میں بات کر رہا ہوں کہ جب حضرت حسینؓ مدینہ منورہ میں تھے، تو آپ نے سفر عراق

کی طرف نہیں کیا، کوفہ کی طرف نہیں کیا، مکہ کی طرف کیا۔ اور آپ کے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے سفر میں کچھ ہی فاصلہ تھا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا سانحہ ارتحال

جب والی مدینہ ولید نے کہا تھا کہ حضرت معاویہؓ کا انتقال ہو گیا ہے، اور ان کا بیٹا یزید ولی عہد مقرر ہوا ہے، اس نے چارج لے لیا ہے۔ تو حضرت معاویہ کی وفات پر سب نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ حضرت معاویہ کی وفات پر سب نے دل سے اظہار افسوس کیا۔

سو ولید نے جب میٹنگ کی، اور میٹنگ میں جن سب کو بلایا، وہ سارے آ گئے، تو ان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی آئے لیکن حضرت عبداللہ بن زبیر نہیں آئے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا کہ میں آج نہیں آسکتا کل آؤں گا، یا دیکھا جائے گا۔ حضرت حسین آ گئے، حضرت حسین نے کہا! یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، ہمیں کچھ سوچنے کا موقع دو۔ ولید نے کہا کہ ہاں کوئی بات نہیں کل سہی۔ لیکن اس کو نہیں پتہ تھا کہ راتوں رات حضرت عبداللہ بن زبیر چلے جائیں گے۔ تو اگلے دن جب ولید کو اطلاع ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن زبیر تو مل نہیں رہے۔ اب وہ حیران اور پریشان ہے کہ انکے جانے سے سلطنت کو خطرہ ہو گا۔ تو اگلا سارا دن وہ اسی کی تلاش کرتے رہے کہ وہ ہیں کہاں، یا گئے کہاں۔ سارا وقت اسی پر لگا دیا کہ کدھر گئے اور وہ اپنا قافلہ لیکر نکل گئے۔ وہ کہاں گئے، ان کو پتہ نہ چل سکا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سفر مکہ

اگلی رات آ گئی۔ تو اگلی رات، آدھی رات حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی نکل گئے۔ حضرت حسین کو یہ پتہ نہیں تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کدھر گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کو پتہ نہیں تھا کہ حضرت حسین بھی آرہے ہیں، حالات بتاتے ہیں تاریخ بتاتی ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ دونوں تقریباً ایک ہی وقت میں یا قریب قریب حرم کعبہ میں داخل ہوئے۔ تو نیت حضرت عبداللہ بن زبیر کی بھی تھی کہ میں کعبہ چلا جاؤں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ارادہ بھی یہی تھا۔ تو وہ واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر تو اس لئے کہ باقی وقت

عبادت میں گزاروں، تو حضرت حسین کا ارادہ یہ تھا، کہ مکہ سے ہو کر اللہ کے ہاں دعا کر کے پھر عراق کی طرف جائیں۔ تو جو مشہور ہے کہ ان کو بڑے بڑے لوگوں نے روکا کہ ادھر (عراق) نہ جائیں، وہ بھی اتفاق سے مکہ آ گئے یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ تو یہاں انہوں نے حضرت حسین سے کہا کہ آپ ادھر نہ جائیں۔ کیوں؟ کیونکہ عراق والوں میں وفا نہیں، وہ آپ کو خراب کریں گے، آپ کو سیاست میں لائیں گے، تو آپ یہیں مکہ میں رہیں، اللہ کی عبادت کرتے کرتے خانہ خدا میں زندگی گزاریں، حرم کعبہ سے بہتر اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سفر عراق

انہوں نے روکا بھی، لیکن حضرت حسین کو ان خطوط پر اعتماد تھا، انہوں نے کہا میں چلتا ہوں۔ سو اب وہ مکہ سے چلتے ہیں۔ اور اب ان کا رخ جو ہے وہ عراق کی طرف ہے۔ اس وقت سڑکیں پکی نہیں تھیں، اور نہ کوئی نئے رستے معروف تھے، جس طرح ہمارے ہاں ہے کہ لندن جانا ہے تو M6 سے جانا ہے یا M1 سے، اس طرح اسوقت راستے نہیں تھے۔ تو تمام صحراؤں میں ادھر سے گزریں ادھر سے گزریں، اسوقت کا جو زمانہ تھا اس کے مطابق آدمی کو پکڑنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ سڑکوں پر جانے والوں کو پکڑا جا سکتا ہے، لیکن جہاں سڑکیں ہی نہیں بلکہ جنگل ہیں یا صحرا ان سارے۔ وہاں کوئی کسی کو کیا پکڑے؟

قافلۂ حسینؓ مقام صرف پر

اب حضرت حسینؓ کا قافلہ جو عراق کی طرف چلا تو اسوقت سڑکیں نمایاں نہیں تھیں، کہ وہ آرام سے پہنچ سکتے۔ تو ادھر عراق میں یزید نے ابن زیاد کو گورنر مقرر کیا ہوا تھا۔ ابن زیاد کو بڑی فکر تھی کہ حسین کس طریقے سے اور کہاں سے آئیں گے۔ سو حضرت حسین مکہ سے چل پڑے اور چلتے چلتے کسی طرف سے جا رہے ہیں

حسینی قافلہ صحرا کی جن راہوں سے گزرا تھا
وہ راہیں آج بھی اس قافلے کو یاد کرتی ہیں

تاریخ میں انکے نقوش کیا ہیں؟ اس طرح جانیے کہ جب آرہے تھے تو راستے میں صرف (گاؤں) کا ایک مقام ہے۔ صرف کے مقام پر جب حضرت حسین پہنچے، تو ابن زیاد کے مقرر کیے ہوئے جو کارندے تھے کہ حضرت حسین کدھر جاتے ہیں، ان میں ایک قافلہ حر تمیمی کا تھا۔ اسے ایک ہزار فوجی دے کر بھیجا گیا تھا، کہ تونے ان کو اس طرف سے روکنا ہے تو حر تمیمی صرف کے مقام پر حضرت حسین کے سامنے آگیا۔ اب یہاں سے تقابل شروع ہوتا ہے کہ کس طرح آمنا سامنا ہوا۔

حضرت حسینؓ کی حر سے ملاقات

اور اتفاق یہ کہ یہ جو حر تھا وہ بھی عراقی تھا۔ اور جو خطوط امام حسینؓ کو بلانے کے لیے مدینہ منورہ لکھے گئے تھے، بلکہ امیر معاویہ کے آخری دنوں میں لکھے گئے تھے، ان خطوط میں لکھا خط اس "حر" کا بھی تھا کہ آپ ادھر آئیں۔ تو حضرت حسینؓ کو اس کا وہ خط یاد آگیا، اور کہا حر تو نے خط نہیں لکھا تھا؟ اور تم نے کیا خود نہیں مجھے بلایا۔ اور اگر اب تم نے رائے بدل دی ہے، تو میں بھی رائے بدلتا ہوں، مجھے مدینہ واپس جانے دو، حر کو خیال تھا کہ اگر میں نے جانے دیا، تو ابن زیاد کیا کہے گا!؟ کیوں کہ میں تو ملازم ہوں؟ میری Job جائے گی۔ تو وہ آگے ہو گیا کہ میں جانے نہیں دوں گا۔

تو حضرت حسین نے شمال کی جانب رخ کیا، کہ میں قادسیہ چلا جاؤں، تو جب وہ قادسیہ جانے کے لئے چلے تو ابھی راستے میں ہی تھے، قادسیہ پہنچنے ہی والے تھے، کہ ان کو راستے میں پتہ چلا کہ قادسیہ میں عمرو بن سعد، ابن زیاد کا نمائندہ وہ آگے ایک فوج لیکر آیا ہوا ہے، تو پھر انہوں نے قادسیہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنا رخ بدل لیا اور قادسیہ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر کربلا ہے تو حضرت حسین نے ادھر رخ کر لیا اور تھکے ہوئے تھے۔ ع

سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

قضاو قدر میں پہلے سے ہی تھا کہ کربلا میں آئیں گے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کربلا میں

تو حضرت حسینؓ کربلا پہنچے۔ ادھر عمرو بن سعد جو قادسیہ میں تھا وہ قادسیہ سے تلاش کرتا کرتا پیچھے مڑا تو وہ بھی کربلا آگیا۔ جب کربلا میں آگیا تو آتے ہی حضرت حسینؓ کے قافلے کے سامنے ہوا۔ اور حضرت حسینؓ کو آواز دی، جب وہ سامنے آئے، تو کہا کہ ہمیں گورنر ابن زیاد نے بھیجا ہے اور ہم اس کی طرف سے مامور ہیں، اور باقاعدہ السلام علیکم کہی، اور بڑے احترام سے بولا، کہ ہمیں اس نے بھیجا ہے اور ہم ایک سرکاری حیثیت میں آئے ہیں، ہمیں (ابن زیاد) نے کہا ہے، کہ ان کو روکو۔ یا میرے پاس لے آؤ۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تین تجاویز

اس نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کہا! کہ آپ اب بتائیں! ہم تو مامور ہیں، ہم تو لیکر ہی جائیں گے، تو حضرت حسین نے (عمرو بن سعد کو) کہا کہ میری تین تجویزیں ہیں (جو سنی شیعہ دونوں کی کتابوں میں درج ہیں) کہ:

اگر آپ مجھے روکتے ہیں، (۱) تو مجھے واپس جانے دو لڑنا میرا مقصود نہیں نہ میں لڑنے کے لئے آیا ہوں (۲) اگر یہ تم نہیں مانتے تو مجھے کسی سرحدی علاقے میں بھیج دو میں زندگی وہی بسر کروں اور اگر کبھی لڑنا پڑے تو کفار کے ساتھ لڑتے ہوئے اپنی جان جان آفرین کو دوں۔ (۳)۔ نمبر تین کہ تم میرے راستے میں رکاوٹ نہ بنو میں شام جاتا ہوں، یزید کے پاس خود جاتا ہوں۔ (شیعہ کتاب، مقتل الحسین ص ۱۰۰)

اور صاحب مقتل الحسین یہ بھی لکھتا ہے کہ اس روایت کو محدثین کی ایک جماعت نقل کرتی ہے:

قال أبو مخنف واما ما حدثنا به المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير الأزدي وغيرهما من المحدثين فهو ما عليه جماعة المحدثين[1] (مقتل الحسین ص99)

(1) اکثر شیعہ علماء اس روایت کے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ ایک راوی کہتا ہے میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ سے لیکر کربلا تک پورے سفر میں ساتھ رہا ہوں مگر میں نے یہ تین شرائط نہیں سنیں۔

مطلب یہ تھا کہ میں یزید کے پاس جاؤں اور اس سے خود بات کروں اور اگر یزید میری شرائط مان لے تو اس کی حکومت کو مانا جا سکتا ہے، جیسے میرے بھائی حسن اور امیر معاویہ بھی تو ایک دوسرے کے پاس پہنچے تھے اور مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ تو میں امیر معاویہ کے بیٹے کے پاس جانے کو تیار ہوں۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ امن پسند تھے

تو حضرت حسینؓ کی جو تین تجویزیں تھیں اس میں سے آخری تجویز کہ مجھے یزید کے پاس شام میں جانے دو، میں اس سے خود بات کروں گا، اس طرح جس طرح میرے بڑے بھائی اور حضرت معاویہ کے درمیان بات ہوئی تھی۔ اب بتایئے کہ حضرت حسینؓ سے زیادہ کوئی امن پسند ہو سکتا ہے؟ کہ انہوں نے فتنے سے، خون ریزی سے، لڑائی جھگڑے سے ہر چیز سے بچنے کا حل پیش کیا۔ تو جس کسی اہل فہم نے بھی حضرت حسینؓ کی یہ تین تجاویز سنیں وہ حضرت حسینؓ کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ وہ اقتدار کے طالب تھے یا وہ امن پسند نہ تھے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ تصور نہیں کر سکتا کہ حضرت حسین خون ریزی کو پسند کرتے تھے یا لڑنا ان کا مزاج تھا۔

(جواب) شیعہ حضرات کی اس بات کا جواب یہ ہے کہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ شرائط عمرو بن سعد کو علیحدگی میں بتائیں اس لیے وہ راوی ان شرائط کو نہیں سن سکا، مگر جب عمرو بن سعد نے ان شرائط کو منظور کروانے کے لیے ابن زیاد ملعون کے پاس بھیجا تو یہی شرائط لکھی ہوئی بھیجیں جنہیں خود شیعہ کے دو بڑے مستند عالم شیخ مفید اور ملا باقر مجلسی اپنی اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں۔ ولما رأى الحسين نزول العساكر مع عمر بن سعد بنينوى ومددهم لقتاله أنفذ إلى عمر بن سعد: "إني أريد أن ألقاك" فاجتمعا ليلا فتناجيا طويلا، ثم رجع عمر بن سعد إلى مكانه و كتب إلى عبيد الله بن زياد: أما بعد: فإن الله قد أطفأ النائرة وجمع الكلمة وأصلح أمر الأمة، هذا حسين قد أعطاني أن يرجع إلى المكان الذي أتى منه أو أن يسير إلى ثغر من الثغور فيكون رجلا من المسلمين، له ما لهم وعليه ما عليهم، أو أن يأتي أمير المؤمنين يزيد فيضع يده في يده، فيرى فيما بينه وبينه رأيه

(الارشاد ج2 ص87) (بحار الانوار ج44 ص389)

عمرو بن سعد کا کربلا میں قیام

تاہم حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ تین تجاویز عمرو ابن سعد کے سامنے رکھیں۔ تو عمرو ابن سعد نے بڑے ادب سے کہا کہ حضور ہم آپ کے مقام کو پہچانتے ہیں، لیکن میرے اختیار میں کچھ نہیں، میں یہ تینوں تجویزیں لکھ کر ابن زیاد کو بھیجتا ہوں، کیوں کہ ہم اس کے بھیجے ہوئے ہیں۔

عمرو بن سعد نے بھی کربلا میں اپنا ڈیرہ لگا رکھا تھا۔ ادھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا خیمہ لگا ہے اور ادھر عمرو بن سعد کا خیمہ لگا ہے۔ البتہ جب اذان ہوتی ہے، تو دونوں فریق جمع ہو جاتے ہیں نماز اکھٹی ہوتی ہے۔ اور تاریخ میں لکھا ہے کہ صفیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ سیدھی کرواتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں آسمان کے نیچے کبھی دو متحارب گروپوں کو اس طرح نماز پڑھتے نہیں دیکھا گیا جس طرح کربلا میں ہوا۔

جب عمرو بن سعد نے وہاں خیمہ لگایا تھا، اور دوستانہ طور پر عمرو بن سعد کی اور حضرت حسین کی ملاقاتیں بھی ہوتیں، اور اکٹھی نمازیں بھی ہو رہی ہیں، تو دوسری طرف یہ خبریں ابن زیاد کو بھی پہنچ رہی ہیں۔ تو ابن زیاد کو وہم ہوا کہ یہ دونوں مل ہی نہ جائیں، کیونکہ ایک ہی جگہ خیمے لگائے ہوئے ہیں اور آپس میں مل بھی رہے ہیں اور نمازیں بھی اکٹھے پڑھ رہے ہیں تو یہ سیاستدان ہوتے بڑے محتاط ہیں۔ تو ابن زیاد نے اپنی طرف سے عمرو بن سعد پر بھی آدمی مقرر کر دیے کہ انہیں دیکھو ان پر نظر رکھو کہ کہیں یہ دونوں مل ہی نہ جائیں۔

یہ عمرو بن سعد فاتح ایران سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیٹا تھا۔ تو جب عمرو بن سعد کے سامنے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تجویزیں پیش کیں تھیں، تو جو عمرو تھا وہ بڑا خوش ہو گیا کہ اب خون ریزی نہیں ہو گی، اب تو یہ ایسی باتیں حسین نے کی ہیں کہ کچھ نہ کچھ تو منظور ہوں گی تو وہ بڑا خوش تھا۔ یہ تجویزیں جب ابن زیاد کے پاس آئیں تو ابن زیاد بھی بڑا خوش ہو گیا، کہ ہم جو کہتے تھے کہ معاویہ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں انتشار بڑھے گا، خون ریزی ہو گی، تو شکر ہے کہ حسین نے جو باتیں کیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خون ریزی نہیں ہو گی تو عمرو بن سعد خوش تھا اور خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

شمر ملعون کا ابن زیاد ملعون کو مشورہ

اس موقعہ پر شمر بھی وہاں ابن زیاد کے پاس تھا۔ اس نے ابن زیاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھنا یہ موقع پھر نہیں آئے گا، اس وقت حسین تمہارے قابو میں ہے، تو اگر وہ کسی طرح چلے گئے تو پھر آگے انتشار ہو سکتا ہے، اس لئے ان کو چھوڑنا نہیں، اور ابن زیاد جو خوش تھا اس کو چقمہ دیا شمر نے، اور کہا ابن زیاد! اس وقت یزید کی نظر انتخاب تم پر ہے، تم کو جو اس صوبے کا بڑا بنایا اگر حسینؓ کی اور یزید کی صلح ہو گئی تو پھر یہاں حسینؓ کا کام چلے گا، حسینؓ کی بات چلے گی اور اگر ایسا ہو گیا پھر تو تو گیا۔ اس لئے اب موقع ہے، کہ تو یہ پیغام بھیج کہ تمہاری تینوں تجویزیں مسترد ہیں، البتہ ایک چوتھی تجویز ہے، جس کو کہتے ہیں مؤرخین کہ ابن زیاد کو پزیرائی کی امید ہو گئی، کہ شاید وہ مان لی جائے کہ ہم حسینؓ کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگین کرنا نہیں چاہتے۔

ابن زیاد ملعون نے حضرت حسینؓ کے تینوں تجاویز مسترد کر کے کیا کہا؟

ابن زیاد نے کہا، حضرت حسین کو پیغام دو کہ میرے ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کی بیعت کریں، تو حسین رضی اللہ عنہ کو میرے پاس لے آؤ، اگر وہ میرے ہاتھ پر یزید کی بیعت کر لے تو پھر ان کو رہا کر دیا جائے گا، اور یہ خود شام جا کر بیعت کر لیں۔ اب زیاد تو خود بڑا بدنام قسم کا آدمی تھا، اور زیاد کا بھی یہ بیٹا ہو اور دوسری طرف امام حسین جیسی بلند پایہ جنت کے جوانوں کے سردار جیسی شخصیت ہو، جو پیغمبر کا نواسہ ہے، فاطمہ کا لعل ہے، علی کا بیٹا ہے، حسن کا بھائی ہے، وہ اس بدبخت کے سامنے بطور گرفتار قیدی کے پیش ہو!! تو حضرت حسینؓ مقام غیرت میں آ گئے۔ اور انہوں نے وہاں ایک تقریر بھی کی، لیکن ابھی میں اس کا ذکر نہیں کرتا تو حضرت حسینؓ نے بات جس پر ختم کی کہا کہ مجھے موت منظور ہے لیکن میں ابن زیاد کے پاس جاؤں اور اس کے ہاتھ پر بیعت کروں یہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ یزید کی اور یزیدیوں کی بات میں فرق ہے؟

دیتی رہے گی درس شہادت حسینؓ کی

آزادی حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے سر تیرا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

تو بظاہر یزید کی اطاعت پر اتنا انکار نہیں جتنا یزیدیوں کی اطاعت پر کہ یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ابن زیاد کو جواب

حضرت حسینؓ نے ان کو انکار کیا کہ نہیں، میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ اب اس کے باوجود خیمے دونوں کے کربلا میں ہی تھے، اور آپس میں ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں۔ تو اب اس پر بھی ابن زیاد نے اپنے آدمی کو بھیجا، اور کہا کہ تم جاؤ اگر تو عمرو بن سعد کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ان سے ملا ہوا ہے، تو اسے میرا پیغام دو اور ایک چٹھی بھی دی، کہ اے عمرو بن سعد! میں نے تمہیں اس لئے تو نہیں بھیجا تھا کہ تو حسینؓ کے ساتھ دوستی بڑھائے، اور ایک ہی جگہ تم نے خیمہ لگایا، اگر تیرا ارادہ لڑنے کا نہیں تو اسی خط سے میں تجھے معزول کرتا ہوں، اور یہ جو خط لے کر آرہا ہے اس کو میں اس فوج کا سربراہ مقرر کرتا ہوں اپنی طرف سے۔ اور اسکو اختیار دیا، کہ اگر پتہ چل جائے کہ عمرو بن سعد ان سے کچھ ملا ہوا ہے، تو اسے اسی وقت گرفتار کرلو اور میں نے تمہیں وہاں اس کی بجائے فوج کا سردار بنایا۔ تو وہ جو خط تھا اس نے آکر عمرو بن سعد کو دکھا دیا۔ اب عمرو بن سعد جب یہ دیکھا تو وہ پھر حضرت حسینؓ کے مقابلے میں سیدھا ہو گیا، کہ اب اگر میں انکار کرتا ہوں تو یہ مجھے گرفتار کرنے کے لئے کھڑا ہے، جو خط لیکر آیا ہے اور سربمہر خط ہے، حکومت کا Official Document ہے انکار نہیں کر سکتا۔ دو تاریخ کو یہ اترے تھے لیکن انہیں آتے جاتے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا۔

نو محرم کو پیش آنے والے واقعات

تو اب 10 (دس) تاریخ آگئی محرم کی ۔۔۔۔۔ آج کیا تاریخ ہے؟ آج محرم کی دس تاریخ ہے۔ نو تاریخ تک کے واقعات کو میں نے ایک ترتیب سے بیان کر دیا۔

اب جو شمر تھا، اس نے ابن زیاد کو کہا تھا کہ میں حسینؓ کے ساتھ لڑنے اور قاتلانہ

حملے کے لئے تیار ہوں، لیکن میری ایک شرط ہے کہ میرے چار بھانجے کربلا میں حسینؓ کے ساتھ ہیں۔ شمر کی بہن کا نام ام البنین تھا، یہ حضرت علیؓ کی بیوی تھیں۔ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی وفات کے بعد جو نکاح کیے ان میں سے ایک نکاح شمر کی بہن سے بھی کیا تھا، جس کا نام ام البنین تھا۔ اور ام البنین کے جو بیٹے تھے وہ شمر کے بھانجے تھے۔ عبید، عباس، جعفر، عثمان یہ ان کے نام تھے۔ تو شمر نے ابن زیاد کو کہا کہ میں حملے کے لئے تیار ہوں، لیکن تو ایک سرکاری تحریر دے، کہ کربلا میں حسینؓ کے ساتھیوں پر جب ہمارا قبضہ ہو تو ان چار کی جان بخشی کی جائے گی اور ان کو امن کے ساتھ خطرے کے بغیر وہاں سے نکالا جائے گا۔

ابن زیاد نے لکھ کر دے دیا کہ ان چار کو قیدی نہ بنایا جائے نہ قتل کیا جائے میں انہیں امان دیتا ہوں۔ تو وہ چٹھی شمر نے لے لی۔ اب یہ زرہ بکتر پہنے ہوئے لڑائی کے لئے تیار ہو گیا، اب اس بد قسمت کے نصیب میں اپنے ہاتھوں کو امام حسینؓ کے خون سے رنگین کرنا مقدر تھا۔ اس نے آکر اعلان کیا کہ کربلا میں یہ جو چار میرے بھانجے ہیں وہ باہر نکل آئیں ان کے لئے میں ابن زیاد کی طرف سے امان کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ چار نکل آئیں پھر ہم قافلے پر حملہ کرتے ہیں، ان سے لڑائی کرتے ہیں۔ قافلے میں بھی کوئی تھوڑے نہیں بلکہ بہتر 72 نفوس تھے۔ عورتوں بچوں کو نکال کر تھوڑے ہو جائیں گے، لیکن کل بہتر نفوس تھے۔ وہ چاروں باہر آئے اور انہوں نے کہا اے شمر ہمیں تمہاری یا ابن زیاد کی امان کی ضرورت نہیں، ہم اللہ کی امان میں جائیں گے ہم اپنی بھائی حضرت حسینؓ کے ساتھ نکلے ہیں اور ان کے ساتھ ہی جا مریں گے۔

اتنے میں کوئی عصر کا ٹائم ہو گیا۔ نو تاریخ ہے اور عصر کا ٹائم ہو گیا، اور پھر عربوں کی روایت ہے کہ رات کو لڑتے نہیں تھے، کہ اتنے میں سورج غروب ہونے کو قریب پہنچا اب یہ مجبوری عرب کے رواج کے مطابق تھی۔

دس محرم اور میدان کربلا

نو محرم سے دس محرم آگیا۔ اس رات یہ جو نو کے بعد آئی ہے یہ جو کربلا کے مسافر

تھے، اس رات پانی بند کیا گیا، ابن زیاد نے کہا! اس قافلے تک پانی نہ پہنچے، اور اتفاق سے دن کے وقت انہوں نے اپنے خیموں میں پانی پہنچایا نہیں تھا، اور یہ وہ وقت تھا کہ علی اصغر بھی پانی کے لئے ترس رہے تھے، اسی دوران حضرت حسینؓ کا بیٹا زین العابدین وہ بیمار تھے، اس کے ساتھ ان کی بہن بھی تھی، ام کلثوم نام کی۔ دونوں ایک خیمے میں تھے۔ ان حالات میں یہ بچے روئے تو بے ساختہ طور پر جو عورتیں تھیں وہ بھی رو پڑیں۔

یہ رونا ہمارے نزدیک قابل اعتراض نہیں، کیوں؟ یہ بے اختیار روئے تھے، ہم جس کو ناجائز کہتے ہیں، وہ وہ رونا ہے جو وقت مقرر کر کے ہو کہ مومنین کرام! ہم صبح نو بجے روئیں گے تو اِس مقرر کردہ رونے پر کلام ہوتا ہے۔ اس رونے پر نہیں، کیوں کہ یہ رونا اختیاری نہیں اضطراری ہے۔

اہل سنت کے ہاں اختیاری رونا جائز نہیں

ایک دفعہ کسی نے ہم سے سوال کیا کہ آپ کے اہل سنت کے عقیدے میں کیا سوگ بالکل ہی نہیں؟ تو میں نے کہا کہ تفصیل سن لو کہ رونا ہو اضطراری، اختیاری نہ ہو۔ اضطراری طور پر تو منہ سے بات نکل ہی جاتی ہے ـ۔ کس کے منہ سے نہیں نکلتی؟ حضور ﷺ کی جب وفات ہوئی تو حضرت فاطمہؓ کی زبان سے کیا نکلا تھا جو نبی وفات ہوئی، حضرت عائشہؓ کی زبان سے کیا نکلا تھا، حضرت فاطمہ نے جب کہا تھا:

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّھَا
صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

مجھ پر اتنے مصائب آگرے، آپڑے، اگر یہ مصائب دنوں پر ڈال دیے جائیں، تو صِرْنَ لَیَالِیَا تو وہ بھی راتیں ہو جائیں، اگر وہ مصائب دنوں پر ڈال دیے جاتے، تو دن بھی راتوں میں تبدیل ہو جاتے، لیکن ان کے ہاں اختیاری طور پر نہیں اضطراری طور پر یہ بات نکلی، اور انفرادی طور پر نکلی اجتماعی طور پر نہیں نکلی۔ تو کسی نے پوچھا کہ آپ کے اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق سوگ یا رونا کس طرح جائز ہے؟ میں نے جواب دیا رونا اگر (1) اضطراری ہو اختیاری نہ ہو، نمبر (2) انفرادی ہو اجتماعی نہ ہو، نمبر (3) تین دن کے

اندر اندر رہو، تین دن سے باہر نہ ہو تو ہمارے ہاں بھی ناجائز نہیں، رخصت ہے اجازت ہے لیکن کسی پہلو سے یہ عبادت نہیں۔

اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کے آداب یہ بتاتے ہیں کہ رونا انفرادی اور اضطراری ہو اور تین دن کے اندر رہو، تین دن کے باہر کا یہ حکم نہیں ہے۔

لطیفہ

جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی تو ایک انگریز ہندوستان آگیا، اور اتفاق یہ کہ تاریخ دس محرم کی تھی اور وہ لکھنؤ آگیا۔ تو اس نے لکھنؤ میں دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور رو رہے ہیں، اور بڑا ہائے ہائے ہو رہا ہے۔ تو انگریز گھبرا گیا اور کہنے لگا! کیا ہوا یہ کیوں رو رہے ہیں؟ تو کسی نے اس کے کان میں کہا کہ پیغمبرِ اسلام کا نواسہ شہید کیا گیا۔ وہ انگریز حیران ہوا کہ پیغمبر تو کئی صدیاں قبل ہوئے، اب یہ نواسہ یہاں کیسے شہید ہو گیا؟! اس نے کہا وہی پیغمبر وہ جو عرب میں آئے ان کا نواسہ؟ کسی نے جواب دیا کہ ہاں وہ ہی۔ تو وہ انگریز فوراً کہنے لگا! کہ عرب کا ڈاک کا نظام بڑا خراب ہے، یہاں اب اتنی صدیوں کے بعد اطلاع پہنچی ہے، ڈاک کا نظام بڑا ہی خراب ہے۔ انگریز کا ذہن تصور ہی نہیں کر سکتا تھا، کہ اتنے سالوں کے بعد وہ کیفیت ہو جو بروقتِ وفات کسی صدمے پر ہوتی ہے، تبھی تو اس نے کہا ناں کہ یہاں اب خبر پہنچی ہے، ڈاک کا نظام بڑا خراب ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اسلام دین فطرت ہے اور فطرت اس چیز کو نہیں روکتی جو بے اختیاری میں ہو۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا آخری فیصلہ

تاہم حضرت حسینؓ مقام غیرت پہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں اسکو اپنے مقام غیرت کے خلاف سمجھتا ہوں، کہ میں ابن زیاد کے پاس گرفتار ہو کر جاؤں، اور اس کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ تو فرمایا اب میں اتمام حجت کرنا چاہتا ہوں، کہ جس پر قیامت کے دن میں کھڑا ہوں گا اور مظلوم کی آواز ہو گی۔

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از در حق بہر استقبال می آید

مظلوموں کی آہوں سے بچو کہ ہنگام دعا کردن کہ جب مظلوم ہاتھ اٹھاتا ہے تو جس طرح کوئی استقبال کے لئے آتا ہے اسی طرح خدا کی رحمت پھر استقبال کرتے ہوئے اس کی دعا کو قبول کرتی ہے۔

حضرت امام حسینؑ کا کربلا میں آخری خطبہ

امام حسین نے فرمایا میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ لیکن میں اب اتمام حجت کرتا ہوں۔ تو یہ وہ خطبہ ہے جو حضرت امام حسینؓ نے کربلا میں دیا اس کے بعد جام شہادت نوش فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں:

جو مجھے نہیں جانتا، وہ مجھے جان لے کہ میں پیغمبر اسلام کا نواسہ ہوں، (مطلب یہ تھا کہ جس کا تم کلمہ پڑھتے ہو، اور تمہاری اذانوں میں جس کا نام گونجتا ہے میں اس کا نواسہ ہوں) میں علیؓ کا بیٹا ہوں، میں حضرت حسن کا بھائی ہوں، میں جعفر کا (جو حضرت علی کے بڑے بھائی تھے) بھتیجا ہوں، میں فاطمہ کی گود کا پروردہ ہوں، اور میں نے اب تک اپنے ہاتھ سے کسی کو مارا نہیں، کہ میرے ذمہ خون دینا ہو، میں نے اب تک زبان سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کیا جسکو میں پورا نہ کر سکوں، اور میری زبان پکڑی جا سکے، میں اس کے علاوہ کہتا ہوں کہ میرے نانا کی زبان سے سننے والے کئی صحابی اب بھی موجود ہیں، جنہوں نے پیغمبر کی زبان سے سنا، کہ حسن و حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہوں گے، (جنت میں جو بڑی عمر کے لوگ گئے ان کے سردار تو ابو بکر و عمر ہوں گے وہ اور مسئلہ ہے۔ لیکن جو دنیا سے جوانی میں گئے، اگرچہ حضرت حسن و حسین جوانی میں نہیں تھے لیکن اللہ تعالی سب کو بڑھاپے سے نکال کر جوانی میں جنت میں داخل کرے گا، تو کہا) تم میں ایسے بھی لوگ ہوں گے، جنہوں نے پیغمبر کی زبان سے سنا ہو گا، کہ میں وہی ہوں میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے تم مجھ پر تلوار اٹھاؤ، میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا اور میں یہ حجت جو ہے اسی دن جو دن آنے والا ہے (مطلب یہ کہ **ولمن خاف مقام ربہ**

جنتین اس وقت سے ڈرو جب ہر کسی کو خوف ہو کہ ایک دن کھڑا ہونا ہے۔)

(تاریخ اسلام حصہ دوم از نجیب آبادی)

آپ نماز ختم کس پر کرتے ہیں، جب نماز ختم ہوتی ہے ناں یوم یقوم الحساب اس کے بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ... یوم یقوم الحساب کا معنی ہے کہ جس وقت حساب کی گھڑی قائم ہو گی جو شخص اس دنیا میں ہی ڈر گیا، اس وقت اس حساب کے دن سے اس انصاف کے دن سے۔

مانا کے ظلمتوں کے ہر سمت ہیں اندھیرے
لیکن کبھی تو ہوں گے انصاف کے سویرے

ہر طرف دنیا میں ظلم ہی ظلم ہے لیکن کبھی تو ہوں گے انصاف کے سویرے، تو انصاف کی صبح تو آنے والی ہے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ دیا اس سے مقام حسین کا پتہ چلتا ہے۔

شمر لعین کا حضرت حسینؓ پر ظلم

پھر دس محرم کو حضرت حسینؓ نے جو اسوقت مقام غیرت میں تھے، کہا کہ میں نے بزدل کی موت نہیں مرنا۔ انہوں نے پہلے کبھی کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا لیکن اب جو سامنے آیا جس کو بھی شمر وغیرہ نے آگے کیا آپ (امام حسین) نے تہ تیغ کیا۔ پھر اسی بدبخت شمر نے اس عظیم ہستی کے گلے کو کاٹا۔ حضرت حسینؓ نے اپنی تقریر سے پہلے اپنے ساتھیوں کو کہہ دیا تھا: (جیسے آج محرم کی دس تاریخ تھی۔ انہوں نے کہا!)

دشمن میرے خون کے پیاسے ہیں، اے حاضرین! اے میرے کربلا کے ساتھیو! رات کا اندھیرا ہے میری طرف سے سب کو اجازت ہے کہ جو جانا چاہتا ہے جائے اسکو کوئی بھی نہیں روکے گا، راستوں میں کوئی بھی نہیں مارے گا (کیوں کہ دشمنی میرے ساتھ ہے تمہارے ساتھ نہیں) تو میں تمہیں موقع دے دیتا ہوں تم یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارا نقصان کروں، ان کو عداوت تو میرے ساتھ ہے تو تم جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ (تاریخ اسلام)

لیکن سب کنبے والوں نے کہا کہ نہیں ہم نہیں جائیں گے۔ لیکن انہوں نے رات کے

وقت ہی اجازت دے دی تھی کہ میں کسی کو جاتے بھی نہ دیکھوں، اور جاتے ہوئے کوئی میرے ساتھ مصافحہ بھی کرنے نہ آئے، پھر جب اللہ کے ہاں جب ہم کھڑے ہوں گے تو ظالم و مظلوم سب ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں گے سو چلے جاؤ جس نے جانا ہے۔ لیکن کوئی نہ گیا۔

تو حضرت حسینؓ وہی کربلا میں تھے یعنی انہیں کوفہ جانے ہی نہیں دیا گیا۔ کربلا میں ہی روک لیا گیا۔ پھر انہیں یہاں دیکھ کر قاتل بھی ٹھہر گئے تو آگے جو عمرو بن سعد تھا بد بختی اس کی بھی تھی حالانکہ وہ دل سے نہیں چاہتا تھا کہ خون ریزی ہو لیکن شمر اور ابن زیاد نے جو پیرایہ اختیار کیا، تو قتل کا حکم یزید نے نہیں دیا تھا وہ ابن زیاد نے دیا تھا۔ عمرو بن سعد، یہ کام نہیں چاہتا تھا لیکن جوش میں آکر یہ کام کر گیا کیونکہ بد بختی اس کا مقدر تھی۔ سو شمر سمیت ان سب نے بڑی بے دردی اور ظالمانہ طریقے سے نواسۂ رسول ﷺ حضرت امام حسین کو شہید کر دیا۔

تو پھر جب یہ واقعہ ہو چکا پھر اس قافلہ کو کوفہ جانے کی اجازت مل گئی۔ چند خواتین تھیں اور مردوں میں حضرت زین العابدین تھے، باقی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے، اجڑا ہوا قافلہ کوفہ میں گیا، تو اب کوفہ تو شہر تھا تو کوفہ کے بعض مرد بازار میں افسوس کے ساتھ دیکھ رہے تھے کیوں؟ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسن اور حضرت حسین کوفہ سے منتقل ہوئے تھے تو اسوقت کے ساتھی بھی جمع ہو گئے۔

حضرت زین العابدین کا اپنی پھوپھی سے سوال

آج جو علیؓ کی، حسین کی آخری نشانی تھی وہ ان کے سامنے حضرت زین العابدین کی شکل میں تھی۔ حضرت زین العابدین حضرت زینب کا ہاتھ پکڑے ہوئے جا رہے تھے کہ رونے والوں کی آوازیں مکانوں کی چھتوں سے آئیں، تو بچے نے اپنی پھوپھی سے پوچھا کہ اماں جی یہ رو کیوں رہے ہیں؟ علامہ طبرسی نے کتاب الاحتجاج (ج 3 ص 68) میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ زین العابدین نے کہا ان ھوئلاء یبکون علینا۔ اے میری پھوپھی مجھے بتایئے! یہ جو کوفہ والے ہم پر رو رہے ہیں، یہ اب ہم پر کیوں رو رہے ہیں!؟ من قتلنا

غیرھم ان کے سوا ہمیں مارا کس نے ہے؟ مطلب یہ تھا کہ اگر حکومت پہل کرتی تو یزید چل کر مدینے آتا یا اس کے کارندے چل کر مدینے آتے، اور مار دیتے۔
مارا کنہوں نے؟ انہوں نے ہی۔ کوفہ والوں نے حضرت حسین کو خط لکھ کر یہاں کوفہ بلایا، ان کے ساتھ وفا کے عہد باندھے۔ حضرت حسین کربلا میں خط کھول کر کہتے ہیں، او کوفہ والو! کیا تم نے یہ خط نہیں لکھے؟ تو حضرت زین العابدین نے اور حضرت زینب نے یہ ساری ذمہ داری ڈالی ہے کہ قاتلین حسین کہاں ہیں؟ ان کو تلاش کرنا ہے تو عراق میں جاؤ، عراق کی گلیاں تمہیں بتائیں گی، ان عورتوں کا رونا تمہیں بتائے گا کہ حسین کے قتل کے ذمہ دار کون ہیں۔[1]

تو حضرت زین العابدین کے یہ الفاظ ان ھؤلاء یبکون علینا اب تو یہ ہم پر رو رہے ہیں لیکن بتایئے من قتلنا غیرھم ہمیں ان کے سوا مارنے والا کون ہے؟ تو جب زین العابدین نے یہ الفاظ کہے تو پھر حضرت زینب بھی بے اختیار ہو گئیں، انہوں نے کہا سحقا لکم اے کوفہ والو! تمہاری بربادی ہو مالکم قتلتم حسینا حسین کو تمہی نے قتل کیا، اس کے اموال لوٹے وورثتموہ اور وارث بھی تم ہی ہو گئے۔ نہیں سمجھے؟ وارث کیا ہوتے ہیں جو مظلوم کی حمایت میں صدا لگاتے ہیں کہ قتل بھی تم نے ہی کیا اور وارث بھی تم ہی بن بیٹھے، اب دنیا کو تم ہی بتا رہے ہو کہ ہم حسین کے ہیں۔ اے اہل کوفہ سحقا لکم مالکم قتلتم حسینا وانبتہ اموالہ وورثتموہ حضرت زینب نے جو الفاظ کہے تو یہ ایک عجیب منظر تھا۔ جو لوگ خط بھیج کر بلانے والے تھے انہوں نے بد عہدی کی لیکن اب جب انجام دیکھ لیا کہ یہ آئے تھے اور اب جا رہے ہیں بیمار کربلا بھی پھوپھی کا ہاتھ پکڑے ہوئے ساتھ ساتھ جا رہا ہے اور انکا رخ اب شام کی طرف ہوا کیوں کہ شام والی عورتیں اور یہ سب ایک دوسرے کے رشتہ دار تھے۔

یزید کے گھر میں آہ وزاری

(1) قاتلان حسین رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ اسے جاننے کے لیے امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ کے رسالہ "واقعہ کربلا کے سلسلے میں قاتلان حسین رضی اللہ عنہ کی خانہ تلاشی" کا مطالعہ فرمائیں۔

تو جب یہ شام پہنچے ہیں تو پھر یزید کے گھر میں آہ و زاری ہونے لگی، عورتیں روتی ہوئیں جب ان قافلے والی عورتوں سے ملیں تو خون حسین نے خود اپنی شان اسی وقت بتادی کہ یہ مظلوم ہیں۔ اب اپنے پرائے سب آنسو بہا رہے ہیں جیسا کہ مشہور شیعہ عالم ملا باقر مجلسی لکھتا ہے:

"جس وقت امام حسین کے گھر والوں کا قافلہ کوفہ سے دمشق میں آکر دربار یزید میں پیش ہوا تو یزید کی بیوی دختر عبداللہ بن عامر بے تاب ہو کر بے پردہ دربار یزید میں چلی آئی، یزید نے دوڑ کر اس کے سر پر کپڑا ڈال دیا اور کہا کہ اے ہندہ! تو فرزند رسول اللہ بزرگ قریش پر نوحہ زاری کر، ابن زیاد لعین نے ان کے معاملہ میں جلدی کی اور حال یہ ہے کہ میں ان کے قتل پر رضامند نہ تھا۔"[1]

(جلاء العیون ص 527)

تو اگر تاریخ کا تجزیہ کیا جائے تو سب سے زیادہ ذمہ داری ان پر ہے یعنی اہل کوفہ پر، حتی کہ اس قافلہ کے جانے کے بعد سلیمان بن صرد خزاعی کے گھر میں یہ جمع ہوئے کہ یہ ہم نے کیا کر دیا! یہ سارا گناہ تو ہمارے ذمہ آئے گا۔ اب پھر جب سلیمان کے مکان پر میٹنگ ہوئی تو یہ ہے اعترافِ گناہ کہ ہم سے بڑی غلطی ہوئی۔ تو جب غلطی ہو جائے تو پھر کیا ہے؟ جب موسی علیہ السلام کوہ طور پر گئے تھے، تو پیچھے قوم نے حضرت ہارون کی بات نہیں مانی تھی، اور بچھڑے کی پوجا شروع کر دی، اور جب حضرت موسی علیہم السلام واپس پہنچے تو ان لوگوں نے پھر اپنی غلطی کا اعتراف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسی کی زبان سے ان کو یہ سزا دلوائی، کہ فاقتلوا انفسکم، اے بچھڑے کی پوجا کرنے والو، اب تم اپنے آپ کو مارو، تو اسوقت یہ

---

(1) اسی طرح کا حوالہ ایک دوسری شیعہ کتاب منتہی الاعمال ج 1 ص 105 مطبوعہ ایران از شیخ عباس قمی (1359ھ) پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور ایک مشہور شیعہ مؤرخ لوط بن یحیی یہاں تک لکھتا ہے کہ:

ووضع الراس فی طشت وغطاہ بمندیل دیبقی ووضعہ فی حجرہ وجعل یلطم علی خدہ ویقول مالی وقتل الحسین (مقتل ابی مخنف ص 139)

ترجمہ: یزید نے آپ کا سر مبارک ایک تھال میں رکھا اس پر ریشمی رومال ڈال کر اپنی گود میں رکھا اور اپنے گالوں پر طمانچے مارنے لگا اور کہنے لگا کہ مجھے قتل حسین سے کیا سروکار تھا۔

سزا دی گئی۔ تاہم جب یہ سلیمان کے مکان سے نکلے تو ماتم کرتے ہوئے، اس لیے کہ ہم یہ جو جرم کر بیٹھے ہیں، اپنے جرم کی سزا میں وہ اپنے آپ کو پیٹتے تھے۔ اب ایک بات کہہ کر بات ختم کرتا ہوں۔ سلیمان کے گھر سے نکلتے ہوئے جب یہ پیٹے۔ تو قتلِ حسین کی ذمہ داری انہوں نے قبول کرلی۔

حضرت حسین کا جاتے ہوئے پیغام

حضرت حسین نے خود اپنے عمل سے یہ بتا دیا کہ وہ ابن زیاد کے سامنے پیش ہونے کی بجائے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ تو جاتے ہوئے کیا وہ یہ پیغام نہیں دے گئے !! سوچو کہ اگر میں ابن زیاد کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے کو تیار نہیں، اور اسکے ہاتھ پر یزید کی بیعت کرنے کو تیار نہیں تو میرا باپ تو مجھ سے زیادہ غیرت مند تھا، اگر حضرت ابو بکر و عمر غلط حکمران ہوتے، تو کربلا اسی دن قائم ہو جاتی۔ تو حضرت حسین ہمارے محسن ہیں کہ سنی عقیدے کو ثابت کرنے کے لئے، وہ میدان میں آئے، تاکہ وہ جو کہا جاتا تھا، کہ تقیہ کے طور پر غلط حکمرانوں کو مان لو، تو اگر ماننا جائز ہوتا تو کیا حضرت حسین رضی اللہ عنہ ابن زیاد کے پاس نہ آجاتے؟ اگر وہ نہیں آئے، تو حضرت حسینؓ کا مقام حضرت علیؓ سے تو نہیں بڑھ گیا۔ اگر حضرت حسینؓ کا عمل یہ ہے، تو اگر حضرت ابو بکر و عمر غلط ہوتے تو حضرت علی بھی ان کے سامنے اسی طرح کھڑے ہو جاتے۔ سو جب حضرت علی نے خلفائے ثلاثہ کو دل سے قبول کیا کہ وہ راہ راست پر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے صحیح طور پر حق دار ہیں تو حضرت علی کو بظاہر ماننے کا دعوی رکھنے والوں کو بھی خلفائے ثلاثہ کو دل سے ماننا چاہیے۔[1]

---

(1) یہ بات بھی بڑی واضح ہے کہ سانحہ کربلا سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ امت سے کٹے نہ تھا بلکہ قیامت تک آپ مؤمنین کی محبت و مودت کے محور میں شامل رہیں گے، کیونکہ آپ سمیت تمام اہل بیت کی محبت اہل سنت کے ہاں جزو ایمان ہے۔ چنانچہ استاذنا المکرم حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

"سانحہ کربلا جن حالات میں پیش آیا وہ اہل عراق کی اچانک بے وفائی کا ایک اچانک رد

عمل تھا یہ نہیں کہ حضرت خاتم النبیین ﷺ کی امت جو پورے قلمرو اسلای میں پھیلی تھی اس کی غم خواری حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھی۔ پوری اسلامی دنیا میں جہاں بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ذکر ہو تا مومنین کے دل حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی محبت اور ان کی مظلومیت کے احساس سے برابر تڑپتے۔ خود اہل شام بھی ابن مرجانہ پر برابر لعنت کرتے تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں میں کوئی اعتقادی تفریق نہ تھی۔ اس سے یہ بات کھلے طور پر سمجھ آتی ہے کہ اس سانحہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے اس جداگانہ عمل سے امت سے ہرگز نہ کٹے تھے اور وہ سلطنت اسلامی کی سرحد پر اپنے موجود ہونے کو بھی اسلام کی ایک بڑی خدمت سمجھتے تھے اور اس کی آپ نے پیشکش بھی کر دی تھی آپ نہ چاہتے تھے کہ شیرازہ اسلام کسی پہلو سے انتشار کا شکار ہو۔

مدینہ منورہ میں حضرت علی بن الحسین کی ملی جلی علمی شخصیت: حضرت امام زین العابدین (94ھ) جب مدینہ منورہ آئے تو آپ حضرت جابر (74ھ) حضرت عبد اللہ بن عباس (68ھ) اور حضرت عبد اللہ بن عمر (74ھ) رضی اللہ عنہم کے تلامذہ میں رہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نہایت قریب رہے۔ وہ بھی آپ سے بہت پیار کرتے تھے۔ آپ کی پیشگوئی تھی کہ لوگ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں چلیں گے، امام زہری کہتے ہیں میں نے ان سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں پایا۔ مسجد نبوی میں ان کا علمی حلقہ اسی طرح مرجع عوام و خواص تھا جس طرح امت کے دوسرے اکابر اہل علم کے حلقے لگتے تھے اور یہ بات ان دنوں کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی کہ ان کے نظریات میں اور وقت کے دوسرے اہل علم میں کوئی اعتقادی فاصلہ پایا جاتا ہے۔ پھر حضرت امام باقر اور امام جعفر بھی حجاز میں اسی طرح مرجع عوام و خواص رہے جس طرح ان کے والد حضرت علی بن الحسین اپنے وقت کی ملی جلی شخصیت رہے تھے۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اہل نفاق حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں میں اعتقادی تفریق پیدا کرنے میں لگ گئے تھے۔ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ان کے سرغنہ کو زندہ جلا دیا تھا۔ تیسری صدی کے آخر میں ان کی یہ کوششیں اس درجہ میں کامیاب ہوئیں کہ انہوں نے ائمہ اہل بیت کو اب عام مسلمانوں سے بالکل علیحدہ کر کے متعارف کرانا شروع کر دیا تو بعض مورخین اور غلط قسم کے راویوں نے اس اختلاف کو اوپر تک لے جانے کی بھی بہت سعی کی ان حالات میں علماء حق کے ذمہ ہوا کہ وہ مسلمانوں کو متنبہ کریں کہ

ماتمی جلوس میں تعاون

جب یہ ماتمی جلوس نکالتے ہیں، تو ان پر غصہ نہ کریں۔ کیوں؟ یہ غصہ اپنے کیے کا اپنے اوپر ہی نکالتے ہیں۔ تو ہمیں اگر کبھی سیاست دان مجبور کریں ناں، کہ بھائی ان سے تعاون کرو، تو میں نے ایک دفعہ ان سے ویسے پوچھا کہ ہم کیا تعاون کریں؟ کہنے لگے جب یہ پیٹتے ہیں تو ان سے تعاون کریں۔ تو میں نے انہیں کہا کہ جو ان کو پیٹنے کا کام ہے وہ ہم کر دیتے ہیں، اور رونے کا یہ کر دیں، تا کہ ان کو یہ کام خود نہ کرنا پڑے۔ کیا آپ یہ تعاون چاہتے ہیں؟ کہا کہ پھر اس کا فائدہ کیا ہو گا؟ میں نے کہا کہ ایک بہت بڑا فائدہ ہو گا کہ ان کا رونا پھر سچا ہو گا۔ تو ہم تو یہ تعاون کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔

سنی شیعہ اتحاد کیسے قائم ہو سکتا ہے؟

اب ایک بات جو ہم سے لوگ آکر پوچھتے ہیں کہ جی ہمیں آپس میں ایک ہی جگہ رہنا ہے اور ملنا جلنا بھی ہے تو آپس میں دونوں فرقوں کا کبھی کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے کہ نہیں؟ تو میں نے کہا اگر سمجھوتہ کرنا ہو تو ایک راہ کھلی ہے، کہنے لگے کیا؟ کہا ہمارا دونوں کا اتفاق ہے کہ قرب قیامت میں امام مہدی پیدا ہوں گے یا ان کے عقیدہ کے مطابق نکلیں گے، سو جو بھی کہو تو امام مہدی کو یہ بھی مانتے ہیں اور ہم بھی۔ تو یہ کہتے ہیں وہ ہمارے ہیں، ہم کہتے ہیں چلو تم اسی پر رہو لیکن جب تک وہ نہیں آتے تم ہمارے ساتھ مل جاؤ، جب وہ آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ مل جائیں گے، اگر وہ تمہارے ہوئے تو تمہارے طریقے پر آ جائیں گے۔ سو جب تک وہ نہیں آتے تم ہمارے ساتھ ہو جاؤ، نمازیں بھی ہمارے پیچھے ہماری مسجدوں میں آکر پڑھو، اپنی عبادت گاہیں علیحدہ نہ بناؤ، اپنی بارگاہ علیحدہ نہ بناؤ۔

وہ تاریخ کے اس دھندلکے دور میں ائمہ اہل بیت کو کسی مشتبہ پیمانے سے جاننے کی غلطی نہ کریں انہیں اسی طرح اپنے اسلاف میں سے جانیں جس طرح وہ دیگر اکابر امت کو جانتے اور پہچانتے چلے آرہے ہیں۔ (مقدمہ، فوائد نافعہ، جلد دوم، ص:15)

واقعہ کربلا پر مزید مطالعہ کے لیے "فوائد نافعہ" جلد دوم، از حضرت مولانا محمد نافع رحمۃ اللہ علیہ کی مراجعت فرمائیں۔

اہل بیت اور صحابہ کے جوڑ پر نفیس نکتہ

ایک اور بات کہ ایک روایت ملتی ہے گو محدثین تو اس میں کلام کرتے ہیں لیکن روایت ہے کہ

سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «أَلَا إِنَّ مَثَلَ أَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ مَثَلُ سَفِينَةِ نُوحٍ مِنْ قَوْمِهِ، مَنْ رَكِبَهَا نَجَا، وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ» (المستدرک للحاکم جلد ۳، ص ۱۶۳)

حضور ﷺ نے فرمایا اھل بیتی کسفینۃ نوح کہ میرے اہل بیت نوح کی کشتی کی طرح ہیں، جس طرح نوح کی کشتی ہے، نوح کی کشتی پر کوئی آلائش نہیں، آلائش ڈوبنے والوں پر ہے تو فرمایا اھل بیتی میرے اہل بیت کسفینۃ نوح وہ نوح علیہ السلام کی کشتی کی طرح ہیں من رکبھا نجا جو اس کشتی میں بیٹھے گا بچ جائے گا۔ جو اس کشتی سے ہٹے گا نوح کا بیٹا بھی ہو، تو ڈوب جائے گا۔ تو آپ اہل بیت کی محبت میں نوح کی کشتی میں بیٹھنے کے لئے تیار ہیں کہ نہیں؟ (سامعین: تیار ہیں)

لیکن قرآن نے کہا کہ کشتیوں والے رستہ کس سے لیتے ہیں؟ قرآن نے کہا وبالنجم ھم یھتدون کہ رات کی تاریکیوں میں جب کشتیاں چلتی ہیں اور اسوقت کوئی ٹیلی فون تو نہیں ہوتے تھے، اشارے بھی لگے نہیں ہوتے تھے کہ رستوں کا پتہ چلے تو قرآن نے کیا کہا؟ کہ کشتیاں رستہ کیسے پکڑتی ہیں؟ فرمایا وبالنجم ھم یھتدون کہ کشتی والے ستاروں سے رستہ پہچانتے ہیں۔ تو نوح کی کشتی میں بیٹھنے والو رستہ بتائیں گے ستارے اور پیغمبر کی زبان نے ستارے صحابہ کو کہا اصحابی کالنجوم۔ تو اہل بیت کو کہا کشتی اور صحابہ کو کہا ستارے۔ (تو کشتیاں سمندروں میں چلتی ہیں، دریاوں کو عبور کرتی ہیں، پر راستے ستاروں سے ملتے ہیں۔)

ہم اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ رستہ ان سے لو۔ اسلام ہمارا کیا ہے کہ رستہ ان سے لو۔ ایک شخص نے ایک دفعہ سوال کیا کہ جی صحابہ اگر ستارے ہیں تو کیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درجہ تھا وہی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تھا؟ کیا جو حضرت عمر کی شان ہے وہی حضرت

معاویہ کی تھی؟ ظاہر ہے فرق تھا۔ تو انہوں نے پوچھا کہ کیا سارے صحابہ برابر ہیں؟ تو میں نے کہا کہ میں اس کا جواب نہیں دیتا، تم پہلے میرے سوال کا جواب دو کہ کیا سارے ستارے برابر چمکتے ہیں؟ کہنے لگا! نہیں۔ میں نے کہا! کیوں؟ کہا! ستاروں کی چمک اپنی اپنی۔ میں نے کہا! کہ صحابہ کی چمک بھی اپنی اپنی، جو عمر کا مقام ہے، عثمان کا مقام ہے، وہ وہی ہے جو وہ مقام لے گئے۔ ع

سبق پڑھ پھر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تو میں نے شہادت کا مقام بتایا ہے کہ شہادت کیا ہے؟ وہ خون دے کر خدا کے ہونے پر گواہی دینا ہے، سچائی کی پزیرائی ہے۔

اسلام میں انبیاء کے بعد تین طبقے

اسلام کے تعارف میں انبیاء کے بعد تین طبقے پیش کیے ہیں، صدیقین، شہدا، اور صالحین۔

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ ۚ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ○

(پارہ:5، النساء:69)

تو "شہدا" ہم اہل اسلام نے بتائے ہیں، اہل کتاب کی تاریخوں میں انکا نام نہیں۔ ہندوؤں کی تاریخ میں یا، رشی ہیں یا جوگی ہیں۔ رشی کو وہ لیتے ہیں پیغمبر کے درجے میں اور جوگی کو وہ لیتے ہیں صالحین کے درجے میں، شہادت کا ان میں کوئی تصور نہیں۔ انگریز غیر مسلموں کے ہاں یا Apostles، پیغمبر ہیں یا Saints ہیں جو اولیاء ہوتے ہیں سو ان کے ہاں بھی شہید کا کوئی تصور نہیں۔ تو شہیدوں کا تعارف کس نے کروایا؟ اسلام نے۔

تو جس طرح اسلام مکمل دین ہے اس نے کچھ الفاظ خاص معنٰی کے بتائے جو لغت میں پہلے نہیں تھے۔ پہلے لغات عربی میں شہید اسے کہا جاتا تھا جو عدالتوں میں جا کر، منڈیوں میں جا کر گواہی دے لیکن خون کے ساتھ گواہی بھی ہوتی ہے اور یہ شہدا ہوتے ہیں یہ

لغات عرب میں پہلے نہیں تھا۔ قرآن نے جن لفظوں کو خاص معنیٰ پہنائے اولئك هم الصديقون والشهداء عند ربهم[1] یہ لغت عرب میں پہلے نہیں تھی۔ اسلام نے لغت عرب میں جو بات داخل کی ہے اس میں اسلامی رموز کار فرما ہیں۔ قرآن کا احسان ہے کہ اسنے نئی زبان بھی دے دی کہ کوئی لفظ کن معنیٰ میں آتا ہے۔

دعاء

تاہم میں ان الفاظ پر بات ختم کر کے دعا نہیں کرتا بلکہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ سارے حضرات الحمد شریف بھی پڑھیں، قل هو الله بھی پڑھیں، ایک ایک مرتبہ درود شریف بھی پڑھ لیں اور تمام شہدا کربلا کو ایصال ثواب پہنچائیں۔ ہمارے امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ دس محرم میں اس تاریخی واقعہ کو یاد کر کے ان کے لئے دعا کیا کرتے تھے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ الحمد شریف پڑھیں اور دعا کرتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

تو غنئ مطلقی اے ذو الجلال
من فقیرِ مطلقم بے قیل و قال
تو کریمی من گدائے مطلقم
تو عزیزی من ذلیل مطلقم
فقر و حاجت عین ممکن بے مقال
چوں غنا عین خدائے ذو الجلال

اے اللہ! تیرے دربار میں یہ مسلمان اہل سنت والجماعت عقیدے کے جو زندہ تشریف فرما ہیں ان کی زندگیوں میں شہدا کی قربانیوں کی برکتیں اتار دے (آمین)،

یا اللہ! تیرے حضور ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں تو غنی مطلقی اے ذوالجلال، اے ذوالجلال تو جو چاہے کرے (آمین)،

(1) پ:27، الحدید:19۔

یا اللہ! ہم شہدا کربلا کی عقیدت میں اپنے دلوں کو تیرے آگے جھکا رہے ہیں اور جو ہم نے اسوقت کلام پڑھا اس کا ثواب تیرے حضور پیش کر رہے ہیں، تو اسے قبول فرما (آمین)،

یا اللہ! اس محنت کو جو دس دن ذکر ہوتا رہا، یا اللہ ہماری اس کوشش کو عمل مبرور بنا (آمین)، اس کو بر ہونے کی شان عطا فرما (آمین)،

اور اس کا ثواب شہدا کربلا کے علی اکبر و علی اصغر کو اور حضرت حسین کے بھائی جو بھی ان کے ساتھ شہید ہوئے اور پھر سید الشہدا مطلقا (وہ تو حضرت حمزہ تھے لیکن سید شہداء کربلا) کربلا کے تمام شہیدوں کے سردار حضرت حسین کو پہنچا (آمین)،

یا اللہ! ان کے درجات بلند فرما (آمین)،

اور جب قیامت کے دن اس پر شہادت گزرے کہ کون ان شہیدوں کو ماننے والے اور ان کی تائید میں ہاتھ اٹھانے والے تھے تو ہماری اس حقیر شہادت کو بھی اس کی شہادت میں قبول فرمالے (آمین)،

ہماری اس قلبی گواہی کو ہماری اس زبان کی گواہی میں شمار کرلے (آمین)،

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ



اسلامِ ما اطاعتِ خلفائے راشدین　　　　ایمانِ ما محبتِ آلِ محمدؐ است

اہلِ بیت کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

اہلِ بیت رسالت سے محبت ضروریاتِ مذہب اہلِ سنت سے ہے

سادات کرام اب تک موجود ہیں اور سب محلِ محبت و مودت ہیں

اثرِ خامہ

مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

فہرست عنوانات

مقامِ اہلِ بیت کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

اہلِ بیت رسالت سے محبت ضروریاتِ مذہب اہلِ سنت سے ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی..... أَمَّا بَعْدُ!

صحیح العقائد مسلمانوں میں جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان اور خلفاء راشدین کی عظمت کا اعتقاد ضروریات مسلک میں سے ہے، اسی طرح جو اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں گستاخی کرے وہ بھی اہل سنت کے دائرہ حقہ میں شمار کے لائق نہیں رہتا۔ اہل بیتِ رسالت میں جس طرح بہ نص قرآن امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن ہیں، اسی طرح آپ کی بیٹیاں اور ان کی اولاد بھی اہل بیت رسالت میں سے ہیں اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ بھی بہ نص حدیث اہل بیت میں سے ہیں، گو آپ کی ساری اولاد یہ شرف نہ رکھتی ہو، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما اپنے نانا کی نسبت سے اہل بیت رسالت میں سے ہیں، اپنے والد کی نسبت سے نہیں، اور نہ ان کے والد (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کی ساری اولاد اس شرف سے مشرف ہوئی ہے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے والدہ کی نسبت والد کی نسبت سے کہیں زیادہ اعزاز رکھتی ہے۔

اہل بیت کی محبت، محبتِ رسالت کی ایک کڑی ہے:

انسان کو جو سکون و آرام اپنے گھر میں ملتا ہے وہ گرد و پیش کی کسی جگہ پر نہیں۔ یہاں انگلینڈ میں کسی کو اپنے سکون اور آرام کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو کہتے ہیں Quite at home میں بالکل اپنے گھر میں ہوں۔ یہاں گھر سے مراد گھر نہیں ہوتا، گھر کا سکون مراد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جو گھر والی دی اس کا مقصدِ وجود بتلایا ﴿لِیَسْکُنَ

اِلَيْهَا﴾ (آدم اس کے ہاں سکون پائے) اسی طرح گھر کے بچے ہیں وہ انسان کے جگر کے ٹکڑے سمجھے جاتے ہیں، ان کی محبت ان کے کردار کے میزان پر نہیں تولی جاتی، خونی رشتے میں ایک اپنی حرارت موجود ہوتی ہے۔ کنعان کا عمل حضرت نوح علیہ السلام سے پوشیدہ نہ تھا، مگر پھر بھی پکار اٹھے:

﴿رَبِّ إِنَّ ٱبۡنِي مِنۡ أَهۡلِي وَإِنَّ وَعۡدَكَ ٱلۡحَقُّ وَأَنتَ أَحۡكَمُ ٱلۡحَٰكِمِينَ ۝٤٥﴾[1]

ترجمہ: اے رب! میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔

آگے حکم الٰہی ایسا ہوا ہے جس کے آگے ہر چیز قربان ہو جاتی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کو بھی قربانی کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ یہ کس لئے؟ یہ اس لئے کہ انسان کے لئے اس دنیا میں سب سے بڑی قربانی کا اور کوئی تصور نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی نوع انسانی میں سے تھے اور آپ کے سینہ میں بھی اپنی اولاد کے لئے ایک انسان کا دل تھا۔ ہمارے احساسات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے بارے میں جو ہوں گے ان کا عکس قلب رسالت پر بھی پڑے گا۔ کاش آپ کبھی اس پہلو سے بھی اہل بیت کی محبت کا احساس کرتے اور اس نتیجہ پر پہنچتے کہ اہل بیت رسالت کی محبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ہی ایک دلآویز نقش ہے۔ جو ہر مومن کے دل پر لگا ہونا چاہئے۔

مؤمن کا حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تعلق کیسا ہے؟

مومنوں کا حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تصدیقِ رسالت کا تعلق نہیں، آپ قرآن کے رو سے مومنوں پر اتنا حق رکھتے ہیں کہ اتنا مومنوں کو خود بھی اپنے اوپر حق نہیں ہے۔ ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾[2] آپ ہر مومن کے لئے اس کے

---

(1) پارہ ۱۲، سورہ ہود، آیت ۴۵۔

(2) پارہ ۲۱، سورہ الاحزاب، آیت ٦۔

بیٹے، والد اور دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ کی اس محبوبیت کا تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کو جس جس سے بھی محبت ہو مومنین ان سب کو دل و جان سے پیار دیں اور حضور ﷺ کو جس جس چیز سے نفرت ہو مومنین بھی اس سے دل سے نفرت کریں۔

اس اصول پر لازم ٹھہرتا ہے کہ مومنین کو حضور ﷺ کے پورے گھرانے سے عقیدت اور محبت کا وہ تعلق ہو جس کے آگے اور کوئی عقیدت اور محبت ٹھہر نہ سکے۔ حضور ﷺ کے گھر میں پہلے آپ ﷺ کی بیویاں ہیں، ان سے ماں کی عقیدت ہو، اور آپ کی اولاد سے اپنی اولاد سے بڑھ کے محبت اور پیار ہو، اور یہ محبت ان کے کردار اور اعمال کے ترازو میں نہ تولی جائے اسے رشتہ رسالت کے آئینہ میں دیکھا جائے۔ یہ سوچا جائے کہ حضور ﷺ اپنے دل میں ان کے لئے کیا مقام رکھتے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اہل بیت رسالت کا اپنا عمل و کردار بھی وہ شان رکھتا ہے کہ اس آئینہ میں کوئی ایسا دوسرا آئے نہ۔ تاہم ان کے اعمال اور قربانیاں دوسرے درجہ میں رہیں گی۔ اول درجہ میں ان کی حضور ﷺ سے رشتہ کی نسبت ہے۔

اہل بیت کے بارے میں خود نبوّت کے جذبات:

لوگ عام طور پر جذبات کو حقائق اور سنجیدگی کے مقابل رکھتے ہیں مگر نبوت کے جذبات پر بھی خدا کی حفاظت کا سایہ ہوتا ہے۔ اور نبی سے جذبات میں بھی کوئی بات خلاف حق صادر نہیں ہوتی۔ اب دیکھئے محبوب دو عالم ﷺ اپنے اہل بیت کے بارے میں کن جذ بات میں بولتے سنائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو آپ ﷺ کے انہی جذبات کے آئینہ میں اہل بیت کی قدر کرنا چاہئے۔ ان سے محبت رکھنی چاہئے۔ یہ ہیں جذبات ہی مگر یہ حقیقت بھی ہیں۔ پیغمبر کے جذبات کبھی حقائق کے خلاف نہیں ہوتے۔ پھر چاہئے کہ اہل بیت کرام کو، وہ آپ کی بیویاں ہوں یا آپ کی اولاد، حضور ﷺ کی محبت اور حضور ﷺ کے جذبات کی تہوں میں دیکھیں۔

① ایک دفعہ منافقوں کی سازش سے ام المؤمنین رضی اللہ عنہا پر ایک الزام آیا

آنحضرت ﷺ نے اس پر خود فیصلہ صادر نہ فرمایا، اللہ کے فیصلے کا انتظار کیا۔ تاہم بے ساختہ یہ بات آپ کی زبان سے نکل گئی۔ فرمایا:

مَا عَلِمْتُ عَلٰی أَهْلِيْ إِلَّا خَيْرًا (1)

ترجمہ: میں نے تو اپنے گھر والوں میں خیر کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔

بات کہنی نہ تھی مگر کہہ گئے اور "عَلَيْهَا" وغیرہ الفاظ نہ کہے۔ ان کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے بات کہی (عَلَى أَهْلِيْ)۔ اپنے اہل بیت کے بارے میں آپ کے جذبات بول پڑے۔ یہ ام المومنین کی عمومی اخلاقی بلندی تھی جس کی آپ نے شہادت دی، اور پھر اللہ رب العزت کا فیصلہ بھی انہی کے حق میں نازل ہوا۔

آپ ﷺ کے حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ جذبات تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس طرح ثرید کا کھانوں میں ایک اپنا امتیاز ہے عائشہ کو دوسری عورتوں پر ایک اسی درجہ کی فضیلت ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ آپ ﷺ جب عائشہ کو یا "حمیرا" کہہ کر آواز دیتے ہوں گے تو اس لفظ اور لہجے میں آپ ﷺ کی آپ رضی اللہ عنہا کے لئے کتنی خیر خواہی سمائی ہوگی۔ پھر ساتھ ہی یہ سوچیں کہ اگر کوئی ناہنجار آپ کے لئے لعن طعن کی زبان استعمال کرے تو حضور ﷺ کے دل مبارک پر اس سے کیا گزرتی ہوگی۔ پاک مردوں کے لئے پاک بیویاں اسلام کا طرہ امتیاز ہے:

﴿وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ﴾ (2)

آپ ﷺ کی اولاد کو لیجئے:

۲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بڑی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا:

خَيْرُ بَنَاتِيْ أُصِيْبَتْ فِيَّ (3)

---

(1) رواہ البخاری جلد ۲، صفحہ ۵۹۵۔

(2) پارہ ۱۸، سورہ النور، آیت ۲۶۔

(3) مجمع الزوائد جلد ۹، صفحہ ۱۵۱۔

ترجمہ: میری بیٹیوں میں یہ خیر البنات ہے جس نے میری وجہ سے مصیبتیں اٹھائیں۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ مکہ مکرمہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مشکلات دیکھیں اور اسلام کی خاطر جو صدمے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا اور آپ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا آپ کے ساتھ برابر کی شریک تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اور ناطے آپ پر مشکلات کے جو پہاڑ ٹوٹے وہ آپ ہی جانتی ہیں۔ انہی ساعات کے تصور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو "خَيْرُ بَنَاتِيْ" کے پیارے الفاظ میں ذکر کیا۔ آپ کے بیٹے حضرت علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کس پیار سے آپ کے ساتھ فتح مکہ کے موقع پر لپٹے ہوئے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس دن کن نظروں سے ردیف رسول کو ناقہ رسول پر دیکھ رہے تھے۔ ذرا تصور کی دنیا میں اتریئے اور ان تمام افراد کے لئے دل میں محبت رکھئے جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جذبات کی حد تک محبت تھی۔

(۳) حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّمَا فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِنِّي يُؤْذِينِي مَا آذَاهَا(1)

ترجمہ: فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جو چیز اسے دکھ دے وہ مجھے دکھ دیتی ہے۔

کسے نہیں پتہ کہ اولاد ماں باپ کا جگر گوشہ ہوتی ہے۔ مگر آپ کہہ رہے ہیں یہ آپ کے جذبہ محبت کا اظہار ہے۔ پھر آپ نے یہاں تک کہ جو اسے ایذاء دے اس نے مجھے ایذاء دی اور جس نے مجھے ایذاء دی وہ خدا کی ناراضگی پا رہا ہے۔

فَإِنَّمَا ابْنَتِي بَضْعَةٌ مِنِّي يُرِيبُنِي مَا أَرَابَهَا وَيُؤْذِينِي مَا آذَاهَا(2)

---

(1) فضائل الصحابۃ ج ۲، ص ۷۵۶، صحیح مسلم۔ رقم الحدیث: ۶۴۶۱۔

(2) سنن ابی داؤد۔ رقم الحدیث: ۲۰۷۳۔ ۲۰۷۳ حلیۃ الاولیاء ج ۲، ص ۴۰۔

اور ایک روایت میں ہے:

مَنْ آذَانِيْ فَقَدْ آذَى اللهَ [1]

جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراض کرنے کی نہ تھی:

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی سے اپنا عقد کرنا چاہا تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اس خبر سے اذیت پہنچی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہہ دیا کہ اللہ کے نبی کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اس پروگرام سے رک گئے۔ سو حضرت علی مرتضیٰ اس وعید کی زد میں نہیں آئے کہ جس نے فاطمہ کو اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی۔ کیوں کہ ایذاء اس اذیت دینے کو کہتے ہیں جس میں قصدِ فعل اذیت دینا ہو۔ لیکن اگر کسی کا قصد اسے اذیت دینا نہ ہو لیکن اس کے کسی عمل سے اسے بلا ارادہ اذیت پہنچے تو اسے ایذاء دینا نہ کہا جا سکے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نیت ابو جہل کی بیٹی سے نکاح میں اذیت فاطمہ نہ تھی۔ ایک اپنی ضرورت پوری کرنی پیش نظر تھی۔ اگر اس سے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اذیت پہنچی تو یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قصد سے نہ ہوئی، نہ وہ حضرت سیدہ کو کوئی اذیت پہنچانا چاہتے تھے۔ پس حضرت علی رضی اللہ عنہ پر اس حدیث کی رو سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ تاہم اس ارشاد نبوت سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنی بیٹی کے بارے میں جذبات عاطفت کتنے لطیف تھے۔

یہی احساس تھا جس کے باعث حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جب انہوں نے آپ کے پاس فدک کی زمین لینے کے لئے کسی کو بھیجا تو یہ زبان استعمال کی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے:

فَتَكَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَرَابَةُ رَسُولِ اللهِ

---

(1) فضائل الصحابہ ج ۲، ص ۷۵۴۔

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ أَصِلَ مِنْ قَرَابَتِي [1]

ترجمہ: اور ابو بکر بولے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت مجھے اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کو کسی پیرائے میں کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ آپ ان الفاظ کی نزاکت پر غور کریں، آپ کس طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دل کو تسلی دے رہے ہیں۔ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طبیعت پر فدک کا سوال کرنے میں کوئی بشری بوجھ آیا ہو تو کیا وہ اس بیان سے نہ اٹھ گیا ہو گا؟ پھر کیا اس بات کو بھلایا جا سکتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیوی اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے ایام علالت میں آخر دم تک آپ کی عیادت میں موجود رہیں۔ اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حضرت سیدہ کو راضی نہ کر چکے ہوتے تو کیا وہ اپنی اہلیہ کو ان کے پاس خدمت اور عیادت کے لئے بھیج سکتے تھے اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی پرہیز گاری اور تقویٰ اس بات کو بھی جائز نہیں کرتے کہ وہ بغیر آپ کی اجازت کے ان کے گھر آ بیٹھی ہوں (الجوہر النقی) پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو فدک کی زمین کے بارے میں جو کچھ کہا وہ اپنے فیصلے کی رو سے نہ تھا خود ارشاد نبوت کی وجہ سے تھا۔ آپ نے درست کہا تھا کہ میں وراثت کے قانون میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔ حضرت خود فرما گئے ہیں کہ انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی۔ سو اس ناراضگی میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے انہیں ناراض کرنا ہرگز نہ تھا۔ جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کرنے کا ارادہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراض کرنے کے لئے نہ تھا۔ گو آپ نے اس پر اپنی ناراضگی ظاہر کی تھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (۷۷۶ھ) لکھتے ہیں:

ثُمَّ تَرَضَّاهَا حَتَّى رَضِيَتْ. وَهَذَا إِسْنَادٌ جَيِّدٌ قَوِيٌّ. وَالظَّاهِرُ أَنَّ عَامِرًا الشَّعْبِيَّ سَمِعَهُ مِنْ عَلِيٍّ، أَوْ مِمَّنْ سَمِعَهُ مِنْ عَلِيٍّ وَقَدِ اعْتَرَفَ عَلِيٌّ وَأَهْلُ الْبَيْتِ بِصِحَّةِ مَا حَكَمَ بِهِ أَبُو بَكْرٍ فِي

(1) صحیح بخاری ج ۱، ص ۵۲۶۔ رقم الحدیث: ۳۷۱۱۔

ذَلِكَ[1]

ترجمہ: پھر آپ نے (حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے) آپ کو راضی کرنا چاہا اور آپ راضی ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ عامر شعبی نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہو گا یا اسی سے جس نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا یعنی اہل بیت نے اس فیصلے کی صحت کو تسلیم کیا ہے جو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے دیا۔

اصولاً کسی کا کسی سے اظہار ناراضگی اور بات ہے اور دوسرے سے **فعل اِغضاب** (ناراض کرنا) ہوا یا نہیں یہ اور بات ہے۔ جو غصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام پر تھا وہ اپنی جگہ تھا، لیکن حضرت ہارون علیہ السلام عمل اغضاب کے مرتکب ہوئے ہوں یہ اور بات ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ناراض کرنے کا قصد نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تھا نہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا۔ حضرت سیدہ اگر کسی سے کسی وقت ناراض ہوئی ہوں تو جب تک دوسرے کا اغضاب ثابت نہ ہو جائے اسے اس کا ذمہ دار نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے جگر کا ٹکڑا کہنا اظہار محبت کا ایک جذباتی پیرایہ ہے، ورنہ کسے معلوم نہیں کہ آپ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں؟ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اولاد سے محبت جذبات کی حد تک تھی۔ لیکن یہ بات ہم کیسے مان لیں کہ نبوت کے جذبات کبھی اعتدال سے تجاوز کرتے تھے استغفر اللہ العظیم کبھی نہیں۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے بھی سچائی کی راہ یہی ہے کہ ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے محبت جذبات کی حد تک ہو۔ اگر کوئی مسلمان عترت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں محبت کا پیرایہ نہیں رکھتا وہ حلقہ رسالت کے مقربین میں سے نہیں ہو سکتا۔ اہل بیت رسالت سے محبت کا تعلق جذبات کی حد تک ہونا چاہئے۔ مسلمان انہی کی خوشی میں خوش ہوں اور ان کی غمی میں غمزدہ اور اشک فشاں ہوں، اور ان کی بے ادبی اور گستاخی اسی طرح نامنظور ہو جس طرح کسی کو آگ میں جانا قابل قبول نہیں ہوتا۔

---

(1) البدایہ والنہایہ جلد ۵، ص ۲۸۹۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خوشی میں اپنی خوشی کی تلاش:

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آخری دنوں میں اس بات کی فکر تھی کی کسی دوسرے کی نظر آپ کے جنازے پر نہ اٹھے۔ چارپائی پر رکھا بدن ہر جہت سے پردہ میں رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیوی اسماء رضی اللہ عنہا آپ کی تیمارداری میں حاضر تھیں اور یہ دور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تھا۔ حضرت اسماءؓ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو تسلی دی اور فرمایا کہ میں نے حبشہ میں دیکھا تھا کہ لوگ عورتوں کے جنازے پر ایک پردہ سا ڈال دیتے ہیں اور اس سے باہر کی نظریں بدن میت کی حد کو پا نہیں سکتیں۔ اس پر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے چہرے پر خوشی کے آثار اترے۔ یہ آخری مسرت تھی جو حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر دیکھی گئی۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا اس پیرائے میں اس واقعہ کو نقل کرنا بتلاتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کو کس طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی خوشی مطلوب تھی۔

حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما امت کی آغوشِ محبت میں:

سیدنا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

اُرْقُبُوْا مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَسَلَّمَ فِي أَهْلِ بَيْتِهِ[1]

ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آپ کے اہل بیت کے حق میں پورا دھیان رکھنا۔

یعنی آپ کے اہل قرابت کی جو بات بھی سامنے آئے اس میں وہی رائے اختیار کرنا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق میں ایک امتی کی ہونی چاہئے۔

اس روایت کے راوی کون ہیں؟

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد اللہ۔

---

(1) صحیح بخاری ج:۱، صفحہ ۵۲۶۹۔ رقم الحدیث: ۳۷۱۳۔

بیان کرنے والے کون؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

نقل کرنے والے کون؟

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ

معلوم ہوا ان تینوں کا دل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کی محبت سے معمور رہا ہے۔ اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے آئینہ میں ہی دیکھ رہے ہیں۔ اہل سنت کی حدیث کی کتابوں میں جس طرح صحابہ کرام اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی فضیلت میں باب بندھے ہیں اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت اور حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کے مناقب کے باب باندھے گئے ہیں۔

حضرت عقبہ بن حارث کہتے ہیں:

رَأَيْتُ أَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، وَحَمَلَ الحَسَنَ وَهُوَ يَقُولُ: بِأَبِي شَبِيهٌ بِالنَّبِيِّ، لَيْسَ شَبِيهٌ بِعَلِيٍّ وَعَلِيٌّ يَضْحَكُ(1)

ترجمہ: میں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اٹھایا ہوا تھا اور آپ کہہ رہے تھے میرے والد قربان ہوں، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ ہے، علی کی شبیہ نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے سن رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔

اس سے پتہ چلا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم چلتے تھے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو گود میں لیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی آپ کو گود میں اٹھایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اہل بیت سے یہ محبت دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ان دونوں بزرگوں میں محبت کا تعلق تھا عداوت کا نہیں۔

ایک سوال: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ بالا روایت سانحہ کربلا سے پہلے کی ہے۔ یزید اور حسین رضی اللہ عنہ کے معرکے میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ یزید کے ساتھ تھے۔ حضرت

---

(1) صحیح بخاری ج ۱، صفحہ ۵۳۰۔ رقم الحدیث: ۳۷۵۰۔

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بے شک اہل بیت رسالت سے محبت کے رشتے میں رہے، لیکن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یزید کی بیعت کر چکے تھے۔ وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے تو خیر خواہ نہ رہے تھے۔

الجواب: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یزید کی بیعت غیر مشروط نہ کی تھی، اس شرط کے ساتھ کی تھی کہ ان کی جو بیعت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہو چکی ہے، وہ قائم رہے گی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یزید کی حکومت انہیں اگر کوئی حکم دے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو وہ ہرگز نہ مانیں گے۔

اسے مشروط بیعت کہتے ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں:

وَإِنَّا قَدْ بَايَعْنَا هَذَا الرَّجُلَ عَلَى بَيْعِ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ[1]

ترجمہ: ہم نے اس شخص کی بیعت کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو قائم رکھتے ہوئے۔

یہ الفاظ خود بتا رہے ہیں کہ یہ کس درجے کی بیعت تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ آپ کی خیر خواہی کے جذبات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ نہ تھے درست نہیں۔ نیک کام میں تعاون اور غلط کام میں عدم تعاون یہ خود قرآن کریم کی تعلیم ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۚ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدہ) معلوم ہوا ایک شخص سے دونوں رابطے رکھے جا سکتے ہیں۔ سو حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے جذبات سانحہ کربلا میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ خیر خواہی کے نہ تھے، یہ ہرگز درست نہیں۔ آپ سے کسی شخص نے مسئلہ پوچھا کہ احرام کی حالت میں مکھی مار دینا کیسا ہے؟ وہ مسئلہ پوچھنے والا عراق کا تھا۔ اب آپ کا جواب سنیں، آپ نے فرمایا:

أَهْلُ الْعِرَاقِ يَسْأَلُونَ عَنِ الذُّبَابِ، وَقَدْ قَتَلُوا ابْنَ ابْنَةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلَى آلِهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُمَا رَيْحَانَتَايَ مِنَ الدُّنْيَا[2]

---

(1) صحیح بخاری جلد ۲، صفحہ ۱۰۵۳، رقم الحدیث: ۷۱۱۱۔

(2) صحیح بخاری جلد ۱، صفحہ ۵۳۰۔ رقم الحدیث: ۳۷۵۳۔

ترجمہ: عراق کے لوگ مجھ سے مکھی مارنے کے بارے میں مسئلہ پوچھتے ہیں اور انہوں نے نواسۂ رسول ﷺ کو قتل کیا ہے اور حضور ﷺ فرما گئے تھے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما میری دنیا کے پھول ہیں۔

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپ کے خیر خواہی کے جذبات حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ رہا یہ مسئلہ کہ آپ نے اس سانحہ کربلا کا بوجھ اہل عراق پر ڈالا ہے اہل شام پر نہیں، ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ حضور ﷺ خود فرما گئے کہ والی سلطنت اللہ کے ہاں اپنی پوری رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (1)

حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما آغوش رسالت میں:

آنحضرت ﷺ نے انہیں اپنے بیٹے فرمایا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ ابْنِي هَذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللهَ أَنْ يُصْلِحَ بِهِ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (2)

ترجمہ: میرا یہ بیٹا سید ہے اور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالی اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرا دے۔

حضور ﷺ نے آپ کو اپنے کندھے پر اٹھا رکھا تھا اور فرما رہے تھے: اے اللہ! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے پیار فرما۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ (3)

اور صحیح مسلم میں ہے:

---

(1) صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۸۹۳۔

(2) صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۲۷۰۴۔

(3) رواہ بخاری جلد ۱، صفحہ ۵۴۰، رقم الحدیث: ۳۷۴۹۔

اللهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ وَأَحْبِبْ مَنْ يُحِبُّهُ (1)

ترجمہ: اے اللہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور تو بھی اس سے محبت فرما اور ہر اس شخص سے جو اسے دوست رکھے۔

حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ تُلُقِّيَ بِنَا قَالَ فَتُلُقِّيَ بِي وَبِالْحَسَنِ أَوْ بِالْحُسَيْنِ قَالَ: فَحَمَلَ أَحَدَنَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَالْآخَرَ خَلْفَهُ حَتَّى دَخَلْنَا الْمَدِينَةَ (2)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر سے واپس لوٹتے تو ہمیں اٹھا لیتے۔ مجھے اٹھاتے اور حسن کو یا حسین کو، ہم میں سے ایک کو آگے اٹھاتے اور دوسرے کو پیچھے، یہاں تک کہ ہم مدینہ آجاتے۔

یہ عبد اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی جعفر کے بیٹے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پوتے اور حضرت حسن کے چچازاد بھائی۔ ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اپنا بیٹا سمجھا۔ اور ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا پیار تھا کہ دونوں کبھی اللہ تعالیٰ کے کسی نافرمانی کے مرتکب نہیں سمجھے جا سکتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنہیں اپنے باغ رسالت کے پھول فرمائیں ان کے بارے میں کوئی بدگمانی مؤمنین کو زیب نہیں دیتی۔

مؤمنین کی عترت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وسیع عقیدت:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد دنیا میں دنیا کے آخر تک رہے گی۔ آپ کو "ابتر" ہونے کا طعنہ دینے والے خود اپنی آگ میں جل کر رہ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اس کثرت سے پائی گئی کہ دنیا کا آخری اسلامی سربراہ آپ کی اولاد سے ہی ہو گا۔

(1) صحیح مسلم ص ۲۸۲، مسند احمد ص ۵۱، ج ۳۔ رقم الحدیث: ۲۴۲۱۔

(2) صحیح مسلم جلد ۲، صفحہ ۲۸۳، رقم الحدیث: ۲۴۲۸۔

اہل بیت سے محبت کا رشتہ ان کی اطاعت کو مستلزم نہیں:

جب آپ کی اولاد دنیا میں دنیا کے آخر تک رہے گی تو ممکن ہے کہ مؤمنین پر آپ کی ساری عترت کی پیروی فرض ہو۔ دین تو مکمل ہو چکا ہے اور کتاب و سنت اس کی ہیڈ لائٹس Head lights ہیں اور مؤمن یہاں انہی دو ستونوں کو قائم رکھنے کے مکلف ہیں اور انہیں انہی دو چراغوں کی روشنی میں آگے بڑھنے کا حکم ہے۔ سو مسلمانوں کا عترت رسول ﷺ سے تعلق ان کی پیروی کا نہیں ان کی محبت اور ولاء کا ہے جو سب عزت رسول ﷺ کو محیط ہے۔ وہ اول دور کے ہوں یا آخر دور کے۔

عترتِ رسول ﷺ میں کسی برے سے برے کو بھی دیکھو تو اسے برا نہ کہو۔ سونے پر کچھ گندگی لگ گئی ہو تو ظاہر ہے اس صورت میں سونے کو دھویا جاتا ہے پھینکا نہیں جاتا۔ یہی صورت بزرگان دین کی اولاد کی ہے۔ اولاد رسول ﷺ ہونے کی نسبت سے ان کی محبت آپ کے دل سے اترنی نہ چاہئے۔ کیا آپ کے اپنے بچوں کی محبت ان کے کسی غلط کام کے باعث آپ کے دلوں سے ختم ہو جاتی ہے؟ نہیں۔ اسے اپنے جذبات کے آئینہ میں دیکھئے اور پھر عترت رسول ﷺ میں غلط راہ چلنے والوں سے تعلقات کی نوعیت طے کیجئے۔

شیعوں کی عترت رسول ﷺ سے عقیدت کی نوعیت:

شیعوں کے ہاں بھی کل عترت رسول ﷺ واجب الاتباع نہیں۔ وہ عترت رسول میں گیارہ ائمہ کے سواء کسی کو گناہوں سے بالا اور امام مفترض الطاعت نہیں مانتے۔ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ شامل کر کے انہیں اپنے بارہ امام کہتے ہیں اور بارہ کی اسی نسبت سے اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ ان کا مشہور محقق محمد اسحٰق "منہج الفاصلین" میں لکھتا ہے:

> دلیل نہم روایت کردہ حسن بن یعقوب باسناد مذکور از سلمان فارسی و عمار بن یاسر و ابوذر و غیر ھم کہ گفتہ کہ شنیدم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمود:

انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اهل بیتی فتمسکوا بهما کی لا تضلوا ان اللطیف الخبیر اخبرنی وعهده الی انهما لن یتفرقا حتیٰ یردا علی الحوض فقام عمر بن الخطاب وهو شبه المغضب فقال یا رسول اللّٰہ نتمسک بکل اهل بیتک فقال لا و لٰکن اوصائی وخلفائی وائمة المسلمین من بعدی اولهم اخی وزیری و وارثی و امام المسلمین و خلیفتی فی امتی۔

ترجمہ: حضرت سلمان فارسی، عمار بن یاسر اور ابو ذر (رضی اللہ عنہم) سے ہم نے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں دو وزنی چیزیں چھوڑ رہا ہوں: کتاب اللہ اور اپنی عترت اپنے گھر کے لوگ۔ تم ان دونوں سے تمسک کرنا تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ۔ بے شک اللہ نے جو لطیف و خبیر ہے مجھے اس کی اطلاع دی ہے اور مجھے عہد دیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھے آملیں۔ اس پر حضرت عمرؓ اٹھے اور وہ غصے سے بھرے معلوم ہوتے تھے، انھوں نے کہا آپ کے اہل بیت میں سے کیا ہم ہر ایک سے تمسک کریں (اس کی پیروی کریں) آپ نے فرمایا نہیں۔ تمسک صرف میرے وصیت یافتہ افراد سے کیا جائے۔ میرے جان نشینوں سے اور ان سے جو میرے بعد ائمہ مسلمین ہوں ان میں پہلا میرا بھائی ہے، میرا وزیر، میرا وارث اور مسلمانوں کا امام ہے وہ میری امت میں میرا خلیفہ ہے۔

یہ روایت اہل سنت کے ہاں نہیں پائی جاتی۔ تاہم اس سے یہ ضرور ثابت ہوا کہ شیعہ کے ہاں مطلق اہل بیت پیشوا نہیں ہیں۔ صرف وہ ہیں جن کے حق میں وصیت تمسک کے لئے ہو۔ صرف اہل بیت ہونا کافی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسا احساس ہے جو مومن کے دل میں ہر فرد اہل بیت کے لئے قائم رکھا جا سکتا ہے؟ وہ ان کی نسبت اور عزت کا احساس ہے جو ہر مومن اپنے دل میں پوری ذریت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں محسوس رکھ سکے! شیعہ کے ہاں اہل بیت ہونے کا معیار عترت ہونا نہیں اس کے بارے میں وصیت

کا ہونا ہے۔ سو فضیلت عترت ہونے کے پیش نظر نہیں وصیت ہونے کے پیش نظر ہے۔
اس کی تائید اثنا عشریوں کے عالم شریف مرتضیٰ سے بھی ہوتی ہے:

ان اهل البيت لكل نبي اوصيائه وعلى هذا يمكن ان يقول دخول فاطمة فى اهل بيته باعتبار انها وسيلة لسائر اهل البيت كما مر فى توضيح آية سورة الاحزاب ......ويمكن ان لا يكون داخلة فى اهل بيت

ترجمہ: ہر نبی کے اہل بیت صرف وہی ہیں جو اس کے اوصیاء ہوں۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ حضرت فاطمہ بایں طور اہل بیت میں داخل ہوں کہ آپ سب اہل بیت کے لئے دنیا میں سبب ٹھہری ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سرے سے اہل بیت میں داخل ہی نہ ہوں۔

اس روایت کی روشنی میں اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ شیعہ کے ہاں عترت رسول سے عقیدت صرف وصیت کی رو سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہونے کے پہلو سے نہیں، نہ یہ نسبت اور ولایت کے پہلو سے ہے۔ حالانکہ اسی پہلو سے عترت رسول کے ہر فرد سے نسبت عقیدت قائم رکھی جا سکتی ہے۔

ملحوظ رہے کہ حدیث ثقلین میں دو وزنی چیزیں وہی مراد لی جا سکیں گی جن میں سے کسی چیز کو کم وزن نہ کرنا پڑے۔ تاکہ اس کے وزن میں فرق نہ آئے۔ اگر ایک چیز اہل بیت مراد لی جائے تو پھر اسے بارہ میں محدود کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب کے سب لائق تمسک نہ رہے۔ قرآن بھی وزنی چیز تبھی ٹھہرتا ہے کہ اس میں سے بھی کوئی حصہ کم نہ ہونے پائے۔ پورے کے پورے قرآن پر ایمان ہو۔

اور اگر ثقلین سے مراد کتاب اللہ اور اہل بیت ہی ہیں تو پھر ان دو سے تمسک اطاعت اور تعمیل کے پیرایہ میں نہیں ہو گا۔ محبت اور ولایت کے معنیٰ میں ہو گا۔ کیونکہ یہ ربط و تعلق تو عترت کے ہر فرد سے رکھا جا سکتا ہے۔ انہیں بارہ میں محدود کرنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ جو بھی سادات ملیں آپ ان سے محبت اور ولایت رکھ سکیں گے۔

اہل بیت کو کم کرنے کی سوچ جیسا کہ شریف مرتضیٰ کی رائے ہے درست معلوم نہیں ہوتی اور واجب الاطاعت حضور ﷺ کے بعد واقعی کوئی نہ ہونا چاہئے۔ راشدین و مجتہدین کی پیروی بواسطہ خلافت واجتہاد ہے، حضور ﷺ کے بعد کوئی مطاع بالذات نہیں ہے۔

اہل بیت رضی اللہ عنہم سے ولایت ومودّت:

اہل بیت سے محبت و مودت دراصل آنحضرت ﷺ سے محبت کی فرع ہے۔ اس کی رو سے حضور ﷺ کی کل عترت لائق مودت و مورد ولایت ہے۔ اہل سنت اسی عقیدہ پر ہیں۔ جہاں سادات کرام ملیں یہ جھٹ انہیں آغوش محبت میں لے لیتے ہیں۔ یہ ان میں تفریق نہیں کرتے۔ شیعہ ان میں تفریق کرتے ہیں اور صرف اوصیاء کو لائق تمسک سمجھتے ہیں۔ شیعہ حضرات کی یہ زیادتی ہے کہ وہ اپنے تصور وصیت کی اساس پر ہزاروں سادات کرام کے اہل بیت ہونے کا انکار کر دیتے ہیں۔

اہل سنت میں بھی کئی غیر محتاط لوگ ملیں گے جو عام ملنگوں اور میراثیوں کو بھی یہ اعزاز دیتے ہیں۔ جہاں کسی تکئے پر کسی میراثی نے ڈیرہ لگا دیا بدعتی عورتوں نے اسے شاہ جی کہنا شروع کر دیا۔ ایسا ہر گز نہ ہونا چاہئے۔ یہ اہل بیت رسالت کی سخت بے ادبی ہے۔ حضور ﷺ کی یہ نصیحت کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں: کتاب اللہ اور اہل بیت۔ قیامت تک آنے والے اہل بیت اطہار کو محیط ہے۔ یہ پنج تن یا بارہ تن پر بند نہیں۔ عترت رسول ﷺ کو ”کوثر“ بھی کہا گیا ہے۔ یہ ان لوگوں کے مقابلے میں ہے جو حضور ﷺ کی نرینہ اولاد نہ ہونے پر اپنے پر تولتے تھے۔ سو اس کثرت میں بھی کمی نہیں کی جا سکتی۔ حضرت امام مہدی اہل بیت میں سے ہوں گے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلہ اہل بیت تیسری صدی میں گیارھویں امام پر ختم نہیں ہو رہتا۔ ورنہ امام مہدی کس طرح اہل بیت رسالت میں سے اٹھیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدَّهْرِ إِلَّا يَوْمٌ، لَبَعَثَ اللَّهُ رَجُلًا مِنْ أَهْلِ بَيْتِي،
يَمْلَؤُهَا عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا [1]

(1) سنن ابی داؤد جلد ۲، صفحہ ۲۳۲۔

عترت رسول ﷺ میں شیعہ کے ہاں کوئی واجب التمسک نہیں:

ان کے ہاں اولاد رسول ﷺ میں ان بارہ کے سواء براہ راست کوئی عترت رسول کے اس اعزاز میں شامل نہیں۔ حضور ﷺ کی صاحبزادیوں حضرت زینب، رقیہ، ام کلثوم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنھن میں سے کوئی ان بارہ میں نہیں ہے۔ حضرت امام حسن عسکری کے بعد جو لوگ بھی اس دنیا میں آپ کی اولاد میں سے پائے گئے ان میں اہل بیت رسالت میں سے کوئی نہ تھا۔ اور آج بھی جو سید دنیا میں موجود ہیں ان میں کوئی اہل بیت میں سے نہیں جنہیں حضور ﷺ نے اپنی آخری وصیت میں واجب التمسک ٹھہرایا ہو۔ اہل سنت کے نزدیک اہل بیت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور قیامت تک آنے والے سادات کو شامل ہے۔ ان کے ہاں کل عترت رسول لائق تمسک ہے اگر تمسک سے مراد ان سے محبت وولایت کا ربط ہو۔ اپنی ذات سے کوئی فرد واجب الطاعت اور مفترض الطاعت ہو، یہ مقام حضور خاتم النبیین ﷺ پر ختم ہو چکا۔ آپ کے بعد کسی آسمانی نمائندے کی آمد نہیں۔

اہل سنت کی صفوں میں اہل بیت رسالت کے زمزمے:

حدیث کی کتابیں گلستان رسالت ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے تیئس سالہ دور رسالت میں یہ باغ لگایا۔ انہیں دیکھیں تو جگہ جگہ اہل بیت رسالت کے زمزمے سنائی دیتے ہیں۔ کوئی کتاب ان کے مناقب و فضائل سے خالی نہیں۔ سانحہ کربلا کے بعد حضرت علی بن الحسین (امام زین العابدین) جب مدینہ آئے تو مسجد نبوی ﷺ میں ان کے گرد تانتا بندھا ہوتا تھا۔ ان کے گرد محدثین کے جھمگٹے لگتے۔ اور علماء آگے بڑھ بڑھ کر ان سے احادیث لیتے تھے اور انہیں آگے روایت کرتے تھے۔ واقعہ کربلا عام مسلمانوں اور اہل بیت رسالت میں اگر کوئی اصولی خط متارکہ قائم کرتا تو حضرت علی بن الحسین اس اعزاز واکرام سے اہل سنت محدثین میں نہ بیٹھتے اور حدیث کی کتابوں میں آل ابی بکر، آل عمر اور آل علی] کے اکٹھے چرچے نہ ہوتے۔

ختم نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے مرتبہ ولایت کی کھڑکی کھلی رکھی اور اس سے ہزارہا اولیاء کرام نے امت کے افراد کے دلوں میں خدا کی محبت کی گرمی پیدا کی۔ ولایت کی اس کھڑکی سے حضور ﷺ کی عترت کو بھی ایک حصہ ملا۔ اس میں جو حضرات خصوصی نسبت پا گئے وہ روحانی طور پر اس امت کے اقطاب تھے۔

چند سندیں ملاحظہ ہوں:

١۔ أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ، أَنَّ حُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ، أَخْبَرَهُ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ أَخْبَرَهُ [1]

٢۔ عَنْ أَبِي جَعْفَرٍ ...... وَآلُ أَبِي بَكْرٍ، وَآلُ عُمَرَ، وَآلُ عَلِيٍّ، وَابْنُ سِيرِينَ [2]

٣۔ عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ، عَنْ أَبِيهِ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ [3]

٣۔ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، قَالَ أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ، أَنَّ حُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ، أَخْبَرَهُ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ [4]

٥۔ وَجَمَعَ الحَسَنُ بْنُ الحُسَينِ بْنِ عَلِيٍّ، بَيْنَ ابْنَتَيْ عَمٍّ فِي لَيْلَةٍ [5]

٦۔ عَنِ الزُّهْرِيِّ، أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ، أَنَّ حُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ أَخْبَرَهُ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ، قَالَ إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرَقَهُ وَفَاطِمَةَ [6]

٧۔ عَنِ الزُّهْرِيِّ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ، أَنَّ الْحُسَيْنَ بْنَ عَلِيٍّ، حَدَّثَهُ

---

(1) صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۵۲۔ رقم الحدیث ۱۱۲۷۔

(2) صحیح بخاری جلد ۱، ص ۳۱۳۔ باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ۔

(3) صحیح بخاری جلد ۱ ص ۳۱۹۔ رقم الحدیث ۲۳۷۵۔

(4) صحیح بخاری جلد ۲، ص ۶۸۷۔ رقم الحدیث: ۴۲۷۴۔

(5) صحیح بخاری جلد ۲، ص ۷۶۵۔ رقم الحدیث: ۵۱۰۵۔

(6) صحیح بخاری جلد ۲، ص ۱۰۹۱۔ رقم الحدیث: ۷۳۴۷۔

عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَرَقَهُ وَفَاطِمَةَ، فَقَالَ: أَلَا تُصَلُّونَ؟[1]

٨۔ عَنِ الْحَكَمِ، سَمِعَ عَلِيَّ بْنَ الْحُسَيْنِ، عَنْ ذَكْوَانَ، عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، قَالَتْ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ[2]

٩۔ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، أَنَّ عَلِيَّ بْنَ حُسَيْنٍ، أَخْبَرَهُ، أَنَّ عَمْرَو بْنَ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ[3]

١٠۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ، عَنْ سَعِيدِ ابْنِ مَرْجَانَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ[4]

١١۔ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ، حَدَّثَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ، أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ، قَالَ أَخْبَرَنِي.....[5]

١٢۔ عَنِ الزُّهْرِيِّ، أَخْبَرَنِي عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنٍ، أَنَّ الْمِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ، أَخْبَرَهُ أَنَّ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ خَطَبَ بِنْتَ أَبِي جَهْلٍ، وَعِنْدَهُ فَاطِمَةُ[6]

١٣۔ حَدَّثَنَا وُهَيْبُ بْنُ خَالِدٍ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ أَبِي مُرَّةَ ....[7]

١٤۔ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَرَأَ[8]

---

(1) صحیح مسلم ج ۱، ص ۲۶۴۔

(2) صحیح مسلم ج ۱، ص ۳۹۰۔

(3) صحیح مسلم ج ۱، ص ۴۳۶۔

(4) صحیح مسلم ج ۱، ص ۴۹۵۔

(5) صحیح مسلم ج ۲، ص ۲۹۰۔

(6) صحیح مسلم ج ۲، ص ۲۹۰۔

(7) صحیح مسلم ج ۲، ص ۲۴۹۔

(8) سنن ابی داؤد۔ ج ۲، ص ۱۹۷۔

١٥ ـ أَنَّ ابْنَ شِهَابٍ، حَدَّثَهُ، أَنَّ عَلِيَّ بْنَ الْحُسَيْنِ حَدَّثَهُ أَنَّهُمْ حِينَ قَدِمُوا الْمَدِينَةَ (1)

امام زین العابدین کی بہن فاطمہ کی بھی ایک روایت لیجئے:

١٦ ـ عَنْ فَاطِمَةَ بِنْتِ حُسَيْنٍ، عَنْ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (2)

١٧ـ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ، عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أُمِّ سَلَمَةَ (3)

١٨ـ حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضَى بِالْيَمِينِ مَعَ الشَّاهِدِ الْوَاحِدِ (4)

١٩ـ أَخْبَرَنِي أَخِي مُوسَى بْنُ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ أَبِيهِ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ بِيَدِ حَسَنٍ وَحُسَيْنٍ فَقَالَ مَنْ أَحَبَّنِي وَأَحَبَّ هَذَيْنِ وَأَبَاهُمَا وَأُمَّهُمَا كَانَ مَعِي فِي دَرَجَتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ (5)

٢٠ ـ حَدَّثَنَا زَيْدُ بْنُ الْحَسَنِ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (6)

ہم یہاں مشہور کتب حدیث کے ان بیس حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ محدثین کے تذکروں میں آپ کو علی بن الحسین امام زین العابدین (۹۴ھ) کا ذکر امام ابراہیم نخعی، امام

---

(1) سنن ابی داؤد۔ ج ا، ص ۲۸۳۔

(2) سنن ابی داؤد۔ ج ا، ص ۲۳۵۔

(3) سنن نسائی جلد ا، ص ۴۰۔

(4) جامع ترمذی ج ا، ص ۱۶۰۔

(5) ترمذی ج ۲، ص ۲۱۵۔

(6) ایضاً ص ۲۱۹۔

ربانی امام ابن سیرین اور امام حسن بصری کے ساتھ ملے گا۔ علامہ ذہبی (۷۴۸ھ) نے تذکرۃ الحفاظ (حافظین حدیث) میں آپ کا ذکر تیسرے طبقے میں کیا ہے۔ پہلے طبقہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، دوسرے طبقے میں اکابر تابعین اور تیسرے طبقے میں چھٹے نمبر پر ان لفظوں میں آپ کا ذکر کیا ہے۔

اپنے والد حضرت حسین، بڑے چچا حضرت حسن، حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت مسور بن مخرمہ، حضرت ابن عمر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور دیگر بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا۔ آپ سے آپ کے بیٹوں ابو جعفر (امام باقر)، محمد زید، عمر اور عبد اللہ کے علاوہ زید بن اسلم، عاصم بن عمر زہری، یحیٰ بن سعید، ابو الزناد اور دوسرے کئی بزرگوں نے کسب فیض کیا۔ زہری کہتے ہیں میں نے علی بن حسین سے زیادہ فقیہ کوئی نہیں دیکھا۔ لیکن حدیث کم روایت کرتے تھے۔[1]

حضرت امام محمد باقر کا تعارف

اس کتاب میں آپ کو ان کے بیٹے ابو جعفر امام باقر (۱۱۴ھ) کا ذکر بھی اکابر ائمہ اہل سنت کے پہلو بہ پہلو ملے گا۔ حافظ ذہبی تذکرۃ الحفاظ کے چوتھے طبقے میں چودھویں نمبر پر ابو جعفر الباقر کا نام اس طرح ذکر کرتے ہیں:

> آپ مدینہ کے رہنے والے چوٹی کے عالم ہیں۔ اپنے والد علی کے علاوہ حضرت جابر بن عبد اللہ، حضرت ابو سعید الخذری، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عبد اللہ بن جعفر (رضی اللہ عنہم) اور چند دیگر اہل علم سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی بالارسال روایت کرتے ہیں۔ آپ سے آپ کے صاحبزادے (امام) جعفر بن محمد کے سوا عمرو بن دینار، اعمش، اوزاعی، ابن جریج، قرہ بن خالد رحمۃ اللہ علیہم اور بہت سے دوسرے لوگوں نے علم حدیث

---

(1) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۷۸۔

حاصل کیا۔ ۵٦ھ میں پیدا ہوئے۔ سنن نسائی میں آپ کے نانا حسن رضی اللہ عنہ سے آپ کی روایت موجود ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی آپ کی ایک روایت سنن نسائی میں مذکور ہے۔ (1)

حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ کا تعارف

امام باقر کے بیٹے امام جعفر صادق (۱۴۸ھ) کا تذکرہ بھی ملاحظہ کیجئے۔ حافظ ذہبی نے پانچویں طبقے میں نویں نمبر پر آپ کا اور دسویں نمبر امام اعظم ابو حنیفہ (۱۵۰ھ) کا نام درج کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

أحد السادة الأعلام وابن بنت القاسم بن محمد وأم أمه هي أسماء بنت عبد الرحمن بن أبي بكر فلذلك كان يقول: ولدني أبو بكر الصديق مرتين حدث عن جده القاسم وعن أبيه أبي جعفر الباقر وعبيد الله بن أبي رافع وعروة بن الزبير وعطاء ونافع وعدة وعنه مالك والسفيانان وحاتم بن إسماعيل ويحيى القطان وأبو عاصم النبيل وخلق كثير .... وثقه الشافعي ويحيى بن معين. وعن أبي حنيفة قال: ما رأيت أفقه من جعفر بن محمد (2)

(امام جعفر صادق) مدینہ منورہ کے رہنے والے چوٹی کے سادات میں سے ہیں۔ والدہ ماجدہ قاسم بن محمد کی بیٹی اور نانی حضرت عبد الرحمن بن ابو بکر کی صاحبزادی حضرت اسماء ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کہا کرتے تھے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے دو مرتبہ جَنا۔ آپ نے اپنے نانا قاسم بن محمد اور والد امام باقر سے علم حاصل کیا۔ حضرت عروہ بن الزبیر، حضرت عطاء، حضرت نافع بھی آپ کے اساتذہ میں سے تھے۔ امام مالک، سفیان ثوری،

---

(1) تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص ۱۱۵۔

(2) ایضاً جلد ۱، صفحہ ۱۲٦۔

سفیان بن عیینہ، حاتم بن اسماعیل، یحیٰ بن سعید القطان اور ابو عاصم النبیل
اور بہت سے افراد آپ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ امام شافعی اور یحیٰ بن
معین نے ان کی توثیق کی ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں میں نے جعفر بن
محمد سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں دیکھا۔

آپ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما دونوں کی پیدائش ۸۰ھ کی ہے۔ آپ نے ۱۷۸ھ میں اور حضرت امام ابو حنیفہ نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

سب ائمہ اہل بیت اہل سنت والجماعت تھے

دیکھئے ائمہ اہل بیت کے یہ تین اکابر کس طرح دیگر ائمہ اہل سنت کے ساتھ ملے جلے ہیں۔ جس طرح وہ احادیث روایت کرتے ہیں یہ بھی ان سے حدیث رویت کرتے ہیں اور علم رجال کا کوئی ماہر انہیں صفوف اہل سنت سے باہر نہیں پاتا۔ اور حق بھی یہ ہے کہ ائمہ اہل بیت سب کے سب اہل سنت والجماعت تھے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ (۲۵۶ھ) کی وفات تک اثنا عشری شیعہ ابھی ایک عقیدہ بن کر نہ ابھرے تھے۔ اثنا عشریوں کے بارھویں امام (۲۵۴ھ) میں پیدا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اثنا عشری عقیدہ اس کے بعد ہی کہیں جا کر قائم ہوا۔ شیعہ حضرات ان تین ائمہ علم کو جمہور اہل اسلام سے کاٹ کر اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اہل سنت نے ان تین حضرات کو ہمیشہ اپنی صفوں سے ظاہر کیا ہے۔ اور وہ تھے بھی انہی کے۔ اثنا عشری عقیدے کے نہ تھے۔

تاہم محمد بن یعقوب الکلینی کی کتاب الکافی میں بھی کئی مقامات پر ان اہل علم حضرات کا عام اختلاط مذکور ہے۔

امام کلینی الکافی جلد۔۔ ص ۱۹۸ میں امام علی رضا (۲۰۳ھ) کے جامع مسجد بغداد میں جمعہ پڑھنے کا ذکر کرتے ہیں۔ ان دنوں وہاں خطیب کون تھا؟ اہل سنت والجماعت عقیدے کا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امام علی رضا عقیدۃً اہل سنت تھے۔ ان کے والد امام موسیٰ کاظم (۱۸۳ھ) اور امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) کی ملاقات بھی الکافی (جلد ۴، ص

۳۵۲) پر مذکور ہے۔ امام باقر اور امام ابو حنیفہ کی ملاقات الکافی (جلد ۱، ص ۵۸) اور (جلد ۲، ص ۲۸۵) پر ملاحظہ کریں۔ امام باقر امام ابو حنیفہ کو وقت کے علماء میں شمار کرتے تھے۔ یہ الکافی (جلد ۸، ص ۲۹۲) پر موجود ہے۔ پھر الکافی (جلد ۴، ص ۴۰۴) پر امام قتادہ (۱۱۸ھ) اور امام جعفر صادق اکٹھے طواف کرتے دکھائے گئے ہیں۔

اثنا عشری عقیدے کا سب سے پہلا محدث محمد بن یعقوب الکلینی (۳۲۸ھ) چوتھی صدی میں ہوا اور چوتھی صدی سے اس فرقے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت اہل سنت و الجماعت عقیدے کے بڑے محدث امام ابو جعفر الطحاوی (۳۲۸ھ) تھے۔

ائمہ اہل بیت اور دوسرے ائمہ اہل سنت کا عام اختلاط:

اہل سنت والجماعت کی کتابوں میں ان ائمہ اہل بیت کا اسی طرح ذکر ملے گا جیسا کہ ہم ذہبی کے حوالے سے پیش کر آئے ہیں۔ حافظ ابن حجر انہیں اسی طرح اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں۔

سانحہ کربلا کے وقت مسلمانوں میں کوئی اعتقادی تفریق نہ تھی:

سانحہ کربلا اور اس دور کے حالات کے عینی گواہ حضرت امام زین العابدین سے بڑھ کر اور کون ہوں گے؟ ان کا عمل بتا سکتا ہے کہ آیا ان کے دور میں دنیا میں کہیں شیعہ سنی تفریق تھی؟ اگر آپ محدثین اہل سنت سے کچھ بھی عقیدۃً مختلف ہوتے تو آپ مسجد نبوی میں روایت حدیث کے لئے دوسرے محدثین کے ساتھ کبھی اپنا علمی حلقہ نہ لگاتے۔

حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہما (۱۰۷ھ) کون تھے؟ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے اور سلیمان بن یسار رضی اللہ عنہ ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام تھے۔ مسجد نبوی میں حضرت علی بن الحسین کا علمی حلقہ ان حضرات کے ساتھ لگتا تھا۔ اور یہ سب محدثین یکساں حدیث روایت کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد آپ کی مجلس درس مسجد نبوی کے پچھلے حصے میں لگتی اور ہزاروں لوگ ان کے علم سے مستفید ہوتے تھے۔

كَانَ عَلِيُّ بْنُ حُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ يَجْلِسُ كُلَّ لَيْلَةٍ هُوَ وَعُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ فِي مُؤَخَّرِ مَسْجِدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الْعِشَاءِ الْآخِرَةِ[1]

ترجمہ: امام زین العابدین اور عروہ بن زبیر عشاء کی نماز کے بعد مسجد نبوی کے آخری حصہ میں ہر رات اکٹھے بیٹھتے تھے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھتا تھا۔فکنت اجلس معهما۔ ایک دن حضرت عروہ نے امام زین العابدین سے کہا اگر کوئی شخص بنو امیہ اور ان کے اعوان وانصار سے میل بھر دور رہے گا، ان پر آفت آئے تو وہ محفوظ رہے گا۔ اس کے بعد حضرت عروہ وادی عقیق میں چلے گئے اور میں مقام سویقہ میں منتقل ہو گیا۔ امام زین العابدین وہیں رہے، کیونکہ آپ اموی حکومت کی مخالفت نہ کرنے کا عہد دے چکے تھے اور آپ اس پر قائم رہے۔

محدثین کی یہ علمی مجالس بتاتی ہیں کہ اس وقت حضرت زبیر کی اولاد میں اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کی اولاد میں ہر گز کوئی عقیدے کا اختلاف نہ تھا۔ سنی شیعہ تفریق ان دنوں تک کہیں سنی نہ گئی تھی۔ شیعہ بطور فرقہ کے چوتھی صدی میں ظاہر ہوئے تھے۔

حضرت سلیمان بن یسار بلالی (۱۰۷ھ) مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔ حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ (۹۳ھ) کہتے ہیں آپ کی صبح کی علمی مجلس حضرت امام زین العابدین رحمہ اللہ کے ساتھ لگتی تھی۔ یزید بن حازم کہتے ہیں:

رَأَيْتُ عَلِيَّ بْنَ حُسَيْنٍ وَسُلَيْمَانَ بْنَ يَسَارٍ يَجْلِسَانِ بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ يَتَحَدَّثَانِ إِلَى ارْتِفَاعِ الضُّحَى وَيَتَذَاكَرَانِ فَإِذَا أَرَادَا أَنْ يَقُومَا قَرَأَ عَلَيْهِمْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي سَلَمَةَ سُورَةً, فَإِذَا فَرَغَ دَعَوْا[2]

ترجمہ: میں نے امام زین العابدین اور سلیمان بن یسار کو ریاض الجنہ

---

(1) طبقات ابن سعد جلد ۵، ص ۱۸۱۔

(2) طبقات ابن سعد جلد ۵، صفحہ ۲۱۷۔

میں دیکھا وہ سورج کے اوپر آنے تک آپس میں علمی مذاکرہ کرتے۔ جب ارادہ کرتے کہ اٹھ جائیں تو عبد اللہ بن ابی سلمہ ان کے سامنے کسی سورت کی تلاوت فرماتے۔ جب وہ ختم کرتے تو یہ دونوں چلے جاتے۔

اہل سنت نے امام زین العابدین کو ہمیشہ اپنا جلیل القدر بزرگ سمجھا ہے۔ آپ کے تذکرے سنی کتب رجال میں اس طرح ہیں جس طرح امام ابراہیم نخعی، حضرت حسن بصری اور دوسرے محدثین کے پائے جاتے ہیں۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو اسی صف میں بیٹھے دکھایا ہے جس میں اہل سنت اکابر بیٹھے نظر آتے ہیں۔

امام نافع (۱۱۷ھ) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے شاگرد خاص ہیں۔ آپ کی بھی امام باقر (۱۱۴ھ) سے ملاقات رہتی تھی۔ دیکھئے الکافی جلد ۸، ص ۱۲۱، ص ۳۵۱۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے روایت لی۔ اسے الکافی جلد ۴، ص ۵۴۶، جلد ۷، ص ۱۰۴ پر دیکھئے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ذکر آپ کو اس کتاب کی جلد ۲، ص ۲۲۳۔ جلد ۳، ص ۱۶، ص ۹۲، ص ۲۹۷۔ جلد ۴، ص ۲۵۹، ص ۵۴۶۔ جلد ۵، ص ۴۴۹۔ جلد ۷، ص ۶۳، ص ۱۳۷، ص ۴۰۴ اور جلد ۸ ص ۲۹۲ پر عام ملے گا۔ حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا ذکر جلد ۵، ص ۳۸۷۔ جلد ۷، ص ۶۱، ص ۴۰۴ اور جلد ۱، ص ۹۵ پر موجود ہے۔ ان ائمہ علم کی ان عام ملاقاتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان اہل علم حضرات کے عہد میں اسلام میں ہرگز کفر و اسلام کی دیواریں کھڑی نہ کی گئی تھیں۔ مسلمانوں میں عقیدوں کی یہ تفریق چوتھی صدی ہجری میں جاکر قائم ہوئی ہے۔ اس سے پہلے شیعہ کا لفظ صرف ایک سیاسی امتیاز کو ظاہر کرتا تھا۔ اس میں عقیدہ کے کسی فاصلے کا امتیاز نہ تھا۔ اہل سنت والجماعت جس طرح صحابہ] کی عظمت و فضیلت کے جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے اہل بیت کی محبت اور عقیدت کے زمزمے بھی انہی کی صفوں میں سنے جاتے تھے۔

اہل بیت رسالت سے محبت دائماً رہے:

قمی (۳۰۷ھ) اور کلینی (۳۲۸ھ) نے اگر صحابہ کرام اور اہل بیت میں تفریق کی

دیوار کھڑی کر دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم بھی اس باہمی وحدت و مودت میں سے نکل جائیں جو اسلام کی پہلی تین صدیوں میں صحابہ اور اہل بیت میں رہی ہے۔ یہ چوتھی صدی کی تفریق پہلی تین صدیوں کی جمع کو نہیں توڑ سکتی۔ یہودیوں کی دسیسہ کاریوں میں گھرے لوگ اگر صحابہ کے خلاف چڑھ دوڑے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اہل سنت اہل بیت کی عقیدت و محبت سے نکل آئیں۔ کتاب و سنت اور اسلام کی پہلی تین صدیوں کا سبق ہمیں کبھی نہ بھلانا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ سب اہل بیت رسالت سے محبت دائمًا رہے۔ ہم اہل بیت سے صرف بارہ افراد مراد نہ لیں، قیامت تک آنے والی اولاد رسول ہمارے لئے برابر کی لائق محبت رہے۔

اسلام ما اطاعت خلفائے راشدین ایمان ما محبت آل محمد است

ساری آل محمد کی اس عقیدت سے اہل بیت کا دائرہ اور وسیع ہو گا اور قیامت تک کی آل رسول اس دائرہ میں جگہ پا سکے گی۔ کاش کہ شیعہ لوگ اس نکتہ کو سمجھ جائیں اور اس سلسلہ اہل بیت کو صرف چند افراد میں رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ حضور ﷺ کی اولاد سے محبت تا انقراض قیامت چلے۔ جب تک دنیا رہے گی اہل بیت رہیں گے اور ان کے چاہنے والے بھی رہیں گے۔ انہیں صرف اوصیاء میں محدود کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

اہل بیت کے سلسلے کو کم کرنے کی سازش:

کفار نے حضور ﷺ کی نرینہ اولاد باقی نہ رہنے کے باعث یہ بات عام کی کہ آپ کا کوئی جانشین نہ ہو گا اور آپ کی وفات سے اس موجودہ بہار اسلام پر خزاں آجائے گی۔ وہ آپ ﷺ کو "ابتر" کہتے تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو فرمایا:

﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ ٱلۡأَبۡتَرُ ۝٣﴾[1]

ترجمہ: بے شک تیرا دشمن ابتر (بلا اولاد) ہو گا۔

---

(1) پارہ ۳۰، سورہ الکوثر۔

یہ لوگ کون تھے آپ کی اولاد کا انکار کرنے والے؟ یہود و مشرکین۔ ہم مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں کہ آپ کی اولاد شان کثرت سے کوثر ٹھہری ہے۔ اہل بیت رسالت قیامت تک چلیں گے۔ شیعہ حضرات کو اولاد رسول میں سے کسی کا انکار نہ کرنا چاہئے، نہ وہ اہل بیت کے تسلسل کے خلاف عقیدہ رکھیں۔ اگر اہل بیت رسالت صرف پہلے گیارہ ہی تھے اور بارھویں حضرت مہدی قیامت کو ظاہر ہوں گے تو اہل بیت کا تسلسل ان کے درمیانی صدیوں میں کہیں مٹا تو نہیں سمجھا جائے گا۔﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾

شیعہ کے پانچ انکار

اہل بیت سے محبت رکھنے والا کوئی شخص مندرجہ ذیل انکاروں میں سے کسی پر نہ جم سکے گا:

① پہلا انکار... کہ آپ کی تین صاحبزادیاں آپ کی صاحبزادیاں نہ تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی پہلی بیٹیاں تھیں۔ ائمہ اہل بیت نے اس عقیدے کی پرزور تردید کی ہے۔

② دوسرا انکار... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مؤمنین کی مائیں تو ہیں لیکن وہ اہل بیت میں سے نہیں۔ قرآن کریم میں اہل بیت کی آیت بے موقع رکھی گئی۔ (معاذ اللہ)

③ تیسرا انکار... حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نواسے علی بن ابی العاص اور عبد اللہ بن عثمان رضی اللہ عنہ آپ کے نواسے نہ تھے۔ (معاذ اللہ)

④ چوتھا انکار... حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے چھوٹے بھائی محسن پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئے تھے، اس لئے وہ اہل بیت رسالت میں نہ اٹھیں گے۔

⑤ پانچواں انکار... حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کی دو بیٹیاں حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم چونکہ بارہ اوصیاء کرام میں سے نہیں اس لئے ان کے ارشادات امت کے لئے لائق تمسک نہیں ہیں۔

ہمیں اس وقت یہ بحث نہیں ہے کہ جو لوگ ان پانچ انکاروں پر ڈٹے ہوئے ہیں وہ

خلوص دل سے اہل بیت رسالت کے مخلص عقیدت مند نہیں۔ ہم یہاں قارئین کو صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اہل بیت کو کم کرنے کی کوششیں مسلمانوں کی کبھی نہیں ہو سکتیں۔ یہ دشمنان اسلام کی آواز تھی کہ معاذ اللہ آپ "ابتر" ہیں اور آپ کا سلسلہ اولاد آگے نہ چلے گا۔ اہل السنۃ و الجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے محبت ہونی چاہیے۔ سنی مسلمانوں کو چاہیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک رشتہ دار کے آگے عقیدت کی آنکھیں بچھائیں، نہ یہ کہ آپ کی پوری کی پوری اولاد کا انکار کر دیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اہل بیت کو حدیث ثقلین میں لائق تمسک ٹھہرایا تھا وہ صرف بارہ تھے نہ کہ ساری کی ساری اولاد لائق تمسک جا ٹھہرے۔

اہل بیت میں ائمہ ولایت:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس امت میں ولایت کا سلسلہ جاری کیا اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں ائمہ ولایت بھی بہت اٹھائے۔ یہ اہل بیت رسالت کا خاص اعزاز رہا ہے۔ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد سے گیارہ حضرات اس دائرۂ ولایت کے قطب ٹھہرے۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے نہیں تاہم آپ بھی اس چادر میں آنے کے باعث اہل بیت رسالت کا اعزاز پا گئے تھے۔ سو یہ بارہ حضرات صرف شیعہ ہی کے نہیں اہل سنت کے ہاں یہ سب اقطاب کے منصب پر مانے گئے ہیں۔ ان کے بعد یہ منصب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عترت میں شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کو ملا۔ آپ اس سلسلہ کے قطب تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ (۱۰۳۴ھ) کا بیان

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے وہ مکاشفات جو خواجہ محمد ہاشم کشمی نے مرتب کئے ہیں ان میں سولہویں مکاشفہ میں ہے:

باید دانست کہ واصلان ذات ازیں بزرگواراں کہ بہ افراد ملقب اند

نیز اقل قلیل اند و اکابر صحابہ دائمہ اثنا عشر از اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بایں فضیلت فائض اند از اکابر اولیاء قطب ربانی محی الدین شیخ عبد القادر جیلانی قدس اللہ سرہ الاقدس بایں دولت ممتاز اند و دریں مقام شان خاص دارند[1]

ترجمہ: جاننا چاہیئے کہ ان بزرگوں میں واصلان ذات جو افراد کہلاتے ہیں بہت کم ہیں۔ اکابر صحابہ کرام] اور اہل بیت کے بارہ امام اس مقام وصال پر فائض ہوئے۔ اکابر اولیاء کرام میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی بھی اس نعمت سے ممتاز ہوئے اور اس روحانی مقام میں بڑی شان پائی۔

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ (۱۱۷۶ھ) کا بیان

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۷۶ھ) نے "المقالة الوضية فى النصيحة و الوصية" میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱۱۹۵ھ) بھی لکھتے ہیں:

صوفیہ اہل سنت بر قطبیت دوازدہ امام متفق اند۔[2]

مفسر قرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) کا بیان

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) "الوصیۃ" میں لکھتے ہیں:

آنچہ حضرت شیخ در قطبیت ائمہ اثنا عشر نوشتہ اند ایں مضمون را حضرت امام ربانی قطب صمدانی حضرت مجدد الف ثانی نوشتہ و فقیر آن را در شمشیر برہنہ نوشتہ۔[3]

ترجمہ: حضرت شیخ نے جو بارہ اماموں کی قطبیت پر لکھا ہے اسے

---

(1) مکاشفات غیبیہ صفحہ ۴۰ شائع کردہ ادارہ مجددیہ کراچی۔

(2) مقامات مظہری مؤلفہ شاہ غلام علی دہلوی ص ۱۲۷ مطبع احمدی دہلوی۔

(3) مجموعہ وصایا اربعہ ص ۵۵ شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے اور اس فقیر نے اسے (اپنی کتاب) شمشیر برہنہ میں لکھا ہے۔

اب آیئے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ (۱۲۳۹ھ) سے بھی اس کی تصدیق کرتے چلیں:

نیز ائمہ پسیں مثل حضرت سجاد باقر و صادق و کاظم و رضا ہمہ مقتدایاں و پیشوایان اہل سنت بودہ اند کہ علماء ایشاں مثل زہری و امام ابو حنیفہ و امام مالک تلمذ از آنجناب کردہ اند و صوفیہ آن وقت مثل معروف کرخی وغیرہ از آنجناب فیض اندوختہ و مشائخ طریقت سلسلہ آنحضرت را سلسلۃ الذہب نامیدہ محدثین اہل سنت ازاں بزرگواراں در ہر فن خصوصاً در تفسیر و سلوک دفتر دفتر احادیث روایت کردہ۔[1]

ترجمہ: پہلے ائمہ میں حضرت زین العابدین، محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم اور امام رضا یہ سب بزرگواران اہل سنت کے مقتداء اور پیشواء ہوئے ہیں۔ اہل سنت کے علماء جیسے امام زہری، امام ابو حنیفہ اور امام مالک ان ائمہ اہل بیت سے تلمذ رکھتے تھے۔ اور ان ادوار کے صوفی جیسے معروف کرخی وغیرہ نے بھی ان حضرات سے استفادہ کیا ہے۔ اور مشائخ طریقت آنحضرت کے سلسلے کو سلسلۃ الذہب (سونے کی کڑیاں) کا نام دیتے تھے۔ محدثین اہل سنت نے ان بزرگوں سے ہر فن میں خصوصاً تفسیر و سلوک میں دفتر دفتر احادیث روایت کی ہیں۔

قطبیت سے آسمانی امامت کی دریافت:

ہر تحریک اپنی ابتداء میں سادہ اور مبنی بر حقیقت ہوتی ہے، پھر اس میں افراط اور مبالغہ راہ پاتے ہیں اور بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ راہ ولایت میں اہل خدمت

(1) تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۴۸۱۔

حضرات (ابدال ہوں یا اقطاب) اپنا کام کرتے ہیں اور پھر راہ سفر پر چلے جاتے ہیں۔ لوگ انہیں جانیں اور پہچانیں۔ نہ ان کا یہ مطالبہ ہوتا ہے اور نہ اپنے لئے یہ کسی منصب کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مجدد بھی اپنا کام کرتا ہے اور پھر فارغ ہو جاتا ہے۔ جو اسے پہچان لے وہ خیر کثیر پالیتا ہے اور جو نہ جان سکے اس کے ایمان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، نہ اس کا بطور مجدد جاننا کسی کے لئے ضروری ہے۔

ائمہ اہل بیت آسمانی مرتبہ امامت کے مدعی نہ تھے

یہ بارہ حضرات (ائمہ اہل بیت) بھی اسی قبیل کے امام تھے۔ ان میں علم کے ساتھ ایک روحانی بزرگی تھی۔ یہ کسی آسمانی مرتبہ امامت کے مدعی نہ تھے، نہ ان کے حلقہ میں انہیں کوئی مامور من اللہ امام مانا جاتا تھا۔ مگر افسوس کہ افراط پسند (بات بڑھانے والے) طبائع نے ان پر مشق تحریف کی اور انکی قطبیت سے آسمانی امامت کا عقیدہ کشید کیا۔ افراط و تفریط کے حامی ہر تحریک میں ہر دور میں ابھرتے ہیں اور اسی کے نتیجہ میں ان صلحائے امت کے بارے میں طرح طرح کے حاشیے لگائے گئے۔ تاہم ان کی روحانی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آسمانی امامت کا عقیدہ ان کی زندگی میں نہ بنا تھا:

ان ائمہ رشد و ہدایت کے پاس جو لوگ اٹھتے بیٹھتے تھے اور ان سے علمی مجلسیں کرتے تھے وہ ان کی آسمانی امامت اور عصمت کے قائل نہ تھے۔ انہیں بزرگ سمجھ کر ان کے پاس بیٹھتے اور ان دنوں مسلمانوں میں سنی شیعہ نام سے کہیں کوئی فرقہ نہ تھا۔ محمد باقر مجلسی لکھتا ہے:

از احادیث ظاہر مے شود کہ جمعے از راویاں کہ در اعصار ائمہ بودہ
اند از شیعاں اعتقاد بعصمت ایشاں نداشتہ اند بلکہ ایشاں را از علمائے نیکو کار
مے دانستہ اند چنانکہ از رجال کشی ظاہر مے شود مع ذلک ائمہ حکم بایمان بلکہ

عدالت ایشاں مے کردہ اند[1]

ترجمہ: احادیث سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ وہ شیعہ راویان حدیث جو ائمہ اہل بیت کے دور میں ہوئے ان ائمہ کو معصوم (مامور من اللہ) نہ سمجھتے تھے۔ وہ انہیں بزرگ علماء کرام سمجھتے تھے۔ رجال کشی سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ائمہ اہل بیت نہ صرف ان راویوں کو مؤمن قرار دیتے بلکہ انہیں عادل بھی سمجھتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا ان دنوں لفظ شیعہ کسی فرقہ کے معنی میں نہ تھا۔ ائمہ اہل بیت کو بزرگ سمجھنے والے لوگ ان کا گروہ شمار ہوتے اور اسی معنی میں ان کو شیعہ کہہ دیا جاتا تھا۔ حضرت خاتم النبیین ﷺ کے بعد کوئی مامور من اللہ امام اور وہ معصوم ہو یہ عقیدہ ان دنوں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ یہ عقائد چوتھی صدی ہجری سے کہیں نہیں ملتے۔ تاہم یہ ائمہ اہل بیت قطب فلک ولایت تھے۔ ان کے علم ان کی بزرگی اور ان کی روحانیت کے بارے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔

اہل بیت نبوت دنیا کے آخر تک منبع فیض:

آنحضرت ﷺ کی اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے چلی، قیامت تک اس دنیا میں موجود رہیں گی۔ دنیا کے آخری دور میں امام مہدی جو کل قلمرو اسلامی کے سربراہ ہوں گے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں سے ہوں گے۔ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے خاندان میں سے ہوں گے۔ لسان رسالت سے سید کا لفظ آپ کے لئے (حضرت امام حسنؓ کے لئے) ہی صادر ہوا اور آپ نے اس سیاق میں آپ کو سید کہا کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں کو پھر سے ایک کر دے گا۔ حضرت امام حسنؓ کی عظیم قربانی اللہ تعالیٰ کو اس طرح پسند آئی کہ اس نے حضور ﷺ کی عالمی خلافت کا پروانہ ان کی اولاد میں لکھ دیا۔

(1) حق الیقین صفحہ ۳۲۸، صفحہ ۵۵۰ ایران۔

حضرت مہدی کے حسنیّ النسب ہونے کا سرّ لطیف:

حافظ ابن قیم حنبلی (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

وَفِي كَوْنِهِ مِنْ وَلَدِ الْحَسَنِ سِرٌّ لَطِيفٌ وَهُوَ أن الحسن رضی اللہ عنہ تَرَكَ الْخِلَافَةَ لِلّٰهِ فَجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ وَلَدِهِ مَنْ يَقُومُ بِالْخِلَافَةِ الْحَقُّ الْمُتَضَمِّنِ لِلْعَدْلِ الَّذِي يَمْلأُ الأَرْضَ وَهَذِهِ سُنَّةُ اللّٰهِ فِي عِبَادِهِ اَنَّهُ مَنْ ترك لِأَجلِه شَيْئًا أَعْطَاهُ اللّٰهُ اَوْ اَعْطَى ذُرِّيَّتَهُ أَفْضَلَ مِنْهُ[1]

ترجمہ: امام آخر الزمان حضرت مہدی کے امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہونے میں ایک غامض نکتہ یہ ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے لئے خلافت چھوڑی، سو اللہ تعالیٰ نے عالمی خلافت حقہ ان کی نسل میں ٹھہرائی۔ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ان کے بندوں میں چلی آرہی ہے کہ جو بندہ اس کی رضا کے لئے کوئی منصب چھوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسے یا اس کی اولاد میں سے کسی کو اس سے بہتر وبرتر عہدہ دیتے ہیں۔

حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما صحابہ رضی اللہ عنہم کی آغوش محبت میں:

ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا مجھے اپنے بدن کا وہ حصہ دکھاؤ جس پر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے دیکھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ذرا قمیص اٹھائی، پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آپ رضی اللہ عنہ کی ناف پر بوسہ دیا۔[2]

جس دن آپ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا آپ (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) مسجد کے دروازے پر کھڑے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ناز پرورده عزیز دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ اس پر غم کے آنسو بہاؤ۔

رأيت أبا هريرة قائما على المسجد يوم مات الحسن يبكي وينادي بأعلى صوته يا أيها الناس مات اليوم حب رسول الله

---

(1) المنار المنيف صفحہ ۱۳۹۔

(2) مسند احمد جلد ۳، ص ۶۳۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فأبکوا [1]

یہ گریہ کی کیفیت اس دن کی ہے جس دن آپ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی۔ تین دن کے اندر کا رونا گرفت میں نہیں آتا۔ نہ یہ اجتماعی ماتم ہے کہ اس کے لئے فرش بچھائے گئے ہوں۔

خونی مہدی کا تصور:

ہندوستان میں مرزا غلام احمد قادیانی نے دنیا کو خونی مہدی کا تصور دیا اور انگریزوں کو باور کرایا کہ میرے مقابل جتنے مسلمان ہیں سب ایک خونی مہدی کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ صرف میں ہوں جو اس کی راہ روکے ہوئے ہوں۔ حکومت برطانیہ اپنے اس خود کاشتہ عقیدے کی پوری امداد کرے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے یہ چند اشتہارات ملاحظہ ہوں:

① یہ مولوی ایک ایسے مہدی کے منتظر ہیں جو تمام دنیا کو خون میں غرق کردے اور خروج کرتے ہی قتل کرنا شروع کردے۔ [2]

② ایسا ہی یہ لوگ ایک خونی مہدی کے منتظر ہیں جو دنیا کو خون سے بھر دے... یہ لوگ در حقیقت ایک خونی مہدی کے دن رات منتظر ہیں [3]

③ عام مولوی اس وجہ سے میرے دشمن ہوگئے ہیں کہ میں نے ان کے خونی مہدی اور خونی مسیح کا انکار کردیا۔ [4]

④ میں کسی خونی مسیح کے آنے کا قائل نہیں اور نہ خونی مہدی کا منتظر۔ [5]

---

(1) تہذیب التہذیب جلد ۲، صفحہ ۳۰۱۔

(2) مجموعہ اشتہارات ص ۲۱، ج ۲۔

(3) ایضاً ص ۱۲۸۔

(4) ایضاً ص ۱۳۰۔

(5) ایضاً ص ۲۸۷۔

⑤ میں خدا کی طرف سے ہوں اور کسی خونی مسیح اور خونی مہدی کا انتظار کرنا جیسا کہ عام مسلمانوں کا خیال ہے یہ سب بے ہودہ قصے ہیں۔ [1]

مرزا غلام احمد قادیانی نے حضرت امام مہدی کے بارے میں جو تصور پیش کیا ہے شیعہ کی کتابوں سے کیا ہے۔ اور انہی کتابوں سے اس نے یہ عقیدہ قائم کیا ہے کہ حضرت امام مہدی کا کام بس قتل وغارت گری کرنا ہو گا۔ (معاذ اللہ)

اہل سنت مسلمان حضرت امام مہدی کے بارے میں کوئی ایسا تصور نہی رکھتے، ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی تشریف آوری حضور رحمت اللعالمین کے سایہ میں ایک رحمت کا نشان ہو گی۔ تمام زمین ان کے عدل و انصاف سے جگمگا اٹھے گی اور ان کی آمد پر شیعہ اور سنی کی صدیوں کی نزاع بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گی۔ جس طرح روئے زمین ایک ہے اس پر حکمران بھی ایک ہو گا۔ اور یہ وہ پاک ہستی ہو گی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ اہل بیت کا فیض عام اور وجود تام ان شاء اللہ قیامت تک رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد جو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے چلی وہ قیامت تک رہے گی اور ہوا کا کوئی جھونکا نور اہل بیت کو بجھا نہ سکے گا۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے اولاد ہونے کا طعنہ دیتے تھے قرآن نے ان کو "ابتر" کہا ہے۔ سو آج ان کی اولاد میں سے کوئی نہیں۔ قرآن میں کہا گیا: ﴿إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ ٱلْأَبْتَرُ ۝٣﴾ خلفاء ثلاثہ اگر اہل بیت کرام کے دشمن ہوتے تو آج روئے زمین پر نہ کوئی صدیقی ہوتا، نہ فاروقی اور نہ عثمانی۔ حالانکہ قریش کی ان لڑیوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔

حضرت امام مہدی کی آمد ایک مصلح کی آمد ہے، منتقم کی نہیں:

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا کردار ایک مصلح کا کردار رہا ہے ایک منتقم کا نہیں۔ اور اسی نسبت نے امام آخر الزمان کو عالمی قیادت دی۔ اب

---

(1) ایضاً ص ۴۱۶۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام زمان کا ظہور ایک منتقم فوجی جرنیل کا ہو اور وہ صفت رحمت کا نشان بن کر نہ ابھریں۔

بغداد کا مشہور تاجر ابو السعادات الحلی ہر جمعہ فوجی لباس پہن کر اپنے گھر کے دروازے کے پیچھے کھڑا رہتا تھا اور لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہوتے۔ وہاں وہ اس انتظار میں ہوتا کہ ابھی محمد بن الحسن العسکری سامرا کی غار سے نکلیں گے اور وہ ان کی مدد میں ان کے ساتھ مل کر تلوار چلائے گا۔ اس کا نماز نہ پڑھنا اور ایک خونی ڈرامہ کھیلنے کے لئے تیار رہنا بتاتا ہے کہ وہ کس قماش کا آدمی ہو گا۔ حافظ ابن کثیر ۶۰۰ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

التَّاجِرُ الْبَغْدَادِيُّ الرَّافِضِيُّ كَانَ فِي كُلِّ جُمُعَةٍ يَلْبَسُ لِأْمَةَ الْحَرْبِ، وَيَقِفُ خَلْفَ بَابِ دَارِهِ، وَهُوَ مُجَافٍ عَلَيْهِ، وَالنَّاسِ فِي صَلَاةِ الْجُمُعَةِ، وَهُوَ يَنْتَظِرُ أَنْ يُخْرِجَ صَاحِبُ الزَّمَانِ مِنْ سِرْدَابِ سَامَرَّا يَعْنِي مُحَمَّدَ بْنَ الْحَسَنِ الْعَسْكَرِيَّ لِيَمِيلَ بِسَيْفِهِ فِي النَّاسِ نُصْرَةً لِلْمَهْدِيِّ (1)

اس قسم کی روایات یہود کی سازش معلوم ہوتی ہیں جنہوں نے اسلام کو دو حصوں میں کرنے کے لئے اس قسم کی روایات گھڑیں کہ امام مہدی کا ظہور ایک منتقم کے طور پر ہو گا (استغفر اللہ) ملا محمد باقر مجلسی لکھتا ہے:

چوں قائم ما ظاہر شود عائشہ را زندہ کند تا بر او حد بزند و انتقام فاطمہ ازو بکشد (2)

ترجمہ: جب امام مہدی ظاہر ہوں گے عائشہ زندہ کی جائیں گی تاکہ اس پر حد جاری کریں، نیز ان سے فاطمہ کا انتقام لیں۔

پھر یہ بھی دیکھیں، یہی باقر مجلسی لکھتا ہے:

---

(1) البدایہ جلد ۱۳، ص ۴۳۔

(2) حق الیقین صفحہ ۳۴۷ طبع لکھنؤ۔

وقتی کہ قائم ظاہر میشود بیش از کفار ابتدا بسنیاں خواہد کرد با علماء ایشاں وایشاں راخواہد کشت۔[1]

ترجمہ: جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو کافروں کے قتل سے پہلے سنی علماء سے قتل کی ابتداء کریں گے۔

اہل سنت کے ہاں خونی مہدی کا کوئی تصور نہیں۔ اسلام میں مہدی کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ اہل سنت انہیں وہ امام بر حق مانتے ہیں جو پوری دنیا کو عدل وانصاف مہیا کرے گا اور پوری زمین عدل وانصاف کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

ملا محمد باقر مجلسی جیسے لوگوں نے ایسی روایات گھڑ کر امت کے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا، بلکہ انہوں نے فرقہ بندی کی ایسی آگ جلائی ہے جس نے دونوں حلقوں میں کفر و اسلام کے فاصلے پیدا کر دیئے۔ انگریز مؤرخ ایڈورڈ براؤن لکھتا ہے:

ارباب نقد و نظر جانتے ہیں کہ ایران کے اس ابتلائے عظیم کا سب سے بڑا سبب تعصب اور تنگ نظری کی وہ آگ تھی جو ملائے موصوف باقر مجلسی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی لگائی ہوئی تھی۔[2]

قرآن وحدیث کی رو سے اہل بیت سے مراد:

قرآن وحدیث کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور آپ کی کل اولاد اہل بیت رسالت میں سے ہیں۔ آیت تطہیر قرآن پاک میں پارہ ۲۲ الاحزاب کی آیت نمبر ۳۳ ہے۔ اس سے پہلے آپ اس سورت کی آیت نمبر ۲۸ پڑھیں، پھر نمبر ۳۰ پڑھیں، پھر نمبر ۳۲ پڑھیں۔ ان آیات میں آپ کو ازواج النبی اور پھر نساء النبی کے الفاظ مسلسل ملیں گے۔ ان کے بعد آیت ۳۳ آتی ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ۝٣٣﴾ سو اس میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ قرآن پاک میں

(1) ایضاً ص ۳۱۷۔

(2) براؤن جلد ۴، صفحہ ۱۹۲۔

اہل بیت سے مراد حضور ﷺ کی ازواج مطہرات ہیں جو تمام مسلمانوں کی مائیں ہیں، اور امہات المؤمنین ہیں۔ اہل بیت کے لفظی معنی گھر والے افراد کے ہیں۔ ''گھر والی'' بیوی کو کہا جاتا ہے۔ پھر لازم ہے کہ بیویوں کے بعد اولاد بھی اہل خانہ میں شمار ہو اور وہ سب اہل بیت کا اعزاز پائیں۔

لفظ ''اہل'' عربی میں مذکر ہے۔ سو آیت تطہیر میں اہل بیت کی مناسبت سے مذکر کی ضمیریں لائی گئی ہیں۔ مردوں کی بھی جماعت ہو تو جماعت کی مناسبت سے (جو مؤنث ہے) ان کے لئے مؤنث کے صیغے لائے جاتے ہیں۔ جیسے صحابہ کی جماعت بیٹھی تھی۔ حالانکہ وہ سب مرد تھے۔ آیت تطہیر میں الفاظ اہل کی مناسبت سے عَنْكُمُ میں اور يُطَهِّرَكُمْ میں مذکر کی ضمیر آئی ہیں۔

ہم پر سب اہل بیت کی تکریم اور ولایت لازم ہو۔ حضور ﷺ کے گھر والے (وہ بیویاں ہوں یا اولاد) سب اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ مگر افسوس کہ شیعہ حضرات صرف بارہ حضرات کو اہل بیت میں سے سمجھتے ہیں۔ حضور ﷺ کی کل اولاد کو مورد مودت نہیں سمجھتے۔

حدیث کی روشنی میں اہل بیت سے مراد:

آیت تطہیر سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کی رو سے صرف ازواج مطہرات اہل بیت کا مصداق ہیں۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اپنی اولاد بیٹی، داماد اور ان کے دو بیٹوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو ایک چادر میں لے کر ان پر بھی یہ آیت پڑھ دی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ یہ چاروں حضرات بھی اہل بیت کی چادر کے نیچے جمع ہیں۔ ان چار میں سے شیعہ کے نزدیک تین مفترض الطاعۃ اور لائق تمسک ہیں، لیکن حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مفترض الطاعۃ نہیں سمجھتے کہ ان کی ہر بات کی پیروی امت پر لازم ٹھہرے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کے ہاں بارہ اوصیاء میں سے نہیں ہیں۔

حدیث کساء جس کی رو سے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اہل بیت میں آئے:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک صبح نکلے اور آپ پر سیاہ اون کی ایک چادر تھی۔ آپ کے پاس حضرت حسن رضی اللہ عنہ آئے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے۔ آپ نے ان سب کو چادر کے نیچے لیا اور ان پر آیت تطہیر پڑھی:

فَجَاءَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ فَأَدْخَلَه ثُمَّ جَاءَ الْحُسَيْنُ فَدَخَلَ مَعَه ثُمَّ جَاءَتْ فَاطِمَةُ فَأَدْخَلَهَا ثُمَّ جَاءَ عَلِيٌّ فَأَدْخَلَه ثُمَّ قَالَ: إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا [1]

ترجمہ: حسن رضی اللہ عنہ آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس چادر کے اندر کر لیا، پھر سیدنا حسین رضی اللہ عنہ آئے ان کو بھی اندر کر لیا، پھر سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا آئیں ان کو بھی اندر کر لیا، پھر سیدنا علی رضی اللہ عنہ آئے ان کو بھی اندر کر لیا بعد اس کے یہ تلاوت فرمائی: ترجمہ "اللہ تعالیٰ جل جلالہ چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے ناپاکی کو اور پاک کرے تم کو اے گھر والو!"۔

اس حدیث کی رو سے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما اہل بیت میں شمار ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان چاروں حضرات کے دلوں کو پاکیزہ فرمایا اور ان کے دلوں سے ہر قسم کے شک و تذبذب کو کو دور فرمایا۔ یہ صادق الایمان ٹھہرے۔ ان کے دلوں میں دین میں کسی قسم کا شک اور ناپاکی نہ رہی، ہر میل ان کے دلوں سے اٹھالی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد اسی ایک بیٹی سے چلی اور ان کی شان طہارت کا اثر آپ کی کل اولاد کو شامل رہے گا۔ دوسری بیٹیوں کے بیٹے حضرت علی اور عبد اللہ لڑکپن میں ہی فوت ہو گئے۔ ان سے آپ کی نسل آگے نہ چلنی تھی۔

---

(1) صحیح مسلم جلد ۴، صفحہ ۲۸۳، رقم الحدیث: ۲۴۲۴۔

حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما ایک نسبت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی آگے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہی اولاد سید کہلاتی ہے جو حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما سے ہو۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی دوسری اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد دوسری بیویوں سے ہوئی ان کی اولاد علوی النسب تو ہے لیکن انہیں سید نہیں کہا جاتا۔ وہ اعوان (حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خدام اور مددگار) سمجھے گئے ہیں۔ نسبت رسالت کے باعث حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی آگے سمجھے گئے ہیں۔

نوٹ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داماد سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو اس چادر تلے شامل نہیں کیا۔ چونکہ اس چادر تلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں غیر محرم کو شامل کرنا پسند نہ فرمایا اور کسی بیٹی کو بھی اس میں ساتھ نہ رکھا۔ کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے لئے غیر محرم تھے۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو بتا دیا گیا تھا کہ آپ کی اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد سے آگے چلے گی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس نسبت کو عزت دینا چاہتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ساری اولاد کو سادات میں لانے کی ایک کوشش:

ایران کے ایک مجتہد العصر نے دائرہ سادات کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے خیال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ اولاد جو دوسری بیویوں سے ہوئی وہ بھی سب سید ہیں بلکہ آپ کے بھائیوں کی اولاد بھی سادات میں شامل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں اولاد فاطمہ ہونے کی شرط نہیں ہے۔ ملا کاظم خراسانی کا یہ جواب ملاحظہ فرمائیں:

> سوال: آیا سادات میں یہ شرط ہے کہ پیغمبر کے دادا ہاشم کی اولاد سے ہوں؟
>
> جواب: شرط ہے، اگرچہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب کی اولاد میں سے نہ ہوں۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ایرانی شیعوں کے ہاں سید ہونے کے لئے اولاد فاطمہ رضی اللہ عنہا میں

(1) ذخیرۃ العباد صفحہ ۲۱۰، ترجمہ اردو سبزواری۔

سے ہونا شرط نہیں ہے۔ یہ ملا کاظم خراسانی نجف اشرف کے بڑے مجتہد گزرے ہیں۔ یہ بحث صرف سادات کے متعلق ہے عترت رسول ﷺ یا اہل بیت رسالت یہ ایک مختلف اصطلاح ہے، اور یہ آنحضرت ﷺ کی اولاد کو کہتے ہیں۔ حضور ﷺ کی اولاد سے محبت حضور ﷺ کی محبت کی ایک فرع ہے۔ ذریت رسول ﷺ جس جہت سے بھی ہو لائق محبت اور مورد عقیدت ہے۔ ہاں شیعہ کے ہاں سادات کا لفظ وسیع ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس نام کے ساتھ سید کا لفظ آئے وہ اولاد رسول میں سے ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عباسی سید ہو یا جعفری یا علوی۔ یہ حضرات بنو ہاشم میں سے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ ذریت رسول ﷺ سے بھی ہوں۔ اہل سنت کی بھی اہل بیت سے محبت حضور ﷺ کی اولاد کے ناطے سے ہے، ہاشم کی اولاد ہونے کے ناطے سے نہیں۔

حضور ﷺ کے رشتہ میں آنے والوں سے محبت کا تعلق چاہئے:

اہل سنت والجماعت کی عقائد کی کتابوں میں حضور ﷺ کے دونوں دامادوں سے محبت رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مجدد ماتہ دہم ملا علی قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

مِنْ عَلَامَاتِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ تَفْضِيْلُ الشَّيْخَيْنِ وَمَحَبَّةُ الْخَتَنَيْنِ (1)

ترجمہ: شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو (تمام صحابہ پر) فضیلت دینا اور دونوں دامادوں (عثمان و علی رضی اللہ عنہما) سے محبت رکھنا اہل سنت والجماعت کی علامات میں سے ہے۔

یہ محبت واقعی حضور ﷺ کی محبت کی ایک شاخ ہے۔ خلفائے راشدین میں سے پہلے دو کی عظمت و افضلیت اور پچھلے دو کی محبت و عقیدت ہر مرد مومن میں ہونی چاہئے اور سادات میں سے ہونا اگرچہ یہ دور کی نسبت ہے تاہم بنو ہاشم سے ہونا بھی کوئی کم اعزاز نہیں ہے۔

---

(1) شرح فقہ اکبر، صفحہ ۹۹، مصر۔